بہنوں کا اپنا ماہنامہ

شعاع

مارچ 2015

بہنوں کا اپنا ماہنامہ

شعاع

بانی و مدیر اعلیٰ محمود ریاض

مدیرہ ——— رضیہ جمیل

مدیر منتظم ——— آذر ریاض

مدیر اعزازی ——— امت الصبور

فلم ٹیلی ویژن ——— شاہین رشید

اشتہارات ——— خالدہ جیلانی

خط و کتابت کا پتہ

ماہنامہ شعاع

37 - اردو بازار کراچی

MEMBER APNS CPNE

رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی

رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپر ایڈیٹرز







مارچ 2015
جلد 29 شمارہ 7
قیمت 60 روپے

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ شعاع، 37 - اردو بازار، کراچی۔

رضیہ جمیل نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا - مقام ۲۰۱ بی ۶ پی ای سی ایچ ایس سوسائٹی کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 0092-21-32766872
Email: shuaa@khawateendigest.com website: www.khawateendigest.com

انٹرویو

ناول









زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ) ----- 700 روپے

ایشیا، افریقہ، یورپ ---- 5000 روپے

امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا --- روپے



شعاع کا مارچ کا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

تخلیق کائنات کا مرکز و محور انسان ہے۔ یہ کائنات انسان کے لیے تخلیق کی گئی۔ اسے شعور عطا کیا گیا' غور و فکر کی صلاحیت دی گئی' قدرت نے انسان کی فطرت میں نیکی' خیر' سچائی ودیعت کی ہے جو کائنات کا حسن اور اس کی بقا کی اساس ہے۔ بات اس آگہی کی ہے جو انسان کی اپنی ذات کا عرفان دیتی ہے۔ انسان کو اس قابل بناتی ہے کہ وہ خامیوں کو جان کر انہیں دور کرے اور اپنی شخصی خوبیوں کو اجاگر کرے۔ غور کرے کہ کائنات میں اس کا مقام و مرتبہ کیا ہے' اس کی تخلیق کس مقصد کے تحت کی گئی ہے۔ اپنی ذات کا عرفان ہی اللہ تعالیٰ کی پہچان کراتا ہے اور یہ ہمیں غور و فکر اور علم سے حاصل ہوتا ہے۔ علم کے لیے کہیں بھی مرد' عورت کی تخصیص نہیں ہے۔

ایک اچھے گھر' ایک اچھے معاشرے کی تشکیل میں خواتین کا کردار بہت اہم ہے۔ کیونکہ بچے کی پہلی درس گاہ ماں کی گود ہوتی ہے اور ابتدائی تربیت کے اثرات تمام زندگی شخصیت پر حاوی رہتے ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ لڑکیوں کی تعلیم کے ساتھ ساتھ ان کی تربیت پر بھی توجہ دی جائے' تاکہ ایک ایسا معاشرہ تشکیل پاسکے جس کی بنیاد مادیت نہیں ہمارا مذہب اور ہماری اقدار ہوں۔

روبرو،

سمیرا احمد کا ناول "یارم" اختتام کو پہنچا۔ "محبت من محرم" کے بعد یہ سمیرا احمد کا دوسرا ناول تھا۔ پہلی قسط سے ہی اس ناول نے قارئین کی توجہ حاصل کرلی۔ جوں جوں ناول آگے بڑھتا رہا۔ مختلف آراء سامنے آتی رہیں۔ اب جبکہ ناول کا اختتام ہوچکا ہے۔ ہمیں یقین ہے آپ لوگوں کو اپنے بہت سے سوالات کے جوابات مل گئے ہوں گے۔

اگر آپ سمیرا احمد سے کچھ کہنا چاہتی ہیں' کچھ پوچھنا چاہتی ہیں "یارم" کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرنا چاہتی ہیں۔ اس پر کوئی تنقید و تبصرہ کرنا چاہتی ہیں تو لکھ کر بھجوادیں۔ سمیرا احمد آپ کے سوالات کے جواب دیں گی۔

سوالات اس طرح بھجوائیں کہ 25 مارچ تک ہمیں موصول ہوجائیں۔

ایڈریس یہ ہے۔

سمیرا احمد' معرفت شعاع 37۔ اردو بازار کراچی۔

اس شمارے میں،

- مومنہ افتخار کا ناول ۔ قید
- سمیرا احمد کے ناول "یارم" کی آخری قسط،
- سحر ساجد اور نازیہ جمال کے ناولٹ،
- نورعین' ملیحہ صدیقی اور جویریہ شاہ کے افسانے،
- رخسانہ نگار عدنان اور نبیلہ عزیز کے ناول،
- ٹی وی فنکار آغا علی عباس سے ملاقات،
- معروف فنکاروں سے گفتگو کا سلسلہ ۔ دستک،
- بیٹھ کر سیر دو جہاں کرنا ۔ آمنہ زریں کا تبصرہ،
- پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں ۔ احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا سلسلہ،
- خط آپ کے اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

شعاع کا یہ شمارہ آپ کو کیسا لگا؟ آپ کی رائے جاننے کے منتظر ہیں۔ ہمیں خط ضرور لکھیے گا۔

حمد باری تعالیٰ

پروردگار بھی ہے، وہ کارساز بھی ہے
بندوں کا ہے وہ آقا، بندہ نواز بھی ہے

محشر میں سب کہیں گے ہم ایک دن رہے ہیں
دُنیا میں یوں تو حاصل عمرِ دراز بھی ہے

وہ ہے علیم و شاکر اور واحد و صمد بھی
بندوں کا قدرداں ہے اور بے نیاز بھی ہے

آنکھوں میں جو نمی ہے وہ جانتا ہے اُس کو
رحمت کا اُس کی مرکز ارضِ حجاز بھی ہے

انسانیت کی خدمت انسان پر ہے لازم
آدابِ بندگی میں روزہ نماز بھی ہے

اُس کا کرم ہے اُس نے سوزِ دلی ہے بخشا
آنکھوں سے اشک نکلے دل میں گداز بھی ہے

لاتقنطو کہا ہے قرآں میں پھول اُس نے
دَر اُس کی رحمتوں کا ہر وقت باز بھی ہے

تنویر پھول

نعت رسول مقبول ﷺ

مجھ میں ان کی ثنا کا سلیقہ کہاں، وہ شہِ دوجہاں وہ کہاں میں کہاں
ان کا مدح سرا خالقِ این و آں، وہ رسولِ زماں وہ کہاں میں کہاں

ان کے دامن سے وابستہ میری نجات، اُن پہ قرباں میری حیات ممات
میں گنہگار وہ شافعِ عاصیاں، نیکیوں کی اماں وہ کہاں میں کہاں

وہ مدینہ نگینہ ہے جو عرش کا، وہ مدینہ بھرم جو بنا فرش کا
وہ مدینہ جہاں رحمتِ بیکراں، میں بھی پہنچوں وہاں وہ کہاں میں کہاں

میں سراپا عدم، وہ سراپا وجود، اُن پہ ہر دم سلام اُن پر ہر دم درود
وہ حقیقت میں افسانہ و داستاں، ان کا میں مدح خواں وہ کہاں میں کہاں

شک نہیں اے ریاضؔ اس میں ہرگز ذرا، وہ سراپا عطا میں سراپا خطا
نام ان کا رہے کیوں نہ وردِ زباں، ہیں وہ تسکینِ جاں وہ کہاں میں کہاں

ریاض الدین سہروردی



اللہ کی رضامندی کے لیے

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے ' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جو شخص وہ علم جس سے اللہ کی رضامندی طلب کی جاتی ہے اس لیے حاصل کرے تاکہ اس کے ذریعے سے دنیا کا ساز و سامان حاصل کرے ' تو وہ قیامت کے روز جنت کی خوشبو بھی نہیں پائے گا۔

(اسے ابو داؤد نے صحیح سند سے روایت کیا ہے۔)

فائدہ : اس میں اس امر کی ترغیب ہے کہ علم دین صرف اللہ کی رضا کے لیے حاصل کیا جائے اگر دنیا حاصل کرنے کا مقصد پیش نظر ہو گا تو یہ بہت بڑا جرم ہے کہ دین کا عالم جنت کی خوشبو تک سے محروم رہے گا۔ ہاں بغیر قصد و نیت کے دنیا مل جائے تو اور بات ہے ' وہ انسان کے لیے نقصان دہ نہیں۔

علم کا اٹھ جانا

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا۔

"اللہ تعالیٰ علم اس طرح نہیں اٹھائے گا کہ اسے لوگوں (کے سینوں) سے کھینچ لے ' لیکن وہ علم کو علماء کی وفات کے ذریعے سے اٹھائے گا۔ یہاں تک کہ جب وہ کسی عالم کو باقی نہیں رکھے گا تو لوگ جاہلوں کو سردار بنالیں گے۔ چنانچہ ان سے سوال کیا جائے گا تو وہ بغیر علم کے فتویٰ دیں گے۔ اور (یوں) خود بھی گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے۔" (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل :

1۔ یہ قرب قیامت کی ایک علامت کا بیان ہے کہ علمائے دین ناپید ہو جائیں گے اور جاہل لوگ سردار ' پیشوا اور امام بن جائیں گے جن کو قرآن و حدیث کا علم ہی نہیں ہو گا ' اس کے باوجود وہ مفتی اور مجتہد بنے ہوں گے اور اپنے فتووں اور خود ساختہ مسئلوں سے اپنے ساتھ دوسرے لوگوں کو بھی گمراہی کا باعث بنیں گے۔

2۔ اس میں جہاں اس امر کی ترغیب ہے کہ علمائے دین زیادہ سے زیادہ تیار کیے جائیں ' وہاں اس کی بھی تاکید ہے کہ جاہلوں کو دین کا پیشوا بنانے سے اجتناب کیا جائے۔

اللہ کی حمد و شکر کا بیان

شکر کی فرضیت کا بیان

اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

"پس تم مجھے یاد کرو ' میں تمہیں یاد کروں گا اور تم میرا شکر ادا کرو اور میری ناشکری نہ کرو۔" (البقرہ۔ 152)

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ "اگر تم شکر کرو گے تو یقیناً" میں تمہیں اور زیادہ (نعمتیں) دوں گا۔" (سورہ ابراہیم۔)

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ "(اے پیغمبر!) کہہ دیجئے ' تمام تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں۔" (اسراء 111)

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ "اور ان کی آخری پکار یہی ہو گی کہ تمام تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں جو تمام جہانوں کا پالن ہار ہے۔" (یونس۔ 10)

فائدہ آیات : اللہ کو یاد کرنے کا مطلب اس کا ذکر اور اس کی اطاعت و فرمانبرداری ہے۔ اسی طرح خوش حالی میں بھی اسے یاد رکھنا اور حالات کی شدتوں میں بھی کسی اور کے در پر جانے سے گریز کرنا ہے۔ اور اللہ کے یاد کرنے کا مطلب یہ ہے کہ آسمانوں پر اس کا تذکرہ فرماتا ہے۔ اسی طرح اس کا مفہوم انسان کی قدر افزائی اور اسے اپنی مغفرت و رحمت سے شاد کام فرمانا اور سختیوں میں اس کی چارہ سازی کرنا بھی ہے۔ شکر' یہ ہے کہ یہ اعتقاد رکھا جائے کہ سب کچھ دینے والا صرف ایک اللہ ہے' پھر اللہ کی نعمتوں پر زبان سے اللہ کی حمد کرنا قولی شکر ہے اور اس کے حکموں کی اطاعت کرنا عملی شکر ہے۔ اور عدم شکر' کفران نعمت ہے جو بہت بڑا گناہ ہے۔ حمد کا مطلب ہے : زبان سے تعظیم کے طور پر منعم کی ثنا و تعریف کرنا۔ اہل ایمان کی زبانوں پر جنت میں بھی اللہ کی حمد کے ترانے ہوں گے۔ جعلنا اللہ منھم۔

صبر

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جب کسی بندے کی اولاد فوت ہو جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ اپنے فرشتوں سے فرماتا ہے : "تم نے میرے بندے کی اولاد (کی روح) کو قبض کیا ہے؟"

تو وہ کہتے ہیں : "ہاں۔"

چنانچہ اللہ فرماتا ہے : "تم نے اس کے دل کا پھل قبض کیا ہے؟"

وہ کہتے ہیں : "ہاں۔" تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے : "میرے بندے نے کیا کہا؟"

وہ کہتے ہیں : "اس نے تیری حمد بیان کی اور انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھا۔"

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے : تم میرے بندے کے لیے جنت میں ایک گھر بنا دو اور اس کا نام بیت الحمد رکھو۔"

(اسے امام ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے : یہ حدیث حسن ہے۔)

فائدہ : اس میں مصیبت کے وقت صبر کرنے اور اللہ کی حمد کرنے کی فضیلت کا بیان ہے۔ خاص طور پر اولاد کی دائمی جدائی کے صدمے پر جزع فزع اور بے صبری کا مظاہرہ کرنے کے بجائے اللہ کی رضا و تقدیر پر صبر و شکر کرنا بڑے اجر و ثواب کا کام ہے۔

تھوڑا ہو یا زیادہ۔

جنت کا بیان

حضرت ابو سعید اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جب جنتی جنت میں داخل ہو جائیں گے تو ایک پکارنے والا پکارے گا کہ تمہارے لیے اب زندگی ہی زندگی ہے۔ تم کبھی موت سے ہمکنار نہیں ہو گے اور یہ بھی کہ تم صحت مند رہو گے' کبھی بیمار نہیں ہو گے اور یہ کہ تم جوان رہو گے' کبھی بوڑھے نہیں ہو گے اور یہ کہ تمہارے لیے راحت ہی راحت ہے' تمہیں کبھی تکلیف نہیں آئے گی۔" (مسلم)

فوائد و مسائل : دنیا میں انسان' جب تک اس کی زندگی ہے' زندہ تو رہتا ہے لیکن یہ پتا نہیں ہوتا کہ یہ زندگی کب ختم ہو جائے گی۔ صحت مند سے صحت مند انسان بھی اس خطرے کی زد میں رہتا ہے کہ پتا نہیں کب کوئی بیماری اس پر حملہ کر دے۔ اسی طرح جوانی کو قرار نہیں' وہ بڑھاپے میں تبدیل ہو جاتی ہے' راحت و آرام کا بھروسا نہیں کہ انسان کب اس سے محروم ہو جائے اور کلفتوں اور تکلیفوں میں گھر جائے۔ غرض دنیا کی کسی چیز کو ثبات و دوام نہیں۔ جب کہ جنت میں ہر چیز زوال و فنا سے محفوظ ہو گی۔ زندگی ہو گی موت نہیں۔ صحت ہو گی' بیماری نہیں۔ جوانی ہو گی' بڑھاپا نہیں۔ راحت و آسائش ہو گی' دکھ اور تکلیف نہیں۔

علم چھپانے والا

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے'

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جس سے علم دین کی کوئی بات پوچھی جائے، پھر وہ اسے چھپائے تو قیامت والے دن اس کو آگ کی لگام دی جائے گی۔"

(اسے ابو داؤدؒ اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے کہا ہے : یہ حدیث حسن ہے۔)

فائدہ : اس سے معلوم ہوا کہ سائل کو دین کی صحیح بات نہ بتلانا سخت کبیرہ گناہ ہے جس پر جہنم کی شدید وعید ہے۔

ناپ تول

حضرت ابوہریرہؓ کہا کرتے تھے۔

"اللہ کی قسم! جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ (زمانہ نبویؐ میں) بھوک کے مارے میں زمین پر اپنے پیٹ کے بل لیٹ جاتا تھا اور کبھی میں بھوک کے مارے اپنے پیٹ پر پتھر باندھا کرتا تھا۔ ایک دن میں اس راستے پر بیٹھ گیا جس سے صحابہؓ گزرتے تھے۔

حضرت ابو بکر صدیقؓ گزرے اور میں نے ان سے کتاب اللہ کی ایک آیت کے بارے میں پوچھا، میرے پوچھنے کا مقصد صرف یہ تھا کہ وہ مجھے کچھ کھلا دیں مگر وہ چلے گئے اور کچھ نہیں کیا۔

پھر حضرت عمرؓ میرے پاس سے گزرے، میں نے ان سے بھی قرآن مجید کی ایک آیت پوچھی اور پوچھنے کا مقصد صرف یہ تھا کہ وہ مجھے کچھ کھلا دیں، مگر وہ بھی گزر گئے اور کچھ نہیں کیا۔

اس کے بعد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم گزرے اور آپؐ نے جب مجھے دیکھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم مسکرا دیئے اور آپؐ میرے دل کی بات سمجھ گئے اور میرے چہرے کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تاڑ لیا۔

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"ابا ہر!"

میں نے عرض کیا۔ "لبیک، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم!"

فرمایا۔ "میرے ساتھ آجاؤ۔" اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم چلنے لگے۔ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے چل دیا۔

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم اندر گھر میں تشریف لے گئے۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم داخل ہوئے تو ایک پیالے میں دودھ ملا۔ دریافت فرمایا۔

"یہ دودھ کہاں سے آیا ہے؟"

کہا۔ فلاں یا فلانی نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تحفہ میں بھیجا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "ابا ہر!"

میں نے عرض کیا کہ لبیک یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم!"

"فرمایا اہل صفہ کے پاس جاؤ اور انہیں بھی میرے پاس بلا لاؤ۔"

اہل صفہ اسلام کے مہمان تھے۔ وہ نہ کسی کے گھر پناہ ڈھونڈتے، نہ کسی کے مال میں اور نہ کسی کے پاس! جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس صدقہ آتا تو اسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان ہی کے پاس بھیج دیتے اور خود اس میں سے کچھ نہ رکھتے، البتہ جب آپ کے پاس تحفہ آتا تو انہیں بلا بھیجتے اور خود بھی اس میں سے کچھ کھاتے اور انہیں بھی شریک کرتے، چنانچہ مجھے یہ بات ناگوار گزری اور میں نے سوچا کہ یہ دودھ ہے ہی کتنا کہ سارے صفہ والوں میں تقسیم ہو، اس کا حق دار میں تھا کہ اسے پی کر کچھ قوت حاصل کرتا جب صفہ والے آئیں گے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مجھ سے فرمائیں گے اور میں انہیں اسے دے دوں گا، مجھے تو شاید اس دودھ میں سے کچھ بھی نہیں ملے گا، لیکن اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی حکم برداری کے سوا کوئی اور چارہ بھی نہیں تھا۔ چنانچہ میں ان کے پاس آیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پہنچائی۔

وہ آگئے اور اجازت چاہی، انہیں اجازت مل گئی، پھر وہ گھر میں اپنی جگہ بیٹھ گئے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "ابا ہر!"

میں نے عرض کیا۔ "لبیک یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم!"

فرمایا۔ "لو اور اسے ان سب حاضرین کو دے دو۔"

پھر میں نے پیالہ پکڑ لیا اور ایک ایک کو دینے لگا۔ ایک شخص دودھ پی کر جب سیراب ہو جاتا تو مجھے پیالہ

واپس کر دیتا، پھر دوسرے شخص کو دیتا وہ بھی سیر ہو کر پیتا، پھر پیالہ مجھے واپس کر دیتا اور اسی طرح تیسرا پی کر، پھر مجھے پیالہ واپس کر دیتا، اس طرح میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچا۔ لوگ پی کر سیراب ہو چکے تھے، آخر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پیالہ پکڑا اور اپنے ہاتھ پر رکھ کر آپ نے میری طرف دیکھا اور مسکرا کر فرمایا۔

"ابا ہر!"

میں نے عرض کیا۔ "لبیک یا رسول اللہ صلی اللہ وسلم! آپ نے سچ فرمایا۔"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"بیٹھ جاؤ اور پیو۔"

میں بیٹھ گیا اور میں نے دودھ پیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم برابر فرماتے رہے کہ

"اور پیو۔"

آخر مجھے کہنا پڑا، نہیں۔ اس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے اب بالکل گنجائش نہیں ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"پھر مجھے دے دو۔"

میں نے پیالہ آپ کو دے دیا۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کی حمد بیان کی اور بسم اللہ پڑھ کر بچا ہوا خود پی گئے۔

شیطان

حضرت جابر رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا۔

"شیطان یقیناً" اس بات سے مایوس ہو گیا ہے کہ نمازی جزیرہ عرب میں اس کی عبادت کریں گے، مگر ان کے درمیان فساد ڈالنے میں (وہ کامیاب رہے گا۔") (مسلم)

فوائد و مسائل : 1۔ یہ حدیث دلائل نبوت میں سے ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ پیش گوئی سچ ثابت ہوئی کہ مسلمان آپس میں لڑیں گے، جھگڑیں گے اور باہم تعلقات منقطع کریں گے اور یہ کام شیطان کی شرارت، اس کی انگیخت اور وسوسہ اندازی کی وجہ سے ہو گا۔

2۔ نمازیوں سے مراد مسلمان ہیں۔

سزا

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"کسی مسلمان کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ تین دن سے زیادہ اپنے بھائی سے تعلق منقطع رکھے۔ چنانچہ جو شخص تین دن سے اوپر تعلق منقطع کیے رکھے گا اور اسی حالت میں اسے موت آگئی تو وہ جہنم میں جائے گا۔" (اسے ابو داؤد نے ایسی سند کے ساتھ روایت کیا ہے جو بخاری کی شرط پر ہے۔)

فائدہ : جہنم میں یہ دخول بطور سزا کے ہو گا، سزا بھگتنے کے بعد اسے جہنم سے نکال کر جنت میں داخل کر دیا جائے گا کیونکہ ہمیشہ جہنم میں رہنا صرف کافروں کے لیے ہے۔ تاہم اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ مسلمان جو چاہے کرلے، وہ بطور سزا بھی جہنم میں نہیں جائے گا۔ ایسا سمجھنا غلط ہے۔

تعلق توڑنا

حضرت ابو خراش حدرد بن ابی حدرد اسلمی اور بعض کے نزدیک سلمی، صحابی رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا۔

"جو شخص اپنے (مسلمان) بھائی سے ایک سال تک تعلق منقطع رکھے گا تو اس کا یہ عمل، اس کا خون بہانے کے برابر ہے۔" (اسے ابو داؤد نے صحیح سند سے روایت کیا ہے۔)

فوائد و مسائل : 1۔ ترک تعلق بھی ایک طرح سے معنوی قتل ہے، جس سے دوسرے مسلمان کو سخت ذہنی اذیت سے گزرنا پڑتا ہے، اس لیے اسے قتل کے مترادف قرار دیا۔

2۔ بول چال یا ترک تعلق صرف اللہ کی رضا کے لیے ہو، **مثلاً** "کوئی شخص بدعتی ہے، یا کھلم کھلا فسق و فجور کا ارتکاب کرتا ہو، سمجھانے کے باوجود وہ اپنی

بدعت یا فسق و فجور سے باز نہ آئے تو ایسے شخص سے صرف اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے بول چال بند کر دینا اور تعلق منقطع کر لینا جائز بلکہ مستحب ہے، تاکہ اسے عبرت و نصیحت ہو اور اس طرح شاید وہ باز آجائے۔ لیکن محض دنیوی رنجشوں کی وجہ سے تین دن سے زیادہ تعلق منقطع کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

سلام کا جواب

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"کسی مومن کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ کسی مومن سے تین دن سے اوپر تعلق منقطع کیے رکھے۔ چنانچہ اگر اسی حالت میں تین دن گزر جائیں تو چاہیے کہ اس سے ملاقات کرے اسے سلام کرے، اگر اس نے سلام کا جواب دے دیا تو دونوں ثواب میں شریک ہو گئے اور اگر اس نے (کشیدگی کو برقرار رکھتے ہوئے) سلام کا جواب نہ دیا تو وہ گناہ گار ہوا اور سلام کرنے والا ترک تعلق کے گناہ سے نکل گیا۔"

(اسے امام ابو داؤد نے حسن سند سے روایت کیا ہے، نیز انہوں نے فرمایا: اگر ترک تعلق اللہ کے لیے ہو تو پھر اس میں کوئی گناہ نہیں۔)

باب : 204۔ مسجد میں نماز کے لیے ایک جگہ مقرر کر لینے کا بیان

1429۔ حضرت عبدالرحمٰن بن شبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا۔

"اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے تین کاموں سے منع فرمایا ہے۔ کوے کی طرح ٹھونگیں مارنے سے، درندے کی طرح بازو پھیلانے سے اور اس بات سے کہ آدمی نماز کے لیے ایک جگہ مقرر کرلے جس طرح اونٹ (باڑے میں اپنے لیے) جگہ مقرر کر لیتا ہے۔"

فوائد و مسائل : کوے کی طرح ٹھونگیں مارنے کا مطلب جلدی جلدی سجدے کرنا ہے۔ یہ عمل نماز میں توجہ اور خشوع کے خلاف ہے، اس لیے تمام ارکان اطمینان سے پورے اذکار اور دعائیں پڑھتے ہوئے ادا کرنے چاہئیں۔

سجدہ کرتے وقت صرف ہاتھ زمین پر رکھنے چاہئیں، کہنیوں تک بازو زمین پر پھیلا دینا درست نہیں۔

نماز کے لیے جگہ مقرر کرنا اور دوسروں کو وہاں نماز پڑھنے سے روکنا جائز نہیں کیونکہ مسجد سب کے لیے مشترک ہے، ہاں اگر جگہ خالی دیکھ کر وہاں نماز پڑھتا ہے اور اکثر ایسا ہو جاتا ہے کہ وہیں نماز پڑھے تو جائز ہے یا مثلاً : ایک شخص صف میں دائیں طرف کھڑا ہونا پسند کرتا ہے تو یہ جائز ہے جبکہ پہلے سے بیٹھے ہوئے شخص کو اٹھایا نہ جائے۔

نماز پڑھتے وقت اگر جوتے اتارے جائیں تو کہاں رکھے جائیں۔

1431۔ حضرت عبداللہ بن سائب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا۔ "میں نے فتح مکہ کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ نے نماز پڑھی تو اپنے جوتے اپنے بائیں طرف رکھے۔"

فوائد و مسائل : جوتے پہن کر نماز پڑھنا بھی جائز ہے اور جوتے اتار کر پڑھنا بھی۔

جوتے اتار کر نماز پڑھیں تو انہیں بائیں طرف رکھیں۔



آغا علی عباس سے ملاقات

شاہین رشید

شوبز میں اگرچہ سفارش بہت چلتی ہے، مگر کامیاب وہ ہی ہوتا ہے جس کے پاس ٹیلنٹ ہوتا ہے۔ یا پھر وہ اس فیلڈ میں کامیاب ہوتا ہے جس کے خون میں فن اداکاری جذب ہوتا ہے۔ آغا علی عباس کے خون میں بھی اداکاری رچی بسی ہوئی ہے۔ آغا سکندر کے صاحبزادے جو ہیں۔ آج کل ناظرین انہیں مختلف ڈراموں میں دیکھ رہے ہوں گے۔ بہترین رومانٹک پرفارمر ہیں۔ اس لیے نوجوانوں کی پسند ہیں اور ڈائریکٹرز کی بھی۔

"کیسے ہیں آغا علی؟"

"اللہ کا شکر ہے۔"

"بہت مصروف رہتے ہیں۔ بات کرنے کا ٹائم ہی نہیں ہے آپ کے پاس؟"

"جی جی۔ واقعی بہت مصروف ہوں اور سچ مچ میرے پاس ٹائم نہیں ہے بات کرنے کا۔"

"ماشاء اللہ آج کل ہر دوسرا تیسرا ڈرامہ آپ کا ہی ہوتا ہے۔ کیسا لگ رہا ہے۔؟"

"اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے مجھے عزت و شہرت دی۔ تو کون ہوگا جس کو اچھا نہ لگ رہا ہو۔ مجھے بھی بہت اچھا لگ رہا ہے۔"

"اور کیا مصروفیات ہیں آج کل۔"

"جو آن ایر ہیں۔ آپ دیکھ رہی ہوں گی اور جو انڈر پروڈکشن ہیں ان کے بارے میں بتانا فضول ہے۔ کیونکہ نہ جانے کب مکمل ہوں۔ کب آن ایر ہوں اور نہ جانے کس چینل پہ آن ایر ہوں۔"

"گڈ۔ بات کو ٹالنا خوب آتا ہے۔ خیر کچھ اور باتیں ہو جائیں؟"

"جی جی ضرور۔ اور ٹال نہیں رہا۔ سچ بتا رہا ہوں۔ کبھی کبھی کوئی پروجیکٹ مہینوں میں مکمل ہو جاتا ہے اور کوئی سالوں میں۔ تو بس اس فیلڈ میں سب کچھ چلتا ہے۔ اس لیے نہیں بتا رہا۔"

"ڈراموں کے حوالے سے تو آپ کو اب سب ہی جانتے ہیں اپنی نجی لائف کے بارے میں کچھ بتائیں۔"

"میں جی 4 دسمبر 1986ء میں لاہور میں پیدا ہوا۔ پیار سے سب "سونو" کہتے ہیں۔ ہم دو بھائی اور ایک بہن ہیں بھائی مجھ سے بڑے ہیں اور بہن چھوٹی۔ اور میں بیچ کا۔"

"بیچ کے لوگ عموماً" شکوہ کرتے ہیں کہ انصاف نہیں ملتا۔ آپ کے ساتھ ایسا ہوا۔"

ہنستے ہوئے۔ "نہیں نہیں ایسا کچھ نہیں ہوا، ہم تینوں بہن بھائیوں میں ماشاء اللہ بہت محبت ہے۔ اور میں اس بات کو نہیں مانتا کہ بیچ کے لوگوں کے ساتھ زیادتی ہوتی ہے۔"

"اس فیلڈ میں نام بنانے کے لیے مقام حاصل کرنے کے لیے، سب کچھ آسانی سے مل گیا یا کچھ جدوجہد بھی کرنی پڑی؟"

"کچھ جدوجہد؟؟ ارے جی جدوجہد سے ہی سب کچھ حاصل کیا۔ کیونکہ والد صاحب کا جب انتقال ہوا تو ہم تینوں کافی کم عمر تھے۔ اور کم عمری میں ماں یا باپ کا ساتھ نہ رہے تو پھر سوائے اللہ کے اور کوئی کسی کا نہیں ہوتا۔ تو بہت محنت کے بعد یہ مقام حاصل کیا ہے۔"

"ہوں۔ تھوڑا بتانا پسند کریں گے کہ کس طرح وقت گزرا۔ اور کیا کیا کیا؟"



نے آج ہم تینوں بہن بھائیوں کو سرخرو کیا ہے۔"

"اس جدوجہد کے دور میں کیا سوچتے تھے کہ منزل کیا ہے۔ فیوچر میں کیا کرنا ہے۔ یا منتظر تھے کہ کوئی راستہ دکھائے۔"

"کوئی راستہ دکھائے؟ اس کے بارے میں تو سوچا ہی نہیں تھا۔ بس اللہ راستہ دکھائے یہ ضرور سوچا کرتا تھا۔ اور جیسا کہ کہا کہ والد صاحب اس فیلڈ میں تھے اور ان کا بڑا نام تھا تو دل چاہتا تھا کہ ہم بھی اس فیلڈ میں ہوں اور والد کی طرح مشہور ہوں۔ اور یہ میرا خواب تھا کہ میں اس فیلڈ میں آؤں۔ اور اللہ نے میرا یہ خواب پورا کیا۔"

"باقاعدہ آمد کیسے ہوئی' کس نے متعارف کرایا؟"

"مجھے اس فیلڈ میں طارق معراج صاحب اور رفیق وڑائچ صاحب نے متعارف کرایا اور میرا پہلا پروگرام "راؤنڈ اپ" تھا جس کا میں میزبان تھا ان ہی دونوں نے پھر مجھے اداکاری کی فیلڈ میں بھی متعارف کرایا۔ لوگ مجھے راؤنڈ اپ سے ہی پہنچاننے لگے تھے۔ لیکن مجھے اصل شہرت ڈرامہ سیریل "تیری اک نظر" اور "جناح کے نام" سے ملی۔ اور میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ مجھے اپنے پہلے پہلے ڈراموں سے اتنی شہرت مل جائے گی کہ یہ راستہ بنیں گے میرے اگلے پروجیکٹ کے لیے۔ میں تو شکر گزار ہوں طارق معراج صاحب کا کہ جنہوں نے مجھ پر بھروسا کرکے اتنے بڑے سیریل میں ایک بڑا اور جان دار رول دیا۔ حالانکہ اس وقت میں بالکل نیا تھا۔ اور میں تو وہ وقت بھی نہیں بھولوں گا جب طارق معراج صاحب نے مجھے فون کرکے کہا کہ آغا مجھے تم پر فخر ہے۔ بتایئے اس وقت میرا خون کتنا بڑھا ہو گا۔"

"ابتدا میں اور کیا کیا کیا؟"

"ابتدا میں تو ہوسٹنگ کی' سوشل راؤنڈ اپ کیا۔ 2006ء میں اس فیلڈ میں آیا۔ اور آج 2015ء ہو گیا ہے۔ تو قدم بہ قدم ترقی حاصل کی ہے' راتوں رات نہیں۔ کمرشلز بھی کیے۔ فلم بھی۔ ڈرامے تو بہت کر چکا ہوں۔"

"اب مطمئن ہیں۔ شہرت پاکر مزا آرہا ہے؟"

"الحمد اللہ اپنی لائف سے بہت مطمئن ہوں۔ اللہ بڑا مہربان ہے محنت کا صلہ ضرور دیتا ہے اور شہرت؟؟ شہرت اور فیلڈ تو میرا خواب تھا۔ اللہ نے میرا یہ خواب

پورا کیا ہے اور بھرپور شہرت والا خواب بھی ان شاء اللہ ضرور پورا کرے گا۔"

"لوگ کہتے ہیں کہ ہمارے پرائیویسی نہیں رہی۔ ہم کہیں جا نہیں سکتے۔ آپ بھی یہی کہیں گے بھرپور شہرت کے بعد۔"

"نہیں نہیں ہرگز نہیں۔ کیونکہ شہرت سب کے حصے میں نہیں آتی' یہ اللہ کا اپنے بندے کے لیے خاص انتخاب ہوتا ہے تو میں بھی اس لحاظ سے خوش نصیب ہوں کہ اچھی شہرت کے لیے اللہ نے میرا انتخاب کیا۔ مجھے تو بہت اچھا لگتا ہے جب میں کہیں جاتا ہوں لوگ پہچانتے ہیں محبت سے پیش آتے ہیں۔ تعریف کرتے ہیں۔"

"اور ایک عدد تصویر کھنچوانے کی فرمائش بھی کرتے ہیں؟"

قہقہہ۔ "جی جی۔ پہلے آٹوگراف ہوتا تھا اور اب تصویر۔ تو کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ آج ہم جو کچھ ہیں اس میں اپنی محنت و مشقت کا عمل دخل تو ہے ہی مگر ناظرین کی پسندیدگی کا بھی عمل دخل ہے۔ کیونکہ اگر وہ مجھے پسند نہیں کریں گے تو ڈائریکٹرز مجھے بک نہیں کریں گے۔"

"بالکل ٹھیک کہا آپ نے۔ آپ نے کم عمری میں ہی پریکٹیکل لائف میں قدم رکھا۔ حالات سے گھبرا کر کسی بری عادت میں مبتلا ہوئے؟"

"ہمارے یہاں کم عمری میں سگریٹ پینے کو ہی بری عادت تصور کیا جاتا ہے اور ہاں۔ میں جب اکیلا ہوتا تھا اور تھک جاتا تھا یا کسی بات پر مجھے غصہ آتا تھا تو سگریٹ پی لیتا تھا۔ تو بس آہستہ آہستہ پھر اس کی عادت ہو گئی۔ اب بھی پیتا ہوں۔ مگر کم پیتا ہوں۔ اب غصہ بھی کم آتا ہے۔ ٹینشن میں بھی کمی آئی ہے۔ اور حالات بھی مالی طور پر اچھے ہیں۔"

"لوگ محبت سے ملتے ہیں۔ آپ کو دیکھتے ہی پہچان لیتے ہیں پھر بھی کوئی بات جو ناگوار گزرتی ہو؟"

ہنستے ہوئے۔ "بہت محبت کرتے ہیں لوگ' لیکن جب پوچھتے ہیں کہ آج کل کون سے ڈراموں میں کام کر رہے ہیں۔ تو سوچتا ہوں کہ پسندیدگی کا اظہار کر رہے ہیں' مگر یہ نہیں معلوم کہ کون کون سے ڈراموں میں کام کر رہے ہیں۔ تو پھر اس وقت تھوڑا موڈ خراب ہوتا ہے۔"

"آپ کے پرستاروں میں لڑکیوں کی تعداد زیادہ ہوگی۔ فون آئے تو بات کرتے ہیں؟"

"ہاں جی بات کر لیتا ہوں۔ مگر مختصر۔ کیونکہ اکثر ریکارڈنگ میں مصروف ہوتا ہوں۔ اور چونکہ میں کسی کو جانتا بھی نہیں تو پھر ہیلو ہائے کر لیتا ہوں۔"

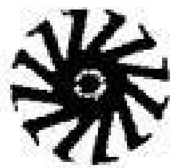
"تنہائی ملے۔ تو کس سے ہم کلام ہوتے ہیں۔ یا میوزک سے دل بہلاتے ہیں؟"

"میوزک تو ڈرائیونگ کے دوران سنتا ہوں۔ تنہائی میں تو اپنے رب سے اور اپنے والد سے ہمکلام ہوتا ہوں۔ رب کائنات سے اپنی باتیں شیئر کرتا ہوں اور ابا سے شکوہ کرتا ہوں کہ جلدی کیوں چلے گئے۔ اور یہ کہ اگر آپ آج ہمارے درمیان ہوتے تو ہم بھائیوں کی ترقی دیکھ کر کتنا خوش ہوتے۔"

"واقعی۔ چھٹی کے دن کیا کرتے ہیں۔ سوتے ہیں یا گھومنے پھرنے جاتے ہیں؟"

"چھٹی کا دن عموماً گھر میں گزرتا ہے' گھر والوں کے ساتھ مزے کرتا ہوں۔ کم ہی سوتا ہوں چھٹی کے دن۔ ویسے بھی میری نیند بہت کچی ہے۔ کوئی آہٹ بھی ہو جائے تو آنکھ کھل جاتی ہے' حالانکہ گھر والے بہت خیال رکھتے ہیں۔"

اس کے ساتھ ہی ہم نے آغا علی عباس سے اجازت چاہی اس شکریہ کے ساتھ کہ انہوں نے اپنی مصروفیات سے ہمیں ٹائم دیا۔



اچھی خاصی شکل کے مالک ہو۔ اداکاری کیوں نہیں کرتے اور پھر انہی کے کہنے پر مجھے ایک سوپ میں کام مل گیا۔۔۔ اور بس پھر سلسلہ چل پڑا۔"

"چلیں جی' اللہ آپ کو مزید ترقی دے۔ ازدواجی لائف کب شروع ہوئی اور کیسی گزر رہی ہے؟"

"جی دسمبر 2011ء میں شادی ہوئی' ماشاء اللہ سے ایک بیٹی ہے اور (Inaya) عنایا نام ہے۔"

"اتنی مصروفیات میں بیٹی اور بیگم کو کتنا ٹائم دیتے ہیں؟"

"سچ میں مصروفیات میں کبھی کبھی ناانصافی ہو جاتی ہے۔ مگر میری کوشش ہوتی ہے کہ بیگم کو اور بیٹی کو برابر ٹائم دوں اور سال میں ایک بار ضرور کہیں نہ کہیں گھمانے لے جاؤں۔"

"آپ جو کچھ کر رہے ہیں وہ بیگم اور بیٹی کے لیے ہی تو کر رہے ہیں۔"

"جی بالکل۔"

"آج کل ورلڈ کپ ہو رہا ہے دیکھ رہے ہیں۔۔۔ لگاؤ ہے آپ کو کرکٹ سے؟"

"کرکٹ مجھے پسند تو بہت ہے۔ مگر امیدیں نہیں لگاتا کہ پھر مایوسی ہو تو دل ٹوٹ جاتا ہے۔ اور مصروفیات بھی اب اتنی زیادہ ہو گئی ہیں کہ ذاتی خواہشات پوری کرنے کے لیے ٹائم ہی نہیں ملتا۔"

"اپنی کامیابیوں کے لیے کس کا نام لیں گے۔"

"تین لوگوں کا نام تو ضرور ہی لوں گا۔ سب سے پہلے تو معین اختر صاحب کا نام لوں گا کہ جنہوں نے مجھے دیکھ کر یہ اندازہ لگا لیا کہ مجھ میں اداکاری کی صلاحیت ہے۔ اور دوسرا نام "مومنہ درید" کا ہے۔ جن کی وجہ سے مجھے بے حد شہرت ملی اور تیسرا نام سہیل ہاشمی صاحب کا کہ جنہوں نے میرے گیپ کے بعد دوبارہ مجھے اس فیلڈ میں متعارف کرایا۔"

"اور کسی سے کوئی شکایت؟"

"نہیں الحمدللہ مجھے کسی سے کوئی شکایت نہیں۔ سب میرے ساتھ بہت پیار اور محبت سے پیش آتے ہیں۔"



شاہین خان

"کیسی ہیں شاہین صاحبہ؟"

"جی اللہ کا شکر ہے۔"

"ابھی آپ کے دو سیریلز ختم ہوئے ہیں۔ گو کہ آپ کے کردار تو پہلے ختم ہو گئے تھے' مگر سیریلز اب ختم ہوئے ہیں مزید کیا کر رہی ہیں آپ؟"

"کافی کام ہے ماشاء اللہ سے۔۔۔ بتانا نہیں چاہوں گی کہ پھر چارم ختم ہو جاتا ہے۔۔۔ کچھ کام شروع ہو چکا ہے' کچھ کام باقی ہے اور کچھ شروع ہونے والا ہے۔

ڈراموں کے علاوہ یاسر نواز کے ساتھ ایک فلم بھی کر رہی ہوں جس کی ریکارڈنگز شروع ہو چکی ہیں۔"

"پہلے آپ سعودی ایرلائن میں تھیں اور کافی ٹائم آپ نے اس ایرلائن میں گزارا۔۔۔ اب پاکستان میں ہیں تو کتنے سال ہوئے پاکستان آئے ہوئے اور آپ خوش ہیں؟"

"جی میں پاکستان آکر بہت خوش ہوں۔ اگرچہ ملک سے باہر رہ کر ہمیں بہت سی سہولتوں کی عادت ہو جاتی ہے۔ مگر ایک وقت آتا ہے کہ ہمیں اپنے ملک آنا پڑتا ہے۔ مجھے پاکستان آئے دس سال ہو چکے ہیں اور

میرے شوہر کی خواہش تھی کہ اب ہمیں پاکستان واپس چلے جانا چاہیے۔"

"اس فیلڈ میں شوقیہ آئیں یا ضرورتاً؟"

"نہ شوقیہ نہ ضرورتاً" میری ایک دوست ہے جو ڈرامہ رائٹر ہے وہ مجھے اس فیلڈ میں لے کر آئی کاظم پاشا کے پاس۔ وہ ان دنوں ڈرامہ سیریل "تھوڑا سا آسمان" بنا رہے تھے۔ کاظم صاحب کو مجھ میں شاید اداکارہ نظر آئی' انہوں نے اپنے سیریل کے لیے منتخب کرلیا اور بس.... پھر آفرز کا سلسلہ شروع ہوگیا.... مگر چونکہ میرا بیٹا چھوٹا تھا تو میں کبھی کبھار ڈرامے کرلیا کرتی تھی' کیونکہ میں ضرورتاً" تو آئی نہیں تھی کہ میرے گھر کا دانا پانی اس سے تھا۔ ڈرامہ کیا' اچھا ریسپانس ملا تو بس پھر شوق بھی پیدا ہوگیا۔"

"آپ کو اپنی صلاحیتوں کا اندازہ تھا.... جب آپ کاظم پاشا صاحب کے پاس گئیں؟"

"مجھ میں ایک خوبی تو ہے میں اسے اپنی خوبی ہی کہوں گی کہ اگر میں کسی ٹارگٹ کو اچیو کرنے کا سوچ لوں تو بس پھر اسے کرکے ہی رہتی ہوں۔ تو جب مجھے آفر آئی تو میں نے سوچ لیا کہ انہوں نے اتنا بھروسا کرکے مجھے لیا ہے تو مجھے بھی ان کی امیدوں پہ پورا اترنا ہے' اگرچہ بیچ میں میں نے گیپ دیا اپنے بیٹے کی وجہ سے' کہ وہ چھوٹا تھا۔ لیکن جب میری دوست نے بھی کہا کہ گیپ نہ دو تو پھر لگ گئی کام سے۔"

"آپ نے کہا کہ آپ یاسر نواز کے ساتھ فلم بھی کررہی ہیں تو کون کون ہوگا آپ کے ساتھ کاسٹ میں؟"

"اس میں جاوید شیخ صاحب' میکال' سوہائے علی وغیرہ ہیں۔ پہلی فلم ہوگی باقی تو ڈرامہ سیریلز ہی ہیں اور جب فلم مکمل ہو جائے گی تو پھر تھوڑا آرام کروں گی۔"

"اتنے ڈرامے بن رہے اور آپ کے ڈرامے بھی مختلف چینلز سے آن ایر ہیں۔ کیا لوگ سب دیکھتے ہیں؟"

"بالکل دیکھتے ہیں اور میں آپ کو بتاؤں ہمارے مختلف چینلز کی اہمیت مختلف شہروں میں ہے۔ جیسے A پلس کے ڈرامے اور پی ٹی وی کے ڈرامے زیادہ تر پنجاب میں دیکھے جاتے ہیں۔ نادرن ایریاز میں دیکھے جاتے ہیں اور میں سمجھتی ہوں کہ ان چینلز کو ناظرین کی ایک بڑی تعداد دیکھتی ہے اور ایک واقعہ آپ کو بتاتی ہوں.... کہ آج سے تین چار سال پہلے جب سیلاب آیا تھا تو ہم لوگ کالام میں تھے ہم وہاں پھنس گئے تھے اور آرمی نے ہمیں نکالا تھا تو وہاں کچھ خواتین بھی تھیں' وہ مجھ سے کہنے لگیں کہ "ارے ہم نے آپ کو ڈراموں میں دیکھا تھا' آپ ڈراموں میں آتی ہیں؟" تو انہوں نے ہمیں بتایا کہ یہاں پی ٹی وی اور A ٹی وی آتا ہے تو آپ سوچیں کہ وہاں کتنے زیادہ یہ چینلز دیکھے جاتے ہیں۔ تب ہی تو لوگوں نے مجھے پہچانا۔"

"ایک ڈرامہ آرٹسٹ کی حیثیت سے کیا آپ کو یہ اختیار دیا جاتا ہے کہ آپ اپنا سین چینج کرالیں.... یا کسی رول کو کرنے سے انکار کردیں؟"

"بالکل ہے.... ایک دو ڈراموں میں میں نے اپنے سین چینج کروائے' اور ایک سیریل میں مجھے ایک رول ملا کہ آپ بڑی عمر کی خاتون ہیں' لیکن ایک چھوٹی عمر کے لڑکے سے افیر چل رہا ہے.... تو میں نے اس رول کو کرنے سے انکار کردیا۔ پروڈکشن بھی اچھی تھی' پیسے بھی اچھے تھے' مگر میں نے منع کردیا۔ تو بس میری کوشش ہوتی ہے کہ میرا امیج خراب نہ ہو۔"

"تو آفر کرنے والے ناراض تو ہوئے ہوں گے؟"

"ہاں.... انہوں نے کہا کہ رول اچھا ہے اور پیسے بھی' تو میں نے کہا کہ آپ پیسوں کی بات نہ کریں۔ کیونکہ میں پیسوں کے لیے کام نہیں کرتی' اور میں نے کہا کہ بہت سی اور بھی آرٹسٹ ہیں' آپ کسی سے بھی یہ رول کرواسکتے ہیں.... اور پھر اس رول کو ایک فیمس آرٹسٹ نے کیا اور اس طرح میں وہ رول بھی نہیں کرتی کہ جس میں شادی بیاہ میں ناچ رہی ہوتی ہیں خواتین۔ میری بھی کچھ قدریں اور روایات ہیں کہ جن کو میں کھونا نہیں چاہتی انہیں برقرار رکھنا چاہتی ہوں۔"

"گڈ.... چلیں جی انشاء اللہ پھر آپ سے بات کریں گے۔"





خط بھجوانے کے لیے پتا
ماہنامہ شعاع - 37 - اردو بازار، کراچی۔
Email: info@khawateendigest.com
shuaamonthly@yahoo.com

آپ کے خط اور ان کے جوابات لیے حاضر ہیں
آپ سب کی عافیت، سلامتی اور دائمی خوشیوں کے لیے دعائیں
اللہ تعالیٰ آپ کو ہمارے وطن کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ آمین

پہلا خط ملتان سے حرا قریشی کا ہے، لکھتی ہیں۔
پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں جن میں نماز، روزہ اور قبر سے متعلق احکامات نے ذہن پر پڑی گئی گرہوں کا منہ کھول دیا۔
"خط آپ کے" میں اب تو تبصرے دلچسپ اور مزا دینے لگے ہیں۔ ہماری اکثر قارئین اچھا اور بہت عمدہ لکھنے لگی ہیں۔ (مبارک ہو بھئی!)
فرح بخاری کا طویل مکمل ناول جب تک پڑھ نہ لیا، دم نہ لیا۔ ہر آنے والی اگلی قسط "یارم" کی دلکشی اور حسن کو بڑھا رہی ہے۔ (جیتی رہیے سمیرا جی) افسانے چاروں ہی اپنی اپنی جگہ سبق کے پیراہن سے مزین تھے۔ لبنیٰ جدون کا "حصار ذات دعا" پڑھ تو لیا پر جانے کیوں پرانے واقعات بچھڑنے، ملنے، وفا، بے وفائی، فلمی انداز کا پرتو لگا۔ "محبت زندگی ہے۔" راشدہ جی نے پھر سے دل جیت لیا۔ آسیہ رزاقی نے جو ہلکا پھلکا، لطف سے بھرپور شادی کا احوال تحریر کیا، اچھا لگا۔ (ساڈی طرفوں وی مبارکاں!) تاریخ کے جھروکے اور باتوں سے خوشبو از حد کمال تھے۔ شعاع کے ساتھ ساتھ بھی دونوں خوب تھے۔ ڈیر شعاع حرا کے لیے نو انٹری کا بورڈ کیوں؟

پیاری حرا! یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم اپنی باقاعدہ قاری کا جو ہر ماہ اتنا دلچسپ، جامع اور تفصیلی تبصرہ کرتی ہو شعاع میں داخلہ بند کردیں۔ کچھ مجبوریاں ہیں جن کی بنا پر ہم سارے خطوط شامل نہیں کرپاتے، کبھی تاخیر سے موصول ہوتے ہیں اور کبھی صفحات کی مجبوری آڑے آجاتی ہے۔ ہر بار کی طرح آپ کا تبصرہ بہت دلچسپ ہے مصنفین تک آپ کی رائے ان سطور کے ذریعے پہنچائی جارہی ہے۔

ماہم حمید نے میرپور خاص سے لکھا ہے

مجھے قلم اٹھانے پر سمیرا حمید کے ناول یارم نے مجبور کیا ہے۔ میں ساتویں کلاس میں تھی جب میں نے پہلی بار شعاع پڑھا تھا اور اب میں بی ایس سی فائنل میں ہوں اور مجھے یہ شوق اپنی امی سے ورثے میں ملا ہے۔

پیاری ماہم! آپ کی امی شعاع کی قاری ہیں اور آپ بھی اتنے سالوں سے شعاع کی قاری ہیں پھر بھی خط لکھنے میں اتنی تاخیر؟ اب یارم نے آپ کو خاموشی توڑنے پر مجبور کیا ہے تو دوبارہ خاموشی اختیار نہ کریجئے گا۔ شعاع کی دوسری تحریروں کے بارے میں بھی اپنی رائے سے آگاہ کریں۔

اقصیٰ، سونیا اور ہاجرہ۔ ترلائی کلاں اسلام آباد سے تشریف لائی ہیں، لکھا ہے

سب سے پہلے سمیرا حمید کی طرف آتے ہیں کیا خوب لکھتی ہیں "یارم" نمبر 1 پر ہے اور رقص بسمل نبیلہ بھی بہت اچھا لکھتی ہیں۔ 89.4 کے DJ (ڈی جے) فیضان خان کا انٹرویو ضرور شامل کریں۔ سب کی تحریریں ہمیں بہت پسند ہیں۔ ہم نے کچھ کہانیاں اور افسانے لکھے ہیں اگر قابل اشاعت ہوئے تو آپ شامل کردیں گے۔
اقصیٰ، سونیا اور ہاجرہ خوش آمدید اور دعائیں۔ کہانیاں

اور افسانے قابل اشاعت ہیں تو ضرور شائع ہوں گے۔
انٹرویو کی فرمائش شاہین رشید تک پہنچا رہے ہیں۔

نگہت نورین نے سیالکوٹ سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

امرحہ۔ آخر یہ ہے کیا چیز؟ ویسے سمجھ نہ آئی۔ گولی کس کو لگی؟ سمیرا جی آپ اچھا لکھتی ہیں مگر کچھ زیادہ ہی فلسفہ نہیں جھاڑ دیتیں۔ ہمیں آپ کا یہ انداز پسند ہے مگر کچھ زیادہ ہی ہو گیا ہے۔ آگے کون آ رہا ہے۔ پلیز عنوان اور مصنفہ بتادیں۔ قسم ہے آپ کو۔؟ ایک تھی مثال کتنا چلے گا؟ صحیح صحیح بتائیے گا۔ "رقص بسمل" اتنا سلو۔ اتنا تھوڑا۔ نبیلہ جی! ادر ول تو اتنی کم قسط نہ ہوتی تھی۔ اب کیا ہو گیا ہے؟ ویسے یہ امثل کون ہیں۔ امت الصبور کیا...؟ مسئلہ دور کریں۔ "غزل رحمت" اسٹوری اچھی ہے۔ مگر قسط بہت کم ہوتی ہے۔ یہ سائرہ رضا کہاں ہیں۔ دل کر رہا ہے امرحہ مل جائے تو مار دوں۔ مر کر بھی عالیان کو تنگ کر کے ہی جائے گی۔ جب میں قسط پڑھ رہی تھی تو لگا شاید اس قسط میں ویرا مر جائے گی۔ اچھا تھا مر ہی جائے۔ بہت بری لگتی ہے مجھے۔ "رفعت" کا نام سنا تو جلد ہی "محبت زندگی ہے" پڑھنے لگے مگر مزہ نہ آیا۔ "مزہ تو آیا تھا تب "گھر اک نگر" کا وہ ہارون اور مامون والا۔ یاد کریں۔ افسانوں میں "سیما بنت عاصم" "بازی لے گئیں۔ واہ سیما جی جب بھی آتی ہیں۔ مزا کر دیتی ہیں۔ ویسے بس ایک بات بتائیں کہ آپ لوگ "مزاجاً" کیسی ہیں۔ کبھی ہمیں اپنی تصویریں دکھائیں۔ پلیز آپ مجھے لگتی تو نہیں یا نہیں موڑنے والی۔ نہیں ہیں ناں۔ وہ ڈرامے والی۔ کرخت مدیرہ۔ اگر ہاں تو ہم تو مر ہی جائیں گے۔ سچ۔ ڈائجسٹ ہی ہماری جان ہے۔ بھائی بھی پڑھتا ہے۔ کہہ رہا ہے سلام ہے۔ محمود صاحب کو۔ خدا ان کے درجات بلند کرے (آمین) شکایتیں۔ ایک لمبی تفصیل ہے۔ پھر کبھی کے لیے اٹھا رکھتے ہیں۔ اب اتنی اچھی مدیرہ ہوں تو شکایتیں کرتے ہمیں خود بھی حیا آتی ہے۔ ویسے ایک بات پوچھنا تھی کہ "نسیم سحر" لکھنا چھوڑ چکی ہیں کیا۔؟

پیاری نگہت! دو صفحے کے طویل خط میں آپ نے بار بار تاکید کی ہے کہ خط پورا شائع کیجیے گا۔ اس میں شک نہیں کہ آپ نے بہت دلچسپ خط لکھا ہے لیکن ہمیں بے حد افسوس ہے کہ ہم آپ کی اس فرمائش کو پورا کرنے سے قاصر ہیں۔ ایک سوال جو آج کل ہم سے بار بار کیا جا رہا ہے آپ نے بھی کہا ہے کیا ہم ڈرامے والی کرخت مدیرہ ہیں تو اس کے لیے ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ آپ کبھی کراچی آئیں تو ہم سے ضرور ملیں، آپ کو خود اندازہ ہو جائے گا۔ ہم کیسے ہیں۔ آپ خود سوچیں اگر ہم کرخت مدیرہ ہوتے اور اپنی مصنفین سے اتنا تضحیک آمیز سلوک کرتے جو ڈرامے میں مدیرہ صاحبہ کر رہی ہیں تو کیا وہ ہمارے پرچوں میں لکھتیں؟ اتنی توہین کوئی عزت نفس رکھنے والا شخص برداشت نہیں کر سکتا اور تخلیق کار تو عام لوگوں سے زیادہ ہی حساس ہوتا ہے۔

آپ کا اندازہ درست ہے امت الصبور ہی امثل ہیں۔ مصنفین کے انٹرویو کی فرمائش کا سلسلہ اپریل سے خواتین میں شروع کر رہے ہیں۔

"ایک تھی مثال" کتنا چلے گا، یہ تو ہمیں بھی اندازہ نہیں۔ رخسانہ ہی بتا سکتی ہیں آپ — کا دل امرحہ کو مارنے کو چاہ رہا ہے اور آپ کو ویرا بے چاری بری لگتی ہے۔ آخر کیوں بھئی؟ ان دونوں نے کیا قصور کیا ہے۔ سائرہ ابھی فی الحال قسط وار ناول نہیں شروع کر رہی ہیں۔ کیونکہ وہ چینل کے لیے ڈراما لکھ رہی ہیں لیکن وہ آپ کے لیے ناولٹ ضرور لکھیں گی۔

درہ بٹ نے ڈسکہ سیالکوٹ سے لکھا ہے

شعاع کے فروری کے بہترین شمارے کے لیے جس طرح بھی آپ کا شکریہ کیا جائے کم ہے۔ جس ناول نے آج مجھے بہت اداس کیا اور خط لکھنے پر مجبور کیا، وہ ہے سمیرا حمید کا "یارم"۔

اگر میں کسی رائٹر کے نام خط لکھوں تو کیا آپ ان تک پہنچا دیں گے؟

رائٹر کے نام ہماری معرفت خط لکھ سکتی ہیں ہم ان تک پہنچا دیں گے۔

مشعل فیاض گوجرانوالہ سے شریک محفل ہیں

رخسانہ نگار کو نہ دیکھ کر دل کو اچھا نہیں لگا۔ رقص بسمل بہت ہی بور ہے۔ یہ کہانی متاثر نہ کر سکی۔ فرح بخاری کا ناول بہت اچھا تھا۔ لیکن اس کی ایک لائن کہ "اتنا مضبوط محبت کا رشتہ بھی ہوتا تو شاید تقدیر ہم سے جیت نہ پاتی"

چونکہ تقدیر سے جیتنا ممکن نہیں۔ خیر ناولٹ میں ٹاپ آف دی لسٹ "حصار دعا" تھا۔ بہت خوب صورت تھا۔ سحر ساجد کا ناولٹ ٹھیک ہی تھا۔ راشدہ رفعت کا ناولٹ پسند نہیں آیا۔ پرانا موضوع تھا۔ افسانوں میں "محبتیں بانٹیں" فریدہ فرید نے بہت زبردست لکھا۔ اور پھر نظیر فاطمہ کا بھی۔ انٹرویوز اچھے تھے۔ ڈاکٹر ایس عامر کا "شعاع کے ساتھ ساتھ" پسند آیا۔ ٹائٹل اس ماہ کا بہت زبردست تھا۔

"سمیرا حمید" (اف) "پہلے ہی معذرت کر لیتی ہوں۔ برا مت منایئے گا" آپ کہانی کم اور لفظوں کی بھرمار زیادہ کرتی ہیں۔ جیسے اگر کوئی ہیرو کہے کہ مجھے تم سے محبت ہے تو آپ محبت لفظ پر ہی دو صفحے بھر دیں۔ کچھ فلسفہ کم کر دیں یارم میں کیونکہ ہم مانچسٹر میں نہیں پاکستان میں رہتے ہیں۔ خیر یارم کا اینڈ ہو رہا ہے تو اچھی بات ہے۔ کہ نویں قسط پر ختم ہو رہا ہے۔ آپ اپنی اگلی کہانی میں پلیز کہانی ہی لکھیے گا۔ کیونکہ الفاظ انسان بھول جاتا ہے پر کہانی یاد رہ جاتی ہے۔ خیر یارم اچھی اسٹوری ہے۔ باقی شعاع تو اچھا ہے۔ میں نے ہر قسم کے رسالے پڑھے ہیں پر شعاع اور خواتین رسالوں میں ٹاپ آف دی لسٹ ہیں۔

پیاری مشعل! آپ کی تنقید و تعریف متعلقہ مصنفین تک پہنچائی جا رہی ہے۔ خط لکھنے کے لیے شکریہ۔

طلعت اقبال لطیف آباد نمبر 6 سے لکھتی ہیں

سرورق کوئی خاص نہیں تھا۔ لیکن جیسے جیسے رسالہ پڑھتے گئے دلچسپی بڑھتی گئی۔ پیارے نبی کی پیاری باتیں اسلامی معلومات میں اضافہ ہوا۔ اس سے ہمیں اپنی اصلاح کرنے کا موقع ملتا ہے۔ اس کے بعد محبت زندگی ہے، شام خزاں طویل سہی، حصار ذات دعا، "غریق رحمت" اور "یارم" کی تو بات ہی کیا ہے۔ افسانے بھی سب بہت خوب تھے۔ میری آپ سے گزارش ہے کہ 1980ء سے شعاع میں جو اچھی تحریر شائع ہوئی ہو وہ ہر شمارے میں شامل کیا کریں۔ یعنی نئی تحریروں کے ساتھ ایک پرانی تحریر کیا خیال ہے؟

پیاری طلعت! خیال تو بہت اچھا ہے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ پھر نئی مصنفین کی تحریریں کم شامل ہوں گی پہلے ہی ہماری بہت سی نئی لکھنے والی مصنفین شکایت کرتی ہیں کہ ان کو موقع نہیں دیا جاتا۔

شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

لاہور سے کومل گلزار لکھتی ہیں

مجھے اتنے سالوں میں پہلی بار "یارم" نے قلم اٹھانے پر مجبور کیا۔ اور آخر کار یہ بری خبر میری نظروں سے گزر گئی۔ میری فیورٹ اسٹوری آخر کار ختم ہو گئی۔ میں مصحف کے بعد یارم کی سب سے بڑی مداح ہوں۔ میں نے ویرا، کارل، سائی جیسے کردار کبھی نہیں پڑھے۔ غریق رحمت بھی بہت اچھی اسٹوری ہے۔ میری ایک ریکویسٹ ہے کہ "شاعری سچ بولتی ہے" کو دوبارہ شامل اشاعت کیا جائے۔ کیونکہ اس کے بغیر شعاع ادھورا ہے۔

پیاری کومل! سمیرا حمید اور سحر ساجد تک آپ کی تعریف پہنچا رہے ہیں۔

ثروت بانو نے منجھوٹہ سے لکھا ہے

فلمی دنیا کا بہت بڑا نام ہمارا قیمتی سرمایہ علی سفیان آفاقی صاحب اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ ان کی وفات کا دلی رنج ہوا۔ فروری کے شعاع میں شادی کا احوال پڑھنے پر انکشاف ہوا کہ وہ آسیہ رزاقی صاحبہ کے بہنوئی بھی تھے۔ "یارم" ایک بہترین ناول بہترین کاوش۔ گو کہ سمیرا حمید کی بعض باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں۔ امرحہ بیچاری اچھی لڑکی ہے۔ لیکن کیا کریں۔ عالیان بڑا صابر بچہ ہے امرحہ کی موت کو جلد ہی قبول کر لے گا۔ کیونکہ ویرا بھی اچھی لڑکی ہے اور رہ گئے امرحہ کے دادا تو وہ بھی اس عمر میں ہیں کہ جلد ہی پوتی سے ملاقات کر لیں گے۔ نبیلہ عزیز کی کہانی "رقص بسمل" اچھی ہے روایتی سی لیکن اب یہ مسئلہ ہو گیا ہے کہ عمیرہ، عنیزہ، نمرہ اور سمیرا کی غیر روایتی کہانیاں پڑھ پڑھ کر سیدھی سادی کہانیاں دل کو بھاتی ہی نہیں ہیں۔ ایک تھی مثال کی کمی محسوس ہوئی۔

پیاری ثروت! آپ نے تو خود ہی سب کچھ طے کر لیا۔ امرحہ مر جائے گی اس کے مرنے کے بعد کس کے ساتھ کیا ہو گا۔ دادا جان عالیان، ویرا سب کا بتا دیا لیکن سمیرا حمید نے تو کچھ اور ہی سوچ رکھا ہے۔ جو آپ یہ قسط پڑھ کر جان لیں گی۔ گھرداری اور بچوں کی مصروفیات سے وقت نکال کر آپ نے خط لکھا، بہت شکریہ۔ آپ کی فرمائش پر تنجن کی ترکیب دی جا رہی ہے۔

سدرہ نثار رانا نے پھول نگر سے شرکت کی ہے

میں شعاع اور خواتین کی بارہ سال سے خاموش قاری ہوں۔ اتنے سالوں میں رائٹرز کے مختلف شہکار ناولوں نے دل پر کاری وار کیے لیکن "یارم" اف! رات کے ساڑھے گیارہ بجے اس ماہ کی قسط ختم کی۔ اور ساری جان مٹھی میں آگئی ہائے سمیرا جی یہ کیا کیا؟ ہمارا محبت سے گندھا عالیان اکیلا؟ نہ جی ایسے عشق کا یہ انجام امرحہ دی لاسٹ ڈک' دی مینڈ کی اور عشق زادی کا یہ انجام میرے دل ناتواں کی حالت بیان سے باہر۔ لفظ لفظ موتی' بوند بوند امرت مجھے سمیرا سے پوچھنا ہے کہ آپ کا ناول پڑھتے ہوئے جو ہم پر گزرتی ہے۔ لکھتے وقت آپ بھی ان ہی کیفیات سے گزرتی ہیں۔

پیاری سدرہ! مصنف جب تک اپنے کرداروں کے احساسات اور جذبات کو محسوس نہ کرے 'تخلیق نہیں کرسکتا۔ اب آپ اندازہ لگالیں کہ سمیرا تخلیق کرتے ہوئے کس کرب سے گزرتی ہوں گی ہم نے سمیرا حمید کو روبرو کا مہمان بنایا ہے۔ آپ ان سے ڈائریکٹ یہ سوال پوچھ سکتی ہیں۔

ام احمد حسن نے حافظ آباد سے لکھا ہے

شعاع میرا موسٹ فیورٹ رسالہ ہے۔ سوچا کہ اپنی محبت کا اظہار کر ہی دیا جائے کیونکہ محبت کو اظہار کی بھی ضرورت ہوتی ہے نا! ایک تھی مثال اور رقص بسمل زبردست ناول ہیں جو عمدہ طریقے سے آگے بڑھ رہے ہیں۔

جی ام احمد! بالکل صحیح سوچا آپ نے 'محبت کو ہمیشہ اظہار کی حاجت رہتی ہے۔ اور محبت کے اظہار میں کبھی کوتاہی نہیں کرنا چاہیے۔
شعاع کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔

سمیعہ سحر قریشی۔ ضلع بھاول نگر سے لکھتی ہیں

شعاع اس بار یکم کو ملا۔ اتنی خوشی ہوئی۔ میں سوچتی ہوں کہ اگر شعاع نہ ہوتا تو کیا ہوتا۔ ایک بار ایسا ہوا کہ میری آپی رسالہ پڑھ رہی تھی۔ کہ میرے بھائی نے کہا کہ چائے بنادو۔ کہانی میں سچویشن ایسی تھی آپی ہنسی اور ہنستی چلی گئی۔ میرے بھائی کو غصہ آیا۔ اس نے سارے کے سارے رسالے لیے۔ اور تھوڑی دیر میں راکھ کا ڈھیر۔ افسوس صد افسوس۔ اب آتے ہیں۔ شعاع کی طرف۔ ٹائٹل پر وائٹ ڈریس میں ماڈل کے ساتھ جیولری بھی پسند آئی۔ یارم پڑھ کر خوشی ہوئی۔ ویل ڈن۔ پھر اس کے بعد شام خزاں طویل سہی بہت ہی منفرد ناول لگا۔ زبردست۔ ناولٹ میں محبت زندگی ہے پسند آیا۔ افسانے سب پسند آئے۔ انٹرویو میں یمنیٰ زیدی سے ملاقات اچھی رہی۔ آسیہ رزاقی۔ شادی مبارک کا احوال بھی پسند آیا۔ خوب صورت بنیے کچھ خاص پسند نہیں آئے۔ لو جی "رقص بسمل" کو میں بھول گئی۔ اس بار یہ قسط شان دار رہی۔

پیاری سمیعہ! آپ کے بھائی نے آپ کی آپی کے ساتھ جو کیا' اسے جان کر بہت افسوس ہوا' بہنیں تو بھائیوں پر جان دیتی ہیں' ان پر مان کرتی ہیں ان کا دل تو ہاتھوں میں رکھنا چاہیے ان کی خوشی کا خیال رکھنا چاہیے۔ ان آنگن کی چڑیوں کو تو ایک دن گھر چھوڑ کر چلے ہی جانا ہے میکے کی اچھی یادیں ان میں جگنو بن کر ان کے دلوں کو جگمگائیں گی۔

شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

ماہم نور نے گوجرانوالہ سے لکھا ہے

ویسے تو سچ بات کہنی چاہیے۔ "یارم" کا سلسلہ بالکل اچھا نہیں ہے۔ لیکن جہاں تک بات ہے رخسانہ نگار عدنان کی تو "ایک تھی مثال" بہت اچھا ناول ہے۔

ماہم! ہمیں افسوس ہے کہ آپ کو "یارم" اچھا نہیں لگ رہا جبکہ ہماری بیشتر قارئین نے اسے بہت پسند کیا ہے۔
آپ کی فرمائش پر زنگر برگر ——— کی ترکیب شامل ہے۔

سیدہ نسبت زہرہ نے کہروڑ پکا سے لکھا ہے

2 فروری کی رات کچھ یاد آیا تو بادل بھی میرے ساتھ رونے لگا بہت اداس تھا دل بہت بے چین' افسردہ لیکن شعاع رسالہ دیکھا تو حقیقت میں خوشی ہوئی تو شعاع کے ساتھ ساتھ میں "ڈاکٹر ایس عامر لاہور" نے لکھا کہ ایک محترمہ ہوتی تھیں سیدہ نسبت زہر گیلانی ان کے تبصرے کمال کے ہوتے تھے وہ آج کل کدھر غائب ہیں یقین مانیے ایک لائن میں کہے گئے اس جملے نے جو خوشی دی' وہ میں الفاظ میں بیان نہیں کر سکتی آنکھ سے بے اختیار خوشی کا

آنسو نکلا کہ دیکھو کسی نے تو یاد رکھا ناں۔

پیاری زہرہ! ہمیں بھی آپ نہیں بھولیں۔ ہم اپنی باقاعدہ لکھنے والی قارئین کو یاد رکھتے ہیں اور ان کی کمی بھی محسوس کرتے ہیں، شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

نور عبدالسلام نے نواب شاہ سے لکھا ہے

مجھے اپنے یہ تینوں ہی رسالے بے حد پسند ہیں کیونکہ آج کے اس دور میں ہمارے گھر، ٹی وی، وغیرہ کچھ بھی نہیں ہے۔ شادی کے ان پندرہ سالوں بعد آج میں نے یہ کاغذ قلم لیا ہے ہاتھ میں۔ کتنے موسم آئے گئے، کتنے دوست ساتھی سب چھٹے صرف واحد ان دوستوں نے میرا ساتھ نہیں چھوڑا۔ میرے سرتاج کہتے ہیں یار چھوڑ دو ان کا پیچھا میری صرف ایک یہ ہی تو واحد تفریح ہے باقی سب کچھ چھوڑ دیا۔ مجھے یاد ہے اسکول لائف، کالج لائف، ٹیچنگ لائف کیسے ہم سب فرینڈز کی ان رسالوں پر لڑائی ہوتی تھی پہلے پڑھنے پر، سچ جب میری شادی ہوئی ان دونوں پیر کامل چل رہا تھا میں نے اپنے میاں سے کہا آپ بھی پڑھیے پھر مل کر بصرہ کریں گے اب یقین کریں مجھ سے پہلے میری بیٹی پڑھ لیتی ہے اتنی جلد کیا بتاؤں شعاع میں آج کل سب سے بیسٹ "یارم" اس قسط نے تو بس سانس تک روک دیا ہے۔ پھر ہے "ایک تھی مثال" رخسانہ جی جلدی سے مثال کے لیے سب اچھا کردیں "رقص بسمل" بھی اچھا جا رہا ہے شکر ہے ولید کو کچھ نہ ہوا۔ "غریق رحمت" سحر ساجد کی بہت ہی اچھی کہانی ہے اور پورے رسالے کی جان ہے مکمل ناول، فرح بخاری، ویل ڈن فرح جی شادی سے پہلے بھی میں اپنے پیارے شہر شہداد پور سے لکھتی تھیں ہر رسالے میں اب تو بس اپنی زندگی ایک مشین کی طرح ہو گئی ہے۔

پیاری نور! شادی زندگی کا ایسا موڑ ہے جو ایک لڑکی کی زندگی کو یکسر بدل دیتا ہے۔ گھر، بچے، شوہر ان سب ذمہ داریوں میں الجھ کر اپنے مشاغل اور دلچسپیاں تو کہیں بہت پیچھے رہ جاتی ہیں۔ اس کے باوجود آپ نے ہمارے پرچوں کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ یہ آپ کی محبت ہے اور آپ کے شوہر کی مہربانی ہے کہ انہوں نے آپ کے مطالعے پر کوئی پابندی نہیں لگائی۔

شعاع کی پسندیدگی کے لیے تہ دل سے شکریہ۔ پندرہ سال بعد آپ نے خط لکھا بہت خوشی ہوئی۔ اب باقاعدگی

سے لکھتی رہیے گا۔

فرحین ہاشمی نے حویلیاں ایبٹ آباد سے شرکت کی ہے' لکھتی ہیں

ایک دفعہ آپ نے خطوط کے جوابات میں لکھا تھا' ہم کہانی اس لیے نہیں پڑھتے کہ اس میں جواب ہوتے ہیں بلکہ اس لیے پڑھتے ہیں کہ اس میں خواب ہوتے ہیں۔"
بس یہی وجہ ہے ہمارے اور آپ کے رشتے کی' وہ رشتہ جس کو دائمی بنانے میں بہت ساری مصنفین کا حصہ ہے۔
میں وہ قاری ہوں جو رفعت سراج' عمیرہ احمد' نمرہ احمد' کنیز نبوی' فرحت اشتیاق' عنیزہ سید' نگہت سیما' راحت جبیں' تنزیلہ ریاض کی تحاریر کو اپنے دل کی آنکھ سے پڑھتی ہوں مگر اپنی خواہش اور کوشش کے باوجود ان کے لیے کچھ نہیں لکھ سکی۔ آج اتنی مجبور ہو گئی کہ میرا دل چاہ رہا ہے' سمیرا حمید کے اس قلم کو چوم لوں جو ہمیں ہمارے گم گشتہ کالج اور یونیورسٹی کے زمانے میں لے گئیں۔
اس زندگی کو جہد مسلسل سمجھ کر گزارنے والے ایک دفعہ پھر سمیرا حمید کی وجہ سے کھل کر سانس لینے لگے' ہنسنے لگے اور رونے لگے... ویل ڈن سمیرا جی۔
امرحہ کو یہ سمجھنا چاہیے تھا کہ!
"محبت ایسا نغمہ ہے' ذرا بھی جھول ہو' لے میں تو سر قائم نہیں ہوتا۔"
اور واقعی کچھ فیصلے صرف دائمی جدائی کے ہاتھوں طے پاتے ہیں۔ امرحہ کے ساتھ عالیان بھی اس حقیقت کو جھٹلانے کی کوششوں میں مصروف رہا کہ "جب دل انسان میں روشنی نہ ہو تو چراغوں کے میلے میں بھی کچھ حاصل نہیں ہوتا اور جب ایک دفعہ دل میں عشق مقیم ہو جائے تو وہاں ہمیشہ درد کا دھواں بھرا رہتا ہے' جو پوری جان کو سلگائے رکھتا ہے۔

آپ کہیں گی کسی اور کہانی پر تبصرہ نہیں کیا تو آپ یہ مت سمجھیے گا میں سب تحاریر کو نہیں پڑھتی۔ میں آپ کے دونوں پرچے خواتین و شعاع کا ایک ایک لفظ اپنے دل کی آنکھ سے پڑھتی ہوں۔
پیاری فرحین! صفحات کی مجبوری کی وجہ سے آپ کا پورا خط شائع نہ کر سکے۔ اس کا ہمیں بہت افسوس ہے۔ اتنے خوب صورت خط کے جواب میں ہم کیا لکھیں۔ سمیرا حمید کی تحریریں پڑھتے ہوئے ہم خود بار بار چونک جاتے ہیں کہ اتنی چھوٹی سی پیاری سی لڑکی کی تحریروں میں اتنا اثر کیسے آ گیا؟ زندگی کے تلخ حقائق ہوں یا محبت کی جادو نگری۔ سمیرا ہر موضوع پر لکھ رہی ہیں اور بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔
آپ افسانہ نگاری کی طرف توجہ دیں' ہمارا اندازہ ہے کہ بہت اچھا لکھ سکتی ہیں۔

علینہ ابتہاج نے ڈیرہ اسماعیل خان سے شریک محفل ہیں لکھا ہے

اف اللہ مجھے تو رونا ہی آگیا اب کیا ہو گا کیا امرحہ! (مر تو نہیں جائے گی) فرح بخاری کا "شام خزاں طویل سی" طوالت کے باوجود خاصا مزہ آیا۔ عازم کا کردار انتہائی پر خلوص تھا۔ اب آتے ہیں ناولٹ کی طرف تو حصار ذات' دعا ایک اچھا ناولٹ تھا' مجھے بڑا پسند آیا لبنیٰ جدون ہمیشہ ہی اچھا لکھتی ہیں۔ "محبت زندگی ہے" جب اینڈ پہ سارے الزامات حارث کے کھاتے میں آئے تو میں ہنس ہنس کے لوٹ پوٹ ہو گئی واہ جی واہ کیا کہنے آپ کے.... فریدہ فرید کا محبتیں بانٹیں ویلن ٹائن ڈے منانے کا اچھا طریقہ ہے۔ باقی افسانے سارے ہی اچھے بلکہ نہیں زبردست تھے یمنیٰ زیدی کا انٹرویو شاندار رہا اب ہماری ملاقات شانو یعنی فائزہ خان سے بھی کروا دیں۔ شکیب جلالی اور حمیدہ شاہین دونوں کی ہی غزلیں قابل تحسین ہیں۔
پیاری علینہ! شعاع کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔

روبینہ لیاقت ملتان سے شریک محفل ہیں لکھا ہے

سب سے پہلے ہم نے رقص بسمل پڑھا' پر مزا نہیں آیا کیونکہ قسط بہت کم تھی پلیز (نبیلہ جی رفتار بڑھایئے) راشدہ رفعت کا ہلکا پھلکا ناولٹ "محبت زندگی ہے" اچھا تھا۔ "غرق رحمت" پڑھ کر ہم رو ہی پڑے۔ افسانے سارے اچھے تھے۔ "یارم" کی یہ قسط ابھی پڑھی نہیں۔

پیاری روبینہ! آپ کی آمد بہت اچھی لگی۔ اور یہ بھلا کیا بات ہوئی پانچ سال پہلے آپ نے خط لکھا' وہ شائع نہیں ہوا تو آپ نے خط لکھنا ہی چھوڑ دیا۔ خط شائع نہ ہونے کی بہت سی وجوہات ہوتی ہیں۔ لیکن ایک بات یقینی ہے کہ ہم تمام خطوط پوری توجہ اور محبت سے پڑھتے ہیں اور آپ کی رائے ہم تک پہنچ جاتی ہے۔

مدیحہ عارف نے سانگلہ ہل سے لکھا ہے

اس بار 2 کو ہی شعاع خرید کر آج یعنی 5 فروری کو پورا ختم کر ڈالا۔ امی جی کا آنکھ کا آپریشن ہے۔ جس کی وجہ سے فیصل آباد جانا ہے میری امی کے لیے دعا کیجیے گا کہ وہ بخیر و عافیت گھر واپس آئیں (آمین)

یوں تو یارم سب کی طرح مجھے بھی بے حد پسند ہے (کارل کی وجہ سے) لیکن اس بار پورے کا پورا شعاع اے ون تھا۔ فرح بخاری نمبر لے گئیں بہت زبردست تحریر.... عازم پرفیکٹ بندہ ہے زبردست ہیرو اور خزران عمدہ سوچ کی مالک اچھی لگی ویسے خزران کا مطلب کیا ہو گا....؟ حصار دعا بہت فلمی سا لگا اور عجیب بھی۔ محبت زندگی ہے مزا آیا پڑھ کر ہلکی پھلکی محبت کی داستان 'اماں جی بے حد پسند آئیں۔ اوہ نو آپی جی سحر ساجد کی تحریر کا اختتام پھر اگلے ماہ۔ بہت اداس کیا اس بات نے کیونکہ اتنا زبردست ناولٹ ہے حارث کا رونا دردا ور تکلیف مجھے بھی رلا گیا بے صبری سے اس کے ختم ہونے کا انتظار ہے۔

مجھے افسانے ہمیشہ سے ہی شعاع کی جان لگتے ہیں اور پڑھنے کا مزہ بھی آتا ہے 'اس بار ٹاپ آف دی لسٹ رہا محبتیں بانٹیں ویسے ایک راز کی بات بتاؤں آپی! میری پیدائش کا دن بھی 14 فروری ہے۔

"اکلوتا" نے تو خوب ہنسایا نظیر فاطمہ نے خوب لکھا۔

پیاری مدیحہ! خزران لفظ خیزران سے نکلا ہے بانس کی نرم کونپل کو خیزران کہتے ہیں۔ عباسی خلیفہ ہارون رشید کی والدہ کا نام تھا۔ آپ کی امی کے لیے دعاگو ہیں 'اللہ تعالیٰ ان کا آپریشن کامیاب کرے۔ دو دن میں پورا شعاع پڑھ کر آپ نے فوراً" خط لکھا اس محبت کے لیے تہ دل سے ممنون ہیں۔

تحریم اختر 155 عثمانی شاہ نکڈر سے لکھا ہے

میں 9th میں تھی تب سے شعاع پڑھ رہی ہوں اب B.A کر رہی ہوں سمیرا حمید کا ناول "یارم" پڑھ کر رہا نہ گیا۔ باقی ناول بھی اچھے ہیں اور پلیز رخسانہ نگار عدنان جی تھوڑا فراخ دلی سے لکھا کریں 'ابھی پڑھنے میں مزہ آیا اور ناول ختم۔

پیاری تحریم! شعاع کی محفل میں خوش آمدید۔
رخسانہ نگار عدنان تک آپ کا پیغام پہنچا رہے ہیں۔

پھول نگر جمبر خورد سے آمنہ پھول چوہدری نے لکھا ہے

وجہ سمیرا احمید کا "یارم" ہے۔ جو مجھے بے حد پسند ہے۔ میں نے کچھ افسانے 'ناول اور ناولٹ لکھے ہیں اگر اجازت دیں تو بھجواؤں۔ رخسانہ نگار عدنان اور نبیلہ عزیز کے ناولز بھی اچھے ہیں "اکلوتا" افسانہ بے حد اچھا تھا۔

پیاری آمنہ! افسانے ناولٹ لکھے ہیں تو ضرور بھجوائیں پوچھنے کی ضرورت نہیں۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے تہ دل سے شکریہ۔

ارم کمال نے فیصل آباد سے لکھا ہے

ٹائٹل بہت ہی پروقار اور پاکیزہ لگا پیارے نبی کی پیاری باتوں سے اپنے کمزور اور ڈگمگاتے ایمان کو پختہ کیا محبت زندگی ہے "راشدہ رفعت کا زبردست اور دلکش ناول جس کے اختتام پر موڈ بھی خوشگوار ہو گیا۔ "حصار دعا" میں بہت سے پہلو سوال طلب تھے مثلاً" اتنی بڑی غلط فہمی کسی لڑکی کے بارے میں ہو اور وہ لڑکی کچھ بولے ہی نہ ذہن قبول نہیں کرتا۔ فرح بخاری کا مکمل ناول "شام خزاں طویل سہی" اتنا خوب صورت 'احساسات و محسوسات کی دلنشین ترجمانی مرد کی یہ اعلا ظرفی بہت ہی کم دیکھنے میں آتی ہے۔ "غریق رحمت" سحر ساجد کا ناول بہت ہی "رقص بسمل" کی کہانی عجیب سی لگتی ہے ماورا کا رویہ اور انداز اتنا سپاٹ اور روبوٹک ہوتا ہے کہ مزا نہیں آتا۔

بہت شکریہ ارم! آپ کا تبصرہ متعلقہ مصنفین تک پہنچایا جا رہا ہے۔

سائرہ 'بختاور' رفعت 'ثمینہ 'تہمینہ اینڈ زیب گاؤں ملتانی والہ تحصیل و ضلع ملتان سے لکھا ہے

اس ماہ کا ٹائٹل بہت پیارا تھا۔ حمد و نعت اور پیارے نبی کی پیاری باتوں کے بعد "یارم کی طرف لپکے۔ اس مرتبہ عالیان اور امرحہ نے رلا دیا۔

"رقص بسمل" کے کچھ صفحات بڑھا دیجیے اور ماورا مرتضیٰ کی امی کے ماضی سے پردہ اٹھائیے۔

"غریق رحمت" ناول بہت اچھا رہا۔

"شعاع کے ساتھ ساتھ" میں ڈاکٹر ایس عامر کا احوال اچھا لگا۔ اللہ تعالیٰ ان کی بیوی کو صحت عطا فرمائے اور ان کی بیٹی کو خوش رکھے۔ (آمین)

ایف ایم 101 ملتان کے RJ آصف نور کا انٹرویو دیں اور ڈرامہ سیریل بشر مومن کی "ردابہ" کا انٹرویو دیں۔ پلیز

....

مائرہ! بختاور، رفعت، ثمینہ، تہمینہ اور زیب! شعاع کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔ انٹرویو کی فرمائش متعلقہ مصنفین تک پہنچائی جا رہی ہے۔

کنول اقبال نے ضلع جہلم سے لکھا ہے

میرے خط لکھنے کی سب سے بڑی وجہ "یارم" ہے سمیرا جی جب یہ شروع ہوا تھا تو شکر کیا تھا ہم نے کہ کسی نے گھریلو جھگڑوں اور ساس بہو سے ہٹ کر لکھا ہمیں اس کو پڑھتے ہوئے بہت مزہ آیا۔ زبردست ناول رہا ہے ویسے

کارل جیسی ایک میری بھی دوست تھی توبہ!

پیاری کنول! شعاع کی محفل میں خوش آمدید۔ آپ نے امرحہ کی زندگی کے لیے دو صفحوں کا طویل خط لکھا ہے

سمیرا حمید اتنی بھی ظالم نہیں کہ آپ کا معصوم سا دل توڑ دیں۔ آنسو پونچھ لیں۔ امرحہ اور عالیان کو کچھ نہیں ہو گا۔

قارئین متوجہ ہوں!

1- ماہنامہ شعاع کے لیے تمام سلسلے ایک ہی لفافے میں بھجوائے جا سکتے ہیں، تاہم ہر سلسلے کے لیے الگ کاغذ استعمال کریں۔

2- افسانے یا ناول لکھنے کے لیے کوئی بھی کاغذ استعمال کر سکتے ہیں۔

3- ایک سطر چھوڑ کر خوش خط لکھیں اور صفحے کی پشت پر یعنی صفحے کی دوسری طرف ہرگز نہ لکھیں۔

4- کہانی کے شروع میں اپنا نام اور کہانی کا نام لکھیں اور اختتام پر اپنا مکمل ایڈریس اور فون نمبر ضرور لکھیں۔

5- مسودے کی ایک کاپی اپنے پاس ضرور رکھیں، نا قابل اشاعت کی صورت میں تحریر واپسی ممکن نہیں ہوگی۔

6- تحریر روانہ کرنے کے دو ماہ بعد صرف پانچ تاریخ کو اپنی کہانی کے بارے میں معلومات حاصل کریں۔

7- ماہنامہ شعاع کے لیے افسانے، خط یا سلسلوں کے لیے انتخاب، اشعار وغیرہ درج ذیل پتے پر رجسٹری کروائیں۔

ماہنامہ شعاع
37-اردو بازار کراچی

حافظ حنا ہاشم اینڈ امرحہ ہاشم صائمہ تبسم R-1707 چھی والا سے لکھتی ہیں

ہمیں ڈائجسٹ منگوانے میں بہت مشکل پیش آتی ہے ہمارے گھر والے پڑھنے نہیں دیتے لیکن پھر بھی ہم پڑھنا نہیں چھوڑتے جب نیا رسالہ آتا ہے تو ہم میں لڑائی بہت ہوتی ہے لیکن پھر بھی پہلے میں یعنی حنا ہی پڑھتی ہوں نبیلہ عزیز کا ناول بہت فنٹاسٹک لگا اور پلیز اس کو جلدی کمپلیٹ کریں ہم مزید اتنی دیر انتظار نہیں کر سکتے اور رخسانہ نگار عدنان کا ناول بھی بہت شاندار ہے اور مثال کے ساتھ مزید برا مت کریں۔

حنا، امرحہ اور صائمہ! شعاع کی محفل میں خوش آمدید۔ کتابوں کے بارے میں معلوم کرنے کے لیے آپ اس نمبر پر فون کریں۔ 021-32216361

ثوبیہ اٹک سے لکھتی ہیں

پہلی شعاع سے لے کر خوب صورت بنیے تک وہ کون سا سلسلہ ہے جو قابل تعریف اور قابل ذکر نہیں ہے۔ رقص بسمل، یارم اور ایک تھی مثال ایسی تحریریں ہیں جن کی تعریف کرنے کو الفاظ کم پڑ جاتے ہیں۔ "غریق رحمت" بھی زبردست کہانی ہے "شام خزاں طویل سہی" اپنے نام کی طرح طویل اور خوب صورت تحریر تھی عازم کا کردار بہت پسند آیا۔ پلیز عازم کے نام کا معنی بتا دیں "اکلوتا" ایک ہلکی پھلکی تحریر تھی جو مزا دے گئی۔ "محبتیں بانٹیں" ایک سبق آموز تحریر تھی۔ واقعی اگر ہمارا آج کا نوجوان، ہماری نوجوان نسل محبت کے معنی سمجھ جائیں۔

پیاری ثوبیہ! شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ عازم کے معنی ہیں عزم کرنے والا حوصلہ مند۔

دستک دستک دستک

شاہین رشید

عمران اسلم

"کیسے ہیں عمران اسلم صاحب؟"

"الحمدللہ۔"

"آج کل تو ماشاء اللہ آپ ہی آپ اسکرین پہ ہیں... آن ایر تو ہم دیکھ ہی رہے ہیں۔ مزید مصروفیات بتائیے؟"

"بس کام ہو رہا ہے اور کوشش ہے کہ اچھا کام کروں 'تاکہ لوگ ہمیشہ مجھے پسند کرتے رہیں اور مصروفیات کے بارے میں بتانا میرے خیال سے قبل از وقت ہو جائے گا' کیونکہ کچھ کام ابھی شروع ہوا ہے اور کچھ شروع ہونے والا ہے' اب یہ تو معلوم نہیں ہوتا کہ کب مکمل ہو گا اور پھر کب آن ایر ہو گا۔"

"چلیں' یہ بات تو بتا دیں کہ رول نیگیٹو ہوں گے یا پوزیٹو؟"

"گزشتہ سال میں نے زیادہ تر نیگیٹو رولز کیے' مگر اس سال کوشش ہو گی کہ لائٹ کامیڈی اور پوزیٹو رولز کروں اور نئے آنے والے سیریلز میں کر بھی رہا ہوں۔"

"اپنی طبیعت سے ہٹ کر کردار کرنے میں لطف آتا ہے یا اپنی طبیعت کے مطابق؟"

"اپنی طبیعت کے مطابق کردار کرنے کا مزا نہیں ہے۔ اور آپ کو بتاؤں کہ میں نے اس فیلڈ کا انتخاب اس لیے کیا کہ میں اپنی لائف کو تھوڑی دیر کے لیے بھول جاؤں 'اور اس دنیا میں چلا جاؤں جو میرے لیے بالکل نئی ہو' تو بس اس لیے ایسے کردار لیتا ہوں جو میں خود نہیں ہوتا۔"

"بہت خوب... کیا اپنی لائف سے خوش نہیں ہیں آپ؟"

"ارے نہیں... ایسا کچھ نہیں ہے میں ایک خوشگوار' ہیپی لائف گزار رہا ہوں۔ لیکن چونکہ میں زندگی میں تھوڑا چیلنج چاہتا تھا۔ اس لیے مجھے مزاج سے ہٹ کر کردار کرنے میں مزا آتا ہے۔"

"فیلڈ میں آکر آپ سمجھتے ہیں کہ آپ دوسروں سے مختلف ہو گئے ہیں؟"

"نہیں 'ایسا ہرگز نہیں ہے۔ میں وہ ہی ہوں جو پہلے تھا' بلکہ اب تو اس فیلڈ میں آنے کے بعد تو میں لوگوں سے زیادہ قریب ہو گیا ہوں۔ مجھے اچھا لگتا ہے' جب لوگ مجھے پہچان کر مجھ سے ہیلو ہائے کرتے ہیں۔ مجھ میں زیادہ انکساری آگئی ہے۔"

"اچھا... کیوں زوال سے ڈرتے ہیں شہرت کی؟"

"نرم مزاج تو خیر میں پہلے ہی تھا اور فرینڈلی 'اور لوگوں کی محبت کو دیکھ کر رب کا شکر ادا کرتا ہوں... اور زوال سے ڈرتا نہیں ہوں 'کیونکہ اللہ تعالیٰ کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی بہتری پوشیدہ ہوتی ہے اور میرے ساتھ اگر ایسا ہوا تو میرے رب نے میرے لیے کوئی دوسرا راستہ منتخب کیا ہو گا۔ میں کیا تھا اور کیا ہو گیا۔ یہ رب کی ہی تو مہربانی ہے۔"

"لوگوں کو مشورہ دیں گے اس فیلڈ میں آنے کا؟"

"بالکل کیوں نہیں 'جن میں صلاحیت ہے وہ ضرور اس فیلڈ میں آئیں۔ ہر با صلاحیت انسان کے لیے اس فیلڈ کے راستے کھلے ہیں اور میرا ایمان ہے کہ ٹیلنٹ اپنی جگہ بنا ہی لیتا ہے۔"

"تو آپ کو مشکل ہوئی اپنا ٹیلنٹ منوانے میں؟"

"مجھ پر تو اللہ تعالیٰ کی خاص مہربانی تھی' مجھے یاد ہے کہ کسی کام کے سلسلے میں میری ملاقات معین اختر صاحب (مرحوم) سے ہوئی۔ تو مجھے دیکھ کر کہنے لگے کہ

رخسانہ نگار عدنان

ایک تھی مثال

عدیل اور فوزیہ نسیم بیگم کے بچے ہیں۔ بشریٰ ان کی بہو ہے اور ذکیہ بیگم کی بیٹی ہے۔ عمران بشریٰ کا بھائی ہے۔ مثال، ذکیہ بیگم کی نواسی اور نسیم بیگم کی پوتی ہے۔ بشریٰ اور نسیم بیگم میں روایتی ساس بہو کا تعلق ہے۔ پانچ سال کی مسلسل کوششوں کے بعد بشریٰ کی نند فوزیہ کا بالآخر ایک جگہ رشتہ طے پاجاتا ہے۔ نکاح والے روز بشریٰ دولہا ظہیر کو دیکھ کر چونک جاتی ہے۔ عدیل سے شادی سے قبل ظہیر کا بشریٰ کے لیے بھی رشتہ آیا تھا مگر بات نہ بن سکی تھی۔ نکاح والے دن فوزیہ کی ساس زاہدہ اور ذکیہ بیگم بھی ایک دوسرے کو پہچان لیتی ہیں۔ بعد ازاں عدیل کو بھی پتا چل جاتا ہے۔ وہ ناراض ہوتا ہے مگر فوزیہ اور نسیم بیگم کو بتانے سے منع کردیتا ہے۔ بشریٰ اور عدیل ایک ہفتے کے لیے اسلام آباد جاتے ہیں۔ وہاں انہیں پتا چلتا ہے کہ بشریٰ کے ہاں سات سال بعد پھر خوش خبری ہے۔

عفان اور عاصمہ اپنے تین بچوں اور والد کے ساتھ کرائے کے گھر میں رہتے ہیں۔ عفان کے والد فاروق صاحب سرکاری نوکری سے ریٹائر ہوئے ہیں۔ گریجویٹی اور گاؤں کی زمین فروخت کرکے وہ اپنا گھر خریدنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ڈیڑھ کروڑ میں زمین کا سودا کرکے وہ عفان کے ساتھ خوشی خوشی شہر آرہے ہوتے ہیں کہ ڈکیتی کی واردات میں قتل ہوجاتے ہیں۔ عفان کے قریبی دوست زبیر کی مدد سے عاصمہ عفان کے آفس سے تین لاکھ روپے اور فاروق صاحب کی گریجویٹی سے سات لاکھ روپے وصول کرپاتی ہے۔ زبیر گھر خریدنے میں بھی عاصمہ کی مدد کررہا ہے۔

اسلام آباد سے واپسی پر عدیل دونوں مقتولین کو دیکھتا ہے۔ زاہدہ، نسیم بیگم سے بیس لاکھ روپے سے مشروط فوزیہ کی رخصتی کی بات کرتی ہیں۔ وہ سب پریشان ہوجاتے ہیں۔ عدیل بشریٰ سے ذکیہ بیگم سے تین لاکھ روپے لانے کو کہتا ہے۔

عاصمہ کی مجبوری ہے کہ گھر میں کوئی مرد نہیں۔ اس کا بیٹا ابھی چھوٹا ہے اور سارے کام اس نے خود کرنے ہیں۔ وہ جلد از جلد اپنا گھر خریدنا چاہتی ہے۔ عاصمہ کے کہنے پر زبیر کسی مفتی سے فتویٰ لے کر آجاتا ہے کہ دوران عدت انتہائی ضرورت کے پیش نظر گھر سے نکل سکتی ہے بشرطیکہ مغرب سے پہلے واپس گھر آجائے۔ سو وہ عاصمہ کو مکان دکھانے لے





جاتا ہے۔ اور موقع سے فائدہ اٹھا کر اسے اپنی ہوس کا نشانہ بناتا ہے اور ویرانے میں چھوڑ کر فرار ہوجاتا ہے۔ وہاں سے وہ عدیل کی مدد سے گھر پہنچ پاتی ہے۔

رقم مہیا نہ ہونے کی صورت میں فوزیہ کو طلاق ہوجاتی ہے۔ نسیم بیگم جذباتی ہوکر ہوا اور اس کے گھر والوں کو مورد الزام ٹھہرانے لگتی ہیں۔ اسی بات پر عدیل اور بشریٰ کے درمیان خوب جھگڑا ہوتا ہے۔ عدیل طیش میں بشریٰ کو دھکا دیتا ہے۔ اس کا ابارشن ہوجاتا ہے۔ عدیل شرمندہ ہوکر معافی مانگتا ہے مگر وہ ہنوز ناراض رہتی ہے اور اسپتال سے اپنی ماں کے گھر چلی جاتی ہے۔ اسی اسپتال میں عدیل عاصمہ کو دیکھتا ہے جسے بے ہوشی کی حالت میں لایا گیا ہوتا ہے۔ عاصمہ اپنے حالات سے تنگ آکر خودکشی کی کوشش کرتی ہے تاہم بچ جاتی ہے۔ نو سال بعد عاصمہ کا بھائی ہاشم پریشان ہوکر پاکستان آجاتا ہے۔ عاصمہ کے سارے معاملات دیکھتے ہوئے ہاشم کو پتا چلتا ہے کہ زبیر نے ہر جگہ فراڈ کرکے اس کے سارے راستے بند کردیے ہیں اور اب مفرور ہے۔ بہت کوششوں کے بعد ہاشم، عاصمہ کو ایک مکان دلا پاتا ہے۔

بشریٰ اپنی واپسی الگ گھر سے مشروط کردیتی ہے۔ دوسری صورت میں وہ علیحدگی کے لیے تیار ہے۔ عدیل مکان کا اوپر والا پورشن بشریٰ کے لیے سیٹ کروادیتا ہے۔ بشریٰ کے آنے کے بعد بشریٰ کو مجبور کرتا ہے کہ وہ فوزیہ کے لیے عمران کا رشتہ لائے۔ نسیم بیگم اور عمران کسی طور نہیں مانتے۔ عدیل اپنی بات نہ مانے جانے پر بشریٰ سے جھگڑتا ہے۔ بشریٰ بھی ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرتی ہے۔ عدیل طیش میں بشریٰ کو طلاق دے دیتا ہے اور مثال کو چھین لیتا ہے۔ مثال بیمار پڑجاتی ہے۔ بشریٰ بھی حواس کھو دیتی ہے۔ عمران بہن کی حالت دیکھ کر مثال کو عدیل سے چھین کرلے آتا ہے۔ عدیل عمران پر اغوا کا پرچا کٹوادیتا ہے۔

عاصمہ اسکول میں ملازمت کرلیتی ہے مگر گھریلو مسائل کی وجہ سے آئے دن چھٹیاں کرنے کی وجہ سے ملازمت چلی جاتی ہے۔

انسپکٹر طارق دونوں فریقین کو سمجھا بجھا کر مصالحت پر آمادہ کرتے ہیں۔ ذکیہ بیگم کی خواہش ہے کہ عدیل، مثال کو لے جائے، تاکہ وہ بشریٰ کی کہیں اور شادی کرسکیں۔ دوسری طرف نسیم بیگم بھی ایسا ہی سوچ بیٹھی ہیں۔ فوزیہ کی اچھا کی شادی کے بعد نسیم بیگم کو اپنی جلد بازی پر پچھتاوا ہونے لگتا ہے۔ انسپکٹر طارق، ذکیہ بیگم سے بشریٰ کا رشتہ مانگتے ہیں۔ ذکیہ بیگم خوش ہوجاتی ہیں، مگر بشریٰ کو یہ بات پسند نہیں آتی۔

وہ گرین کارڈ کے لالچ میں بشریٰ سے منگنی توڑ کر نازیہ بھٹی سے شادی کرلیتا ہے، پھر شادی کے ناکام ہوجانے پر ایک بیٹے سیفی کے ساتھ ایک طویل عرصے بعد دوبارہ اپنی چچی ذکیہ بیگم کے پاس آجاتا ہے اور ایک بار پھر بشریٰ سے شادی کا خواہش مند ہوتا ہے۔ بشریٰ تذبذب کا شکار ہوجاتی ہے۔

بشریٰ اور احسن کمال کی شادی کے بعد عدیل مستقل طور پر مثال کو اپنے ساتھ رکھنے کا دعوا کرتا ہے مگر بشریٰ قطعی نہیں مانتی، پھر احسن کمال کے مشورے پر دونوں بمشکل راضی ہوجاتے ہیں کہ مہینے کے ابتدائی پندرہ دنوں میں مثال بشریٰ کے پاس رہے گی اور بقیہ پندرہ دن عدیل کے پاس۔ گھر کے حالات اور نسیم بیگم کے اصرار پر بالآخر عدیل عفت سے شادی کرلیتا ہے۔ والدین کی شادی کے بعد مثال دونوں گھروں کے درمیان گھن چکر بن جاتی ہے۔ بشریٰ کے گھر میں سیفی اور احسن اس کے ساتھ کچھ اچھا برتاؤ نہیں کرتے اور عدیل کے گھر میں اس کی دوسری بیوی عفت۔ مثال کے لیے مزید زمین تنگ، بشریٰ اور عدیل کے نئے بچوں کی پیدائش کے بعد ہوجاتی ہے۔ مثال اپنا اعتماد کھو بیٹھتی ہے۔ احسن کمال اپنی فیملی کو لے کر ملائیشیا چلا جاتا ہے اور مثال کو تاریخ سے پہلے عدیل کے گھر بھجوادیتا ہے۔ دوسری طرف عدیل اپنی بیوی بچوں کے مجبور کرنے پر مثال کے آنے سے قبل اسلام آباد چلا جاتا ہے۔ مثال مشکل میں گھر جاتی ہے۔ پریشانی کی حالت میں اسے ایک نشئی تنگ کرنے لگتا ہے تو عاصمہ آکر اسے بچاتی ہے۔ پھر اپنے گھر لے جاتی ہے۔ جہاں سے مثال اپنے ماموں عمران کو فون کرکے بلواتی ہے اور اس کے گھر چلی جاتی ہے۔

عاصمہ کے حالات بہتر ہوجاتے ہیں۔ وہ نسبتاً "پوش ایریا" میں گھر لے لیتی ہے۔ اس کا کوچنگ سینٹر خوب ترقی کرجاتا

ہے۔ مثال ‘ واثق کی نظروں میں آچکی ہے تاہم دونوں ایک دوسرے سے واقف نہیں ہیں۔

عاصمہ کا بھائی ہاشم ایک طویل عرصے بعد پاکستان لوٹ آتا ہے اور آتے ہی عاصمہ کی بیٹیوں اریشہ اور اریبہ کو اپنے بیٹوں وقار ‘ وقاص کے لیے مانگ لیتا ہے۔ عاصمہ اور واثق بہت خوش ہوتے ہیں۔

سیفی ‘ مثال پر بری نیت سے حملہ کرتا ہے تاہم مثال کی چیخوں سے سب وہاں پہنچ جاتے ہیں۔ سیفی الٹا مثال پر الزام لگاتا ہے کہ وہ اسے بہکا رہی تھی۔ احسن کمال بیٹے کی بات پر یقین کرلیتا ہے۔ مثال اور بشریٰ مجبور اور بے بسی سے کچھ کہہ نہیں پاتیں۔ احسن کمال پوری فیملی سمیت دوسرے ملک میں شفٹ ہوجاتا ہے۔ بشریٰ مثال کو مستقل عدیل کے گھر چھوڑ جاتی ہے۔ جہاں عفت اور پریشے اسے خاطر میں نہیں لاتیں۔ واثق کو بہت اچھی نوکری مل جاتی ہے۔ مثال اور واثق کے درمیان ان کہا سا تعلق بن جاتا ہے۔ مگر مثال کی طرف سے دوستی اور محبت کا کوئی واضح اظہار نہیں ہے۔ واثق البتہ کھل کر اپنے جذبات کا اظہار کرچکا ہے۔ واثق ‘ عاصمہ سے اپنی کیفیت بیان کردیتا ہے۔ عاصمہ خوش ہوجاتی ہے مگر غائبانہ ذکر پر بھی مثال کو پہچان نہیں پاتی۔ واثق عاصمہ کو لے کر مثال کے گھر ملنے جاتا ہے۔ مگر دروازے پر عدیل کو دیکھ کر عاصمہ کو برسوں پرانی رات یاد آجاتی ہے۔ جب زبیر نے عاصمہ کی عصمت دری کرکے اسے ویرانے میں چھوڑ دیا تھا اور عدیل نے عاصمہ کو گھر پہنچایا تھا۔ اگرچہ عدیل نے اس وقت بھی نہیں سمجھا تھا کہ عاصمہ پر کیا بیتی ہے اور اب بھی اس نے عاصمہ کو نہیں پہچانا تھا مگر عاصمہ کو عدیل بھی یاد تھا اور اپنے ساتھ ہونے والا وہ بھیانک حادثہ بھی۔ شرمندگی اور ذلت کے احساس سے عاصمہ کو انجائنا کا اٹیک ہوجاتا ہے۔ واثق دروازے سے ہی ماں کو اسپتال لے جاتا ہے۔ مثال اس کا انتظار کرتی رہ جاتی ہے۔ پھر بہت سارے دن یوں ہی گزر جاتے ہیں۔ ان ہی دنوں عدیل اپنے دوست کے بیٹے فہد سے مثال کا رشتہ طے کردیتا ہے۔ عفت ‘ مثال کے لیے اتنا بہترین رشتہ دیکھ کر بری طرح جل جاتی ہے۔ اس کی دلی خواہش ہے کہ کسی طرح یہ رشتہ پریشے سے طے ہوجائے۔ مثال بھی اس رشتے پر دل سے خوش نہیں ہے۔ مگر وہ اپنی کیفیت سمجھ نہیں پارہی۔ عاصمہ کی طبیعت ذرا سنبھلتی ہے تو وہ مثال کی طرف جانے کا ارادہ کرتا ہے۔ اتفاق سے اسی دن مثال کی فہد سے منگنی کی تقریب ہورہی ہوتی ہے۔ وہیں کھڑے کھڑے واثق کی ملاقات پریشے سے ہوجاتی ہے جو کافی ناز و ادا سے واثق سے بات کرتی ہے اور اس بات سے بے خبر ہوتی ہے کہ اس کی کلاس فیلو وردہ جو اسے بہت پسند کرتی ہے ‘ واثق کی بہن ہے۔ منگنی کے بعد مثال ایک دم شادی سے انکار کردیتی ہے۔ عفت خوش ہوجاتی ہے۔ عدیل بہت غصہ کرتا ہے اور بشریٰ کو فون کرکے مثال کو بھیجنے کی بات کرتا ہے۔ گھر میں ٹینشن پھیلی ہے۔ اسی ٹینشن میں مثال کالج کی لائبریری میں واثق سے ملتی ہے۔ واپسی میں عفت اسے واثق کے ساتھ دیکھ لیتی ہے اور عدیل کو بتادیتی ہے۔ عدیل از حد پریشان ہوجاتا ہے۔ پریشے ‘ وردہ سے ملنے اس کے گھر جاتی ہے تو واثق سے ملاقات ہوجاتی ہے۔

۲۴
چوبیسویں قسط

پری کی آنکھوں میں چمک اور عجیب سی خوشی ابھری۔ واثق کے مسکراتے لب اس کی آنکھوں کی چمک کو دیکھ کر آہستہ آہستہ مسکراتے چلے گئے۔

”ہائے!“ پری نے بے تکلفی سے مسکراتے ہوئے اپنا دودھیا نرم و گداز ہاتھ اس کی طرف بڑھایا۔ واثق اس کے انداز کو بس دیکھ کر رہ گیا۔

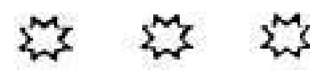
”آپ۔۔۔ کون؟“ وہ کچھ مروّت بھرے لہجے میں فقط یہی کہہ سکا۔

”سلام دعا کا فیشن نہیں ہے کیا آپ کے ہاں؟“ وہ شوخی سے آگے ہو کر گنگنانے والے انداز میں بولی۔

”آپ کے خیال میں سلام دعا ایک فیشن ہے۔۔۔ فیشن جو ٹائم بائی ٹائم بدلتا ہے۔“ وہ الٹا تنقیدی انداز میں جتانے کو پوچھنے لگا۔

"میں پری ہوں۔" وہ مزید کسی بے کار بحث میں الجھنے کے بجائے بڑے فخریہ انداز میں اپنی تعارف کرانے لگی۔
"اور پلیز! یہ مت کہیے گا کہ آپ واقعی پری ہیں۔" پھر فوراً ہی مغرورانہ انداز میں بولی۔
وہ بے ساختہ ہنس پڑا۔
"بٹ رئیلی! میں یہی کہنا چاہتا ہوں۔ تم واقعی پری تو نہیں؟" وہ کچھ طنزیہ ' کچھ شوخ لہجے میں بولا۔
پری نے آنکھیں سکوڑ کر واثق کو دیکھا۔
"آپ میرا مذاق اڑا رہے ہیں؟"
"کمپلیمنٹ بھی آپ کو مذاق لگتا ہے۔ رئیلی یو آر اے فیری۔" وہ آنکھوں میں تحسین لیے کہتا ایک دم سے پری کو بے حد اچھا لگا۔
"ہاں... یہ الگ بات ہے آپ کو یہ کمپلیمنٹ بار بار سننا اچھا لگتا ہوگا۔ ہے نا۔" وہ شرارت سے بولا۔
"نہیں! اتنی بھی خود پرست نہیں ہوں۔" وہ کچھ ٹھنک کر بولی۔
"یعنی تھوڑی بہت تو ہیں نا!" وہ جتاتے ہوئے کہہ کر جانے لگا۔
"اللہ آپ دونوں میں تعارف ہو بھی گیا اور میں نے جو اتنا شاندار ابتدائیہ سوچ رکھا تھا کہ آپ دونوں کے تعارف سے پہلے یہ کہوں گی یوں کہوں گی اور..." وردہ پیچھے سے آکر تاسف بھرے لہجے میں بنا رکے کہتی چلی گئی۔
"او بہن میری! کہیں فل اسٹاپ کوما وغیرہ بھی لگا لیا کرو' یہ بھی ہماری زبان کا حصہ ہیں۔" واثق اس کے تیز تیز بولنے سے کچھ چڑ کر بولا۔
"بھائی! یہ پری ہے۔" وہ جلدی سے اس کا ہاتھ پکڑ کر پھر سے کھینچ کر پری کے سامنے لاتے ہوئے بے تابی سے بولی۔
"اف!" وہ مصنوعی انداز میں سر پکڑ کر کراہا۔
"سنو لڑکی! تمہارا ایکچوئل نیم کیا ہے؟" وہ پری سے تیز لہجے میں پوچھ رہا تھا۔
"پریشے۔" وہ کچھ کنفیوز ہو کر جلدی سے بولی۔
"اوکے۔ زیادہ بہتر یہی ہے کہ ان محترمہ کو ان کے مکمل نام سے پکارا جائے۔ یہ بار بار پری پری کی گردان... ایمان سے بندہ اچھا خاصا کنفیوز ہو جائے کہ واقعی آسمانوں سے اللہ نے کوئی پری تو نہیں بھیج دی۔" وہ دونوں کے چہروں کے بدلتے تاثرات دیکھتے ہوئے کچھ محظوظ ہونے والے انداز میں کہنے لگا۔
"بھائی!" وردہ تو رو دینے کو تھی۔ اس کی اتنی خوب صورت سہیلی جسے آج اس نے گھر میں کسی سرپرائز کی طرح بلایا تھا۔ اسے لگا واثق اس کی بے عزتی کر رہا ہے۔
"اب آپ زیادتی کر رہے ہیں۔ قسم سے میری دوست کسی بھی آسمانی پری سے کم نہیں۔" وہ روہانسی ہو کر بولی۔
"آپ واپس کب جا رہی ہیں؟" وہ جھک کر سنجیدگی سے پری سے پوچھ رہا تھا۔
"جی!" پری سخت حیرت زدہ تھی۔ کوئی یوں تھوڑی پوچھتا ہے مہمان سے!
"آسمانوں پہ..." وہ فوراً تصحیح کرتے ہوئے پوچھنے لگا۔
پری نے بے بسی سے مدد طلب نظروں سے وردہ کی طرف دیکھا۔
"بھائی! یہ بالکل بھی اچھی بات نہیں ہے۔" وہ شکایتی لہجے میں بولی۔
"کیا انہیں واپس نہیں جانا؟" وہ بوکھلا کر مصنوعی حیرانی سے بولا۔

"کیا اسے جانا چاہیے؟" وہ الٹا معنی خیز انداز میں واثق سے پوچھنے لگی۔ وہ اسے جواباً گھور کر رہ گیا۔
اسی وقت عاصمہ نماز پڑھ کر دوپٹا ٹھیک کرتی ان کے درمیان آ گئی۔ ورہ بڑے متاثر کن انداز میں پری کا ماں سے تعارف کرانے لگی۔
واثق کو کھسکنے کا موقع مل گیا۔
پری اسے دور تک جاتے دیکھتے ہوئے جانے کیا کیا سوچتی چلی گئی۔
"اس دن مثال کی انگیجمنٹ والے دن یہ شخص مجھے نظر آیا اور پہلی نظر میں مجھے اتنا اچھا لگا کہ میں نے اس کے پھر ملنے کی دعا کی تھی اور میری دعا اتنی جلدی قبول ہو گی۔ میں نے سوچا نہیں تھا' لیکن مجھے لگتا ہے اللہ تعالیٰ ضرور میری یہ خواہش پوری کرے گا ــــــــ تب ہی تو یہ مجھے پھر مل گیا... مل گیا۔" وہ خود ہی اپنی سوچ پر ہنس پڑی۔
"ارے واہ! تم کیوں ہنسیں' ہم دونوں کمبائن اسٹڈی ہی تو کریں گے۔ خدانخواستہ کچھ اور تو نہیں میرے کہنے پر یوں ہنس پڑیں۔" ورہ اس کے یوں ہنسنے پر اسے ٹھوکا دے کر بولی تو وہ سہلا کر مسکرانے لگی۔
عاصمہ دونوں کو دیکھ کر شفقت سے مسکراتے ہوئے جانے لگی۔
"میں اندر ہوں کمرے میں ورہ اگر کچھ کھانے کے لیے چاہیے ہو تو نسرین کو بتا دینا' وہ ابھی یہیں ہے رات میں جائے گی۔" وہ ملازمہ کا بتا کر جانے لگی۔
"جی امی! میں کہہ دوں گی۔" پیچھے سے آواز لگا کر ورہ نے جواب دیا۔ پری ابھی بھی کسی سوچ میں گم تھی۔
"ارے! تم کیا سوچ سوچ کر مسکرائے جا رہی ہو۔" ورہ اتنی بھی سیدھی نہیں تھی جتنا پری اسے سمجھے ہوئے تھی۔
"تو اب کیا مجھے مسکرانا بھی نہیں چاہیے۔" وہ الٹا خفگی سے بولی۔
"پہلے تو تم ذرا بھی مسکرا نہیں رہی تھیں۔ اتنی بری شکل بنا کر بیٹھی تھیں' جیسے میں تمہیں زبردستی باندھ کر لائی ہوں یہاں..."
وہ جتانے والے انداز میں بولی تو پری فوری طور پر کچھ کہہ نہیں سکی۔
"اب میں چلوں ورہ! کافی لیٹ ہو گئی ہوں' امی کو میں تھوڑی دیر کا ہی کہہ کر آئی تھی۔"



"کیا وہ کسی اور کو پسند کرتی ہے؟" عدیل کو یہ بات سوچنا اور ہضم کرنا بہت مشکل لگ رہی تھی۔
اسے عفت کی بات پر بھی کچھ شک تھا۔
بشریٰ یہ بات ــــ نہیں مانتی کہ مثال کسی میں دلچسپی رکھتی ہے۔ اس نے صاف کہہ دیا تھا کہ مثال اس ٹائپ کی لڑکی نہیں ہے۔ لیکن عفت بلاوجہ اپنے بچوں کی قسم نہیں کھا سکتی۔
دل دلیل پر آمادہ تھا۔ دماغ بھی اس کا ساتھ دیتا' مگر پھر عدیل کو لگتا یہ سب غلط ہے' ایسا نہیں ہو سکتا۔
اسے ایک عجیب سا خوف بھی محسوس ہونے لگا تھا۔
اگر مثال نے یہ بات کہہ دی کہ ہاں وہ واقعی کسی اور کو پسند کرتی ہے' بھلے ضد میں بھلے کسی اور وجہ سے۔ تو وہ کیا کرے گا' اسے زبردستی روک تو نہیں سکے گا اور اس کا رشتہ وہاں بھی نہیں کر سکے گا' جہاں وہ چاہے گی۔
اور بشریٰ کے پاس مثال کو بھجوانا... وہ بات کر کے دیکھ چکا تھا' یہ بات سنتے ہی بشریٰ کی اور مثال کی حالت بگڑنے

لگتی۔
کچھ بھید بھاؤ اس میں بھی تھا' جو دونوں ہی یہ نہیں چاہتی تھیں' لیکن جب سیدھے سیدھے شادی ہو رہی ہے' اتنے اچھے رشتے کا مل جانا کسی نعمت سے کم نہیں تو پھر مثال کو کیا مسئلہ ہے؟
وہ عفت کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے فوری طور پر مثال سے کچھ نہیں پوچھ سکا تھا۔
مگر بے قرار دل کو چین بھی ایک پل نہیں آ رہا تھا۔
"نہیں مجھے ایک بار تو مثال سے بات کرنا ہو گی۔" وہ طے کرنے والے انداز میں خود سے کہہ کر باہر نکلنے لگا کہ اس کا فون بجنے لگا۔ اس نے بے زاری سے اجنبی نمبر دیکھ کر کال ریسیو کی تھی' مگر دوسرے لمحے اس کے ہاتھوں کے توتے اڑ گئے تھے۔
"جی بات کر رہا ہوں عدیل احمد!" استفسار پر اس نے ناگواری سے جواب دیا تھا۔
"دانیال احمد کے والد ہیں آپ؟" اگلا استفسار چونکا دینے والا تھا۔ عدیل ٹھٹھک کر رہ گیا۔
"جی۔ دانیال میرا ہی بیٹا ہے' آپ کون ہیں؟" وہ سمجھا شاید دانیال کے کسی دوست کے والد ہوں گے یا کوئی ٹیچر۔ اسے لگا شاید اس کی طرف سے کوئی شکایت ہے' سو متوجہ ہو کر دوسری طرف کا جواب سننے لگا۔
"آپ کو اسی وقت تھانے آنا ہو گا۔ میں انسپکٹر رؤف بات کر رہا ہوں۔ آپ کا بیٹا ہمارے پاس..." اس سے آگے انسپکٹر تھانے کا پتا بتا رہا تھا اور عدیل جیسے کچھ بھی سن نہیں پا رہا تھا۔
"تو آپ پہنچ رہے ہیں۔ میں آپ کا ویٹ کر رہا ہوں خدا حافظ۔" کہہ کر فون بند کر دیا گیا۔
عدیل سُن ہاتھوں کے ساتھ فون ایک طرف ڈال کر نڈھال سا بیٹھ گیا۔
اس کا دماغ چند لمحوں میں جیسے ماؤف ہو کر رہ گیا تھا۔
"یہ پری مجھے گھنٹہ بھر کا کہہ کر گئی تھی اپنی دوست کی طرف' ابھی تک آئی نہیں۔" عفت استری کیے ہوئے کپڑوں کے ہینگرز ہاتھ میں لیے اندر آ کر الماری میں لٹکاتے ہوئے بڑبڑاتے ہوئے کچھ اطلاعی انداز میں بول رہی تھی۔
عدیل کے چہرے پر دوسرے لمحے طیش بھرے تاثرات ابھر آئے۔
"آپ اس طرح کیوں بیٹھے ہیں' فائزہ بھابھی کی کال آئی تھی دوپہر میں۔ میں آپ کو بتانا بھول گئی۔ فہد جلد آ رہا ہے۔ وہ کہہ رہی تھیں اور آتے ہی شادی کی تاریخ رکھ دیں گے۔ انہوں نے تیاریاں شروع کر دی ہیں۔ ان کے فون کا مقصد یہی تھا کہ ہم بھی تیاریاں شروع کر دیں۔ سن رہے ہیں نا آپ؟" وہ اونچی آواز میں کہہ رہی تھی۔
"دانی کہاں ہے؟" وہ اس کے سر پر پہنچ کر درشت لہجے میں بولا۔ عفت اس بات کے لیے تیار نہیں تھی۔
وہ ششدر سی عدیل کو دیکھتی رہ گئی۔
اس نے باقی ہینگرز یونہی بیڈ کے کنارے پر رکھ دیے۔ اسے لگا عدیل کے ساتھ کچھ ہو گیا ہے۔
"کیا مطلب؟ وہ اس کا میچ تھا۔ آج کرکٹ کا۔ تو اسکول سے آ کر وہیں گیا ہے۔ کل ان کے اسکول میں کمپٹیشن ہے۔" وہ کچھ ڈری ہوئی اٹک اٹک کر کہہ رہی تھی۔
"ارے غافل عورت! کس طرح کی ماں ہو تم کہ تمہیں کسی بھی بات کا ہوش نہیں ہے۔ دوسروں کے عیب اور برائیاں ڈھونڈنے سے فرصت ملے تمہیں تو تم اپنی اولاد کی طرف دھیان دو..."
عدیل کا لہجہ' اس کا طرز تخاطب اور الزامات۔
عفت کو لگا جیسے کسی نے اس پر پٹرول سے بھرا گیلن الٹا دیا ہو اور اب دیا سلائی بھڑکنے کو ہے۔

"میری اولاد۔۔۔ میری اولاد۔۔۔ میکے سے لے کر آئی تھی میں، یا کسی یتیم خانے سے پکڑ کر، جو ہروقت ایک ہی بات کا طعنہ بن کر آپ کے منہ پر رہنے لگی ہے، آپ کے کچھ نہیں لگتے کیا وہ دونوں؟" وہ پاگلوں کی طرح چیخنے لگی تھی۔

"وہ اس وقت کسی میچ میں نہیں ہے۔ حوالات میں ہے۔ جانتی ہو تم؟" وہ غرا کر اسے حقارت سے پرے دھکیل کر بولا۔

اور عفت کو لگا کسی نے اس کے پورے وجود کو مٹھی میں بھینچ لیا ہو۔ اس سے سانس بھی نہیں لیا جا رہا تھا۔

وہ بے یقین نظروں سے ہونٹ بھینچے عدیل کو دیکھے جا رہی تھی۔

"قسم لے لیں عدیل۔۔۔ دانیال اور پری آپ کے بچے ہیں۔ میں خدا کو گواہ بنا کر کہتی ہوں، پھر آپ نے کیوں اپنی اولاد سے اس طرح کا بیر باندھ لیا ہے۔" وہ سر پکڑ کر وہیں نیچے بیٹھ گئی۔ اور گھٹی گھٹی ہچکیوں سے رونے لگی۔

عدیل کو لگا اس کا ذہنی توازن بگڑ گیا ہے۔

"وہ صرف میرا بیٹا نہیں ہے۔ وہ آپ کا بھی ہے۔ آپ کا خون، آپ کا اکلوتا بیٹا پھر آپ اس کے بارے میں ایسی بات کیسے کر سکتے ہیں۔۔۔ کیسے؟" وہ آخر میں چیخی تھی۔

"عفت۔۔۔!" عدیل بھی ضبط کھو بیٹھا۔ "تم میری بات سن بھی رہی ہو یا نہیں؟" وہ سخت غصے اور اور جھلاہٹ میں چیخا تھا۔

"دانیال تھانے میں ہے۔ مجھے ابھی پولیس اسٹیشن سے کال آئی ہے۔ انہوں نے فوری طور پر مجھے تھانے بلایا ہے۔" وہ زور سے سمجھانے والے انداز میں کہہ رہا تھا۔ عفت اور بھی حیرت زدہ نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"پتا نہیں ابھی اور کیا دیکھنا باقی ہے مجھے اس اولاد کے ہاتھوں، ابھی جوان نہیں ہوا یہ لڑکا اور باپ کو تھانے کے چکر لگوانے لگا۔" وہ بڑبڑاتے ہوئے الماری سے اپنی چیزیں نکالنے لگا۔

"اور سن لو! اگر کچھ سیریس معاملہ ہوا، کوئی ایسی ویسی بات تو قسم سے میں اسے وہیں چھوڑ کر چلا آؤں گا۔ جرم کی سرپرستی تو بہرحال میں نہیں کر سکتا۔"

وہ اس کے قریب رک کر تلخی سے جتانے والے لہجے میں کہہ رہا تھا۔ وہ تیزی سے اٹھ کر اس کے پیچھے لپکی۔

"عدیل! رکیں۔۔۔ میں۔۔۔ مجھے بھی جانا ہے آپ کے ساتھ۔" وہ حواس باختہ سی دوپٹے سے بے خبر اس کے پیچھے آ رہی تھی۔

"میرے ساتھ تم تھانے چلو گی؟" وہ حقارت سے بولا اور رات کا کھانا تیار کرتی مثال کے ہاتھ وہیں رک گئے۔ وہ عدیل کی بات سن کر حیران سی رہ گئی۔

"میں جاؤں گی۔ میں جا رہی ہوں۔ مجھے اپنے بیٹے کے پاس جانا ہے، پلیز مجھے ساتھ لے کر چلیں۔" وہ آنکھوں میں جمے ہوئے آنسوؤں کے ساتھ منت بھرے لہجے میں کہہ رہی تھی۔ مثال آہستگی سے کچن کے دروازے میں آ کر کھڑی ہو گئی۔

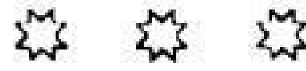
"تم ہوش میں تو ہو؟" وہ نیچی آواز میں غرایا۔

"خدا کے لیے میری ماں کا اور امتحان نہیں لیں۔ مجھے جانا ہے دانی کے پاس۔ ساتھ لے کر جائیں مجھے پلیز۔"

وہ مثال کی موجودگی سے بے خبر منت کر رہی تھی۔

"عفت! میرا دماغ خراب نہیں کرو، میں جا رہا ہوں ابھی پولیس اسٹیشن، وہاں کیا معاملہ پیش آنے والا ہے، مجھے کچھ معلوم نہیں۔ تم مجھے یوں روک کر مزید پریشان نہیں کرو۔ میں وہاں جاتے ہی تمہیں کال کر کے بتا دوں گا کہ کیا معاملہ ہے۔ چلتا ہوں میں۔" وہ رکھائی سے کہہ کر جانے لگا۔

"عدیل! خدا کے لیے مجھے ساتھ لے کر جائیں۔۔۔" وہ روتی ہوئی اس کے پیچھے گئی۔ عدیل ان سنی کرتا باہر جا چکا تھا۔ عفت بے آواز آنسوؤں سے رونے لگی۔



"یہ کیا کہہ رہی ہو تم وردہ!" عاصمہ اور واثق تو جیسے ششدر رہ گئے۔ وردہ کے چہرے پر جوش اور اطمینان تھا۔
واثق کے چہرے پر اب ہلکا ہلکا غصہ نمودار ہونے لگا تھا۔
"تمہاری اس فضول بات کا مطلب کیا ہے۔" وہ اپنا غصہ زیادہ دیر تک چھپا نہیں سکا۔
وردہ واثق کے لہجے پر لمحہ بھر کو کچھ پریشان سی ہو گئی۔
"وردہ! سوچ سمجھ کر بولا کرو۔" عاصمہ نے بھی اسی لہجے میں اسے گھر کا۔
"امی! کیا ہے۔ اس گھر میں کوئی اچھی بات کرنے پر بھی ڈانٹ ڈپٹ ضروری ہوتی جا رہی ہے۔" وہ منہ بنا کر بولی۔ عاصمہ اور واثق ایک دوسرے کو دیکھ کر رہ گئے۔
"امی! کیا میں غلط کہہ رہی ہوں۔ پلیز آپ ایمان داری سے بتائیں۔" وہ دونوں کو خاموش دیکھ کر فوراً" بولی۔
واثق نے کھانا وہیں پہ چھوڑ دیا۔
"تمہاری عمر ہے ایسی باتیں کرنے کی؟" عاصمہ کو اس طرح اسے منع کرنا ٹھیک لگا۔
"کم آن امی! مجھے کیا ہوا ہے؟ پھر آپ بھی تو بھائی کے لیے لڑکیاں دیکھ رہی ہیں۔ اگر ایک لڑکی میں نے پسند کر لی تو کیا برا کیا۔"
"وردہ۔" واثق کو اب اس پر غصہ آنے لگا تھا۔
"واثق! تم کھانا کھاؤ' اسے بولنے دو۔" وہ واثق کو غصے میں دیکھ کر نرمی سے بولی۔
"امی! پری ہر لحاظ سے بھائی کو سوٹ کرے گی۔ دونوں کی جوڑی چاند سورج کی ہے۔ اتنا پرفیکٹ کپل ہو گا کہ لوگ آپ کو مبارک باد دیا کریں گے راستہ روک روک کر۔" وہ واثق کو آنکھ مار کر بولی۔
"امی! اسے چپ کروا لیں۔" وہ وردہ سے کچھ سخت نہیں کہنا چاہتا تھا۔ اس لیے اس کو براہ راست نہیں ٹوکا۔
"وردہ بیٹا! یہ بات ٹھیک نہیں ہے۔"
"امی! مجھے کوئی ایک ریزن بتا دیں انکار کی۔" وہ بھی اسی لہجے میں بولی۔ یوں بھی واثق اور عاصمہ نے وردہ کو بہت لاڈ میں رکھا ہوا تھا۔ وہ ہر طرح کی بات آرام سے کر لیا کرتی تھی۔
"بیٹا! واثق اور پری کا ایج ڈیفرنس دیکھا ہے تم نے؟" عاصمہ کے فوری طور پر یہی وجہ سمجھ میں آسکی تو بولی۔
"اللہ کو مانیں امی!" وردہ کھانا چھوڑ کر دونوں ہاتھ کانوں کو لگا کر بڑے مفکرانہ لہجے میں بولی۔ دونوں بے اختیار مسکرانے لگے۔
"تم چاہتی کیا ہو؟" واثق اب دلچسپی لیتے ہوئے بولا۔
"پری! ہمارے گھر میں آجائے میرے پیارے سے اتنے ہینڈسم وجیہہ بھائی کی دلہن بن کر اور امی! یہ میں نے یہ بات اسی دن سوچ لی تھی جس دن میں نے پری کو پہلی بار دیکھا تھا۔" وہ شوق سے کہہ رہی تھی۔
"امی۔۔۔ یہ کیا پڑھنے جاتی ہے کالج میں؟" واثق اسے گھور کر بولا۔
"اب تو میں کہہ سکتی ہوں "یہی" پڑھنے جاتی ہے۔" عاصمہ کچھ بے بسی سے بولی۔
"اس لیے تو اس کے گریڈز کا حال دیکھ لیں' فرسٹ ٹرم میں۔۔۔" وہ بھی لقمہ دیتے ہوئے بولا۔

ورده دونوں کو دیکھ کر ایک دم سے رونے لگی۔

"حد ہے بھئی۔ یہ تمہارا حوصلہ ہے اور اتنی اتنی سی بات پر رونے لگو گی تو آگے کیا کرو گی؟" وہ اسے ٹشو دیتے ہوئے چھیڑنے کے سے انداز میں بولا۔

"آگے کیا مطلب؟" وہ آنسو بھری آنکھوں سے بولی۔

"مطلب جب تم اپنے بھیا کا پروپوزل اس پری کے لیے لے کر جاؤ گی اور وہاں تمہیں جوتے پڑیں گے تم تو وہیں رونا شروع کر دو گی۔" وہ اسے چھیڑ رہا تھا۔

ورده اور بھی شدت سے رونے لگی۔

"ورده! کیا بچپنا ہے یہ' کیوں اس طرح بے وجہ رونے لگی ہو' کھانا کھاؤ ٹھیک طرح سے۔" عاصمہ نے اسے ڈانٹا۔

"میری تو اس گھر میں کوئی ویلیو ہی نہیں ہے' مجھے تو کوئی کچھ سمجھتا ہی نہیں۔" اس کے رونے میں اور بھی شدت آ گئی۔ عاصمہ نے بے بسی سے واثق کو دیکھا۔

"اوکے تم رو لو جی بھر کر اور اس خوش فہمی میں مت رہنا کہ تمہاری فضول باتوں کی حوصلہ افزائی کے لیے تمہیں شہہ دی جائے گی۔ آج اگر تم نے یہ بات مذاق میں کہہ دی ہے۔ تو میں اگنور کر رہا ہوں۔" واثق سنجیدہ تھا۔

اٹھ کر کھڑا ہوا تو ورده کچھ سہم کر خاموش ہو کر اسے دیکھنے لگی۔

"لیکن آئندہ اگر تم نے اس طرح کی بات سنجیدگی میں کی تو ورده! یاد رکھنا' تمہارا بڑا بھائی ہوں۔ مجھے اس طرح کا مذاق دوسری بار پسند نہیں آئے گا۔"

"بھائی!" وہ ششدر سی رہ گئی۔

"یہ میری زندگی کا معاملہ ہے۔ تم اس طرح کسی بھی راہ چلتی لڑکی کا نام میرے ساتھ جوڑ کر مجھے مذاق کا نشانہ بنانا چاہو۔ یہ میں برداشت نہیں کروں گا۔ چھوٹی ہو گھر میں' سو اسی حساب سے بات کرو۔" وہ سخت درشت لہجے میں کہتا ہوا ورده اور عاصمہ کے تاثرات دیکھے بغیر تیزی سے وہاں سے چلا گیا۔ دونوں کچھ دیر کے لیے بالکل خاموش ہو گئیں۔ دوسرے لمحے ورده پھر سے رونے لگی۔

"ورده بس کرو' بہت ہو گیا' واثق نے کھانا بھی ٹھیک سے نہیں کھایا۔ کم از کم تمہیں کھانے کے دوران یہ سب نہیں کہنا چاہیے تھا۔ اب تم سمجھ دار ہوتی جا رہی ہو' کم از کم کسی بات کو کرنے کا موقع محل سمجھ سکتی ہو۔" عاصمہ نے بھی اسے ڈانٹا۔

"امی! کیا اتنی ہی بری بات کر دی میں نے' جو بھائی نے اس طرح سے مجھے ڈانٹ دیا ہے۔ پری اتنی بری ہے کیا؟" اس کی سوئی وہیں اٹکی ہوئی تھی۔

عاصمہ نے بے اختیار ماتھے پر ہاتھ رکھا۔

"اب تم دوبارہ اس لڑکی کا نام نہیں لو گی۔ اوکے! کھانا کھاؤ۔ میں واثق کو دے کر آتی ہوں۔" عاصمہ اٹھ کر چلی گئی' ورده یونہی بیٹھی رہ گئی۔



"ماما! بابا کا فون نہیں آیا؟" پری سخت پریشانی میں اندر آ کر ماں سے پوچھنے لگی۔

عفت جو اُجڑے حلیے میں بیٹھی تھی' نفی میں سر ہلا کر پھر آنسو پینے لگی۔ مثال اس کے پاس بالکل خاموش بیٹھی تھی۔

"میں نے کہا بھی تھا کہ مجھے ساتھ لے جائیں۔ میں چلی جاتی تو یوں ان چار گھنٹوں میں ہزار بار مرتی تو نہیں۔"
وہ سخت گھٹی گھٹی سسکیاں لینے لگی۔ مثال کو اس پر بے تحاشا ترس آیا۔
وہ اٹھ کر خاموشی سے پانی کا گلاس لے آئی اور عفت کے آگے کیا' وہ اسے دیکھ کر رہ گئی۔ دوسرے لمحے وہ پانی کا گلاس لے کر پینے لگی۔
"پاپا نے کچھ بتایا بھی نہیں کیوں پکڑا ہے انہوں نے ان کو۔" پری بے قرار تھی۔
"بتایا ہوتا تو میرے دل کو چین نہیں ہو جاتا۔ کئی بار فون کر چکی ہوں۔ کال ہی کاٹ دیتے ہیں۔ کس تھانے میں گئے ہیں' مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں' ورنہ میں ٹیکسی کروا کے ہی جاتی۔" عفت کے دل کو سخت بے قراری لگی تھی۔ ایک پل چین نہیں آرہا تھا۔
"میں کال کروں؟" پری نے اپنے سیل پر نمبر ملایا۔
کچھ دیر بعد فون مایوسی سے بند کر دیا۔
"اگر عدیل کے کسی دوست کو فون کر کے کہتی ہوں تو خفا ہوں گے آکر۔ ورنہ وقار بھائی کی بھی اچھی خاصی واقفیت تو ہوگی۔ اب وہاں رشتہ ایسا نازک ہے۔ یا اللہ۔۔۔ میں کیا کروں۔ میرے بچے کو اپنی امان میں رکھنا۔ اسے کچھ بھی نہ ہو' وہ ساتھ خیریت کے گھر آجائے۔" عفت روتے ہوئے دعائیں مانگنے لگی تھی۔
"جاؤ آپی! تمہارا فون بج رہا ہے اندر۔۔۔" پری گم صم بیٹھی مثال کو جتانے والے انداز میں بولی۔
"جاؤ جلدی دیکھو تمہارے پاپا کا ہوگا۔ ایک تم ہی تو ہو ان کی سگی اولاد' باقی تو سب کوڑا ہے۔" عفت ایسے میں بھی طعنہ دینے سے باز نہیں آئی۔
مثال تیزی سے اٹھ کر اپنے کمرے میں آگئی۔
فون مسلسل بجتے ہوئے بند ہو چکا تھا۔
اس نے فون اٹھایا۔ بشریٰ کی کال پھر سے آرہی تھی۔
مثال بجتے فون کو دیکھتی رہی۔
"کس کا فون ہے؟" پری دروازے میں آکر کھڑی ہو گئی تھی۔
"میری ماما کا ہے۔" مثال مجرمانہ لہجے میں آہستگی سے بولی۔
"اب بتا دینا انہیں' ساری رپورٹ دے دینا۔" وہ طنزیہ لہجے میں ماں کی طرح طعنہ دے کر چلی گئی۔
مثال کا جی تو بے اختیار چاہا فون ہی کاٹ دے۔
ضد میں آکر میں وہی کام کیوں کرتی ہوں جو دوسرے چاہتے ہیں اور دوسرے لمحے اسے خیال آیا تو اس نے کال ریسیو کر لی۔
"میں دوسرے کمرے میں تھی۔" بشریٰ کے پوچھنے پر وہ سرسری لہجے میں بولی۔
"کیسی ہو تم؟" بشریٰ نے اس سے وہ سوال اتنے دنوں بعد آج پوچھا تھا جو وہ اس سے ان دنوں متوقع کر رہی تھی' جب وہ اس سے دور گئی تھی۔
"ٹھیک ہوں میں۔" وہ مختصراً" بولی۔
"اور تمہارے پاپا؟" وہ بات بڑھانے کو بولی۔
بشریٰ کیا پوچھنا چاہ رہی ہے۔ مثال سمجھ رہی تھی۔

"ٹھیک ہیں وہ بھی۔"

"تمہارے پاپا نے دوبارہ کوئی بات تو نہیں کی۔" وہ مبہم لہجے میں پوچھ رہی تھی۔ وہ خوف زدہ تھی کہ کہیں عدیل مثال کو بشریٰ کے پاس بھجوا نہ دے۔
"تمہارے اور ان کے درمیان جو جھگڑا ہوا تھا۔" وہ کھل کر نہیں پوچھ پا رہی تھی۔
"ماما! میرا کل کالج میں ٹیسٹ ہے۔ میں وہ تیار کر رہی تھی۔ آپ پلیز پھر کال کر لیجئے گا۔ مجھے ابھی پڑھنا ہے۔ خدا حافظ۔" ایک دم سے اسے بشریٰ سے عجیب سی بیزاری ہوئی تھی۔
بغیر سوچے سمجھے اس نے خدا حافظ کہہ کر فون بند کر دیا۔
انہیں مجھ سے میرے مسائل سے کوئی دلچسپی نہیں۔
"میں واثق سے کہوں، وہ جا کر پاپا اور دانی کا پتا کرے۔" اسے خیال آیا۔
"نہیں اگر پاپا کو یہ بات اچھی نہیں لگی پھر شاید واثق کو بھی عجیب لگے۔ معلوم نہیں دانی کس مسئلے میں پکڑا گیا ہے۔" وہ کنفیوز سی نمبر ملاتے ہوئے رک گئی۔
پھر اس نے ہمت کر کے عدیل کا نمبر ملا ہی لیا اور حیرت انگیز طور پر عدیل نے اس کی کال ریسیو کر بھی لی۔
"پاپا! آپ کب گھر آ رہے ہیں، ماما بہت پریشان ہیں۔" اسے فوری طور پر یہی سمجھ میں آیا۔
"میں آ رہا ہوں کچھ دیر میں۔ کہہ دو تم۔" وہ روکھے تھکے لہجے میں کہہ رہا تھا۔
"آپ ٹھیک ہیں نا؟" وہ ایک دم سے پریشان ہوئی۔
"میں ٹھیک ہوں اور گھر ہی آ رہا ہوں۔"
"اور دانی۔ وہ ٹھیک ہے؟ آپ اسے ساتھ لے کر آ رہے ہیں نا؟" وہ جلدی سے پوچھنے لگی۔
مگر دوسری طرف سے عدیل نے جواب دیے بغیر فون ہی بند کر دیا تھا۔ وہ فکر مند سی ہو گئی۔
بہت دنوں بعد اسے اس گھر میں ایک فیملی ممبر کی طرح عجیب سی فکر لاحق ہوئی۔ جیسا بھی تھا دانی اس کا چھوٹا بھائی تھا اور بچپن میں مثال نے اسے بہت گود میں کھلایا تھا۔
"اللہ نہ کرے دانی کو کچھ ہو، وہ خیریت سے ہو اور پاپا کے ساتھ ہی ہو۔" وہ انجانے میں دعا مانگنے لگی۔
"اتنی لمبی ہو گئی تمہاری ماما کی کال۔ سب کچھ بتا رہی ہو انہیں مزے لے لے کر۔" پری کو چین نہیں آ رہا تھا، اندر آ کر زہریلے لہجے میں بولی۔
مثال نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کے پاس سے گزر کر باہر نکل گئی۔ عفت اسی طرح اسی پوزیشن میں بیٹھی تھی۔
"ماما! پاپا آ رہے ہیں گھر۔ میری ابھی بات ہوئی ہے پاپا سے۔ وہ ٹھیک ہیں۔" وہ عفت کو تسلی دینے کی خاطر بتانے لگی۔
"اور دانی۔ دانی۔ وہ ٹھیک ہے نا۔ وہ ساتھ ہے نا تمہارے پاپا کے؟" وہ بے قراری سے بولی۔
مثال لمحہ بھر کو بالکل خاموش ہو گئی۔ اگر اس نے سچ بتا دیا کہ پاپا نے دانی سے متعلق اس کے سوال کا جواب نہیں دیا تو عفت اس پر چیخنے لگے گی۔
"ماما! ٹھیک ہے، آپ پلیز اتنی ٹینشن نہیں لیں، پاپا آ رہے ہیں تھوڑی دیر میں۔ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔" وہ نرم لہجے میں عفت کے پاس بیٹھ کر اسے تسلی دینے لگی۔
"ماما! آپ تو یہ دیکھیے، پاپا نے آپ کی کال ریسیو کی نہ میری، لیکن مثال آپی کی کال فوراً" لے لی۔ آخر وہ ہمیں کچھ سمجھتے بھی ہیں یا نہیں۔ پتا نہیں کب ہمیں دوسرے درجے کے شہری سے آگے کچھ سمجھا جائے گا۔" عفت

جو مثال کے ساتھ بہتر محسوس کر رہی تھی' پری کے کہنے پر طنز بھری نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

"ایسی باتوں کا شکوہ کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ جسے کوئی کچھ سمجھتا نہیں۔ چھوڑو اب ان باتوں کا گلہ کرنا' جو تمہاری مثال آپی ہیں' وہ تم یا دانی کبھی نہیں ہو سکتے۔"

مثال ساکت سی بیٹھی رہ گئی۔

اسی وقت باہر گاڑی رکنے اور گاڑی کا دروازے کھلنے اور دوسرے لمحے ڈور بیل بجنے کی آواز آئی۔

"پاپا آگئے!" پری سب کچھ بھلا کر تیزی سے گیٹ کھولنے کے لیے باہر بھاگی تھی۔

اور دوسرا لمحہ عفت کے ساتھ مثال کے لیے بہت حیرت انگیز اور پریشان کن تھا۔ پری کے ساتھ وقار اور فائزہ مسکراتے ہوئے پھول اور کیک لیے اندر آ رہے تھے۔

مثال ایک دم سے کھڑے ہو کر انہیں سلام کرنا بھی بھول گئی۔ فائزہ نے خود ہی آگے بڑھ کر اسے گلے سے لگا کر پیار کرنا شروع کر دیا۔

عفت کو خود کو سنبھالنے میں کچھ ہی وقت لگا تھا۔

"ہم یہاں سے گزر رہے تھے تو سوچا آپ لوگوں سے ملتے چلیں بلکہ بھابھی! سچ کہوں تو یہاں سے گزرتے ہوئے' اپنی مثال بیٹی کو دیکھے بغیر جانا اچھا نہیں لگا' اس لیے بغیر بتائے آگئے۔ آپ کو برا تو نہیں لگا؟" فائزہ مثال کو پیار کرنے سے فارغ ہو کر خوشگوار لہجے میں آنے کی وجہ بتانے لگی۔

"آپ کا اپنا گھر ہے' جب چاہیں آئیں۔ اطلاع دینے کی بھی کیا ضرورت ہے۔" عفت بظاہر سنبھل کر بولی۔

"کوئی بھی مصیبت کب اطلاع دے کر آتی ہے۔" وہ دل میں جل کر بولی تھی۔

"عدیل بھائی کہاں ہیں؟ کیا آفس سے نہیں آئے ابھی تک۔" وہ ادھر اُدھر دیکھ کر کچھ گھر کی خاموش پریشان فضا سے کچھ اخذ کرتے ہوئے بولی۔

"ٹائم تو نہیں ہے اب آفس کا۔" وقار گھڑی دیکھتے ہوئے بولے۔

"جی آگئے تھے آفس سے تو۔ ایک کام سے باہر گئے ہیں۔ ابھی آتے ہوں گے۔ آپ آئیں اندر ڈرائنگ روم میں بیٹھتے ہیں۔ پری کال کرو بیٹا! پاپا کو ذرا جلدی گھر آجائیں۔" عفت انہیں یہاں سے ہٹانا چاہ رہی تھی۔

"ارے بھابھی! تکلف نہیں' ہمارا اپنا گھر ہے۔ ہم یہیں ٹھیک ہیں۔" وقار وہیں رکھی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھتے ہوئے اپنائیت بھرے لہجے میں بولے۔

عفت کو اور بھی پریشانی لاحق ہو گئی۔ اگر ابھی عدیل آگئے دانی کو لے کر تو بڑا مسئلہ ہو جائے گا اور اس بات کا ملبہ بھی مجھ پر ڈالا جائے گا کہ میں نے جان بوجھ کر ان لوگوں کو یہاں بٹھا دیا۔

وہ پریشان ہوتے ہوئے کچھ سوچ رہی تھی۔

"آنٹی' انکل پلیز آپ اندر آجائیں۔ یہاں ٹھنڈ ہے اور پھر پاپا بھی آتے ہی خفا ہوں گے کہ آپ کو یہاں راستے میں کیوں بٹھا دیا۔ آجائیں پلیز۔"

مثال بے تکلفی سے فائزہ کا ہاتھ پکڑ کر انہیں اندر لے جانے لگی۔ وقار نے فائزہ کو اشارہ کیا اور دونوں اندر چلے گئے۔

"دیکھا آپ نے آپی کو کس چالاکی سے انہیں اندر لے گئی ہیں' اوپر اوپر سے ڈرامے کر رہی ہے کہ اس رشتے سے خوش نہیں ہیں اور اندر سے۔" پری ان کے جاتے ہی دھیمی آواز میں بولی۔

"جانتی ہوں میں۔ کس ماں کی بیٹی ہے۔" عفت بڑبڑا کر اندر چلی گئی۔



اگر میرے نصیب میں نہیں تھیں تو مجھے ملیں کیوں۔ واثق کو لگتا تھا اب اس کی ہر رات اسی طرح کے گلے شکوے کرتے گزرے گی۔

وہ پھر سے مثال کے ادھورے اسکیچز نکال کر بیٹھا تھا اور شام غم بنا رہا تھا۔

"کیا کروں مثال میں کہ تم میری ہو جاؤ۔" وہ یک ٹک ایک ہی تصویر کو جس میں اس کے چہرے کا بایاں رخ اس کے ریشمی بالوں میں چھپا ہوا تھا' دیکھے جا رہا تھا۔

"اور یہ وردہ بے وقوف لڑکی۔" اسے خیال آیا۔ "لیکن نہیں صرف وردہ بے وقوف نہیں وہ لڑکی پری... اس کے انداز اس کے دیکھنے کا طریقہ۔ وہ جس طرح مجھ سے بے تکلف ہو رہی تھی۔"

واثق کے دماغ میں پری کے چہرے کی خوشی اور آنکھوں کی چمک گردش کرنے لگی۔

"کچھ نہ کچھ گڑبڑ ضرور ہے۔ یہ کیڑا صرف وردہ کے دماغ میں نہیں ہے' اس لڑکی کے دل میں بھی کہیں موجود ہے۔ اور وہ مثال کی سوتیلی بہن۔" وہ ٹھٹک سا گیا تھا۔ "نہیں مجھے اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں سوچنا بلکہ مجھے اس لڑکی سے ملنے میں اب احتیاط کرنا ہوگی۔" وہ مثال کو سوچتے سوچتے کچھ اور ہی سوچنے لگا تھا۔

"مجھے وردہ کو بھی سختی سے منع کرنا ہو گا کہ وہ لڑکی دوبارہ یہاں نہیں آئے۔" وہ دل میں فیصلہ کرنے لگا۔

"لیکن نہیں۔ اس طرح تو وردہ کو بھی شک ہونے لگا کہ شاید میں اس میں انوالو ہوں۔ اور اس پری کو بھی۔" اسے دوسری سوچ نے ٹھٹکایا۔

"کیا بات ہے واثق! میں تمہیں کھانا دے کر گئی۔ ابھی تک ویسے ہی رکھا ہے' تم نے کھایا کیوں نہیں؟" عاصمہ نے اندر آتے ہوئے پوچھا تو اس نے آہستگی سے الماری کا پٹ بند کر دیا اور پیچھے ہٹ کر خود کو مصروف ظاہر کرتے ہوئے دراز میں کچھ ٹٹولنے لگا۔

"واثق! کیا بات ہے بیٹا! تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟"

"جی امی! آئی ایم فائن۔ بس دل نہیں چاہ رہا تھا اس لیے نہیں کھایا۔ آپ یہ گرما گرم چائے دے دیں۔ اس کی سخت طلب ہو رہی تھی اور پلیز امی! آپ اب یہ چھوٹے چھوٹے کام وردہ سے کروایا کریں۔ اسے بھی کچھ کام کی عادت ہو۔ دوسرے آپ کو تھوڑا ریسٹ کرنا چاہیے۔"

وہ اس کے ہاتھ سے چائے کا کپ لیتے ہوئے نرمی سے بولا۔

"ابھی اسے کام کرنے کی عادت کہاں ہے' پھر پڑھائی کا بھی بوجھ ہے۔ میں چاہتی ہوں وہ ابھی صرف اپنی پڑھائی پر فوکس کرے۔"

"پھر بھی امی! اسے تھوڑا کام میں ڈالیں یہ آپ کے لیے ضروری ہے۔" وہ پھر سے بولا۔ عاصمہ کسی اور ہی دھیان میں گم تھی۔

"واثق!" وہ کچھ دیر بعد بولی۔

"جی امی!" وہ اس کے انداز پر کچھ چونکا۔

"ایک بات کہوں اگر تم وعدہ کرو کہ اس بات پر ٹھنڈے دل سے غور کرو گے۔ فوراً" غصہ نہیں کرو گے۔"

واثق کچھ چونک کر ماں کی طرف دیکھنے لگا۔ یقیناً کوئی اہم بات تھی؟

"پلیز امی! آپ جانتی ہیں' میں بلاوجہ غصہ نہیں کرتا۔" وہ جیسے ماں کو یاد دلاتے ہوئے بولا۔

"میں جانتی ہوں۔ میرا بیٹا کتنا سمجھدار ہے۔" وہ کچھ اوپرے پن سے بولی تھی۔ واثق کو یہی لگا۔

"واثق! وردہ کی بات میں وزن ہے۔ وہ لڑکی پری مجھے بھی اچھی لگی ہے۔ بے شک تمہارے ساتھ اس کا عمر کا کچھ فرق بیٹا لیکن..." وہ اٹک اٹک کر کہہ رہی تھی۔

"فار گاڈ سیک امی! آپ تو ایسی بات نہیں کہیں۔" وہ بری طرح سے جیسے ہرٹ ہوا تھا۔
"واثق! پری نہ سہی، کچھ دنوں، کچھ مہینوں بعد تو تمہیں ایسی کسی بات کے بارے میں سوچنا ہے میری جان! کیونکہ بہرحال شادی تو تمہاری مجھے کرنی ہے۔ تو پھر پری اس لحاظ سے بہترین آپشن ہوگا۔" وہ سمجھاتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ اور واثق کو لگ رہا تھا جیسے کوئی اس کو کسی اندھیرے غار کی طرف دھکیل رہا ہو۔
"واثق! تم سن رہے ہو ناں۔" اسے ساکت بیٹھا دیکھ کر وہ اسے ہلا کر بولی۔
"امی پلیز! مجھے بہت کام کرنا ہے۔ آپ بھی جا کر اب ریسٹ کریں۔ دوا لے لی تھی آپ نے؟" وہ موضوع کو صاف ٹالتے ہوئے کہہ رہا تھا۔
"واثق۔ کیا تم نے میری بات سنی نہیں ابھی جو میں نے تم سے کہی؟" وہ کچھ خفگی سے پوچھ رہی تھی۔
"سن لی ہے۔" وہ سنجیدگی سے بولا۔
"پھر تم نے جواب کیوں نہیں دیا۔" وہ اسی خفگی سے بولی۔
"آپ کو شاید میرا جواب اچھا نہیں لگے۔" وہ جتا کر بولا۔ عاصمہ اسے دیکھتی رہ گئی۔ کچھ دیر خاموش رہی، شاید اسے سمجھانے کے لیے الفاظ سوچتی رہی۔
"واثق! تم جانتے ہو ناں مثال کی انگیجمنٹ ہو چکی ہے۔ تم نے خود مجھے بتایا تھا نا!" وہ اسے یاد دلاتے ہوئے کہہ رہی تھی۔
"امی! آپ جو کہنا چاہتی ہیں اس میں کچھ بھی ایسا نہیں، جو میرے لیے کچھ خاص ہو۔ مثال میری قسمت میں نہیں۔ میں جانتا ہوں۔ اس سے آگے مجھے کیا سوچنا ہے، کیا کرنا ہے۔ میں کچھ بھی طے نہیں کر سکا اور فی الحال کچھ مہینے طے کرنا بھی نہیں۔ کیا آپ مجھے اتنا ٹائم دیں گی؟" وہ کچھ ٹوٹے ہوئے لہجے میں کہہ رہا تھا۔ عاصمہ کو لگا جیسے اس کے دل کو بھی کچھ ہونے لگا ہے۔
اس کا اتنا پیارا، سلجھا ہوا، سمجھدار بیٹا۔ دل کے معاملے میں پہلے ہی قدم پر ٹھوکر کھا بیٹھا تھا۔
"بالکل واثق! تم جتنا چاہو، ٹائم لو، مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن بیٹا! تم جب بھی سوچو پری، بہت پرفیکٹ ہے، تم سمجھ رہے ہو ناں!" وہ اپنی پسند ڈھکے چھپے انداز میں اس پر ظاہر کر رہی تھی۔
"امی! مثال کے بعد پری اگر دنیا کی آخری لڑکی بھی ہوگی تو بھی، میں اس کے بارے میں سوچنا بھی پسند نہیں کروں گا۔ میں ساری زندگی شادی کے بغیر رہ سکتا ہوں، لیکن پری کے بارے میں قطعاً" نہیں سوچ سکتا۔ آپ آئندہ مجھ سے اس لڑکی کے بارے میں کبھی کوئی بات نہیں کیجئے گا۔"
وہ اتنے حتمی اور ٹھوس لہجے میں کہہ رہا تھا کہ لمحہ بھر کو عاصمہ بھی جیسے گنگ سی رہ گئی۔
"اتنے سخت لہجے میں انکار کی وجہ پوچھ سکتی ہوں۔" وہ کچھ ناگواری سے بولی۔
"کیا مجھے وجہ بھی بتانی ہوگی؟" وہ الٹا ناراضی سے پوچھنے لگا۔
"واثق!" وہ خفگی سے بولی۔
"امی پلیز! آپ ورده کو سمجھائیے گا۔ آئندہ وہ مجھے اس معاملے میں پریشرائز نہیں کرے گی۔ مجھے بالکل بھی یہ بات پسند نہیں۔ مجھے ایک ضروری کال کرنی ہے۔ ایکسکیوزمی۔" کہہ کر فون اٹھا کر کوئی نمبر ملانے لگا۔ عاصمہ اسے دیکھتی رہی، پھر اندر چلی گئی۔



"عدیل!" عفت زور سے چیخی تھی اور باہر کھڑی مثال جو ان کے لیے چائے لے کر آرہی تھی۔ وہیں ٹھٹک کر رہ

گئی۔

"چلاؤ مت۔ میں نہ صرف چلا سکتا ہوں بلکہ بہت کچھ کر سکتا ہوں۔ جس طرح تمہارے لاڈلے کو میں اتنا ذلیل ہو کر حوالات سے لایا ہوں۔ میرا دل چاہ رہا تھا' میں وہیں کسی گاڑی کے نیچے خود کو ختم کرلوں۔ ایسی رسوائی کا میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔" مثال نے کبھی عدیل کو اس طرح چیختے ہوئے نہیں سنا تھا' سوائے اس دھندلی یاد کے جب اس نے بشریٰ کو چلاتے ہوئے طلاق دی تھی۔

"اس نے جو کچھ کیا' وہ سب بعد میں بتانا' ابھی صرف یہ بتایئے یہ لڑکا کیا آپ کی اولاد نہیں ہے۔" عفت اس کے چیخنے پر خوف زدہ ہونے کے بجائے اور بھی تندی سے بولی تھی۔

"تمہارا دماغ انہیں وسوسوں نے خراب کردیا ہے۔ تم نے کبھی دھیان نہیں دیا کہ تم ان بچوں کی پرورش کیسے کررہی ہو۔ ایک ہی بیٹا جس کا تمہیں زعم تھا عفت! تم سے وہ نہیں سنبھالا گیا۔ سولہ سال کی عمر میں وہ چوریاں کرنے لگا ہے۔ اس نے تین لڑکوں کے ساتھ مل کر گینگ بنا رکھا ہے اور آج کی واردات اس کی پہلی واردات نہیں تھی۔" عدیل کا بولتے ہوئے جیسے سانس پھولنے لگا۔

اور عفت اسے دیکھتی جارہی تھی۔

"لڑکیوں کے پرس چھیننا' ان سے ملنے والی چیزوں سے انہیں بلیک میل کرنا اور نہ جانے کیا کیا۔۔۔ ایک لمبی فہرست تھی الزامات کی اس پر اور ان تین لڑکوں پر۔" عدیل بولتے بولتے ہانپ گیا۔

"اگر ایف آئی آر درج ہوجاتی' اگر ڈی ایس پی میرا واقف کار نہیں نکلتا' اگر میں ان کی منت نہیں کرتا تو تمہارا بیٹا۔۔۔ چلو۔ میری اولاد' آج سے لے کر کتنے مہینوں کے لیے جیل میں پڑجاتا' تم سوچ سکتی ہو۔"

وہ نڈھال بیڈ پر گر گیا تھا۔

"تم سے ایک بیٹا نہیں سنبھالا گیا۔"

"صرف میری ذمہ داری نہیں ہے' بچوں کی پرورش۔"

"یہ کہنا چاہتی ہو کہ میں ایک غیر ذمہ دار باپ ہوں۔ ہاں ٹھیک کہا تم نے۔ مجھے بھی تھانے جاکر ایسا ہی لگا کہ میں ایک انتہائی غیر ذمہ دار باپ ہوں' جس کا جوان ہوتا بیٹا گندے کاموں میں ملوث اور مجھے کسی بات کی خبر نہیں۔"

عدیل کو لگ رہا تھا جیسے وہ سو سال کا ہوگیا ہو ان چند گھنٹوں میں۔

"اور آپ کے خیال میں ہمیں نے فائزہ اور وقار بھائی کو فون کرکے بلایا۔ آپ اور کتنے بدگمان ہوں گے مجھ سے۔" عفت بھی سر پکڑ کر رونے لگی۔

"میں جیسی بھی سہی عدیل! مثال کی سوتیلی ماں سہی' مگر ایک بیٹی کی ماں تو میں بھی ہوں۔ کبھی تو مجھے بھی سمجھنے کی کوشش کریں۔" عفت کا دل چاہ رہا تھا دھاڑیں مار مار روئے۔

آج اسے لگ رہا تھا' جیسے اتنے سارے سال اس نے یونہی عدیل کی رفاقت میں گنوا دیے۔ اس کے ہاتھ میں تو کچھ بھی نہیں تھا۔

نہ عدیل کی وفاقت' نہ اس کی محبت' اس کا اعتبار اور آج اولاد کی طرف سے ملنے والا یہ گھاؤ۔ وہ تو جیسے سراسر خسارے میں تھی۔

"وہ دونوں خود آئے تھے۔ میں کیوں بلاتی انہیں۔" وہ شکست خوردہ سی کہہ رہی تھی۔ "آپ نے بات کی دانی سے۔ کیا سمجھایا اسے۔" کچھ دیر کی خاموشی کے بعد اسے پھر خود ہی بولنا پڑا۔

"تمہارے خیال میں میں اتنی دیر اور کیا کرتا رہا' اسے سمجھاتا رہا اور پوچھتا رہا کہ میں نے اسے کب کسی چیز کی کمی کی ہے' کب اسے محرومیاں دی ہیں' اسے کچھ بھی چاہیے ہوتا تھا میں نے دیا تو ہے۔" عدیل صدمے سے

چور تھا۔
"آپ سے الگ، جو بھی وہ مجھ سے کہتا' میں بھی تو مانتی تھی۔" وہ بھی آہستگی سے بولی۔
"میں نے تو ہمیشہ اس کے دوستوں کا بھی پیار رکھا۔ معلوم نہیں کہاں چوک ہو گئی۔"
"اب کیا کرنا ہے؟" کچھ دیر بعد وہ پھر عدیل سے آگے کا لائحہ عمل جاننا چاہ رہی تھی۔
"میں کیا بتاؤں۔ ہر طرح سے سمجھا چکا ہوں۔ قسمیں کھاتا ہے۔ وعدے کرتا ہے اور پھر کوئی نہ کوئی ایسی حرکت۔۔۔ مجھے اس کا کوئی حل سمجھ میں نہیں آ رہا۔ معلوم نہیں اللہ مجھے کس گناہ کی سزا دے رہا ہے ایسی اولاد دے کر' جو مجھے صرف اذیت دینا جانتی ہے۔" عدیل کا ٹوٹا ہوا لہجہ کسی کرب کی مانند مثال کے دل میں اترا تھا' وہ آہستگی سے مڑ گئی۔
"پتا نہیں کس گناہ کی خدا مجھے سزا دے رہا ہے ایسی اولاد دے کر جو مجھے صرف اذیت دینا جانتی ہے۔"
مثال کے کانوں میں بار بار عدیل کا کرچی کرچی لہجہ گونج رہا تھا۔
"میرے پاپا دنیا کے سب سے اچھے پاپا ہیں۔ سب سے بہادر' سب سے زیادہ ہمت والے۔" اسے یاد آیا۔ نرسری میں وہ اپنی فرینڈ کے ساتھ محبت سے اپنے پاپا کے متعلق اسی طرح کے جملے بولا کرتی تھی۔ آج اس کے بہادر پاپا اپنی اولاد کی وجہ سے اپنے گناہ شمار کر رہے تھے۔
"نہیں! میں اپنے پاپا کو اب کوئی دکھ نہیں دوں گی۔" اس نے بستر پر لیٹنے سے پہلے فیصلہ کر لیا۔
"اور ماما سے اچھے تو پاپا ہیں نا۔ انہوں نے اس وقت مجھے قبول کیا' جب ماما نے اس احسن کمال کے سامنے بھی میرے حق میں ایک لفظ نہیں بولا' صرف اپنے گھر کو بچانے کے لیے انہوں نے اس کمینے سیفی کو ایک بھی گالی نہیں دی۔"
اسے جانے کیا کچھ یاد آنے لگا تھا۔ اسی وقت اس کا سیل فون بجنے لگا۔
واثق کی کال تھی۔ وہ سوچ میں پڑ گئی۔
"کیا تم مجھے یاد کر رہی تھیں؟" وہ اس سے پوچھ رہا تھا۔
"نہیں۔" وہ رکھائی سے بولی۔
"ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔" وہ دعوے سے بولا۔
"کیا مطلب؟" وہ چونکی۔
"یار ایسا ہو نہیں سکتا کہ ایک آدمی جس کا دل اسے بتائے کہ دوسرا شخص اس کو مس کر رہا ہے' وہ سارے کام چھوڑ کر اسے کال کرے۔ سو میں نے بھی ایسا ہی کیا۔"
"آپ کی باتیں بہت عجیب سی ہوتی ہیں۔" وہ کچھ بھی نہیں سمجھی تھی' سو یونہی کہنے لگی۔
"تم پریشان ہو مثال؟" وہ رک کر پوچھ رہا تھا۔
"نہیں تو۔" وہ جلدی سے بولی۔
"پلیز تم مجھ سے جھوٹ بولنا بند کر دو۔" وہ اسے ٹوک کر بولا۔
"میں جھوٹ نہیں بول رہی۔" وہ آہستگی سے بولی۔
"تم بول رہی ہو۔" وہ اسی لہجے میں بولا۔
"واثق! میں نے فیصلہ کیا ہے۔" وہ آہستگی سے بولی۔
"میں سن رہا ہوں۔ تم کہو۔" وہ ہمہ تن گوش تھا۔
"میں اب اپنے پاپا کو کبھی کوئی دکھ نہیں دوں گی۔" وہ جذباتی لہجے میں بولی۔ واثق کچھ لمحے خاموش رہا۔

"مثال! میرے خیال میں تم نے پہلے بھی اپنے پاپا کو کبھی کوئی دکھ شعوری طور پر نہیں دیا۔ جتنی کہانی تم نے مجھے اپنی سنا رکھی ہے، جو کچھ بھی غلط ہوا، کبھی بھی تمہاری وجہ سے نہیں ہوا۔" وہ اسے کسی اور ہی طرح سے روشنی میں لا رہا تھا۔

"ہاں، لیکن جس کی وجہ سے بھی ہوا، پاپا تو ہرٹ ہوئے اور واثق! میں نے اپنے پاپا کو۔ ماما سے سپریشن کے بعد کبھی بھی کھل کر ہنستے، خوش ہوتے نہیں دیکھا۔" وہ اس وقت بہت حساس ہو رہی تھی۔

"تم ان کے لیے کیا کرنا چاہتی ہو، تمہارے ذہن میں کچھ ایسا ہے، جس سے وہ واقعی خوش ہو جائیں۔" وہ اس کے ارادے جاننا چاہ رہا تھا۔

"ہاں میں نے سوچ لیا ہے، شام میں فائزہ آنٹی اور انکل آئے تھے فہد کے پیرنٹس۔ فہد اسی مہینے آ رہا ہے پاکستان۔ وہ فوراً" شادی کرنا چاہیں گے اور...."

"اور تم اس شادی کے لیے اب راضی ہو۔ اب اپنے پاپا کو انکار نہیں کروگی۔ اس سے انہیں خوشی ملے گی۔" وہ اسے ٹوک کر بولا۔

"ہاں بالکل! میں نے یہی سوچا ہے۔" وہ جوش سے بولی۔

"اور تمہیں کیا ملے گا۔ یہ بھی تم نے سوچ لیا ہے۔" وہ کچھ جتا کر کہہ رہا تھا۔

مثال کچھ بول نہیں سکی۔

"سو جاؤ۔ کافی رات ہو گئی ہے۔ رات کے ارادے اور فیصلے دن کی روشنی میں اکثر کمزور پڑ جایا کرتے ہیں ہم کل بات کریں گے۔ خدا حافظ۔" اس نے جتانے والے انداز میں کہہ کر فون بند کر دیا۔

مثال اس کی بات لے کر سوچتی رہی اور جانے کب نیند کی وادی میں اتر گئی۔



وردہ کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔

یہ اتنی بے یقینی کی بات تو نہیں تھی.... لیکن نہیں.... تھی! بس اس نے بھی سوچ لیا تھا کہ یہ بات اب وہ کہیں بھی نہیں دہرائے گی اور نہ کسی سے کہے گی۔ کیوں کہ اس کی وجہ سے اس کا بھائی اس سے خفا تھا۔

مگر یہ بات کس طرح "دسفر" کرے گی۔ اسے یہ اندازہ نہیں تھا۔

"میں خود نہیں جانتی وردہ! لیکن میرا دل.... جب سے میں تمہارے گھر سے آئی۔" پری بہت الجھی ہوئی تھی۔ رک رک کر بول رہی تھی جیسے اسے اپنے جذبات کا اظہار کرنا نہ آ رہا ہو۔

"میں رات بھر سو نہیں سکی۔ مجھے نہیں پتا یہ کیا ہے۔ محبت ہے یا.... میں ساری رات صرف تمہارے بھائی کے بارے میں سوچتی رہی۔ خواب میں بھی انہیں دیکھتی رہی وردہ! یہ کیا ہے؟"

وہ آنکھوں میں نمی لیے بس رو دینے کو تھی۔ اور وردہ کو لگ رہا تھا وہ بھی ابھی سب کے بیچ بیٹھی رو ہی پڑے گی۔ اتنی اچانک بات کا تو اس نے سوچا بھی نہیں تھا اور وہ پری کو کوئی دلاسہ بھی نہیں دے سکی۔ بس بے بسی سے دیکھتی رہی۔



"میں آج واثق سے کہہ دوں گی کہ ہم آئندہ کبھی آپس میں نہ ملیں گے نہ فون پر بات کریں گے۔ آج سے ہم دونوں کے راستے بالکل جدا ہیں۔ مجھے صرف پاپا کی خوشی میں خوش ہونا ہے۔ فہد یقیناً" اچھا ہوگا۔ فائزہ آنٹی اور انکل اتنے اچھے ہیں، مجھے اب کچھ اور نہیں سوچنا۔" وہ سوچتی ہوئی آ رہی تھی جب سامنے گاڑی میں بیٹھے شخص کو دیکھ کر وہ شاکڈ سی رہ گئی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

نور عباس



"ارے واؤ حریم! تمہاری رسٹ واچ کتنی خوب صورت ہے۔ کتنے کی لی؟" رائمہ نے حریم کے دودھیا بازو میں چمکتی گلابی رنگ کی خوب صورت گھڑی کو ستائشی نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا جس میں لگے سلور نگینے پوری آب و تاب سے چمکتے ہوئے گھڑی کی شان بڑھا رہے تھے۔

"پتا نہیں' اصل میں ہم سب لوگ کل پراہٹ گئے تھے نا تو واپسی پر مجھے یہ گھڑی پسند آگئی۔ میں نے ضد کی تو چاچو نے دلا دی۔ میں نے چاچو سے قیمت پوچھی تو انہوں نے کہا کہ میں آم کھاؤں گٹھلیاں نہ گنوں ویسے میرے خیال میں پندرہ سو سے اوپر کی ہے۔" اپنی کلائی میں پڑی نفیس سی گھڑی کو گھماتے ہوئے حریم نے لاپروائی سے کہا۔

"تم نے رسٹ واچ لینے کے لیے اپنے چاچو سے ضد کی۔ یار حریم! تم یہ سب کچھ کیسے کرلیتی ہو' میں تو کبھی سوچ بھی نہیں سکتی کہ میں اپنے چاچو یا تایا ابا سے کوئی فرمائش کروں۔ یقین کرو' عید شب رات پر بھی جب تایا ابا یا چاچو ہمیں عیدی وغیرہ دیں تو مجھے وہ ہی لینے میں اتنی جھجک ہوتی ہے کہ حد نہیں اور تم۔۔۔ امیزنگ!" اپنے سر کو دائیں بائیں ہلاتے رائمہ جی بھر کر حیران ہوئی۔

"ہیں واقعی؟" اس بار حیرت حریم کے چہرے پر تھی۔ "لیکن میں تو اپنے چاچو سے فرمائش کرتی ہوں بلکہ سچ بتاؤں تو مجھے پاپا سے بات کرنے میں دقت محسوس ہوتی ہے' لیکن میرے چاچو تو بہت بہت اچھے ہیں۔" حریم نے آنکھیں میچتے ہوئے کہا۔

وہ اکلوتے بھائی کی اکلوتی بہن تھی' جس وقت وہ ناعمہ بیگم کی گود میں آئی۔ فراز صاحب اپنی اکلوتی بہن کی شادی کر کے فارغ ہوئے تھے۔ فاران چاچو نے جو اپنی دوست نما بہن کے چلے جانے پر بے حد اداس تھے۔ ننھی سی شہزادی کے گھر آنے پر باقاعدہ لڈیاں ڈالی تھیں۔ مٹھائیاں تقسیم کیں۔ صبح شام اس کے نخرے اٹھائے جاتے۔ وہ حریم کا اتنا خیال رکھتے کہ حریم کا بڑا بھائی ایاز حقیقتاً "جیلس" ہو جاتا۔ یونیورسٹی سے واپسی پر وہ حریم کے لیے ڈھیروں چیزیں لے کر آتے۔ حریم کی باتیں' حریم کے کپڑے' حریم کے جوتے' حریم کی شرارتیں۔ حریم بڑی ہوئی' تب بھی ان کے پیار میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ حریم بھی اپنے والدین اور بھائی سے زیادہ فاران چاچو کے قریب تھی۔ اپنے رعب داب والے پاپا سے اسے ہمیشہ سے ڈر لگتا تھا۔

وہ اپنے سارے مسائل فاران چاچو سے بیان کرتی۔

"ٹیچر نے مجھے کم مارکس دیے ہیں۔"

"آج حرا نے اسکول میں مجھے مارا۔"

"مجھے فلاں سوٹ چاہیے۔"

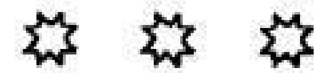
"میں نے فلاں ہوٹل سے چکن منچورین کھانا ہے۔"

اس کی یہ ساری فرمائشیں صرف فاران چاچو ہی پوری کیا کرتے تھے۔ کالج ٹرپ پر جانے کی اجازت اسے فاران چاچو نے دلوائی تھی۔ کیوں کہ فراز صاحب کو لڑکیوں کا ٹرپ پہ جانا پسند نہیں تھا۔

جس دن فاران چاچو کو ایک بہت بڑی ملٹی نیشنل کمپنی میں جاب ملی' وہ خوشی سے بے حال ہو گئی۔ کتنی محنت اور محبت سے اس نے اس خوشی کو منایا تھا۔ کیک' پھول' اس کے اپنے ہاتھ کی بنی بریانی اور خوشی



سے جھلملاتا چہرہ اس کی بے پایاں خوشی کو بڑی خوب صورتی سے بیان کر رہے تھے۔ فراز صاحب نے اپنے والدین کی وفات کے بعد اپنے بہن بھائی کو اپنی اولاد سے بڑھ کر چاہا تھا۔ اپنی شریک حیات کو باور کروایا تھا کہ وہ واقعی اپنے بہن بھائیوں کے ماں باپ ہیں اور ان کی شریک حیات نے بھی ان کے بہن بھائی کو اولاد سے کم نہیں سمجھا تھا۔



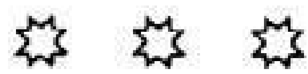
"کیا بات ہے حریم! کمرے میں اندھیرا کیوں کر رکھا ہے؟" لائٹ آن کر کے فاران بیڈ کے قریب آیا۔ "یہ دیکھو! میں تمہارے لیے تمہاری فیورٹ رس ملائی لے کر آیا ہوں۔" سر تک کمبل اوڑھے حریم کے قریب بیڈ پر بیٹھتے ہوئے انہوں نے ہاتھ میں پکڑا شاپر اس کے قریب رکھا۔

"ارے! طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری۔ آنکھیں کیوں لال ہو رہی ہیں؟" حریم کے متورم چہرے کو دیکھ کر فاران کا دل مٹھی میں آ گیا۔

"چاچو! دیکھیں نا ایاز کتنا بدتمیز ہے۔ کل کالج میں میرا اکنامکس کا ٹیسٹ تھا۔ ٹیسٹ میں میرے مارکس کم تھے تو میں نے پاپا کو نہیں بتایا۔ پتا نہیں کیسے میرا ٹیسٹ ایاز کے ہاتھ لگ گیا اور اس نے وہ ٹیسٹ پاپا کو دکھا دیا۔ آپ کو نہیں پتا چاچو! پاپا نے مجھے کتنا ڈانٹا ہے۔" وہ ایک بار پھر سے زور شور سے رونے لگی۔

"اچھا اچھا رونا بند کرو اور یہ رس ملائی کھاؤ۔ میں ابھی ایاز کی خبر لیتا ہوں۔" فاران نے اپنے کندھے پر ٹکا اس کا آنسوؤں سے تر چہرہ اوپر اٹھاتے ہوئے پیار سے کہا۔

"آئندہ تم نے ایسی فضول حرکت کی تو تمہاری خیر نہیں۔ چھوٹی بہن ہے تمہاری۔" تھوڑی دیر بعد فاران بھیگی بلی بنے ایاز پر گرج رہا تھا جو تھوڑی سی مزاحمت کے بعد خاموشی سے کھڑا اپنی عزت افزائی کروا رہا تھا جبکہ مزے سے رس ملائی کھاتی حریم مسکراتے ہوئے ایاز کی درگت بنتے دیکھتی رہی۔



"ہائے اللہ چاچو! مجھے تو یقین ہی نہیں آ رہا کہ آپ کی شادی ہو رہی ہے اور وہ بھی چھ ماہ بعد۔ سچ چاچو! چاچی اتنی پیاری ہیں اتنی پیاری ہیں کہ کیا بتاؤں۔ میں

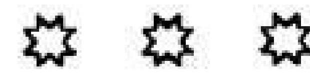
نے تو سوچ لیا ہے بری کے سارے جوڑے میں خود بناؤں گی۔ ایک سے بڑھ کر ایک خوب صورت اور چاچی کا میک اپ ہم شہر کے سب سے مشہور پارلر سے کروائیں گے اور ہاں آپا کی شادی میں تو میں لہنگا پہنوں گی اور ہاں چچی کا فوٹو سیشن ہم اسی پارلر سے کروائیں گے۔ وہ پیسے تو زیادہ لیتے ہیں لیکن تصویریں غضب کی آتی ہیں۔ ایسا کریں مجھے دس ہزار روپے ابھی پکڑا دیں۔ بعد میں یہ نہ ہو کہ شادی کے اخراجات میں یہ پیسے بھی کھپ جائیں۔" جوش سے بولتی بولتی حریم نے فاران کے سامنے اپنی ہتھیلی پھیلائی۔

"نہیں نہیں چاچو! اسے پیسے بالکل مت دیجئے گا۔ یہ کھانے پینے میں خرچ کر کے آپ کو ٹھینگا دکھا دے گی' پھر یہ نہ کہیے گا کہ پہلے بتایا نہیں تھا۔" دبلے پتلے سے ایاز نے قدرے چڑ کر کہا۔ وہ ایم بی اے کے آخری سمسٹر میں تھا' لیکن حریم سے اس کے تعلقات ویسے ہی تھے۔

"تم چپ رہو! یہ میری اور چاچو کی آپس کی بات ہے۔ جلدی پیسے دیں چاچو! ورنہ بعد میں نہیں لوں گی۔" حریم نے حسب عادت ابرو تان کر مصنوعی غصے سے کہا۔ وہ فاران سے یوں ہی پیسے نکلوایا کرتی تھی اور ایسے منہ بسورتی لڑتی جھگڑتی وہ فاران کو بہت پیاری لگتی تھی۔ بالکل کسی معصوم بلی کی طرح۔

"چاچو! حریم آپ سے بدتمیزی کر رہی ہے۔" ایاز نے بھڑکایا۔

"بھلا بہنوں اور بیٹیوں کی مان بھری فرمائشیں کبھی بدتمیزی ہو سکتی ہیں۔ حریم کی دھونس تو اس کا مان ہے' جسے وہ محبت سے جتاتی ہے اور پھر حریم کو تو میں انکار کر ہی نہیں سکتا۔۔۔" فاران نے حریم کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس کی پھیلی ہوئی ہتھیلی پر پیسے رکھے تو وہ ایاز کو زبان نکال کر چڑاتے ہوئے قہقہہ لگاتی کمرے سے باہر نکلی۔



"نہیں اس سال ہم یہ شادی کرنے کی پوزیشن میں بالکل نہیں ہیں۔ تم فاران کی ساس سے بات کرو ہم فاران کی شادی اگلے سال ہی کر پائیں گے۔" ڈھیروں رجسٹر کھول کر بیٹھے فراز صاحب نے کلکیولیٹر کو ایک طرف رکھتے ہوئے ناعمہ بیگم کو مخاطب کیا' جو عفرا کے دوپٹے پر بڑی مہارت سے گوٹا لگا رہی تھیں۔ حریم کی خواہش تھی کہ اس کے چچا کی بری میں کوئی کمی نہ رہے' سو گوٹے کے کام کا ایک جوڑا بنانا ضروری طے پایا۔

"نہیں۔۔۔ یہ یکایک آپ کو کیا ہوا۔ ابھی پچھلے مہینے ہی تو آپ نے کیٹرنگ کے سارے انتظامات کی پلاننگ کی ہے۔" آنکھوں سے عینک اتارتے ہوئے ناعمہ بیگم نے میرون رنگ کے شیفون کے دوپٹے کو گود میں رکھا۔

"کاروبار میں بڑا نقصان ہو گیا ہے۔ اوپر سے جس فیکٹری سے ہم مال لیتے تھے' وہ بھی مال دینے سے انکاری ہے۔ شادی میں کم از کم سات آٹھ لاکھ کا خرچ آئے گا۔ ایسی صورت میں نہ صرف ہم پر قرض چڑھ جائے گا بلکہ ہو سکتا ہے' کاروبار مکمل طور پر تباہ ہو جائے۔ اب تم ہی بتاؤ میں کیا کروں۔" پیشانی کو ملتے ہوئے فراز صاحب بے حد پریشان تھے۔

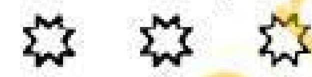
"تو فاران سے کہیں نا۔ اوپر والا پورشن بنانے پر اتنے پیسے لگا رہا ہے۔ آخر شادی بھی اسی کی ہے' اگر شادی کے انتظامات پر بھی پیسے خرچ کر لے گا تو اس میں حرج کیا ہے۔ آپ نے ساری زندگی اسے اپنے بچوں کی طرح سمجھا ہے اب اگر اس وقت منع کیا تو بڑی بدنامی ہو گی۔" ناعمہ بیگم نے سنجیدگی سے کہا۔

"بہت اچھا مشورہ دیا ہے تم نے مجھے۔ تم سے ایسی ہی بات کی توقع تھی۔ اگر میں نے فاران کو بیٹا سمجھا ہے تو اس نے مجھے بیٹا بن کر بھی دکھایا ہے۔ تم نے دیکھا نہیں کہ وہ ہمارے بچوں سے کتنی والہانہ محبت کرتا ہے۔ میری اور تمہاری کتنی عزت کرتا ہے اور ایاز کے ایم بی اے کا سارا خرچ میرے منع کرنے کے باوجود اپنے کندھوں پر اٹھا رکھا ہے۔ اگر ایاز کی شادی کے

وقت ایسے حالات ہوتے تو کیا تم مجھے ایسا مشورہ دیتیں۔ خیر یہ لمبی بحث ہے۔ شادی اپنے مقررہ وقت پر ہی ہوگی۔ میں گاڑی بیچ رہا ہوں اور ہاں تم کل صبح گھر پر موجود زیورات مجھے دے دینا۔ ان ہی کو تڑوا کر نئے ڈیزائن میں بنوالیں گے۔ نیا زیور بنوانے کی گنجائش بالکل نہیں ہے۔" ایک فیصلے پر پہنچ کر فراز صاحب مطمئن ہو چکے تھے۔

"لیکن وہ زیور تو حریم کے ہیں۔ اگر اپنی ساری جمع پونجی اسی شادی پر خرچ کردیں گے تو ہمارے پاس کیا رہ جائے گا۔"

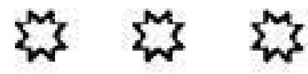
"یہ زیورات اسی لیے ہیں نا کہ ہماری اولاد کے کام آئیں۔ فاران کا درجہ ہماری اولاد سے کم تو نہیں حریم کے لیے اور بن جائیں گے اور ہاں اب جلدی سے اپنا کام سمیٹ کر لائٹ آف کرو۔ مجھے صبح گاڑیوں کے شوروم بھی جانا ہے اور جیولر کی شاپ پر بھی۔" فراز صاحب نے کیلکولیٹر اور سارے رجسٹر بند کر کے رکھتے ہوئے کہا۔ ناعمہ بیگم دل ہی دل میں تلملا کر رہ گئی تھیں۔ جانتی تھیں کہ ان کی تلملاہٹ ظاہر ہوتی تو فراز صاحب کا آسمان کو چھوتا غصہ اور ناراضی برداشت کرنی پڑے گی۔ سو بڑی بے دلی سے چیزیں سمیٹتے ہوئے انہوں نے اپنے آپ کو کوسا۔ کاش وہ شادی ایک سال لیٹ کردینے والی بات مان لیتیں تو شاید گاڑی اور زیور بچ جاتے مگر اب تیر کمان سے نکل چکا تھا۔



"نہیں حریم! دلہن کے لہنگے کے لیے میں تیس ہزار سے زیادہ نہیں دے سکتا گنجائش ہی نہیں ہے۔" فراز صاحب نے پانچ پانچ ہزار کے چھ نوٹ حریم کی طرف بڑھاتے ہوئے قطعیت سے کہا۔

"مجھے کچھ نہیں معلوم پاپا! مجھے عفرا چچی کے لیے جو لہنگا پسند آیا ہے وہ چالیس ہزار کا ہے اور مجھے وہی لینا ہے۔" خلاف معمول فراز صاحب سے بات کرتے ہوئے حریم کا لہجہ ضدی تھا' جہاں بات فاران چاچو کی ہو وہ ایسے ہی پرجوش ہو جایا کرتی تھی۔

"اب بس بھی کرو نا حریم! تمہارے پاپا کہہ تو رہے ہیں کہ ان کے پاس پیسے نہیں ہیں۔ اب جلدی سے چلو بازار میں ویسے ہی رش ہوتا ہے۔ اوپر سے رکشے ٹیکسیوں کے دھکے کھانے میں آدھا دن تو یوں ہی نکل جاتا ہے۔" ناعمہ بیگم نے چادر اوڑھتے ہوئے غصے سے کہا۔ گاڑی بک جانے کے بعد وہ کہیں آتے جاتے ہوئے ایسے ہی برہم ہو جاتی تھیں۔ حریم نے بے بسی سے سر جھکاتے ہوئے طوعاً کرہاً پیسے پکڑے تھے۔



"ایک تو تمہارے ابو کا دماغ پہلے ہی اپنے بہن بھائیوں سے آگے کچھ نہیں سوچتا' رہی سہی کسر تم بہن بھائی نے پوری کردی ہے۔ میں نے تمہارے پاپا سے اتنے مشکل سے تمہاری شاپنگ کے لیے پندرہ ہزار روپے الگ سے لیے تھے اور تم اپنی شاپنگ چھوڑ چھاڑ ضد کر بیٹھیں کہ دلہن کا لہنگا چالیس ہزار کا ہی لیں گی۔ تمہاری شاپنگ کے سارے پیسے بھی دلہن کا لہنگا خریدنے میں لگ گئے اور شہزادی صاحبہ خوش خوش واپس آگئیں۔ اب پرانے کپڑے پہننا اور ماں باپ کو جی بھر کر ذلیل کروانا۔" ناعمہ بیگم تو جیسے جلتے توے پر بیٹھی ہوئی تھیں۔

"کچھ نہیں ہوتا ماما! آپ اپنا غصہ تھوک دیں۔ میں شادی میں سب سے خوب صورت اور اسٹائلش کپڑے پہنوں گی۔ بس میں نے سوچ لیا ہے کہ حبہ آنٹی کی پانچ عدد بیٹیوں کو تگڑی فیس پر ٹیوشن پڑھاؤں گی۔ میری شاپنگ بھی ہو جائے گی اور حبہ آنٹی کی پرانی شکایت بھی دور ہو جائے گی کہ میں نے ان کے اتنے اصرار کے باوجود ان کی بیٹیوں کو پڑھانے کی ہامی نہیں بھری۔" ہلکے پھلکے انداز میں کہتے ہوئے حریم نے ناعمہ بیگم کے گلے میں بانہیں ڈالی تو وہ غصے سے پاؤں پٹختے ہوئے چلی گئیں۔

"لیکن تمہیں تو ٹیوشن پڑھانا کبھی پسند نہیں رہا اور حبہ آنٹی کی نالائق بیٹیوں کو پڑھانا تو ناپسندیدہ ترین۔"

ایاز نے چپ چاپ بیٹھی حریم کو پکارا تو وہ جیسے ہوش میں آئی۔

"کیا کریں بھیا! مجبوری ہے۔" حریم لہنگے کو ڈبے میں سے نکالتے ہوئے مسکرائی۔ "ویسے بھی دو مہینے کی تو بات ہے' میں نے کون سا ساری زندگی ٹیوشن پڑھانی ہے۔ اچھا چھوڑو' یہ بتاؤ کہ یہ لہنگا کیسا ہے۔ عفرا آپی پر اچھا لگے گا نا؟" حریم نے نارمل سے انداز میں کہتے ہوئے دوپٹا اپنی گود میں پھیلایا تو جھلملاتے دوپٹے کو دیکھ کر ایاز بھی تعریف کیے بغیر رہ نہیں سکا۔

☼ ☼ ☼

"یہ لیں چچی! کھیر کھائیں۔" حریم نے بلوریں پیالے میں ڈالی ہوئی کھیر عفرا کی طرف بڑھائی۔

"تھینک یو سو مچ حریم! کھیر واقعی بہت مزے کی تھی۔ میں نے تو دو دفعہ کھائی تھی کل بھی۔ اب تو خوب ٹھنڈی ہو گئی ہے۔ مزا آئے گا' میں ابھی چمچہ لے کر آتی ہوں۔" پیالے کی ٹھنڈک محسوس کر کے عفرا اپنے آپ پر کنٹرول نہیں رکھ پائی تھی۔

"کیا ہوا حریم! تم کچھ پریشان نظر آ رہی ہو۔ ادھر آؤ میرے پاس بیٹھو۔" فاران حریم کے چہرے سے اس کی دلی کیفیت کا اندازہ لگا لیا کرتا تھا سو عفرا کے کمرے سے جانے کے بعد اس نے ہلکے سے پوچھا۔

"پاپا پچھلے دو تین دن سے بہت پریشان ہیں۔ نہ کھانا ٹھیک طرح سے کھاتے ہیں اور نہ ہی ہم سے کوئی بات کرتے ہیں۔ آپ کے سامنے ہی ٹھیک سے بات کرتے ہیں۔ آپ کے جانے کے بعد پاپا پھر ویسے ہو جاتے ہیں اداس اور خاموش۔ انہوں نے کل کھیر بھی نہیں کھائی' حالانکہ ان کی کتنی فیورٹ ہے' میں نے کئی بار ان سے پوچھنے کی کوشش کی ہے' لیکن وہ ہر بار ٹال جاتے ہیں' پلیز چاچو! آپ ہی ان سے بات کریں۔ مجھے نہیں لگتا کہ وہ آپ کے علاوہ کسی کو اپنے دل کی بات بتائیں گے۔"

حریم کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تو فاران حقیقتاً تڑپ اٹھا۔ جس وقت عفرا کھیر کا آدھا پیالا کچن میں ہی کھا لینے کے بعد کمرے میں داخل ہوئی۔ حریم کے سر کو پیار سے تھپتھپاتے ہوئے فاران دھیمی آواز میں اسے تسلی دے رہا تھا۔

عفرا کی آنکھیں شرارے لپکانے لگیں۔

☼ ☼ ☼

"اتنا سب کچھ ہو گیا اور آپ نے مجھے کچھ بتانا ضروری بھی نہیں سمجھا۔ اتنی تکلیف خود ہی سہتے رہے۔ اب آپ کو پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں' جو شخص مجھ جیسے جوان کماؤ بیٹے کا باپ ہو۔ اسے کاروبار کے ختم ہو جانے یا پھر دس پندرہ لاکھ کے مقروض ہو جانے پر اتنا پریشان ہرگز نہیں ہونا چاہیے۔ گھر کا خرچ میں خود ہی چلا لوں گا۔ ایاز کی پڑھائی بھی پوری ہونے والی ہے۔ ایک دو سالوں میں وہ بھی اپنے پاؤں پر مضبوطی سے کھڑا ہو جائے گا' بس اب آپ فکر مند نہ ہوں اور مجھے سارے بلز دے دیں' میں پے کر دوں گا اور ہاں کل آفس سے آ کر مہینے بھر کا راشن بھی لے آؤں گا۔"

فراز صاحب کے کانپتے ہوئے سرد وجود کو اپنی مضبوط بانہوں میں سمیٹے وہ بول رہا تھا۔ بالکل ویسے ہی جیسے اس کی ہر پریشانی ہر مسئلے کو فراز صاحب لمحوں میں اس کے وجود سے اتار پھینکتے تھے۔

☼ ☼ ☼

"بس کیا بتاؤں امی! میری تو ہنستی بستی زندگی اجڑ کر رہ گئی ہے۔ کیا کیا خواب سجائے تھے میں نے اتنے بڑے افسر کی بیوی بن کر خوب عیش کروں گی۔ ہزاروں کے ڈریسز۔ لاکھوں کی جیولری' لیکن میرے سارے خواب تو شادی کے بعد اپنی موت آپ ہی مر گئے۔ ان کے بھائی تو بزنس برباد کر کے چپکے سے بیٹھ گئے اور اب آپ کا داماد نہ صرف گھر کا پورا خرچ اٹھا چکا ہے بلکہ قرضہ اتارنے کے لیے کمیٹیاں بھی بھر رہا ہے۔"

"تنخواہ تو بہت اچھی ہے لیکن اتنے بڑے گھر کے بلز اور مہینے کا خرچ بہت زیادہ ہے۔ فاران کو اوپر کی

کمائی کا بھی کوئی شوق نہیں۔ سارا سارا دن نیچے فراز بھائی کے پاس بیٹھے تسلیاں ہی دیتے رہتے ہیں۔"

فون پر اپنی ماں سے بات کرتی عفرا جلے پیر کی بلی کی مانند پورے کمرے میں چکراتی پھر رہی تھی۔

٭ ٭ ٭

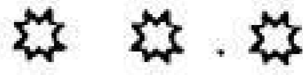
"دیکھیں فاران! مجھے آپ کی فراخ دلی بہت اچھی لگتی ہے اور میں آپ کے خاندان کی باہمی محبت کی دل سے قدردان بھی ہوں۔ آپ جتنا چاہیں اتنا وقت اپنی فیملی کو دے سکتے ہیں۔ لیکن میں بھی تو آپ کی ذمہ داری ہوں۔ اگر مناسب سمجھیں تو تھوڑا سا وقت مجھے بھی دے دیں۔"

عفرا نے آنکھوں میں آنسو بھرتے ہوئے ہولے سے کہا۔ اسے اپنی امی کی ہدایت پر عمل جو کرنا تھا۔ فاران کو اپنے بھائی اور ان کے بچوں سے اکیلے میں نہ ملنے دینا ہی حمیرا بیگم کی پہلی ہدایت تھی۔

"بھائی اور بچے بہت ڈسٹرب ہیں عفرا! انہیں میرے تسلی بھرے الفاظ کی ضرورت ہے۔ حالات تھوڑے ٹھیک ہو جائیں۔ ہم پھر سے پہلے کی طرح لانگ ڈرائیو پر جایا کریں گے۔ ڈنر کریں گے اور میں تمہیں ڈھیر ساری شاپنگ بھی کراؤں گا۔ لیکن اس وقت مجھے دوراہے پر کھڑا کرنے کی کوشش مت کرو۔" فاران مضبوط لہجے میں بولا۔

"ارے نہیں۔ میرا وہ مطلب نہیں تھا۔ اچھا ایسا کرتے ہیں۔ کل سے آپ آتے ہی اوپر آجایا کریں پھر ہم دونوں مل کر نیچے جایا کریں گے اور مل کر سب کے ساتھ خوشیوں بھرا وقت گزارنے کی کوشش کیا کریں گے۔"

عفرا نے تیزی سے فاران کی بات کو اچک لیا اور پھر ہر شام عفرا فاران کے ہمراہ دو تین گھنٹے حریم کے پورشن میں گزارنے لگی۔ اس دوران وہ اپنی کم مائیگی کا رونا رو رو کر ان سب کو شرمندہ کرتی رہتی اور اسی شرمندگی کے زیر اثر وہ سب ہی اپنی ضروریات زندگی کو محدود کرتے جا رہے تھے جبکہ عفرا ہر دوسرے تیسرے دن بہانے بہانے سے فاران کو جلدی ہی اوپر والے پورشن میں لے جاتی۔ آہستہ آہستہ کچھ دیر بھائی کے پورشن میں گزار کر جلدی ہی اوپر چلے جانا فاران کی روٹین بنتا گیا۔

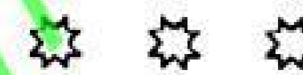


"چچی! اگر آپ کے پاس دو سو روپے ہے تو مجھے دے دیں۔ شام کو پاپا واپس آئیں گے تو واپس کر دوں گی۔ اصل میں آئل ختم ہو گیا ہے اور سالن پکانے میں دیر ہو رہی ہے۔"

حریم نے انگلیاں چٹخاتے ہوئے کہا۔ کاروبار ڈوب جانے کے باعث پہلی دکان تو ختم ہو گئی تھی لیکن فاران نے گھر کے قریب ہی فراز صاحب کو ایک چھوٹی سی دکان کھلوادی تھی کہ مصروفیت کا ہونا فراز صاحب کے لیے بہت ضروری تھا۔

"نہیں حریم! میرے پاس تو پیسے نہیں ہیں۔" عفرا نے بیڈ پر پڑا پرس غیر دانستہ طور پر تکیے کے نیچے کھسکایا۔ "اور اگر سو دو سو نکل بھی آتے تو تمہیں واپس کرنے کی کیا ضرورت تھی، ویسے بھی تو گھر کا سارا خرچ فاران ہی چلا رہے ہیں نا! دو سو روپے کی کیا حیثیت ہے اور بھلا اپنوں میں لین دین کیسا۔"

خوب کڑوی گولی شوگر سیرپ میں ڈبو کر حریم کی زبان پر رکھی گئی تھی۔ جسے حریم نے بڑی مشکل سے حلق سے نیچے اتارا تھا۔



"فاران چاچو! ہمارا کوئی احساس نہیں۔ مہینے کا سارا سامان ختم ہو گیا ہے۔ ابو کی چھوٹی سی دکان سے بمشکل اتنی ہی آمدنی ہو پاتی ہے کہ امی اور ابو کی ادویات آجائیں۔ یہ سب کچھ ہم کیسے ہینڈل کریں۔" حریم نے غصے سے کہا۔

"اوہو! آج تو موسم بڑا گرم ہے مانو بلی! اصل میں پچھلے دنوں میں کافی بزی تھا۔ اس لیے خیال نہیں رہا۔ آئندہ ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔ ایسا کرو یہ پیسے پکڑو اور گھر

مجھے بتا دینا۔" فاران نے ہزار ہزار کے کتنے ہی نوٹ حریم کی طرف بڑھائے تو حریم نے ہونہہ کہتے ہوئے رخ موڑ لیا۔

"بھائی! آپ ہی کہیں نا اسے کہ مان جائے۔ آئندہ ایسی غلطی ہرگز نہیں ہوگی۔" فاران نے مسکراتے ہوئے فراز صاحب کو مدد طلب نظروں سے دیکھا جو مسکرا رہے تھے۔

"اچھا چلو سوری پلیز۔ اب تو مان جاؤ!" حریم کو اپنے بازو کے گھیرے میں لیتے ہوئے اس نے پیار سے کہا تو حریم ہمیشہ کی طرح کھلکھلا کر ہنس دی۔

"ایاز اچھی جاب پہ سیٹ ہو جائے پھر ساری تنخواہ ہم آرام سے اپنے اوپر خرچ کریں گے، پھر میں اپنی ساری حسرتیں پوری کروں گی، ویسے بڑی ہمت ہے آپ کی حوصلے کی سالوں سے اپنے بھائی کے بچوں پر خرچ کرتے چلے جا رہے ہیں۔ مجھے تو آپ پر بہت فخر ہوتا ہے، لیکن کبھی کبھی افسوس بھی ہوتا ہے۔ آپ کا عہدہ اور آپ کا لائف اسٹائل میچ نہیں کرتا۔" عفرا بڑی مہارت سے اپنا کام کر رہی تھی۔

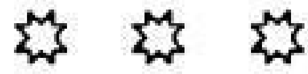
"ہاں یہ تو ہے، پتا نہیں ایاز کو نوکری کیوں نہیں مل پا رہی۔ اب تو مجھے بھی اچھے وقت کا بے صبری سے انتظار ہے۔ کم از کم اتنا تو ہو کہ بچے اپنے پاؤں پر کھڑے ہو جائیں۔ اچھا کھا سکیں۔ اچھا پہن سکیں۔" فاران نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔

"خیر۔ یہ بات تو نہیں ہے کہ وہ اپنی مرضی کا کھاتے نہیں، جو دل چاہتا ہے وہ کھاتے ہیں۔ ابھی کل شام ہی میں نے حریم کو فون کیا تو اس نے مجھے بتایا تھا کہ انہوں نے بازار سے کباب منگوائے ہیں اور وہ سب کباب انجوائے کر رہے ہیں۔" عفرا نے اپنے بالوں میں ہاتھ چلاتے ہوئے بے نیازی سے کہا۔

"کباب! لیکن حریم نے تو مجھے کہا تھا کہ انہوں نے سبزی بنائی ہے اور یہ کہ کل ایاز کا انٹرویو ہے۔ پٹرول کے لیے پیسے چاہئیں۔ اگر ایسی ہی بات تھی تو کباب منگوانے کے بجائے سبزی یا پھر دال بنا لیتے۔ اسے پتا تو

ہو جاتا ہے۔" فاران نے عفرا کا پھینکا دانہ چگ لیا تھا اور اب قدرے غصے میں تھا۔

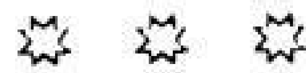
"جب مال مفت ہو تو دل بے رحم ہو ہی جاتا ہے۔ اچھا چلیں چھوڑیں۔ یہ بتائیں کہ کل امی نے کھانے پر بلایا ہے۔ کیا پہن کر جائیں گے؟" عفرا نے اپنا تیر نشانے پر لگتا دیکھ کر موضوع بدل دیا تھا۔ اسے ڈر بھی تو تھا کہ کہیں باتوں میں یہ سچ اس کے منہ سے نہ نکل جائے کہ وہ کباب ساتھ والوں کے گھر سے آئے تھے اور یہ بھی کہ حریم نے کل واقعی سبزی بنائی تھی۔



"چاچو! کتنے دن ہو گئے۔ آپ نے ہماری طرف چکر نہیں لگایا۔ پاپا بھی آپ کا پوچھ رہے تھے اور ہاں میں نے آپ کے لیے آپ کی فیورٹ کھیر بھی بنائی ہے۔ آج آ کر کھا لیجیے گا۔" حریم نے پیالے میں پڑی تھوڑی سی کھیر کو دیکھتے ہوئے کہا جو اس نے چائے کا دودھ بچا کر صرف فاران کے لیے بنائی تھی۔ پچھلے پندرہ، بیس دنوں سے فاران ان سے ملنے نہیں آیا تھا۔ جسے وہ سب ہی فاران کی مصروفیت پر محمول کرتے رہتے۔

"ٹھیک ہے۔۔۔ آؤں گا اور ہاں کھیر جیسی مہنگی چیز پر پیسے خرچ کرنے کے بجائے گھر کی کسی اور ضرورت پر خرچ کر لیتیں تو بہتر ہوتا۔" فاران نے لیے دیے انداز میں کہتے ہوئے فون رکھا تھا تو ایک پل کے لیے حریم سن رہ گئی۔

"چاچو بھی نا، ہر وقت ہمارے بارے میں ہی سوچتے رہتے ہیں، اب ان کو کھیر کھلانا ہم پر بھاری تو نہیں۔" حریم نے فاران کی بات کا خود ساختہ مطلب نکالتے ہوئے سوچا۔ اس کے دل میں فاران کی عزت کچھ اور بڑھی تھی۔



"چاچو! کھیر کیسی بنی ہے؟" حریم نے پرشوق انداز میں پوچھا۔

”ہوں. بہت اچھی ہے۔ اچھا حریم! مجھے تم سے کہنا تھا کہ آئندہ سے گھر کا ماہانہ سامان میں خود لا کر دیا کروں گا۔ تم لوگ. بہت سی چیزیں فضول میں ہی لے آتے ہو اور ہاں ایاز سے کہنا کہ۔۔۔“

”فضول میں کیا مطلب۔۔۔ ہم لوگ بچت کر کر کے تھک جاتے ہیں اور آپ کہہ رہے ہیں کہ ہم فضول چیزیں لاتے ہیں۔ لائیں دیں مجھے پیسے پکڑائیں۔“ ہمیشہ کی طرح حریم کو فوراً“ ہی غصہ آگیا تھا۔ سو بولتے بولتے لڑ پڑی ہوگئی۔

”بدتمیز! جاہل! سوائے بدتمیزی کے تمہیں اور کچھ آتا بھی ہے۔ پورے دو سال ہوگئے ہیں مجھے ماتھے پر کوئی شکن لائے بغیر اس گھر کا خرچ اٹھائے ہوئے اور تم لوگوں کو کوئی احساس ہی نہیں۔ تم بھی ٹیوشن پڑھاتی ہو۔ ایاز بھی سارا سارا دن گھر سے باہر رہتا ہے۔ آخر گھر میں کچھ نہ کچھ تو آتا ہی ہوگا۔ کھانے پینے میں تم لوگوں کا اسٹینڈرڈ ہم سے اونچا ہے اور میں اتنی بڑی پوسٹ پہ ہوتے ہوئے ایک کلرک جیسی زندگی گزارنے پر مجبور ہوں۔ کس کے لیے؟ صرف اور صرف تم لوگوں کے لیے اور تمہیں میری قربانیوں کی کوئی قدر ہی نہیں ہے۔ صحیح کہتی ہے عفرا میں اپنی ساری زندگی بھی تم لوگوں پر وار دوں۔ تب بھی تم لوگ مجھ سے خوش نہیں ہوگے۔“

ایک جھٹکے سے کھیر کا پیالا ٹیبل پر پٹخ کر وہ کھلے ہوئے دروازے کو زور سے لات مارتا ہوا کمرے سے باہر نکلا تھا۔

”ٹھک۔۔۔ ٹھک۔۔۔ ٹھک۔۔۔“ زہر میں بجھے کتنے ہی بھالے ایک کے بعد ایک اس کے دل میں پیوست ہوتے چلے گئے۔ تذلیل اور اہانت کے بے پناہ احساس کے باعث وہ کھڑی بھی نہ رہ پائی اور کسی بے جان شے کی طرح کرسی پر ڈھے گئی۔ یہ بھی مقام شکر تھا۔ اس کے دل نے دماغ کی طرف خون کا بہاؤ کم کردیا تھا۔ سو ماؤف ہوئے ذہن کے ساتھ وہ صرف اپنے دل کی بے ترتیب دھڑکن کو سمجھ پا رہی تھی‘ ورنہ اگر اس وقت ذہن کے دریچے روشن ہوتے تو وہ فاران کے اس روپ کو بھی برداشت نہ کرپاتی۔

”کیا ہوا حریم! طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری؟“

فراز صاحب نے حریم کے پیلے زرد چہرے کو دیکھتے ہوئے فکرمندی سے پوچھا۔ وہ دونوں صبح سے ہی اپنے کسی رشتے دار کی عیادت کے سلسلے میں گھر سے باہر تھے۔ سو انہیں اس سارے واقعہ کی کانوں کان خبر نہیں ہوئی۔

”جی پاپا! میں بالکل ٹھیک ہوں اور چہرہ تو اس لیے زرد ہے کہ آج میں نے اپنے چہرے پر ہلدی والا ابٹن لگایا تھا۔“ حریم نے چہرے پر بشاشت پیدا کرتے ہوئے کہا۔ ناعمہ بیگم کے سامنے ایسی بات کرنا تو بارود کو تیلی دکھانا تھا اور ویسے بھی وہ اپنے پیارے سے پاپا کو پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی۔

”اچھا چلو جلدی سے جا کر فاران کو بلا کر لاؤ۔ ایاز کا فون آیا تھا۔ اسے نوکری مل گئی ہے۔ ماشاء اللہ اچھی جاب ہے اور ساتھ میں گھر اور گاڑی بھی۔ اللہ کا شکر ہے مشکل وقت کٹ گیا۔ ان کڑے دنوں میں فاران نے بڑی خوش دلی سے اپنی ذمہ دار نبھائی ہے۔ اب میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اس گھر میں اپنا حصہ فاران کو گفٹ کردوں گا۔ اس نے ہمارے لیے بڑی قربانیاں دی ہیں۔ بے شک تم نے اپنی اور ایاز کی بہت سی ضرورتیں ٹیوشن پڑھا کر پوری کی ہیں‘ لیکن ہم فاران کے احسان کا بدلہ ہرگز نہیں چکا سکتے۔“ اب فراز صاحب حریم سے مخاطب تھے۔

”تو آپ نے کون سا کم قربانیاں دی ہیں۔ اپنے بہن‘ بھائیوں کی خوشیوں اور جذبات کو اپنے بچوں کی خوشیوں اور جذبات سے مقدم سمجھتے رہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ جب ایاز چھوٹا سا تھا۔ آپ سے کتنا پوچھا کرتا تھا کہ پاپا! آپ کو چاچو زیادہ پیارے لگتے ہیں یا میں‘ تو کبھی آپ نے اکیلے میں بھی جھوٹے منہ اسے یہ نہیں جتایا کہ وہ آپ کی اولاد ہے‘ آپ کو سب سے مقدم ہے‘ جب آپ نے اپنی بساط سے بڑھ کر ان کا خیال رکھا ہے تو اب ان کی باری بھی تو بنتی ہے۔“ ناعمہ بیگم کوئی موقع ضائع نہیں جانے دیتی تھیں۔

ہیں تو تمہارے بچے چپ رہتے بھی ہیں تو صرف اور صرف میرے اس رویے کی وجہ سے ورنہ یہ ہی بچے میرے ہاں گننے پر احساس برتری اور میرے نہ گننے پر احساس کم تری کا شکار ہو جاتے۔ یہ ایک لمبی بحث ہے۔ تمہاری سمجھ میں کیا خاک آئے گی۔ تم جاؤ حریم! فاران کو بلا کر لاؤ۔" فراز صاحب نے خاموشی سے کھڑی حریم کو پکارا تو وہ چونک اٹھی۔

"پہلے پتا تو کر لیں کہ وہ گھر پر ہیں بھی یا نہیں۔ ڈیڑھ گھنٹہ پہلے جب میں نے حریم کے بارے میں پوچھنے کے لیے عفرا کو فون کیا تھا۔ تب وہ دونوں کسی ہوٹل میں کھانا کھا رہے تھے۔ پتا بھی تھا کہ بچی گھر میں اکیلی ہے۔ پھر بھی سیر و تفریح کے بغیر رہ نہیں سکے آپ کے بھائی اور بھاوج۔" نامعہ بیگم نے نخوت سے کہا۔

"فاران کی گاڑی دروازے پر کھڑی ہے۔ وہ لوگ گھر آ چکے ہیں۔ حریم بیٹا! اب چلی بھی جاؤ۔ ایاز مٹھائی لے کر آتا ہی ہو گا۔" فراز صاحب کے لہجے میں اب ہلکی سی جھنجلاہٹ در آئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"میری گڑیا ناراض ہو اور میں مزے سے کھانا کھاؤں۔ ایسا کبھی ہو سکتا ہے۔ چلو جلدی سے ٹیبل پر آ جاؤ۔ قسم سے بھوک سے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے ہیں۔ آئی پرامس! تمہیں کل شام کو پزا کھلاؤں گا۔ اس دفعہ وعدہ خلافی کی جرات ہرگز نہیں کروں گا۔" گھٹنوں کے بل جھکا فاران لجاجت سے حریم کو منا رہا تھا۔

آہ۔۔۔ پرانی یاد میں کھوئی حریم دوسری سیڑھی پر ہی لڑکھڑا گئی تھی۔

"وہ دونوں کسی ہوٹل میں کھانا کھا رہے تھے۔ پتا بھی تھا کہ بچی گھر پر اکیلی ہے۔ پھر بھی سیر و تفریح کے بغیر رہ نہیں سکے آپ کے بھائی اور بھاوج۔۔۔" نامعہ بیگم کی چیختی ہوئی آواز اس کے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ انڈیل رہی تھی۔

"آپ کی گڑیا، آپ کی مانو بھی اکیلی ہونے کے ساتھ ساتھ بہت پریشان بھی تھی۔ فاران چاچو! پھر مجھے منائے بغیر آپ ہوٹلنگ کرنے کیسے چلے گئے۔" دل کا خون ہوا تو ایک آنسو اس کی آنکھ سے ٹپکا تھا۔ یہ بے آواز شکوہ اسے مزید نڈھال کر گیا۔

"حریم کی دھونس تو اس کا مان ہے۔ جسے وہ بڑی محبت سے جتاتی ہے اور پھر حریم چاہے تو میرے گلے پر انگوٹھا رکھ کر پیسے نکلوا لے۔ کس کی مجال ہے، جو اس کی بات کو بدتمیزی سمجھے۔"

تیسری سیڑھی اور دوسری یاد حریم کے حلق میں جیسے کانٹے اگ آئے۔

"کیوں چاچو! اگر مان توڑنا ہی تھا تو مجھے مان جتانے کی زور زبردستی سے اپنی بات منوانے کی عادت کیوں ڈالی۔" دوسرا شکوہ تھا اور اس کی آنکھ سے ٹپکنے والا دوسرا ہی آنسو۔۔۔

"میں حریم کی آنکھوں میں آنسو برداشت نہیں کر سکتا۔" بارہا مختلف مواقع پر بولا گیا فاران کا مخصوص جملہ اس وقت حریم کی آنکھوں سے نمکین پانی بن کر بہہ رہا تھا۔

"صرف تھوڑا سا انتظار ہی تو تھا۔ چاچو دیکھیں آج آپ کی آزمائش ختم ہو گئی۔ مجھے یقین ہے کہ اب جلد ہی ہمارے آپس کے تعلقات معمول پر آ جائیں گے، کیونکہ آپ کی فطرت اور عادت ہرگز بری نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے آپ دل ہی دل میں پچھتا بھی رہے ہوں، لیکن آنے والے دنوں میں ہمارے درمیان کچھ تو ایسا ہو گا جو خلاف معمول ہو گا۔ اب ہم اپنے تعلق کے کچے دھاگے کو جتنی بھی گرہ لگا لیں، لیکن تعلق میں آئی جھجک کی دیوار کو کبھی نہیں گرا پائیں گے اور یہ جھجک تو ایسا فتنہ ہے کہ جب کسی تعلق میں ڈیرہ ڈال دے تو دلوں میں دوریاں آنے سے کوئی نہیں روک پاتا۔"

آخری سیڑھی پر قدم رکھتے ہوئے حریم نے تیزی سے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے سوچا تھا۔

☼

ملیحہ صدیقی



دادی تخت پر بیٹھی سیم کی پھلی کاٹ رہی تھیں۔ امی باورچی خانے میں گوشت بھون رہی تھیں۔ جویریہ صحن میں بندھی رسی پر دھلے کپڑے ڈال رہی تھی۔

ابرار نے گھر میں داخل ہوتے ہی نظر دوڑائی اور کپڑوں کی آڑ لے کر اپنے کمرے میں بحفاظت پہنچنے کا خوش کن تصور کیا مگر وہ جویریہ ہی کیا، جو اس کے اشارے سمجھ جائے۔ ایسے ہی تو وہ اسے بونگی نہیں کہتا تھا۔

"ارے بھائی! میرا رسالہ لے کر آئے؟" وہ چیخی تو اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔

"جویریہ! تم یہ بچوں والے رسالے پڑھنا کب چھوڑو گی؟"

"جب امی مجھے ڈائجسٹ پڑھنے کی اجازت دیں گی، اور آپ مجھے فرسٹ ایر فول اور بونگی کہنا چھوڑ دیں گے۔" اس نے بھی جواباً منہ بنایا۔

"ارے یہ ابرار آگیا۔" دادی بڑبڑائیں۔

"جی دادی جان!" سلام کرتے وہ کسی مجرم کی طرح پیش ہوا۔

"میرا اپنا چشمہ لائے، جو بنوانے کو دیا تھا؟"

ان کے سوال پہ وہ ہکلایا۔ "بس دادی جی! وہ میرا پورا ارادہ تھا مگر گرمی اتنی تھی کہ۔۔۔ میں بھول گیا۔" اس نے اقرار کر ہی لیا۔

"لو جی بس۔" دادی نے سر پر ہاتھ مارا۔ "دو دن سے کہہ رہی ہوں مگر یہ لڑکا پورا اپنے دادے پر پڑا ہے۔"

وہ فوراً "میدان میں آگئیں۔ "اللہ بخشے! وہ بھی کبھی وقت پر کوئی چیز لا کر نہیں دیتے تھے مگر ہر کام وقت پر چاہیے ہوتا تھا۔ میری تو ہر چیز بھول ہی جاتے تھے۔ ہاں اپنی چیزیں وقت پر آتی تھیں۔"

وہ اب کھسکنے کے چکروں میں تھا۔

"دادی جی! اتنے برے تھے دادا حضور تو اللہ کیوں بخشے۔"

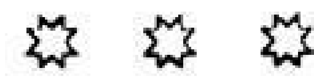
ادھر اس کی زبان میں کھجلی ہوئی ادھر دادی نے برابر میں پڑی لکڑی کے بجائے غلطی سے چھری اٹھالی۔ انہوں نے ساری زندگی مجازی خدا کے آگے زبان بند کر کے گزاری تھی۔ اب ذرا موقع ملا تھا تو یہ دادا کا پوتا۔۔۔

"دادی جی! یہ چھری ہے۔" وہ سیدھا کمرے میں ورنہ دادی نے عادت کے مطابق فوراً "اسرائیل کی طرح وار کرنا تھا، چاہے زد میں کوئی بھی آئے۔

"اسی لیے کہہ رہی ہوں کم بختو! لا دو چشمہ۔ کیڑے کاٹ کاٹ کر کھلادوں گی۔ دیکھنا!"



وہ اسی چھری سے تیز تیز سیم کاٹنے لگیں۔



"امی! اس دن تو میرے آفس میں پارٹی ہے۔" وہ کوفت سے بولا۔ "آپ عمار کے ساتھ چلی جائیے گا۔" اس نے معاملہ نمٹایا۔

"اور جویریہ کو کون لے کر جائے گا۔ ہم دو افراد تو جائیں کم از کم۔ تمہارے ابو تو دکان سے لیٹ کھانے کے وقت ہی آئیں گے۔ عمار کا ٹکنا مشکل ہے۔" انہوں نے حساب کتاب کیا۔

"اور اپنے بڑے ماموں کی اولاد کا تو تمہیں پتا ہے۔ فوراً "برا" مان جاتے ہیں۔" انہوں نے اسے دیکھا جو برا سا منہ بنائے ٹی وی دیکھنے میں مگن تھا۔

"مجھے تو ضرور جانا ہے۔" جویریہ کمرے میں آتے ہوئے بولی۔

"ہاں انہیں دیگوں کے لیے گائے بھی تو قربان کرنی ہوگی۔" وہ بولا جویریہ نے احتجاجاً "منہ کھولا۔

"جیا! فوراً" جاؤ۔ گملوں میں پانی ڈالو ورنہ رات ہو جائے گی۔ کیاری میں بھی ڈال دینا۔" امی نے اسے منظر سے غائب کیا ورنہ اصل معاملہ دب جاتا۔ وہ منہ پھلاتی پلٹ گئی۔

"آپ دونوں عمار کے ساتھ بائیک پر چلی جائیے گا۔" اس نے حل نکالا۔

"ہاں تاکہ وہ ہم کو لڑھکا دے' رہنے دو۔ رکشا بھلا ہے۔" انہوں نے خفگی سے کہا۔

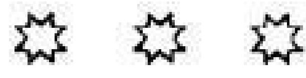
"ایک تو ہر سال اتنے اہتمام سے برسی کرنے کی جانے کیا ضرورت ہے۔ غریبوں میں کھانا تقسیم کر دو' یتیم خانے بھجوا دو اور بس۔" ابرار بے زاری سے بولا۔

"ہاں تو اور کیا۔ اولاد تو ماں باپ کی بالکل الٹ ہے۔ اتنی فضول خرچ۔" انہوں نے بھی منہ بنایا۔

"اللہ معاف کرے! بڑی بھابی کوئی فقیر یا کوئی بھی مانگنے والا آتا تھا' کبھی دروازہ نہیں کھولتی تھیں۔ اور اللہ کی شان دیکھو! ان ہی کی برسی میں اتنا خرچا' ورنہ ان کی کنجوسی تو پورے خاندان میں مشہور تھی۔ بھائی ایک بار بھولے سے اماں کے لیے سوٹ لے آئے۔ انہوں نے وہ باتیں سنائیں کہ بس بھائی دنوں شرمندہ رہے۔ جب غضنفر آٹھ سال کا تھا' بیمار تھا' بھائی رکشا چلاتے تھے جب' مگر ماں کا کوئی حق نہیں ہوتا گیا۔ کوئی مہمان آجاتا تو بھاری لگتا۔ گھر کا کھانا سامنے رکھ دیا جاتا۔ اس میں سے بھی اچھا ان کے بچے مہمان کے سامنے ہی کھا لیتے۔ پوچھتے بھی نہیں۔ ہمیں تو بہت شرم آتی ہے۔ اللہ بخشے اب وہ اچھی جگہ ہیں مگر کہنے میں تو آتا ہے۔" انہیں کچھ خیال آیا تو گال پیٹے۔

"اللہ نے تو بخش دیا ہوگا۔ آپ بھی بخش دیں۔" ابرار جو فل اسٹاپ کا انتظار کر رہا تھا' بڑبڑایا۔

"کیا کہہ رہے ہو۔" ان کی سمجھ میں نہ آیا مگر اپنی اولاد کا پتا تھا۔ اس لیے گھورتی ہوئی اٹھ گئیں۔



پارٹی بہت اچھی رہی تھی۔ سب کئی طرح کے کھانوں' میٹھے اور کولڈ ڈرنک کے بعد چائے سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ باتوں کا دور چل رہا تھا۔ کمپنی کے سینئرز جونیئرز کو کمپنی کے ماضی کے قصے سنا رہے تھے۔

عثمانی صاحب بولے تو ابرار بھی متوجہ ہو گیا کیونکہ اس سے سینئر بس عثمانی صاحب تھے۔

"آپ لوگوں کو تو شکر ادا کرنا چاہیے کہ اب طارق صاحب ہیں۔ جب ہی اتنے بونس مل جاتے ہیں۔ ورنہ اللہ جنت نصیب کرے ان کے والد باجوہ صاحب کو' جب وہ تھے بمشکل تنخواہ وقت پر ملتی تھی۔ تنخواہ میں اضافہ تو ہم بھول ہی گئے تھے مگر جب بھی کمپنی کو نہیں چھوڑا۔"

عثمانی صاحب اور بھی جانے کیا کہہ رہے تھے مگر وہ تھوڑا دور جا کر بیٹھ گیا۔ ہر طرف یہی تکرار تھی۔ تھوڑی دیر بعد جنید بھی اس کے پاس آکر بیٹھ گیا۔

"یار! یہ لوگوں کو جانے کیا مرض ہے۔ ہر مرے ہوئے آدمی کی برائی کر کے پھر اللہ بخشے کہہ کر جیسے فارغ ہو جاتے ہیں۔" وہ تھوڑا بے زار سا تھا۔

"ہاں یہ تو ہے۔" جنید بھی بولا۔
"جبکہ اسلام کہتا ہے کہ مرجانے والوں کو برا نہ کہا جائے۔ وہ اپنے کیے کا بدلہ پا چکے ہوتے ہیں۔" جنید کی بات پر وہ افسوس سے سرہلانے لگا۔

☆ ☆ ☆

امی اور دادی کی کوششیں آخر رنگ لائیں اور وہ مشترکہ طور پر فرح کو بہو بنانے میں کامیاب ہو ہی گئیں۔ ابرار ایم بی اے کر کے کاسمیٹکس کمپنی میں زونل سیلز منیجر کی پوسٹ پر تھا تو فرح نے بھی اسلامک اسٹڈیز میں ایم فل کیا ہوا تھا۔

ابرار درمیانے قدو قامت کا اوسط شکل و صورت کا تھا تو فرح حسین تھی۔ ابرار کے دو چھوٹے بہن بھائی تھے تو اس کا بس ایک چھوٹا بھائی تھا۔ فرح کا خاندان بھی اچھا تھا اور لڑکے والوں کا خاندان تو ہمیشہ اچھا بلکہ لڑکی والوں سے بھی اچھا ہوتا ہی ہے تو وہ دونوں جوڑ ملا کر بہت خوش تھیں۔

ابرار بھی دبلی پتلی خوش شکل فرح کی سنگت میں خوش تھا۔ خاص کر وہ اس کے اسلامک اسٹڈیز کو بطور مضمون منتخب کرنے پر بہت خوش تھا۔ جب وہ سلیقے سے دوپٹا لیتی، باتوں میں کبھی کبھار قرآن و حدیث کا حوالہ دیتی تو اس کا دل جیت لیتی۔ ایسی ہی جیون ساتھی کا تو اس نے تصور کیا تھا۔ وہ امی اور دادی کا شکر گزار ہوتا۔

آج فرح کی خالہ کی طرف ان کے پورے گھر کی دعوت تھی۔

"ارے جیا! تم تیار نہیں ہوئیں؟" ابرار اپنے کمرے کی طرف جاتا ہوا بولا۔
"نہیں بھائی! ٹیسٹ ہے۔" اس نے منہ بنایا۔
"یہ میری دوست نے مجھے گفٹ میں نیل پالش دی تھی مگر میں تو کبھی کبھار لگاتی ہوں۔ لیکن بھابھی کو میں ہر دفعہ لگایا کروں گی جب بھی دعوت ہو۔" وہ گولڈن نیل پالش لہراتے ہوئے بولی۔

"ارے بونگی۔" بے اختیار ابرار کے منہ سے نکلا، پھر وہ آواز دبا کر بولا۔ "باؤلی بھیڑ! اس کو نیل پالش لگائے دیکھا ہے کبھی؟ وہ نہیں لگاتی۔"
ابرار کی بات پر وہ خفگی بھول گئی۔ "ہیں؟ کیوں نہیں لگاتیں؟ وہ تو دلہن ہیں۔"

اب وہ جو یہ بی بی کو سمجھاتا تو دیر ہو جانی تھی۔ وہ کمرے میں چلا گیا۔ فرح اس کو آتے دیکھ کر مسکرائی۔ اس کی تیاری آخری مراحل میں تھی۔ ہلکے کاسنی ٹراؤزر شرٹ میں وہ کھلی کھلی سی لگ رہی تھی۔ دلکش سا میک اپ۔ ہاتھوں میں اس کے لائے ہوئے موتیا کے گجرے، کانوں میں چھوٹی گولڈن جھمکیاں چہرے کے گرد بہت نفیس لگ رہی تھیں۔
"زبردست یار!" اس نے سراہا۔ وہ مسکرائی۔
"شکر ہے کوئی بھی میری تیاری پر اعتراض نہیں کرتا۔ ٹوکتا نہیں ہے۔ آپ سب اچھے ہیں۔"
ابرار مسکرانے لگا۔

"ورنہ اللہ مغفرت کرے میری دادی مرحومہ، وہ تو امی کی ہر تیاری پر اعتراض کرتی تھیں۔ اتنا پھیکا رنگ کیوں پہنا۔ چوڑیاں کیوں کم ہیں۔ سرخی گہری کرو، مہندی لازمی لگاؤ۔ میں بہت چھوٹی تھی مگر بچپن سے ڈر بیٹھ گیا تھا کہ میری ساس بھی ایسی نہ ہوں۔ امی بے چاری گھبرائی ہوئی ہی رہتیں۔ ایسا بھی نہیں کرنا چاہیے کہ انسان کی اپنی پسند ہی ختم ہو جائے۔ بس شکر ہے۔ یہاں ایسا کوئی نہیں۔"
وہ میک اپ واپس جگہ پر رکھتے ہوئے بولے جا رہی تھی۔
پانی پیتے ابرار کو پھندا لگ گیا۔ وہ کھانسنے لگا۔

کیا "اللہ بخشے" ہماری زندگیوں میں لازم ہو گیا ہے۔ اس نے سر بھی تھام لیا۔
فرح گھبرا کر آئی اور اس کی پشت سہلانے لگی۔ وہ سر پکڑے بیٹھا رہا۔

*

نازیہ جمال



وہ آج بھی وہیں بیٹھی تھی، جہاں وہ اسے گزشتہ دو ہفتوں سے دیکھتا چلا آرہا تھا۔ سنگی بنچ پہ بالکل سنگی مجسمے کی طرح ساکت و خاموش۔ کسی غیر مرئی نقطے کو گھورتے ہوئے۔ پارک میں اس وقت روز کی طرح مرد و زن اور بچوں کی بھیڑ تھی۔ بھانت بھانت کی بولیاں۔ بلند آہنگ قہقہے، دبی دبی ہنسی، کچھ بھی تو اس کا ارتکاز نہ توڑ پا رہا تھا۔

''پاپا! مجھے سلائیڈ پہ چڑھائیں!'' کافی دیر سے ادھر ادھر بھاگتا، اپنے ہم عمر بچوں سے چہلیں کرتا سلجوق اس کے پاس آکر اس کا ہاتھ پکڑ کر بولا تو وہ جو کافی دیر سے اسے دیکھنے کا کام انتہائی توجہ اور محویت سے کر رہا تھا، چونک کر حواسوں میں پلٹا۔

''ہاں چلو اپنے بیٹے کو سلائیڈ پہ چڑھاتے ہیں۔'' انتہائی خوش دلی سے بولتے ہوئے اس نے سلجوق کے پھولے سرخ رخساروں پہ لگاتار کئی بوسے دے ڈالے۔

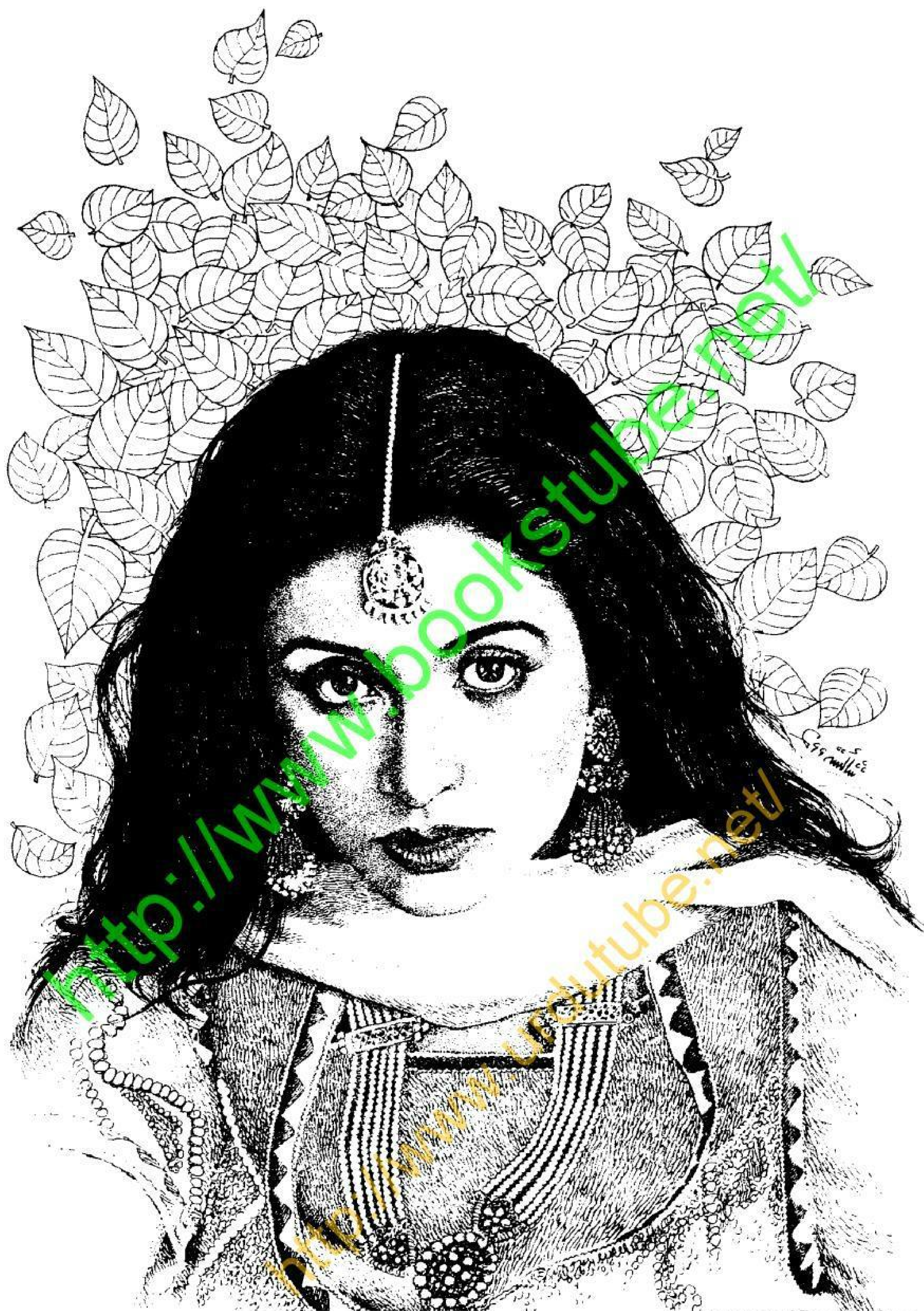
''اور یہ پرنسز مناہل کہاں ہیں؟'' اس نے ادھر ادھر نظر دوڑاتے ہوئے سلجوق سے پوچھا۔

''وہ رہی'' سلجوق کی انگلی کے اشارے کی سمت دیکھا تو بے ساختہ مسکرا دیا۔ مناہل روز کی طرح آج بھی ایک گروپ جوائن کیے بیٹھی تھی۔ خاتون اسے چپس کا پیکٹ کھول کر دے رہی تھی۔ جبکہ چاکلیٹ سے وہ پہلے ہی سارا منہ اور فراک خراب کر چکی تھی۔

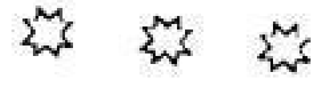
وہ تھی ہی اتنی پیاری کہ بے ساختہ ہر ایک کا دل اسے گود میں لے کر پیار کرنے کو چاہتا۔ بڑی ہی دوستانہ طبیعت پائی تھی۔ کیا مجال کہ کسی اجنبی سے بدک جائے۔ مناہل سے نظر ہٹتے ہی بے ساختہ مطلوبہ منظر پہ جم گئیں۔ اس لڑکی میں ایسا کچھ بھی چونکانے یا جھٹکا دینے والا نہ تھا۔ سیاہ بالوں کی ڈھیلی ڈھالی چوٹی ایک طرف پڑی ہوئی تھی۔ دائیں کندھے پہ میرون شال، جو نیچے بنچ تک آرہی تھی۔ گندمی رنگت جس میں زردی واضح طور پر گھلی ہوئی تھی۔ گہری سرمئی آنکھیں اور ان میں چھایا حزن.... ہاں اس لڑکی کے سراپے پہ ایک واضح دکھائی دیتی ملال کی چادر لپٹی ہوئی تھی۔ آنکھوں میں ہلکورے لیتا دکھ ہر کسی کو اپنی طرف متوجہ کر سکتا تھا اور وہ بھی تو ان آنکھوں کی ہی طرف متوجہ ہوا تھا۔ ان سرمئی آنکھوں میں بلا کی کشش محسوس ہوئی تھی اسے۔

شام دبے قدموں اترنا شروع ہو گئی تھی۔ رفتہ رفتہ پارک خالی ہونے لگا۔ بسیروں میں لوٹتے پنچھیوں کی چہکاریں ماحول کو بے حد حسین بنا رہی تھیں۔ قریبی مسجد سے اللہ اکبر کی آواز بلند ہوئی تو فضا مزید کیف آور ہو گئی۔

وہ لڑکی بھی بنچ سے اٹھ کھڑی ہوئی اور شال سے سر کو ڈھک کر چل دی۔ مناہل کا چاکلیٹ سے بھرا منہ ٹشو سے صاف کرتے ہوئے عالی حسن نے اس لڑکی کو



پہلے تو حیرت پھر دکھ کی کیفیت میں جاتے ہوئے دیکھا۔ اس لڑکی کی چال میں واضح لنگڑاہٹ تھی۔



"کچھ نہیں ہوا مجھے تم خوامخواہ پریشان ہو رہے ہو آ۔۔۔ چھی۔" تسلی آمیز لہجے میں بولتے ہوئے اس نے زور سے چھینک ماری، ساتھ ہی ٹشو باکس سے ٹشو گھسیٹ لیا۔

"کمال ہے یار! تم نے پندرہ منٹ کی کال میں بلا مبالغہ ساٹھ دفعہ چھینکیں ماری ہیں اور تم کہہ رہی کہ ٹھیک ہو۔ سیدھی طرح بتاؤ ڈاکٹر کے پاس گئی تھیں یا یونہی گھر میں پڑی میڈیسنز سے کام چلا رہی ہو؟" اب کے وہ ذرا ڈپٹ کے پوچھ رہا تھا۔

"قسم سے عمیر! معمولی سا نزلہ بخار ہے۔ ذرا سا جاڑے نے جھاڑا ہے۔" وہ زکام زدہ آواز میں صفائی دینے لگی۔

"محترمہ! یہ تو قریب آ کے۔۔۔ معائنہ کرنے کے بعد ہی پتا چلے گا کہ یہ موسمی نزلہ بخار باوجود علاج کے ختم ہونے کا نام کیوں نہیں لے رہا۔ ٹھہرو میں آتا ہوں۔"

"نہیں عمیر! میں بالکل ٹھیک ہوں۔۔۔ آ۔۔۔ چھی۔"

اگلے پندرہ منٹوں میں عمیر اس کے کمرے میں اس کے روبرو موجود تھا مع ایک عدد وائٹ روز کے بوکے اور ڈھیر ساری چاکلیٹس کینڈیز اور سوپ کے پیکٹس کے۔

"یہ ہلکا سا نزلہ زکام ہے؟" وہ اس کی تپتی پیشانی پہ ہاتھ رکھ کر چلایا۔

"ہاں تو عمیر! اس میں بخار کا کیا قصور، موسم دیکھو کتنا سرد ہے۔ کہرے کا قہر ٹوٹ رہا ہے۔ پچھلے چار دنوں سے سورج کی شکل تک نہیں دیکھی۔ اب ایسے یخ بستہ موسم میں بخار کا ہونا کیا اچنبھا ہے۔" وہ کہنی کے بل اٹھتے ہوئے نقاہت سے بولی۔ چہرہ بخار کی تپش سے سرخ تھا آنکھوں سے پانی بہہ رہا تھا۔

"ذرا مجھے ڈاکٹر کا ۔۔۔ لکھا (نسخہ) دکھاؤ۔" وہ سائیڈ ٹیبل پہ رکھی دواؤں کو اٹھا اٹھا کر دیکھتے ہوئے بولا۔

"ڈاکٹر کے پاس چیک اپ کے لیے نہیں گئی تھی۔ نکڑ والے ڈاکٹر سے بھائی دوا لے آئے تھے۔" وہ بازوؤں میں کشن بھرتے ہوئے بولی تو بے ساختہ عمیر نے اپنا سر تھام لیا۔

"یار مشائم! حد ہے خود پہ ظلم کی۔ اب یہ نکڑ پہ شیشے کی لمبی الماریوں میں رنگی برنگی دوائیاں بیچنے والا عطائی کہاں کا کوالیفائیڈ ڈاکٹر ہے۔ تم اٹھو چلو میرے ساتھ، میرے دوست کا کزن ڈاکٹر زبیر حال ہی سے امریکہ سے لوٹا ہے۔ اس کے کلینک پہ چلتے ہیں۔" عمیر اسے بازو سے پکڑ کر اٹھاتے ہوئے بولا۔

"نہیں عمیر! بھائی میڈیسنز لے تو آئے ہیں اور بھابھی پرمیشن نہیں دیں گی۔" وہ اپنا بازو اس کی گرفت سے چھڑاتے ہوئے انکاری لہجے میں بولی۔

"ان کے تو اچھے بھی پرمیشن دیں گے۔" وہ اس کی ایک نہ سنتا باہر لے آیا۔ وہ ایسا ہی تھا۔ منہ زور اور اپنی من مانی کرنے والا۔ گرم و آرام دہ لاؤنج میں شینا بھابھی دو سالہ شاویز کو کھانا کھلا رہی تھیں۔ ان دونوں کو ساتھ دیکھ کر ناگواری نے ان کے ماتھے پہ بے شمار شکنیں ڈال دیں۔

"اسے تیز بخار ہے۔ میں نے سوچا اسے کسی اچھے سے ڈاکٹر سے چیک اپ کروا آتے ہیں۔" عمیر تحمل سے بولا۔

"کیوں اس نے تمہیں بتایا نہیں کہ اس کے بھائی دوا لے آئے ہیں۔" بے حد جھنجھلاتے ہوئے انداز میں پوچھا۔

"اور اگر کسی ڈاکٹر سے چیک اپ بھی کروانا ہے تو خالد خود آکر اسے لے جائیں گے۔ کسی کو خوامخواہ تکلیف دینے کی کیا ضرورت ہے۔ اس وقت گھر پہ میں موجود ہوں اور مشائم کو یوں ڈاکٹر کے پاس جانے کی

اجازت نہیں دے سکتی، جب تک خالد گھر پہ نہیں آجاتے۔" شہنا کا لہجہ و انداز قطعی تھے۔ مشائم نے عمیر کی طرف بے بسی سے دیکھا۔ عمیر نے سر کو ذرا سی جنبش دی۔

"میں خالد بھائی سے بات کر چکا ہوں۔ آپ تصدیق کر لیجئے گا۔ چلو مشائم۔" وہ دوٹوک الفاظ میں کہہ کر مشائم کے کندھوں پہ بازو رکھے آگے بڑھ گیا۔ شہنا سلگ کر رہ گئی۔

گاڑی کا گرم و پرسکون ماحول اعصاب کو تقویت دینے لگا تھا۔

"عمیر! بھابھی ناراض ہو گئی ہیں۔ پتا نہیں بھائی کو کیا سے کیا لگائیں گی؟" وہ کار ڈرائیو کرتے عمیر کو دیکھتے ہوئے خوفزدہ انداز میں بولی۔

بھابھی کا ممکنہ رد عمل اسے سہمائے دے رہا تھا۔

"ول یو شٹ اپ مشائم!" عمیر ایک دم غصے سے بولا۔

"کوئی چار سال قبل ایک بہت بڑی سیرمنی ہوئی تھی۔ تین سو معزز مہمانوں کی موجودگی میں 'عمیر فیاض نے تمہیں رنگ پہنا کر خود سے منسوب کیا تھا۔ محترمہ شہنا خالد بھی اس تقریب با سعید میں موجود تھیں۔ وہ تو نہ بھولی ہوں گی مگر تم بار بار بھول جاتی ہو۔ کہ تم میری منگیتر ہو۔ ہونے والی شریک حیات۔ وہ تمہیں میرے ساتھ آنے جانے پر روکنے والی کون ہوتی ہیں؟" وہ مہارت سے ڈرائیو کرتے ہوئے اپنے مخصوص دوٹوک انداز میں بول رہا تھا۔ مشائم تو بس یک ٹک اسے دیکھے جا رہی تھی۔

"ویسے! وہ مجھ سے کیوں اتنی خار کھاتی ہیں؟ جب بھی تم سے ملنے آتا ہوں۔ ایک دم سے گارڈ کی طرح تمہارا پہرہ دینے لگتی ہیں۔ نہ چائے نہ خاطر تواضع۔ چہرے پہ بڑا بڑا سا "دفع ہو جاؤ" لکھا ہوتا ہے۔ میں صرف تمہارا فیانسی ہی نہیں بلکہ پھوپھی زاد بھی ہوں۔ میرے ابا کی بہن کا گھر ہے یہ۔" ذرا سا گردن موڑ کر اس سے پوچھا۔

"تم بھابھی کی ناپسندیدگی کی وجہ سے بخوبی واقف ہو۔ خالد بھائی زاریہ باجی سے بچپن سے ہی منسوب تھے۔ لیکن خالد بھائی کو یونیورسٹی میں شہنا بھابھی پسند آ گئیں۔ اور ایسی پسند آئیں کہ اماں ابا کے سامنے ڈٹ گئے کہ شہنا کے علاوہ کوئی لڑکی ان کی زندگی میں نہیں آ سکتی۔"

"ہاں یہ تو مجھے معلوم ہے۔ ناراض تو الٹا ہمیں ہونا چاہیے کہ خالد بھائی نے زاریہ باجی سے منگنی ہی نہیں بلکہ ان کا دل اور خالد بھائی کے حوالے سے دیکھے گئے سارے خواب توڑ ڈالے ہیں۔ مگر ہم نے تو ایسا کوئی ایشو کری ایٹ نہیں کیا۔ نصیب کا لکھا جان کر اپنی بہن غیروں میں بیاہ دی۔ نہ کوئی انا کا مسئلہ اور نہ ہی غیرت کا طوفان۔" وہ ونڈ اسکرین سے نظر ہٹا کر ذرا سا اسے دیکھتے ہوئے بولا۔

"بھابھی سمجھتی ہیں کہ ان کی شادی کے وقت ان کے جہیز میں ۔ مامی راشدہ نے سو کیڑے نکالے تھے۔ ان کے خاندان پر باتیں بنائیں' خالد بھائی کا دل خراب کر کے ان کا گھر خراب کرنے کی کوشش کی گئی۔ سو اسی ایک بات کو لے کر وہ نیگیٹو ہو جاتی ہیں۔" گاڑی ایک شان دار کلینک کے سامنے رک گئی۔ مریضوں کا رش تھا۔ مگر عمیر کے دوست ہونے کی وجہ سے انہیں جلد نمبر مل گیا۔

"اب یہ میڈیسنز ہدایت کے مطابق باقاعدگی سے لینی ہیں۔ مجھے دو دن کے اندر پہلے والی مشائم کی مترنم و دلکش آواز سننی ہے نا کہ یہ بھاری زکام زدہ اجنبی آواز اور اوپر سے چھینکوں کا تڑکا۔" وہ بے حد اپنائیت سے اسے دھونس بھرے لہجے میں مخاطب ہوا تو مشائم مسکرا دی۔

ڈاکٹر سے فارغ ہوتے ہی عمیر اسے ایک اچھے سے ریسٹورنٹ میں لے آیا۔

"عمیر! گھر چلتے ہیں۔ بہت دیر ہو رہی ہے۔" وہ سر پر دوپٹا سیٹ کرتے ہوئے بے چینی سے بولی۔ ایک خوراک لینے سے اسے خاصا افاقہ محسوس ہو رہا تھا۔

طبیعت کی گرانی کم ہوتی جارہی تھی۔

"ڈونٹ وری! ڈنر کر کے چلتے ہیں۔ بخار کے طفیل تو ہاتھ لگی ہو۔ ورنہ تو ہر وقت بھابھی نام کی تلوار تمہارے سر پر لٹکتی رہتی ہے۔ انگیجمنٹ پیریڈ کا سارا مزا کرکرا کر کے رکھ دیا ہے تمہارے اس بے بنیاد خوف نے۔ دنیا میں مجھ سا بے چارہ و مسکین منگیتر ڈھونڈے سے بھی نہیں ملے گا جو صرف اپنی منگیتر کی کالز پر گزارہ کر رہا ہو۔ اور کال بھی کتنی، کبھی پندرہ منٹ، تو کبھی پانچ منٹ۔۔۔ ٹھہریں عمیر! میں نے واشنگ مشین کا بزر سنا ہے ابھی۔ عمیر! مجھے لگ رہا ہے میری ہنڈیا لگ رہی ہے۔" وہ اس کی نقل کر کے اس کے سارے جملے اسی کے انداز میں مہارت سے بول رہا تھا۔ مشائم بے ساختہ ہنستی چلی گئی۔ بے حد خوب صورت وہ ہنسی تھی کہ جس سے چہرے کا ایک ایک نقش سج گیا تھا۔

نقاہت، سر درد اور طبیعت کا اضمحلال نہ جانے چپکے سے کہاں روپوش ہو گیا تھا۔ دل و دماغ ایک فرحت آمیز کیفیت کی لپیٹ میں آ گئے تھے۔ دیر کھانا سرد کرنے لگا۔ عمیر نے کال ملائی اور بے حد توجہ سے مشائم کی سرمئی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔

"جی خالد بھائی! ایکچوئلی میرے ایک دوست کو اپنے تھیسز کے حوالے سے چند اردو کلاسیکی ناولز درکار تھے۔ میں ٹھہرا بزنس کا بندہ۔ مشائم کو بک شاپ پہ ساتھ لے گیا۔ اسے ٹمپریچر تھا، ساتھ ڈاکٹر سے بھی چیک کروالیا۔"

یہ محبت کرنے والے، اگر یوں ہی تحفظ و اعتبار

بتانے لگیں تو زندگی بھی خود پہ نازاں ہونے لگتی ہے۔

مشائم عمیر کی گہری نگاہوں کی تاب نہ لاتے ہوئے پلیٹ پہ جھک گئی۔



"پھر یوں ہوا کہ شہزادے کے گھوڑے نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا شہزادے نے بہت زور لگایا مگر"

وہ بولتے بولتے ایک دم چپ ہو گیا۔ سر جھکا کر نیچے دیکھا، سلجوق گہری نیند سو چکا تھا۔ اس نے بے حد آہستگی سے اپنا بازو سلجوق کے سر کے نیچے سے نکالا۔ اس کے ماتھے پہ بکھرے بال انگلیوں سے ہٹائے اور ماتھے پہ بوسہ دیا۔

مناہل تو کب کی سو چکی تھی۔ سوتے میں بھی اتنی پیاری لگ رہی تھی جتنی جاگتے میں۔

"ڈیری نائس!" مسکراتے ہوئے جھک کر مناہل کو بوسہ دیا۔ کمبل درست کر کے اپنے بیڈ پہ آگیا، جو بچوں کے بیڈ سے بازو بھر کے فاصلے پر تھا۔

"پاپا! آج اسکول میں پیرنٹس ٹیچرز میٹنگ ہے۔ آپ آئیں گے ناں۔" صبح ناشتے کی ٹیبل پہ سلجوق نے اسے بتایا تو توس پر جام لگاتے ہوئے اس کے ہاتھ رک گئے۔ لمحہ بھر کے توقف کے بعد بولا۔

"سوری جانو! آنا مشکل ہو گا مگر پرنسپل سے فون پر بات کر لوں گا۔ کانٹیکٹ تو میرا رہتا ہے ان سے۔" وہ پیار سے اسے سمجھاتے ہوئے بولا۔

"اوکے! ٹیچر نے کہا تھا اگر فادر بزی ہوں تو ماما کو لازمی آنا چاہیے۔" سلجوق نے کہتے ہوئے دودھ کا گلاس لبوں سے لگا لیا۔ عالی حسن نے بغور سلجوق کا چہرہ دیکھا۔ دکھ کی ایک لہر نے بے ساختہ اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ دل ایک دم سے ناشتے سے اچاٹ ہو گیا۔ سلجوق نے دودھ پی کر عادتاً زبان ہونٹوں کے گرد پھیری اور اسے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

"بیٹا! آپ ٹیچر کو بتا دیتے نا میرے پاپا ہیں ماما نہیں۔" اس نے بے ساختہ سلجوق کو گلے سے لگا لیا، اور نم آنکھوں سے اس کے بالوں پہ لب رکھ دیے۔



مشائم کی بیسٹ فرینڈ عفرا کی آج مہندی تھی۔ وہ دل لگا کر تیار ہوئی۔ زرد رنگ کی قمیص پہ سبز اور سرخ دھاگوں کا کام تھا۔ ساتھ میں فیروزی چوڑی دار پاجامہ اور سرخ بڑا سا دوپٹا۔ لمبے گھنے بالوں کو ڈھیلے ڈھالے پراندے میں قید کیا جس کے سروں پہ بے شمار ننھے

ننھے گھنگھرو لگے ہوئے تھے۔ آنکھوں میں کاجل اور لپ گلوس۔

بھائی سے تو وہ جانے کی اجازت کب سے لے چکی تھی' مسئلہ عفرا کے گھر ڈراپ کرنے کا تھا۔ خالد بھائی کی گاڑی سروس کے لیے گئی ہوئی تھی۔ اور رکشا مین روڈ پہ ہی مل سکتا تھا۔

"عمیر کو بلالوں۔" دل نے چپکے سے صلاح دی مگر دماغ انکاری تھا۔

"اونہہ۔۔۔ بھابھی خوامخواہ رُوڈ ہو جاتی ہیں اور پھر بلاوجہ مجھے اس کا لیکچر اور بھابھی کی باتیں سننی پڑتی ہیں۔" مگر جب دل کی مراد آتی ہے تو پاسبان عقل کے سارے مشورے دھرے رہ جاتے ہیں۔ عمیر کے ہاتھ میں برتھ ڈے انوی ٹیشن کارڈ تھا۔ اس کے بھتیجے ثمیر کی برتھ ڈے تھی جس کے لیے وہ انہیں مدعو کرنے آیا تھا۔ عمیر کو سامنے پاکر اس کے چہرے پہ جو رنگ اُترے سو اُترے تھے۔ عمیر خود اسے مبہوت سا دیکھنے لگا۔

"مجھے عفرا کے ہاں چھوڑنا ہے۔"

"ہاں تو چلو۔ اس سے بڑھ کر بھلا اور کون سا کام میرے لیے اہم ہو سکتا ہے۔" عمیر سنبھلا مسکرایا۔ وہ پُراعتماد سی اس کے پہلو بہ پہلو چلتی گاڑی میں بیٹھ گئی۔

"مائی گڈنیس! اتنی بیوٹی کہاں تھی آج سے پہلے تک۔ میں نے تمہیں ہمیشہ ایک ہی حلیے میں دیکھا بے حد رف اور سادہ۔ یو نو! آج میرا دل چاہ رہا ہے کہ سیدھا نکاح پڑھوا کے گھر لے جاؤں۔" وہ بے خود سا ذرا سا اس کی طرف جھک کر بولا۔

"سنبھل کے عمیر!" ناز سے مسکراتے ہوئے مشائم نے ذرا سا ٹوکا۔

"یار! جملہ حقوق اپنے نام باضابطہ طور پر کروانے کے بعد دیکھنا تمہیں میری چاہت کے کتنے روپ دیکھنے کو ملتے ہیں۔" وہ مخمور لہجے میں دھیمے دھیمے اس کے کانوں میں سرگوشیاں کر رہا تھا۔ عمیر کے یہی تیور تو مشائم کا کام تمام کیے دیتے تھے۔

✺ ✺ ✺

روز تو عصر سے پہلے پہلے تک ٹیوٹر سلجوق کو پڑھا کر رخصت ہو جاتا تھا' مگر آج نجانے کیوں ابھی تک پڑھائی جاری تھی۔

آفس سے واپسی تک اسے ایک ناقابل فہم سی بے چینی اور اضطراب گھیرے میں لے لیتے۔ ایک بے نام سا انتظار۔۔۔ جوں جوں وقت گزرتا جاتا' یہ کیفیات دوچند ہوتی جاتیں۔ وہ خود اپنی کیفیت سمجھنے سے قاصر تھا۔

"کیا بات ہے؟ ابھی تک ہمارے بیٹے کو چھٹی نہیں دی آپ نے؟" وہ کافی دیر تک اپنے کمرے میں سلجوق کے فری ہونے کا انتظار کرتا رہا' مگر سلجوق کے نہ آنے پر اسے خود ہی لاؤنج میں آنا پڑا۔

"جی سلجوق کے مڈٹرم ہو رہے ہیں نا' اس لیے ذرا ایکسٹرا ٹائم دینا پڑ رہا ہے۔" نوجوان ٹیوٹر نے متانت سے جواب دیا تو وہ مسکراتے ہوئے سر اثبات میں ہلا کر باہر آگیا۔

منال آپا کے ساتھ مصروف تھی۔ اگلے پندرہ منٹ بعد وہ پارک میں موجود تھا۔ سنگی بینچ خالی تھی۔ نجانے کیوں اس کے اندر مایوسی اترنے لگی تھی۔ اس نے چاروں طرف پارک میں نظر دوڑائی۔ ہر کونا آباد تھا' سوائے بینچ کے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیوں پارک میں چلا آیا ہے بغیر کسی ارادے و ضرورت کے بچوں کے بغیر' جن کو بہلانے کی خاطر وہ شام کے وقت تھوڑا سا پارک میں انہیں لے آتا تھا۔ آج تو وہ بھی نہیں تھے۔ اس نے واپسی کے ارادے سے قدم بڑھائے ہی تھے کہ وہ آتی ہوئی دکھائی دی۔ دھیرے دھیرے لنگڑا کر چلتی ہوئی' سرخ میرون شال اچھی طرح جسم پر لپٹی ہوئی تھی۔ وہ اپنی مخصوص جگہ پہ آکے بیٹھ گئی۔

عالی حسن کو یوں محسوس ہوا کہ جیسے اس کے دل کا

ایک کونا چپکے سے آباد ہو گیا ہو۔ ساری کلفت، سارا اضطراب نجانے کہاں منہ چھپا کے بھاگ گئے تھے۔

”تو کیا تم صرف اس لڑکی کو دیکھنے کی خاطر پارک آنے کے لیے بے تاب ہو رہے تھے؟“ دل نے اچانک اس سے سوال کیا اور وہ ششدر رہ گیا۔



کیسے مجھے تم مل گئیں؟
قسمت سے آئے نہ یقین

عمیر نے سی ڈی آن کی۔ گاڑی میں مدھر بول گونج اٹھے۔ سگنل پہ رکتے ہی پھول بیچنے والا لڑکا بھاگ کے آیا۔ عمیر نے سارے ہی لے لیے۔

”اف عمیر! اتنے سارے پھول لینے کی کیا ضرورت تھی۔ بس ہاتھوں کے لیے دو کنگن لے لیتے۔“ مشائم نزاکت سے ہاتھ پہ انگلیاں ٹکا کر بولی۔

”صرف ہاتھ ہی نہیں میں تمہیں پور پور پھولوں سے لدا دیکھنا چاہتا ہوں۔“ وہ گہری نظریں مشائم کے حیا آلود چہرے پہ ڈال کے بولا۔

”میری محبت اور چاہت ہماری زندگی کو پھولوں بھری رہگزر بنائے گی۔ ہر لمحہ مہکتا ہوا گزرے گا۔“

”میں نے غلطی کی تم سے لفٹ لے کر۔ اچھا تھا رکشے پہ چلی جاتی۔“ شدت جذبات سے بے تحاشا سرخ پڑتے چہرے کو چھپاتے ہوئے مشائم خفگی سے گھور کر بولی۔ سگنل کھل گیا۔ عمیر نے گاڑی آگے بڑھائی۔

”اچھا جی! ایسے کیسے چلی جاتیں۔ تمہارا یہ خادم خاص یہ ذمہ داری پوری طرح نبھائے گا۔ بس امی کو بھیجتا ہوں خالد بھائی سے ڈیٹ لینے کے لیے۔ اب مزید صبر نہیں ہوتا۔“ عمیر نے لہک کر مشائم کے کان میں جھک کر محبت سے کہا تھا کہ مشائم زور سے چیخی۔

”عمیر سامنے دیکھو۔ وہ ٹرالر۔۔۔“



چھٹی کا دن تھا اور وہ خوب انجوائے کر رہا تھا۔ سلجوق کے پسندیدہ چائنیز رائس بنائے۔ اس کے ساتھ بیٹھ کے کارٹون دیکھے۔ سکینہ بوا کی آمد سے دن مزید پر لطف ہو گیا۔ سکینہ بوا اباکی فرسٹ کزن تھیں۔ قصبے میں علاج معالجے کی تشفی بخش سہولیات کی عدم دستیابی کی بنا پر وہ شہر کا چکر لگاتی رہتیں۔ اس بار ڈاکٹر کے پاس آئیں تو ادھر بھی ملنے آگئیں۔

”بچے تو ماشاء اللہ سے بڑے ہو۔۔۔ رہے ہیں۔ پچھلی دفعہ آئی تو چھوٹی ان سی تھی۔ اب تو ماشاء اللہ بولنے لگ گئی ہے۔“ کھلونوں سے کھیلتی مناہل کو دیکھتے ہوئے بوا محبت بھرے انداز میں بولیں۔

”جی بوا! سلجوق تو ماشاء اللہ بہت ہی فرماں بردار بچہ ہے۔ مگر یہ مناہل بہت شرارتی ہوتی جا رہی ہے۔“ وہ چائے کا کپ بوا کو تھماتے ہوئے مسکرا کر بولا۔

”ابھی تو بچے چھوٹے ہیں۔ کم سن اور انجان۔ بڑے ہوں گے تو اتنی ہی ذمہ داریاں بڑھتی چلی جائیں گی۔ یہ ذمہ داریاں تم اکیلے نہیں اٹھا پاؤ گے۔“ چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے بوا نے اس کا چہرہ جانچا۔

”بچے چاہے جتنے بھی فرماں برادر اور نیک طبیعت ہوں۔ انہیں ماں کی ضرورت ہر وقت رہتی ہے۔ تمہاری محبت، توجہ بے شک بہت زیادہ ہے مگر ہزار ہا ایسے مسائل ہوتے ہیں، جن کو ایک عورت ہی سمجھ اور حل کر سکتی ہے؟“ عالی حسن کے لب بے ساختہ بھنچ گئے۔ وہ نفی میں سر ہلا کر بولا۔

”نہیں بوا! میں انہیں ماں اور باپ دونوں کا پیار دینے کی توفیق رکھتا ہوں۔“ انداز میں قدرے بے گانگی تھی۔

”ان دونوں کو تو چلو ماں باپ کا پیار مل رہا ہے۔ اور تم۔۔۔ تمہیں کیا مل رہا ہے۔ کب تک ایسی سونی زندگی بسر کرتے رہو گے۔ عورت کے وجود سے ہی گھر مکمل ہوتا ہے۔ ماشاء اللہ سے برسر روزگار ہو۔ صحت مند ہو۔ زندگی کی ہر نعمت ہے تو ایک جیون ساتھی کا انتخاب کرنے میں کیوں تامل کر رہے ہو؟“ بوا اس کے احساسات سے بے خبر ناصحانہ انداز میں بولے چلی

جارہی تھیں۔

"آپا پلیز! میری زندگی ان بچوں سے مکمل ہے۔ کسی اور فرد کی ضرورت نہیں ہے۔ میری محبت' توجہ بس ان ہی کے لیے وقف ہے۔ میں انہیں کسی بھی رشتے کی ناگواری و تلخی سے کوسوں دور رکھنا چاہتا ہوں۔" وہ ٹھہرے ہوئے انداز میں قطعیت سے بولا۔

"خدانخواستہ ناگواری و تلخی کیوں؟ میں بھلا کسی غیر ذمہ دار اور تنگ دل لڑکی سے شادی کا مشورہ تھوڑی دے رہی ہوں۔" بوا اس کے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھ کر دل سوزی سے بولیں۔

"تم کسی اچھی سی لڑکی سے شادی کرو۔ جو تمہارے دل کو بھلی لگے؟"

"اچھی سی لڑکی۔" چائے کے کپ کو بغور دیکھتے ہوئے عالی حسن تلخی سے مسکرادیا۔



اسٹیئرنگ پہ دھرے خوب صورت' نازک نسوانی ہاتھوں نے گاڑی کو انجانے راستے پہ ڈال دیا۔

"اے مادام! یہ اچھے بھلے منزل کو جاتے راستے کو چھوڑ کر آپ کس راہ چل دیں؟" عالی نے شگفتگی سے ابرش سے پوچھا۔

"اونہوں! منزل کی طرف جانے والا راستہ وہ نہیں' بلکہ یہ ہے۔" ابرش نے دلکشی سے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"دیکھو! مجھے سیدھا سیدھا گھر ڈراپ کردو۔ میرے بھائی ویٹ کررہے ہوں گے؟" عالی کے لہجے میں فکرمندی تھی۔ ابرش ہنستی چلی گئی۔

"توبہ ہے عالی! اسکول گوئنگ بچے کی طرح پریشان ہورہے ہو جیسے گھر وقت پر نہ پہنچنے پر تمہیں سزا ملے گی۔ تمہارا اسکول جانا بند ہوجائے گا۔ شاید پاکٹ منی بھی بند ہوجائے۔ ویری فنی!" ابرش مسلسل ہنسے چلی جارہی تھی۔

"اسٹاپ اٹ ابر! تمہیں پتا تو ہے بھائی میرے زیادہ دیر باہر رہنے کو اچھا نہیں سمجھتے۔" وہ اس کے مذاق اڑانے پہ ذرا خفا ہو کر بولا۔

"پھر بھی یار! تمہارے بھائی کو سمجھنا چاہیے کہ تم کوئی ننھے بچے نہیں ہو' ایم بی اے کے اسٹوڈنٹ ہو' تمہاری بھی سوشل لائف ہے۔ فرینڈز ہیں جن کو ٹائم دینا پڑتا ہے' کچھ چاہنے والے ہیں۔" بولتے بولتے آخر میں ابرش کا لہجہ دھیما اور گہرا ہو گیا۔

گاڑی ایک بے حد شان دار گھر کے سامنے جارکی۔ سفید ماربل سے تعمیر شدہ۔ مکمل پھولوں اور سبزے سے ڈھکا ہوا۔

"یہ کس کا گھر ہے؟" عالی کی حیرت فطری تھی۔

"تمہارا اور کس کا؟" ابرش گاڑی کی چابی ہوا میں اچھالتے ہوئے مسکرا کر بولی۔

"کیا مطلب' میں سمجھا نہیں۔" عالی نے ناسمجھی سے بھنویں سکوڑ کر پوچھا۔

"سمپل' شادی کے بعد ہم دونوں یہاں رہیں گے۔ ڈیڈ مجھے شادی کا گفٹ دے رہے ہیں۔" ابرش بڑا سا منقش بھاری لکڑی کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی۔ اس کے ایک ایک عضو سے ترنگ چھلک رہی تھی۔ جینز کے اوپر سرخ ٹاپ پہنے' ہائی ہیل کے ساتھ وہ اعتماد سے آگے بڑھتی جارہی تھی۔ عالی کے ماتھے پر بل پڑگئے۔

"واٹ ربش! میرا آل ریڈی ایک گھر ہے۔ تمہیں میری دلہن بن کر اسی گھر میں آنا ہے۔" وہ ناگواری سے ایک ایک لفظ جتا کر بولا۔

"اوہ نو عالی! وہ گھر؟" ابرش نے ناپسندیدگی سے ناک سکوڑ کر کہا۔

"ہاں! کیا وہ گھر! وہ گھر میرے ابا کی حلال کی کمائی کا بنا ہوا ہے۔ اسی گھر میں مراد بھائی اور میں نے اکٹھے تاحیات رہنا ہے۔ انڈراسٹینڈ!" وہ خلاف فطرت نسبتاً بلند آواز میں غصے سے بولا۔

"ٹھیک ہے اس ملک کے بہت بڑے انڈسٹریلسٹ

سجاد پاشوانی کی اکلوتی بیٹی ابرش سجاد اسے بہت اچھی لگتی تھی، کلاس میں اس کی ٹاپ پوزیشن سے وہ بری طرح متاثر ہو چکا تھا۔ ابرش کی ذہانت، اس کا اعتماد اور مضبوط کردار سب ہی تو اسے بھائے تھے مگر اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ وہ ابرش کو اپنے گھر یا مالی حیثیت کا مذاق اڑانے کا حق دے۔ اس کے ابا ابراہیم حسن ایک ایماندار، فرض شناس معلم تھے۔ تاحیات تدریسی فرائض انتہائی لگن اور دیانت داری سے انجام دیتے۔ حلال کی کمائی سے ان دونوں بھائیوں کی پرورش کی۔ خودداری اور خود اعتمادی تو اس کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھیں۔ اس لیے تو ابرش کی اپنے گھر پہ ناگواری کا اظہار اسے چابک کی طرح محسوس ہوا تھا۔

"اوہ کم آن ابرش! بیڈ روم دیکھو۔ اس کا انٹیریر میں نے خود پسند کیا ہے۔" وہ نازپرور تھی، نازنین تھی۔ محبوب کی ذرا سی برہمی اس کے لطیف و نازک جذبات پر گراں گزرنے لگی تھی، سو اس کا موڈ بحال کرنے کی خاطر موضوع بدل کر بولی۔

ٹراؤزر کی جیبوں میں ہاتھ گھسا کر عالی نے طویل و عریض بیڈ روم کا جائزہ لیا، ہر چیز سے امارت ٹپک رہی تھی۔

"ادھر بالکونی میں بیٹھ کر ہم چائے پئیں گے۔" ابرش اس کا ہاتھ تھام کے آگے بڑھنے لگی۔ اس نے آہستگی سے اپنا ہاتھ نازک گرفت سے چھڑایا۔ ابرش بے حد کھلے ماحول کی پروردہ تھی۔ باپ وسیع کاروباری سلطنت کا مالک تو ماں بیوٹی پارلرز کی چین کی چیئر پرسن۔ مگر اس کی تربیت خالص مذہبی و روایتی ماحول میں ہوئی تھی۔ اماں ابا دونوں مرحومین صوم و صلوۃ کے پابند ہونے کے ساتھ ساتھ مشرقی روایات کی جی جان سے پاسداری کرنے والے تھے۔ ایسے میں اتنے بڑے گھر میں یوں ابرش کا اسے تنہا کمرے میں لے آنا اس کی سلجھی اور متین طبیعت پہ گراں گزر رہا تھا۔ سو نرمی سے ابرش سے مخاطب ہوا۔

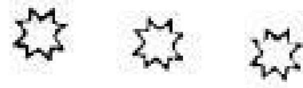
"آئی تھنک کافی وقت گزر چکا ہے۔ اب چلنا چاہیے۔"

"اونہوں! ڈنر نہیں تو چائے تو لازمی پی کر چلتے ہیں۔ کرم داد بس لانے والا ہی ہوگا۔" ابرش مطمئن سی کرسی پر بیٹھ گئی۔ اسی وقت عالی کے موبائل پہ کال آگئی۔

"اوہ! مراد بھائی کی کال ہے۔ آئی تھنک گھر واپسی کا کہتے ہوں گے۔" عالی نے کہتے ہوئے سیل آن کر کے کانوں سے لگایا۔

"جی بھائی! بس ذرا ایک دوست کے ساتھ کام تھا۔ ابھی پہنچ رہا ہوں۔" بات کرتے ہوئے وہ ابرش کو چلنے کا اشارہ کر کے بیڈ روم سے باہر نکل گیا۔

"یہ مراد حسن، کباب میں ہڈی، کبھی مجھے خوش نہیں ہونے دے گا۔" ابرش غصے سے مٹھیاں بھینچ کر بادل نخواستہ پیچھے چل دی۔



"دائیں ٹانگ ٹوٹ گئی ہے۔ دایاں کندھا بھی خاصا متاثر ہوا ہے۔ باقی سر، ہاتھوں اور کمر پہ تھوڑی بہت انجریز ہیں۔" ڈاکٹر نے مشائم کی ابتدائی رپورٹ خالد کو پڑھ کر سنائی۔ ان کا دل بے تحاشا دکھ سے بھر گیا۔

"میری پیاری بہن! کیسے سج دھج کے دوست کی شادی پر جا رہی تھی اور اب عضو عضو درد میں مبتلا ہے۔" وہ آبدیدہ سے پٹیوں میں جکڑی مشائم پہ جھک گئے۔ وہ مسکن ادویات کے زیر اثر سوئی ہوئی تھی۔ ٹانگ پہ پلستر چڑھا ہوا تھا۔ عمیر کی ڈریسنگ بھی اسی اسپتال میں کی گئی۔

"ہائے میرا لال! کیسے خونم خون پڑا ہے۔ اچھا بھلا بھتیجے کی سالگرہ کا دعوت نامہ دینے کو بھیجا تھا، کیا جی میں آئی کہ مشائم کو لے کر چل پڑا۔ مشائم خود بھی تو خالد کے ساتھ جا سکتی تھی۔ رکشا، ٹیکسی کر لیتی۔ میرے نازوں پلے بیٹے کا یوں حال نہ ہوتا۔" مامی راشدہ کا با آواز بلند رونا دھونا جاری تھا۔

"پلیز مامی! خدا کا شکر ادا کریں کہ کوئی جانی نقصان

دھک دھک دل سے بول...
مرحبا اسپغول









نہیں ہوا۔ چوٹیں ہیں۔ وقت کے ساتھ بھر جائیں گی۔" خالد نے بے ساختہ انہیں ٹوک دیا۔ مگران پہ خاک اثر نہ پڑا۔

"ہائے میرا بیٹا! مجھے پتا ہوتا تو تم لوگوں کی طرف نہ بھیجتی۔ فون پہ دعوت دے دیتے۔ زیادہ سے زیادہ تم لوگ ناراض ہو جاتے' فنکشن میں نہ آتے' مگر میرا عمیر یوں خون میں لت پت نہ پڑا ہوتا۔" غم سے نڈھال ہو کر وہ صوفے پہ گر گئیں۔

"امی! یہ حادثہ قسمت میں لکھا تھا۔ اگر مشائم اس سے ڈراپ کرنے کا نہ کہتی' تو کہیں اور جاتے ہوئے عمیر حادثے کا شکار ہو سکتا تھا۔ بیسیوں بار وہ اسے اپنی گاڑی میں لاتا لے جاتا ہے۔ بس اس بار نصیب میں یہ ایکسیڈنٹ لکھا تھا۔" خالد کو امی راشدہ کی باتوں پہ حد درجہ افسوس ہو رہا تھا۔

"ٹرالر ڈرائیور اور عینی شاہدین کے مطابق غلطی عمیر کی اپنی تھی۔ ٹرالر اپنے صحیح روٹ پہ چل رہا تھا۔ عمیر کی گاڑی اپنے روٹ سے ہٹ کر ٹرالر سے ٹکرائی تھی۔" اب کے خالد نے انہیں مختلف حقائق سے آگاہ کیا۔

"بکواس کرتے ہیں سب۔ آنکھیں پھوٹیں سب کی۔ میرا بیٹا کوئی اناڑی ڈرائیور تھا۔ انیسویں سال سے گاڑی چلا رہا ہے۔ اسے کوئی مرنے کا شوق تھا۔" وہ سخت جلبلا کر بولیں۔

"عمیر کا قصور بس اتنا ہے کہ وہ اپنا کام چھوڑ کر مشائم کو ڈراپ کرنے گیا۔" امی نے تنگ کر کہا۔

"پلیز! آپ لوگ شور نہ کریں۔ مریض ڈسٹرب ہو رہے ہیں۔" ایک نرس نے انہیں آکر ٹوکا۔

"خون میں لت پت تو میری بن پڑی ہے۔ اپنا بیٹا تو ٹھیک ٹھاک ڈریسنگ کروا کر بھی چلا گیا۔ چوٹیں کتنی تھیں' صرف بازو پہ رگڑ اور گردن پہ خراشیں۔" خالد یہ سب کچھ سوچ ہی سکے' امی راشدہ سے کہنے کی ہمت نہ ہو سکی۔ مبادا کہیں اور زیادہ شور نہ ڈال دیں۔

☆ ☆ ☆

شہنا کے لیے تو خواری ہی خواری تھی۔ گھر کے نہ ختم ہونے والے کام اور چھوٹے چھوٹے بچوں کا ساتھ۔ وہ تو صحیح معنوں میں چکرا کر رہ گئی تھی۔ کتنے سالوں سے مشائم سارے گھر کے کام خوش اسلوبی سے نمٹاتی چلی آرہی تھی۔ بے حد تابع داری اور دل لگا کے کھانا پکانا' صفائی' دھلائی کتنے ہی کام پھرتی سے کر دیتی تھی۔ شہنا کو تو اپنے چار بچے ہی کافی تھے۔ ناک میں دم کر دینے کی حد تک شریر۔ خالد کی موجودگی میں تو خاموش رہتی۔ مگر اس کے آفس جاتے ہی آپے سے باہر ہو جاتی۔

"لازمی جانا تھا دوست کی شادی پر' کتنا روکا مگر نہ۔ محترمہ سارے کام چھوڑ چھاڑ کر چل دیں' وہ بھی کس کے ساتھ جو اپنی ریش ڈرائیونگ میں خاندان بھر میں مشہور ہے۔ اب اچھا ہے' ہڈی پسلی تڑوا کے پلنگ توڑ رہی ہیں۔" بھابھی کے باآواز بلند جلے کٹے بھرے بخوبی اس تک پہنچتے رہتے۔ وہ کرب سے آنکھیں موندے لیٹی رہتی۔ جھنجلاہٹ کے مارے شہنا بچوں کو بھی دھنک ڈالتی۔ وہ بھاگ کے پھپھو کے کمرے میں پناہ لیتے۔ اپنی بے حد پیاری پھپھو کا یوں بستر سے لگے رہنا انہیں بے حد دکھی کرتا تھا۔ عمیر بھی تقریباً" روز آتا۔

"یار! قصور تمہارا تھا' نہ تم ایسی آفت لگتیں نہ میں بے خود ہوتا۔" وہ اس کا ہاتھ اپنے گرم و مضبوط ہاتھوں میں لے کر شرارت سے کہتا۔

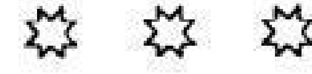
"اچھا جی! میں نے کہا تھا کہ اپنے ہوش و حواس کھو دیں۔ کتنی بار تو کیئر فل رہنے کے لیے ٹوکا تھا۔" وہ اس الزام پہ آنکھیں نکال کر اسے گھورتی۔

عمیر جب بھی آتا اس کے لیے چاکلیٹ' پھل' ڈرنکس اور ڈھیروں چیزیں لے آتا۔

"کیا تھا جو یہ چوٹیں مجھے لگ جاتیں۔ سارے زخم تم نے ہی اٹھا لیے۔" عمیر اس کے زرد چہرے پہ محبت بھری نظر ڈال کے بولا تو وہ بے ساختہ تڑپ اٹھی۔

"خدانخواستہ۔ میری تو دعا ہے کہ تم پر آئی ہر مصیبت میں اپنی جان پہ لے لوں۔" مشائم بھیگے لہجے

میں بولی تو عمیر بس اسے دیکھ کر رہ گیا۔ اس کی آنکھوں میں لفظوں کی سچائی رچی تھی۔



ابرش دبئی میں یوتھ فیسٹیول اٹینڈ کرنے گئی ہوئی تھی۔ واپسی پہ عالی کے لیے ڈھیر ساری چیزیں لے آئی۔ بیش قیمت ڈریسز' گھڑی' پرفیوم' نہ جانے کیا کیا۔ ساری چیزیں دبئی کے مہنگے ترین مالز سے خریدی گئی تھیں۔

"جناب! پسند آئیں؟" وہ عالی کو دیکھتے ہوئے مسکرا کر بولی۔

"جب میں انہیں لے ہی نہیں رہا تو پسند' ناپسند کا کیا سوال۔" عالی بے حد سنجیدہ تھا۔

"واٹ ڈو یو مین؟" ابرش نے آنکھیں نکالیں۔

"یہ میں تمہارے لیے لائی ہوں۔ اور تم نے انہیں خوشی سے وصول کر کے مجھے تھینکس بھی کہنا ہے' اور میرے ٹیسٹ کی تعریف بھی کرنی ہے۔" اب کے وہ دھونس بھرے انداز میں بولی۔

"تمہارا ذوق بھی قابل تعریف ہے اور بہت بہت شکریہ' لیکن تم اچھی طرح جانتی ہو' زیادہ برانڈڈ اور مہنگی اشیا پہننا مجھے پسند نہیں۔" عالی کا انداز ہنوز تھا۔ ابرش دل گرفتی سے اسے دیکھنے لگی۔

"میں نے تم سا بے مہر اور روڈ بندہ اپنی زندگی میں نہیں دیکھا۔ پتا نہیں ایسی کون سی بات تھی کہ میں تمہیں اپنا دل دے بیٹھی' تمہیں تو دل رکھنا بھی نہیں آتا' کسی کے جذبات کو کیسے مجروح کرنا ہے' تم بخوبی جانتے ہو۔ یو ریئلی ہرٹ می عالی!" ابرش کی آواز میں نمی گھلی ہوئی تھی۔

وہ بے ساختہ شرمندہ ہو گیا۔ وہ اسے رلانا کب چاہتا تھا۔

"پلیز ابرا! بچی مت بنو' فرینڈز میں تحائف کا تبادلہ ہوتا ہے۔ لیکن تم۔۔۔ مجھے اچھا نہیں لگتا اتنا سب کچھ لینا۔" وہ انگلی کی پور سے اس کی آنکھوں کی نمی سمیٹتے ہوئے محبت اور نرمی سے سمجھاتے ہوئے بولا۔

"تم بھی ناں' خواہ مخواہ اوور سینسیٹو ہو جاتے ہو۔" وہ بچوں کے سے انداز میں منہ بسور کر بولی تو عالی بے ساختہ مسکرا دیا۔

"نیکسٹ ویک میری برتھ ڈے آرہی ہے۔ تم بھی مجھے گفٹ دے دینا اچھا سا۔"

"ہاں ضرور۔۔۔ مگر میں برتھ ڈے پارٹی میں نہیں آؤں گا۔"

"یہ کیا بات ہوئی؟" وہ ایک دم روہانسی ہو کر بولی۔

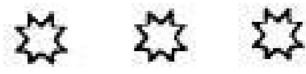
"میری برتھ ڈے پہ تم نہیں ہو گے تو میں سیلیبریٹ نہیں کروں گی۔"

"جو بھی کرو' میں نہیں آسکتا۔" وہ بے مروتی سے بولا۔ "سوڈو بوڈا اشرافیہ کے مجمع میں مجھے عجیب سی بے چینی ہونے لگتی ہے۔ ان کی بناوٹی باتیں' غرور و تکبر سے اکڑی گردنیں' ملک کی دولت کو دونوں ہاتھوں سے لوٹنے والے' سخت زہر لگتا ہے مجھے یہ سب کچھ۔" وہ صاف گوئی سے ابرش پہ اپنی ناپسندیدگی جتا کر بولا۔

"ہاں تو میں کوئی گیٹ ٹوگیدر نہیں کرنے والی۔ سیدھے سیدھے ریسٹورنٹ میں ایک ٹیبل ریزرو کرواؤں گی۔ پھر کینڈل لائٹ ڈنر کرتے ہوئے کیک کاٹوں گی۔" وہ مزے سے پروگرام سیٹ کرتے ہوئے بولی۔

"کوئی نہیں ہوگا۔ صرف میں' تم اور آنے والی زندگی کی ڈھیر ساری باتیں۔ یقیناً" تمہارا گفٹ رنگ ہوگا جو تم مجھے بڑی چاؤ سے پیار سے پہناؤ گے۔" ہاتھوں کے پیالے میں اپنا چہرہ رکھتے ہوئے ابرش عالی کو خوابناک نگاہوں سے تکتے ہوئے مخمور لہجے میں بولی۔

"اف! یہ رومان پسند لڑکی۔" عالی بے ساختہ ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گیا۔



"ارے مامی جی! کیسی ہیں آپ؟" مامی راشدہ اندر داخل ہوئیں تو مشائم انہیں دیکھ کر احتراماً" اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے بولی تھی کہ کندھے میں ایسا درد اٹھا کہ وہ کراہ کر دوبارہ لیٹ گئی۔ عمیر بھی ان کے ہمراہ

تھا۔ بے تابی سے آگے بڑھا۔

"پلیز تم لیٹی رہو۔ اٹھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

مامی راشدہ نے ایک کڑی نگاہ **عمیر** پہ ڈالی تھی۔

"ہاں بھئی مشائم! کیسی ہو؟ اچھی بھلی چلتی پھرتی پتا نہیں کیسے معذور ہو کر پڑی ہو۔ لڑکی ذات کے چہرے پہ ذرا سا ایک داغ پڑ جائے تو وہ بھی فکر مندی کی بات ہوتی ہے اور تم تو اپاہج ہو کر رہ گئی ہو۔ سچ پوچھو تو میری راتوں کی نیند اڑ گئی ہے۔" راشدہ نہایت دل سوزی سے بولیں۔ مشائم کے چہرے کا رنگ ایک دم پھیکا پڑا تھا۔

"مامی! الحمد اللہ اب میں پہلے سے کافی بہتر ہوں۔ باقی سب زخم تو ٹھیک ہیں بس یہ ٹانگ۔" مشائم کا لہجہ نجانے کیوں بھرا گیا تھا۔

"ہاں وہی تو۔ ٹانگ کی ہی تو بات کر رہی ہوں۔ انسان کے جسم کا ایک عضو ناکارہ ہو تو سارا جسم بے جان ہو کر رہ جاتا ہے۔ معذور بندہ تو خود ہر کسی کا محتاج ہوتا ہے بجائے اس سے کسی کام یا کسی خدمت گزاری کی توقع رکھی جائے۔" مشائم کے جسم سے درد کی لہریں اٹھنے لگیں۔ **عمیر** بغور اس کے چہرے پہ اذیت کی زردی دیکھ رہا تھا۔

"اچھا امی! نوٹ کریں، مشائم کے بیڈ ریسٹ لینے پہ **شینا** بھابھی کا کتنا نقصان ہو رہا ہے۔" وہ نیم مزاحیہ انداز میں ماں سے مخاطب ہوا۔ مقصد ماں کی باتوں کا اثر مشائم پر سے زائل کرنا تھا۔

"ہاں اس مہارانی کے طور طریقے تو دیکھو۔ سلام کرنے کے بعد شکل تک نہیں دکھائی۔ نہ خاطر نہ تواضع۔ سالوں کا بغض سینے میں دبائے پھرتی ہے۔ اب میں ساس کی جگہ پر ہوں۔ مگر نہ جی! کوئی ادب لحاظ نہیں۔" وہ اپنے مخصوص کڑے لہجے میں بولیں۔

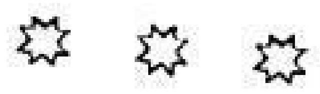
"اور خالد... بھلا اس نے بھی بزرگوں والا احترام دیا ہے، جو اس کی بیوی میری تعظیم کرے۔ کب سے آئے بیٹھے ہیں۔ مہارانی نے پانی تک کا نہیں پوچھا۔ ایسے گھر آنے کا فائدہ جہاں خاک عزت ہو رہی ہو۔"

"امی! آپ **شینا** بھابھی کو چھوڑیں، انہیں زاریہ باجی کی نسبت سے ہمیں عزت دینا اچھا نہیں لگتا ہوگا۔" **عمیر** ماں کے شانے دبا کر انہیں ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرنے لگا تو انہوں نے اس کا ہاتھ پرے جھٹک دیا۔

"مشائم ابا کی بھانجی ہے۔ ساری خدمت اور خاطر داری آپ کو اس سے مطلوب ہونی چاہیے، **شینا** بھابھی تو غیر خاندان کی ہیں۔ ان کا کیا گلہ کرنا۔ مشائم تو ساری زندگی آپ کی خدمت کرتی چلی آ رہی ہے۔ بس آپ کی توقعات اس سے وابستہ ہونی چاہئیں۔" **عمیر** مخاطب تو ماں سے تھا مگر دیکھ مشائم کو رہا تھا جس کی آنکھیں مان اور قدردانی کے احساس سے جھلملا رہی تھیں۔

"ہونہہ مشائم سے خدمت کی امید رکھوں؟ جو خود پانی تک کے لیے دوسروں کی محتاج ہے۔"

راشدہ مامی کے تلخ انداز نے تو مشائم کی روح تک کھینچ لی تھی۔



وہ آج مکمل عالی کی پسند کے مطابق تیار ہوئی تھی۔ گھیر دار ڈیزائنر فراک، چوڑی دار پاجامہ، بالوں کا اونچا جوڑا بنایا تھا۔ کانوں میں ڈائمنڈ کے ٹاپس۔

"آج تو محترم سے تعریف اگلوا کر رہوں گی۔ نظرو انداز میں ڈھیر ساری ستائش مگر منہ سے ایک لفظ نہیں پھوٹتا۔" وہ خود پہ ڈھیر سارا پرفیوم اسپرے کرتے ہوئے دل میں بولی۔

عالی کو اس کی ڈریسنگ پر اعتراض ہوتا تھا۔ اس لیے تو آج اس خاص موقع کی مناسبت سے عین عالی کی پسند کے مطابق تیار ہوئی تھی۔

ابرش جتنی بولڈ، جذبات کا بھرپور اظہار کرنے والی لڑکی تھی، عالی اتنا ہی محتاط طبیعت کا حامل تھا۔ وہ شوخ تھی، چنچل تھی، رومانس کوٹ کوٹ کر اس کی فطرت میں بھرا ہوا تھا اور عالی اتنا ہی نپے تلے انداز میں گفتگو کرنے والا۔ ابرش کبھی کبھی تو اس کے لیے دیے والے انداز پہ سخت جھنجلا جاتی تھی۔ اپنے جذبوں کی

خاطر خواہ پذیرائی نہ ہونے پر وہ بری طرح سیخ پا ہوتی۔ حالانکہ عالی کی سنجیدہ و متین طبیعت نے ہی اسے اس کی طرف مائل کیا تھا۔ اس کے ٹھہرے ہوئے بولنے کے انداز نے ہی گھائل کیا تھا۔ پھر بھی دل شدت سے اس کے والہانہ انداز کا تمنائی رہتا۔ اس کی طرف سے وارفتگیوں کا منتظر!

ریسٹورنٹ میں آئے ہوئے اسے کافی دیر ہو چکی تھی، مگر عالی کا ابھی تک کوئی پتا نہ تھا۔ وہ بے تابی سے داخلی راہداری کو دیکھ رہی تھی، مگر تاحال اس کی آمد نہیں ہوئی تھی۔ ویٹر اس سے کیک اور دیگر لوازمات سرو کرنے کی اجازت طلب کر رہا تھا مگر اس نے انکار کر دیا۔

"ابھی نہیں، میرے فرینڈ نے آنا ہے۔" جوں جوں وقت گزر رہا تھا، اس کی بے چینی دوچند ہوتی جا رہی تھی، بارہا فون کیے جواب ندارد!

اتنے میں عالی کی کال آ ہی گئی۔

"عالی کہاں رہ گئے ہو۔ تمہیں پتا ہے میں کب سے تمہارا ویٹ کر رہی ہوں۔" آواز سنتے ہی وہ خفگی سے بولنے لگی۔

"سوری ابرش! آج میرا آنا ممکن نہیں۔" عالی کا انداز شرمندگی لیے ہوئے تھا۔

"واٹ! کیا کہہ رہے ہو۔ تم نے آنا ہے، بس۔" وہ اتنے زور سے چیخی کہ ساتھ بیٹھے افراد گردن موڑ کر اسے دیکھنے لگے تھے۔

"مراد بھائی کی طبیعت خراب ہے۔ ایک ڈیلی گیشن سے انہیں ملنا تھا، وہ تو نہیں جا سکتے، سو مجھے ہی انہیں اٹینڈ کرنا پڑے گا۔" عالی مدھم لہجے میں بتا رہا تھا۔

"مراد حسن! آئی ول کل یو۔" ابرش نے زور سے موبائل ٹیبل پہ پٹخا تھا۔

☼ ☼ ☼

"عمیر تمہیں معلوم ہے، آج میں کچن میں گئی ہوں، ماہم کی فیورٹ اسپیگیٹی بنائی ہے۔" کال پہ مشائم نے عمیر کو خوشی سے لرزتی آواز میں بتایا۔

"ویری گڈ! اسی طرح مضبوط قوت ارادی سے تم اپنی زندگی پھر سے پہلے جیسی، جاری رکھ سکتی ہو؟" عمیر نے ہمیشہ کی طرح اس کے حوصلوں کو سراہا تھا۔

"نہ صرف کچن میں، بلکہ پورے گھر کا چکر لگایا، پودوں کی گوڈی کی، اپنے کمرے کی صفائی کی۔"

"مگر تمہاری ٹانگ؟" عمیر کہتے کہتے رک گیا۔

"ہاں اب درد نہیں ہوتا ٹانگ میں، پہلے ہوتا تھا، میں ہلکی پھلکی ایکسر سائز کرتی رہتی ہوں نا۔" وہ معصومیت سے بولی۔

"پھر بھی مشائم! تمہیں چلنے میں تھوڑی، بہت دقت تو ہوتی ہو گی؟" عمیر نجانے کیا پوچھنا چاہ رہا تھا، وہ خاموش رہ گئی۔

"امی پھر ہمارے گھر نہیں آئیں۔ انہیں کب لاؤ گے۔" چند لمحوں کے توقف کے بعد اس نے پوچھا۔

"امی بہت بزی رہتی ہیں۔ تم جانتی تو ہو سیلہ بھابھی بھائی کو لے کر الگ ہو گئی ہیں۔ ایک گھر میں دو دو کچن، وہی ازلی ساس بہو کی چپقلش اس لیے ٹائم نہیں نکال پاتیں۔"

"ان شاء اللہ! امی کو مجھ سے ایسی کوئی شکایت نہیں ہو گی۔ بہت مثالی تعلقات ہوں گے ہم دونوں کے۔ تم دیکھنا؟" مشائم کے لہجے میں مان اور یقین بول رہے تھے۔

☼ ☼ ☼

مناہل کو بہت تیز بخار تھا۔ وہ اسے ایک منٹ کے لیے چھوڑ — نہیں رہی تھی۔ مسلسل گود میں بیٹھی روئے چلی جا رہی تھی۔ آفس جانا بھی لازم تھا۔

شومئی قسمت، انہی دنوں آپا جی کے عزیزوں میں کوئی فوتگی ہو گئی، وہ تو وہاں چلی گئیں۔ سلجوق کا ناشتا، لنچ، اسکول بیگ تیار کرنے میں وہ صحیح معنوں میں بوکھلا کر رہ گیا تھا۔ سلجوق شام کو پارک چلنے کا کہتا تو دل اس کا ہم نوا ہو جاتا، مگر مناہل کو یوں اکیلا گھر میں چھوڑ کر جانا بھی ممکن نہیں تھا۔ سو دل مسوس کر رہ گیا۔

☼ ☼ ☼

مشائم کے گھر کے کاموں میں ہاتھ لگتے ہی شہنا کی جان میں جان آگئی تھی۔ رویہ بھی پہلے سے بہت بہتر ہو گیا تھا۔ اب خود بھی مشائم کے ساتھ لگی رہتی تھی۔

"مجھے ناہید بھابھی نے بتایا ہے کہ مامی راشدہ کا ارادہ مارچ میں عمیر کی شادی کرنے کا ہے؟" مٹر چھیلتے ہوئے شہنا مشائم کے چہرے کو دیکھتے ہوئے بولی۔ اس وقت مشائم لنچ کی تیاری میں لگی ہوئی تھی' شہنا بھی اس کی مدد کے ارادے سے کچن میں آگئی۔ بھابھی کی بات سن کر مشائم کے چہرے پر کئی رنگ بکھر گئے تھے۔ آنکھیں کسی احساس سے چمک اٹھی تھیں۔

"اچھا' عمیر نے تو ایسی کوئی بات نہیں بتائی۔" مسکاتے لبوں سے جواب دیا۔

"ویسے عمیر نے کافی دنوں سے چکر نہیں لگایا' فون تو آتا ہوگا اس کا۔" شہنا نے چھلکے سمیت کرڈسٹ بن میں ڈال دیے۔ مشائم کے چاول بھگوتے ہاتھ شہنا کی بات سن کر تھم گئے تھے۔

"جی کال آئی تھی' کہہ رہا تھا کچھ بزنس کی پرابلمز ہیں۔" اس نے پلو سے ہاتھ پونچھتے ہوئے جواب دیا۔

"پورے دو ہفتے ہوگئے ہیں عمیر نے چکر تک نہیں لگایا" اس نے دل ہی دل میں دنوں کا حساب لگایا۔ سوچتے ایک اور بات ذہن میں اٹک گئی۔

"چلو آنا نہ سہی' کال بھی اب کم کرتا ہے؟" دل میں ادھم مچاتے منفی خیالات کو پرے کرتے ہوئے اس نے خود کال ملالی۔

"ہیلو عمیر! کہاں ہو' اتنے دن سے کوئی کال نہ میسج۔" وہ شکوہ کناں انداز میں گویا ہوئی۔

"بتایا تھا ناں عذیر بھائی بزنس کو پھیلا رہے ہیں' سو فراغت نہیں ملتی۔" عمیر ہموار انداز میں بولا۔

"کال اور میسج کرنے کا بھی وقت نہیں ملتا۔ ایسی کون سی بزنس ایمپائر چلا رہے ہو۔" لٹ کانوں کے پیچھے اڑستے ہوئے پوچھا۔

"زیادہ طنز کرنے کی ضرورت نہیں' کوئی چھوٹا موٹا کاروبار نہیں ہمارا۔ خود تو سارا دن ریسٹ کرتی رہتی ہو اور میری مصروفیات پہ شک کیا جارہا ہے۔" عمیر خاصے روکھے لہجے میں بولا۔

"میں کہاں ریسٹ کررہی ہوں۔ گھر کے سارے کام کرتی ہوں پہلے کی طرح۔ تم دو ہفتوں سے آئے جو نہیں ہو۔ ورنہ مجھے دیکھتے۔" وہ روہانسی ہو کر بولی۔ عمیر کے روکھے لہجے نے اس کی آنکھوں کو نم ناک کردیا تھا۔

"اور تم مجھے باہر بھی نہیں لے کر گئے۔ کب سے میں نے باہر کی دنیا نہیں دیکھی۔ نہ شاپنگ' نہ ہوٹلنگ۔ واک کرنے بھی نہیں گئی۔ پلیز تم آؤ ناں مجھے باہر لے جاؤ۔" سنبھل کر اس نے بات کا رخ بدلنے کو کہا۔

"مشائم! میں تمہیں ایک بار واک پہ لے گیا تھا۔ میں دو منٹ میں دس قدم چلتا ہوں اور تم دس منٹوں میں دو قدم۔ خود سوچو میں اور تم ایک ساتھ کیسے چل سکتے ہیں۔ میں ٹھہرا تیز رفتار۔ اور تم چلنے میں کافی وقت لیتی ہو۔ میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہوتا۔ مشائم!" عمیر کا لہجہ تو بے حد نرم تھا مگر الفاظ۔ مشائم کتنی دیر خالی الذہنی سے موبائل کو بیٹھی گھورتی رہی۔

☼ ☼ ☼

"مامی جی! آپ زیادتی کررہی ہیں۔" خالد بے حد سنجیدہ اور رنجیدہ تھے۔

"کون سی زیادتی میاں! اپنے بیٹے کو بیاہ رہی ہوں' یہ زیادتی ہے؟ اپنے فرض سے سبکدوش ہو رہی ہوں تو کیا گناہ ہے؟" مامی راشدہ حیرت سے بولیں۔

"اور میری بہن! اس کا کیا مستقبل ہوگا۔ ہم کیا جواز دیں گے دنیا کو آپ کے اس فیصلے کا؟" خالد نے کڑے ضبط سے پوچھا ورنہ دل تو سارے ادب آداب بالائے طاق رکھنے کو چاہ رہا تھا۔

"ارے بچے! دنیا جانتی ہے کہ مشائم ٹھیک سے چل نہیں پاتی۔ خدانخواستہ میرے بیٹے میں کوئی عیب

نہیں جو اسے مشائم سے بیاہ دوں۔ اور دوسری بات مجھے ایسی بہو چاہیے جو میرے گھر کے سارے کام دوڑ دوڑ کر انجام دے۔ بڑی بہو رانی تو خیر سے شوہر کو لے کر الگ ہو چکی ہیں۔ اب میں گھٹنوں کی مریض' کام نہیں کر سکتی۔ میری بھتیجی صومیہ خیر سے بڑی قابل اور سگھڑ ہے۔" ان کے انداز میں شیرینی گھل گئی تھی۔

"مشائم بھی پورا گھر سنبھالنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ میرا پورا گھر وہ خوش اسلوبی سے چلا رہی ہے۔" شینا جس نے کبھی مشائم کی خدمت اور کارگزاری کا اعتراف نہیں کیا تھا' اب مشائم کی حمایت میں کھل کر بول رہی تھی۔ "اتنی تابع دار اور نیک طبیعت۔ پورے دس سال ہو گئے ہیں میری شادی کو۔ کبھی پلٹ کر مجھے جواب نہیں دیا۔"

"مامی جی! اگر اس ایکسیڈنٹ میں **عمیر** کی ٹانگ ٹوٹ جاتی تو کیا آپ اس طرح مشائم کے لیے انکار کر سکتی تھیں؟" خالد نے مجروح نظروں سے انہیں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"میں انکار نہ کرتی بلکہ اس وقت تم انکاری ہو جاتے اپنی بہن کسی لنگڑے سے بیاہنے میں؟" ان کا اعتماد قابل دید تھا۔

"ناممکن۔ میری بہن کبھی بھی **عمیر** کو نہ چھوڑتی۔ چاہے دونوں ٹانگوں سے بھی معذور ہو جاتا' کیونکہ یہ اماں اور ماموں کی طے کردہ نسبت تھی جسے آپ توڑ رہی ہیں۔"

"ہاں جانتی ہوں' یہ مرحوم کا طے کردہ رشتہ ہے مگر جب **عمیر** خود ہی راستہ بدلنا چاہ رہا ہے تو میں اس کے راستے کی کیوں دیوار بنوں؟" مامی راشدہ اب کے قدرے دھیمے لہجے میں کہہ کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔

ان کی بات سن کر **شینا** اور خالد کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔



بے تحاشا محبت کے امین
بے وجہ چھوڑ بھی تو جاتے ہیں

"نہیں بھابھی! آپ غلط کہہ رہی ہیں' مامی ایسا نہیں کہہ سکتیں۔ وہ جانتی ہیں **عمیر** اور میں ایک دوسرے کے بغیر نہیں رہ سکتے۔" وہ بے یقینی سے **شینا** کو جھٹلا رہی تھی۔

"مجھے کوئی ضرورت نہیں ہے جھوٹ بولنے کی۔ مارچ میں **عمیر** کی صومیہ سے شادی طے ہے۔ یہ دیکھو کارڈ۔" **شینا** نے سائیڈ ٹیبل سے کارڈ اٹھا کر اسے تھمایا' وہ بے یقینی سے آنکھیں پھاڑے **عمیر** کے ساتھ صومیہ کا نام دیکھے گئی۔

"نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ یقیناً" آپ نے مامی سے مس بی ہیو کیا ہو گا' تب ہی انہوں نے اتنا ظالمانہ فیصلہ کیا ہے۔ آپ چاہتی ہی نہیں کہ میری **عمیر** سے شادی ہو۔ آپ ان کی ریسپیکٹ نہیں کرتی تھیں' اس لیے۔" وہ ایک دم سے چیخنے لگی تھی۔ ناخن سے زور زور سے کھرچ کر صومیہ کا نام کارڈ سے مٹا ڈالا۔

"کچھ بھی کر لو۔ صومیہ **عمیر** کا نصیب ہے۔ تم اس کے نصیب میں نہیں ہو۔" **شینا** زور دے کر بولی۔

"یہ مامی نے **عمیر** کو بہکایا ہو گا۔ ورنہ **عمیر** تو میرے علاوہ کسی اور کا سوچ ہی نہیں سکتا۔ وہ محض ٹانگ کو جواز بنا کر کیسے راستہ بدل سکتا ہے۔ اسے تو میرے دل سے غرض تھی۔ میں بات کرتی ہوں **عمیر** سے۔"

"کچھ بھی کر لو۔ یہ **عمیر** کا اپنا فیصلہ ہے۔ اسے کسی نے مجبور نہیں کیا۔" **شینا** اسے پاگلوں کی طرح نمبر ملاتے دیکھ کر ترحم سے بولی تھی۔

عمیر نے راستہ ہی نہیں اپنا نمبر بھی بدل لیا تھا۔



غم بھی جزو زندگی ہے لیکن
زندگی اشک اور آہ نہیں

مشائم لاؤنج کی صفائی کر رہی تھی۔ **شینا** صوفے پہ آلتی پالتی مارے بیٹھی اپنا پسندیدہ مارننگ شو دیکھ رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں موبائل تھا جس پر وہ پروگرام میں لائیو کال لینے کی کوشش کر رہی تھی۔

”پتا نہیں کیا پرابلم ہے نمبر مل کے نہیں دے رہا۔“

”اچھا مشائم! خالد بتا رہے تھے کل لنچ پر کچھ لوگ آ رہے ہیں۔ لنچ زبردست ہونا چاہیے۔“ شینا اچانک یاد آنے پر بولی۔

”کون لوگ اور آنے کا مقصد؟“ اس کی نظر میں استفسار تھا۔

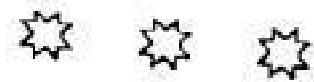
”خالد کے بہت اچھے فرینڈ ہیں اشفاق۔“ بولتے ہوئے شینا نے مالٹا اٹھا کر چھیلنا شروع کر دیا۔

”اس کے ایک بھائی ہیں، مطلب اشفاق کے بھائی آفاق، ان کے رشتے کے لیے یہ فیملی آ رہی ہے۔ بہت ایجوکیٹڈ اور سلجھی ہوئی فیملی ہے۔ خالد بہت تعریف کر رہے تھے۔“ وہ تین اکٹھی قاشیں منہ میں رکھتے ہوئے شینا نے اس کا چہرہ بغور دیکھا۔ جہاں پر سختی چھانے لگی تھی۔

”بھائی کو منع کر دیں۔ ان لوگوں کے آنے کی کوئی ضرورت نہیں۔“ وہ قطعیت سے کہہ کر رخ موڑ گئی۔ آنسو بھر بھر آنکھوں میں چلے آ رہے تھے۔ کچھ بھی صاف نظر نہیں رہا تھا، سب کچھ دھندلا ہو چلا تھا۔

”خواہ مخواہ، ایویں منع کر دیں۔ اتنا اچھا رشتہ ہے۔ زندگی بس دکھی یادوں کو سینے سے لگائے رکھنے کا نام نہیں ہے۔ عمیر کے جذبوں میں کھوٹ تھا، نیت میں خلوص نہ تھا۔ بزدل تھا، اس لیے بیچ راستے میں چھوڑ گیا۔ اس نے تو اپنی دنیا بسالی، اگلے ماہ اس کا بے بی آ جائے گا اور تم کب تک پیروں کے چھالے ٹھیک ہونے کا انتظار کرتی رہو گی۔ اس نے تو بھاگ کر اپنی منزل کو پا لیا۔“ شینا حد درجہ صاف گوئی اور کھرے پن سے بولی۔ مشائم کے کمزور رخسار آنسوؤں سے تر ہونے لگے۔

شینا نے اسے رونے دیا۔ اس وقت کسی قسم کا دلاسا غیر ضروری لگ رہا تھا۔ اچھا ہے رو رو کر عمیر کی یادوں کو اپنے دل سے دھو ڈالے۔



اشفاق اینڈ فیملی واقعی بہت اچھی تھی، مشائم بھی انہیں بہت پسند آئی تھی۔ بے حد معصوم اور من موہنی صورت والی۔ سادہ و پُرکشش۔ خالد اور شینا مشائم کے رویے پر بہت خوش تھے۔ کہاں تو وہ اندر آ کر ملنے سے بھی انکاری ہو رہی تھی اور کہاں ان خواتین سے سلیقے سے بات چیت کر لی۔ مگر ان کی یہ خوشی مہمانوں کے جاتے ہی کافور ہو گئی۔

”اچھا یہ آفاق صاحب میرے لیے آپ کو پسند آ گئے ہیں۔ ادھیڑ عمر اور دو بچوں کے والد محترم۔“ خالد کی نظروں میں بے خوفی سے دیکھتے ہوئے اس نے طنز سے پوچھا۔

”مشائم! آفاق بس میری ایج کا ہے یا مجھ سے دو تین سال بڑا۔ کم عمری میں شادی ہو گئی۔ نصیب میں صاحب اولاد ہونا لکھا تھا۔ بیوی سے نبھ نہ سکی۔ اب یہ ایسی باتیں تو نہیں ہیں کہ جن کو لے کر ہم بلاوجہ انکار کر دیں۔“ خالد اس کے قریب آ کے محبت سے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر قائل کرنے والے انداز میں بولے۔

”کیوں، میں کوئی اندھی ہوں، بہری ہوں، پھوہڑ یا بدکردار ہوں جو دو بچوں کے باپ کے ساتھ چلی جاؤں۔“ وہ ہٹ دھرمی سے چلا کر بولی، آنکھیں آنسوؤں سے لبالب بھری ہوئی تھیں، شینا اور خالد نے پریشان ہو کر ایک دوسرے کو دیکھا تھا۔

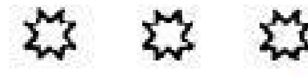
”یہ مشائم کا تو انداز نہیں۔“

”آپ کی اپنی بیٹی ہوتی تو اس کے لیے اعلیٰ سے اعلیٰ گھر تلاش کرتے اور میرے لیے برتا ہوا مرد جس کے دل اور جذبوں پہ کسی عورت کا تصرف رہ چکا ہو۔ اتنی بھاری پڑ گئی ہوں میں آپ پر۔“ وہ صوفے پر بیٹھ کر زور زور سے ہانپتے ہوئے بول رہی تھی۔

”ہاں اگر ہماری بیٹی تمہاری عمر کی ہوتی تو ہم ضرور اسے دو بچوں کے باپ کے ساتھ رخصت کر دیتے کیوں کہ فرض کو پورا کرنے کی بھی ایک عمر اور وقت ہوتا ہے۔ ہم وقت ضائع بالکل نہ کرتے۔“ خالد کے بجائے شینا اس سے مخاطب ہوئی۔ بالکل دو ٹوک انداز میں۔

"شینا پلیز!" خالد نے اسے مزید بولنے سے روکا۔

"نہیں خالد! مجھے کہنے دیں، یہ جتنی جلدی حقیقت کو قبول کرتے ہوئے کوئی فیصلہ کرے گی' اتنا ہی خوش رہے گی۔ اس کی عمیر سے نسبت ٹوٹ چکی ہے۔ ٹانگ میں نقص آچکا ہے۔ پھر بھی یہ بہت ہی ہائی فائی قسم کے پرپوزلز کی امید لگائے بیٹھی ہے تو یہ اس کی خام خیالی ہے۔" شینا کا حرف بہ حرف درست تھا' مگر وہ اپنی بکھری ہستی کو کیسے اتنی جلدی سمیٹ پاتی۔ مشائم نے سر صوفے کی پشت سے ٹکا دیا تھا۔



جیسے تیسے ہی سہی زندگی اپنی پرانی ڈگر پر لوٹ آئی تھی۔ وہ پہلے کی طرح گھر کے سارے کام نمٹاتی خوشی خوشی۔ فارغ وقت میں کبھی کبھار شام کو نزدیکی پارک کا چکر لگا لیتی۔ بھانت بھانت کے لوگوں کے چہروں کو دیکھنا' ان کی آوازیں سننا اسے اچھا لگتا۔ خالد بھائی کے بچوں کو تو وہ شروع سے پڑھاتی آرہی تھی۔ ہمسایوں میں سے ایک دو نے اس سے ٹیوشن مانگی تو اس نے ہامی بھرلی۔ مہینہ بھر میں کافی بچوں کی تعداد ہوگئی۔ اس کا وقت بہت مصروف اور ہلکا پھلکا گزرنے لگا تھا۔

"لو بھئی مشائم! سنبھالو اپنے نئے اسٹوڈنٹس۔ اچھی طرح توجہ اور محنت سے پڑھانا ہے۔"

اس شام خالد بھائی دو بچوں کو ہمراہ لیے گھر میں داخل ہوئے تھے۔

وہ پین رکھ کر دلچسپی سے بچوں کی طرف متوجہ ہوئی۔

"نئے ہمسائے ہیں۔ ان کے فادر نے شاید بچوں کو بیگ اٹھائے ہمارے گھر آتے جاتے دیکھا ہوگا' اس لیے مجھ سے ٹیوشن کی بات کرلی۔" خالد نے مسکراتے ہوئے بتایا۔ پھر بچوں کی طرف مڑے۔

"چلو بچو! شاباش اپنی بکس نکالو۔ آنٹی آپ کو پڑھائیں گی۔"

سلجوق نے تابع داری سے سر ہلاتے ہوئے بیگ کھول لیا' جبکہ منال کی توجہ برآمدے میں رکھے آسٹریلین طوطوں کی طرف تھی۔ اپنی چلبلی اور باتونی فطرت کی بدولت وہ گھر بھر کا دل موہ چکی تھی۔

"مشائم! انہیں بہت پیار اور توجہ سے پڑھایا کرو۔ ان کی مدر کی ڈیتھ ہوچکی ہے۔" خالد بھائی نے اسے بتایا تو اس کا دل بے تحاشا دکھ سے بھر گیا۔



آج وہ کتنے دنوں بعد پارک میں آئی تھی۔ اوائل مارچ کی ٹھنڈی میٹھی شام میں قسم قسم کے پھول اپنے منہ بند کرنے لگے تھے۔ وہ دھیرج سے بینچ پہ بیٹھ گئی کہ اچانک ایک سمت سے منال دوڑتی ہوئی آئی اور بینچ پہ چڑھ کر اس کی گود میں بیٹھ گئی۔

"ارے منال صاحبہ! آپ یہاں کہاں سے آگئیں۔" اس نے منال کے براؤن گھنگھریالے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے مسکرا کر پوچھا۔

"بابا کے ساتھ آئی ہوں۔" منال نے توتلی زبان میں بتایا۔

"پرنسس! آپ یہاں کہاں بیٹھ گئیں؟" عالی حسن نے بے حد حیرانی سے اسے اس لڑکی کی گود میں بیٹھے دیکھا۔ کتنے مزے سے وہ اس کی گود میں چڑھی بیٹھی تھی اور اس نے بھی تو منال سے مسکرا کر بولنا شروع کردیا تھا۔ وہ سلجوق اور منال کو لے کر جونہی پارک میں داخل ہوا تو منال اس سے ہاتھ چھڑا کر بھاگتے ہوئے اس کی گود میں جا بیٹھی تھی جیسے برسوں کی آشنائی ہو اس سے۔ اسی کی گود میں جسے بلاشبہ دیکھنے کی خاطر وہ بچوں کو لے کر پارک میں چلا آتا تھا اور جسے ٹین ایجر کی طرح یک ٹک دیکھنے کے سوا ابھی تک وہ اور کچھ نہ کرپایا تھا۔ نہ آگے بڑھ کر اس کا نام پوچھنے کی ہمت خود میں پیدا کرپایا تھا' نہ اپنا تعارف' صرف یہی سوچ کر "وہ میرے بارے میں کیا سوچے گی۔ مجھے کوئی غلط قسم کا انسان نہ سمجھ لے۔ میرے بارے میں کوئی ایسا ویسا تاثر نہ لے لے۔" کتنے ہی خدشات تھے جنہوں نے دل کو دبک کر رہنے پر مجبور کیا تھا۔ وہ خود

بھی تو استفہامیہ نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"پاپا! یہ ہماری ٹیوشن والی آنٹی ہیں۔ مشائم آنٹی۔ ہم ان کے گھر پڑھنے جاتے ہیں۔" سلجوق نے تعارف کروایا۔

"اوہ! بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔" دل سے بے ساختہ اٹھتی خوشی کی لہروں کو دباتے ہوئے وہ بظاہر نارمل اور تہذیب سے بولا۔

"آپ کے بچے بہت سوئیٹ ہیں۔" مشائم ذرا سا مسکرا کر بولی۔

"آپ یہ بات سلجوق کے لیے کہہ سکتی ہیں۔ اس ناٹی گرل کے لیے یقیناً" آپ کی رائے مختلف ہوگی۔" وہ ہلکے پھلکے انداز میں بولتا ہوا بینچ پر ذرا فاصلے پہ بیٹھ گیا اور مناہل کی ناک دبا کر بولا۔

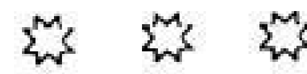
"پورا گھر تلپٹ کیے رکھتی ہے۔ کوئی چیز اپنی جگہ پر مل جائے ناممکن۔۔۔ آپا جی کو بہت ہلکان کیے رکھتی ہے۔" کھیلتی مناہل کو محبت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے عالی نے کہا۔

"جی سلجوق کو جتنا شوق کتابیں پڑھنے کا ہے' اسے اتنا ہی پھاڑنے کا۔" عالی اس کی بات پہ ذرا سا مسکرایا' پھر مشائم کے چہرے پہ بھرپور نظر ڈالتے ہوئے بولا۔

"بچے آپ کی بہت تعریف کرتے ہیں' آنٹی نے آج یہ کھلایا' یہ بات بتائی' ایسے پڑھایا۔ ان کا ٹیوٹر کسی ذاتی وجہ سے دوسرے شہر گیا تو میں کافی پریشان تھا' مگر شکر کہ خالد صاحب کے توسط سے آپ کی ٹیوشن مل گئی۔"

دن ڈھلنے میں کچھ وقت رہتا تھا' مگر وہ جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس شخص کی نگاہیں گہری ہوتی جارہی تھیں یا اسے معلوم ہو رہا تھا۔

"ٹھہریے! ہم بھی آپ کے ساتھ چلتے ہیں۔" عالی حسن بھی مضبوط لہجے میں کہتا اٹھ کھڑا ہوا۔



پتا نہیں کیوں وہ اگلے کئی دنوں تک پارک نہ جاسکی۔ کام کرتے ہوئے توجہ بار بار بٹ جاتی' دل جیسے اُچاٹ ہوتا جارہا تھا۔ سلجوق پڑھنے آیا تو بلا ارادہ اس سے پوچھ بیٹھی۔

"سلجوق! آپ لوگ پارک جاتے رہتے ہو؟"

"نہیں اب نہیں جاتے' مناہل ٹھیک ہو جائے گی تو پھر چلیں گے۔ پاپا کہتے ہیں۔" سادگی سے کہتے ہوئے سلجوق نوٹ بک پہ لکھتے جھک گیا۔

"کیوں کیا ہوا مناہل کو۔ وہ کئی دنوں سے آ بھی نہیں رہی۔" اس نے بے ساختہ پریشان ہو کر پوچھا۔

"وہ سیڑھیوں سے گر گئی تھی' منہ پہ خون لگا تھا۔ پاپا کہتے ہیں نانی جو ہے۔"

"اوہ!" وہ سر ہلا کر رہ گئی۔

شہنا کے کسی کزن کی شادی تھی۔ اسے بھی ساتھ چلنے کو کہا' مگر اس نے انکار کر دیا۔

"ڈفر لڑکی! کب تک گھر میں بیٹھی رہو گی۔ باہر نکلو۔ لوگوں کو فیس کرو۔ ورنہ یونہی تمہارے کانفیڈنس کا کباڑا ہو جائے گا۔" شہنا کندھے اچکا کر روز روٹین والی نصیحتیں کرتی بچوں کو لے کر چلی گئی۔

اس نے گھر کو لاک کیا اور اگلے بیس منٹ بعد وہ ایک خوب صورت سے گھر کے سامنے کھڑی تھی۔ دروازہ ملازمہ نے کھولا۔ مناہل واقعی سر پر پٹی باندھے نظر آگئی۔

"اوہ مائی گڈنیس! یہ کیا ہو گیا؟" اس نے آگے بڑھ کر اسے بانہوں میں بھر لیا۔

"کل گر گئی تھی۔" کہتے ہوئے ساتھ چھلی ہوئی کہنی بھی دکھادی۔

سلجوق آنٹی کو گھر میں پا کر خوشی سے پھولے نہ سما رہا تھا۔ فوراً" اسے اپنا اور پاپا کا مشترکہ کمرا دکھایا۔ مناہل کی فرمائش پہ اس کے پسندیدہ نوڈلز بنانے کچن میں چلی آئی۔ جزوقتی ملازمہ شاید اس سے غائبانہ طور پر متعارف تھی' تب ہی خوش دلی سے بولی۔

"سلجوق بابا بہت خوشی سے آپ سے پڑھنے جاتے ہیں' صاحب بتاتے رہتے ہیں کہ اب سلجوق کا رزلٹ اچھا آرہا ہے۔ بہت تعریفیں کرتے ہیں آپ کی۔"

"کون تعریفیں کرتا ہے؟" پوچھتے ہوئے اس کا دل

دھڑک دھڑک گیا۔

"یہ اپنے سلجوق بابا اور کون؟" صغریٰ سادگی سے بولی تو اس کا سانس ہموار ہو گیا۔

نوڈلز کے ساتھ ساتھ مناہل کو کھلانے والی آنٹی بھی بہت پسند آ رہی تھی۔ بہت پیار اور اصرار سے کھلاتی ہوئی گدگداتی ہوئی۔

"واٹ اے سرپرائز! آپ ہمارے گھر؟" عالی بے حد خوش گوار حیرت میں گھرا پوچھ رہا تھا۔

"وہ مجھے سلجوق نے مناہل کے گرنے کا بتایا تو میں اسے دیکھنے چلی آئی۔" وہ ایک دم سے **کنفیوز** ہوتے ہوئے بولی۔

"بہت اچھا کیا' میری بیٹی آپ کو بہت مس کر رہی تھی۔ آپ کو دیکھے بنا اسے چین کہاں آتا ہے آپ فرسٹ ٹائم آئی ہیں۔ صغریٰ بی نے کچھ کھانے کو پوچھا؟" ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرتے ہوئے اس نے مہمان نوازی والے آداب نبھاتے ہوئے پوچھا۔

"ارے نہیں اس کی ضرورت نہیں۔ مناہل کو دیکھ لیا۔ میں بس اب چلتی ہوں۔" وہ گھبرا کے اٹھ کھڑی ہوئی۔ جتنا یہاں آنے کے لیے اس کا دل چاہ رہا تھا' اتنا ہی یہاں سے جانے کی بے چینی ہو رہی تھی۔

"دس از ناٹ فیئر! آپ میرے بچوں کی اتنی کیئر کرتی ہیں' ان سے محبت کرتی ہیں اور یہاں سے ایک کپ چائے کا پی کر تو جانا بنتا ہے۔" وہ بے حد دوستانہ انداز میں کہتے ہوئے صوفے پہ گرنے والے انداز میں بیٹھ گیا۔

"آپ سے سلجوق کی اسٹڈیز کے بارے میں کچھ **ڈسکس** کرنا ہے۔ ماشاء اللہ گریڈ ون میں ہے' مگر کافی پروگریس دکھا رہا ہے۔"

"مجھے دیر ہو رہی ہے۔ شام کے کھانے کی تیاری بھی کرنی ہے۔" وہ عالی کی بات کو سنی ان سنی کرتے ہوئے بولی۔ اپنے دل کی لحہ بہ لحہ بدلتی حالت اسے پریشان کیے جا رہی تھی۔ اسے لگ رہا تھا اگر وہ کچھ دیر اور یہاں رکی تو پھر کبھی نہ باہر نکل سکے گی۔ عالی نے ناسمجھی سے اسے دیکھا۔ ابھی تو اس نے کچھ کہا ہی نہیں۔

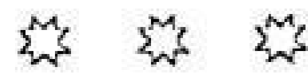
"آنٹی! آپ رات کا کھانا ہمارے ساتھ کھا کر ہی جائیں گی نا۔" سلجوق معصومیت سے اس سے پوچھ رہا تھا۔

"اب ہماری آفر تو ٹھکرا دی۔ ذرا ہمارے بیٹے کی خواہش کیسے پس پشت ڈالیں گی؟" مسکراتے ہوئے عالی کا انداز **چیلنجنگ** تھا۔ جیسے کہہ رہا ہو اب جا کر دکھائیں۔

"عالی حسن صاحب! میرا گھر لاک ہے۔ چابی میرے پاس ہے اور میں نے رات کے کھانے کی تیاری کرنی ہے۔" وہ بے حد سنجیدگی سے عالی کو دیکھتے ہوئے بولی۔

"اوکے! آپ کے آنے کا بہت شکریہ۔" عالی ممنون لہجے میں بولا۔

گھر سے نکلتے ہوئے مشائم کو بار بار سنڈریلا والی کہانی کا وہ حصہ یاد آ رہا تھا جب سنڈریلا رات کے بارہ بجے کے بعد واپس اپنی بے کیف اور پُرمشقت زندگی میں جا رہی ہوتی ہے۔ ایک دم سرشاری و طمانیت سے بھری۔



"بھابھی! آپ کے کزن کی شادی کا **فنکشن** کیسا رہا؟" اتنا پوچھنا ہی غضب ڈھا گیا۔

"بہت انسلٹ ہوئی میری' کسی سے بات کرنے کے قابل تک نہیں رہ گئی۔ جس کے ساتھ بیٹھو' جو بات کرو' بس ایک ہی تکرار نند کی شادی کیوں نہیں کر رہی ہو' مشائم! اب تم کوئی فیصلہ کر ہی لو۔" شینا تو جیسے پھٹ ہی پڑی تھی۔

"بھابھی! آپ کیا کہہ رہی ہیں؟" وہ بھونچکا سی انہیں دیکھتے ہوئے بولی۔

"صاف اور سمپل بات کر رہی ہوں۔ تم شادی سے انکاری ہو' اور سب لوگ سمجھ رہے ہیں کہ میں تمہاری شادی کو لیٹ کیے جا رہی ہوں۔ صرف اس وجہ سے کہ تم میرا پورا گھر سنبھالے ہوئے ہو۔ میں نے

تمہیں نوکرانی بنا کر رکھا ہوا ہے۔" شہنا بے حد کڑوے انداز میں بولی۔

"مگر بھابھی! میں نے تو کسی سے کوئی بات نہیں کی۔" وہ روہانسی ہو کر بولی۔

"تم نہیں کرتیں، لیکن لوگ تو یہی سمجھ رہے ہیں نا کہ میں نے تمہاری شادی لیٹ کی ہوئی ہے۔ اتنی خود غرض ہوں میں۔" شہنا کو چڑھی تپ اترنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔

"محترمہ خود پرانی یادوں کا ماتم کیے بیٹھی ہیں اور ہم پہ گھر کے کام ان سے کروائے جارہے ہیں۔" شہنا سارا دن کھولن نکالتی رہی، نجانے رشتہ داروں نے ایسا کیا کہہ دیا تھا کہ ٹھنڈی ہو کے نہیں دے رہی تھی۔

"آفاق اب بھی خواہش مند ہیں۔ اتنا بڑا بزنس، گھر میں کھڑی گاڑیوں کا تو شمار ہی ممکن نہیں۔ تمہارے تو نصیب کھل جاتے۔ اب اس حالت میں ایسے ہی رشتے آئیں گے۔ دو بچوں کے باپ والے۔" شہنا شاید ٹھان چکی تھی کہ اسے رلا رلا کر نیم جاں کرنا ہے۔ بھائی کا بھی مشفقانہ انداز نہ جانے کہاں چلا گیا تھا۔

"دیکھو مشائم! اماں ابا ہوتے تو شاید میرے کندھے اتنا بوجھ محسوس نہ کرتے، مگر اب تمہاری ذمہ داری کلی طور پر میرے اوپر ہے۔ تمہیں میرے فیصلے پر بھروسا ہونا چاہیے۔ تم اچھی طرح سوچ لو۔ آفاق میری طرف سے مثبت جواب کا منتظر ہے۔" خالد بے حد سنجیدہ انداز میں اپنا دوٹوک فیصلہ سنا کر چلے گئے۔

"یا اللہ! مجھ پہ مہربان وقت لے آ۔" اس نے دل کی گہرائیوں سے خالق و مالک کو پکارا تھا۔



"بہت کہا بچوں سے کہ گھٹنے درد کر رہے ہیں۔ طبیعت ٹھیک ہونے پہ چلوں گی، مگر سلجوق میاں بضد کہ آنٹی سے آج ہی ملنا ہے۔" مہربان بزرگ نے کہتے ہوئے اسے بازوؤں میں بھر کر اس کی ملیح پیشانی چوم لی۔

"میں عالی حسن کے ابا کی پھوپھی زاد بہن ہوں۔ عالی میاں کی بوا۔" بوا سکینہ اپنا تعارف کرواتے ہوئے بے تکلفی سے صوفے پہ بیٹھ گئیں۔

"اوہ۔" اس نے سر ہلایا۔ سلجوق بھی بوا کے ہمراہ تھا۔ فوراً اس کے ساتھ جڑ کر بیٹھ گیا۔

"ماشاء اللہ! بچے آپ کے ساتھ خوب ملے ہوئے ہیں۔ جب سے آئی ہوں بس ایک ہی بات۔ "بوا ہماری آنٹی اتنی اچھی ہیں۔" ان کے گھر ہمیں بہت مزا آتا ہے، عالی میاں بولے کہ بوا آپ خود چل کر ان کی آنٹی سے مل لیں۔ تب ہی انہیں قرار آجائے گا۔" بوا مسکرا کر بتانے لگیں۔ تو وہ بھی انکساری سے مسکرا دی۔

"بیٹا! گھر میں کوئی بزرگ تو ہوگا کوئی بڑا؟" بوا نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔ شہنا تو ان سے مل گئی تھی۔

"جی اماں ابا تو فوت ہو چکے ہیں۔ ایک بڑا بھائی اور ان کے بچے ہیں۔" اس نے دھیمے سے بتایا۔ خلاف توقع شہنا چائے کی ٹرالی گھسیٹتی آگئی۔ چائے کے ساتھ کافی لوازمات تھے۔

مشائم سلجوق کو لے کر باہر لان کی طرف جانے ہی لگی تھی کہ اس نے عقب میں بوا سکینہ کی آواز سنی۔ وہ بھابھی شہنا سے مخاطب تھیں۔

"میں عالی حسن کی بوا ہوں۔ اس کا رشتہ لے کر آئی ہوں مشائم بٹی کے لیے۔" وہ ایک جھٹکے سے پیچھے مڑی تھی۔



"آفاق، عالی حسن سے بدرجہا بہتر ہے۔ آفاق کی فیملی تو زیادہ تر باہر رہتی ہے۔ اتنا بڑا ویل فرنشڈ گھر۔" چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے شہنا نے خالد کو دیکھا۔ ان کا چہرہ پُر سوچ تھا۔

"ہاں مگر، آفاق کے بچے کافی بڑے ہیں۔ عالی بہت ینگ ہے، بچے بھی کافی چھوٹے ہیں، مشائم کو جلدی بطور ماں قبول کرلیں گے۔" خالد متذبذب تھے۔

"کم آن خالد! عالی تو ٹلی انجان ہیں۔ حال ہی میں ادھر شفٹ ہوئے ہیں۔ نہ فیملی بیک گراؤنڈ کا پتا نہ متاثر کن آمدنی، پھر اشفاق بھائی کی تو ساری فیملی ہماری جانی پہچانی ہے۔" شینا مکمل طور پر اشفاق والے پروپوزل کی حامی تھی۔ اتنے امیر اور صاحب حیثیت گھرانے سے رشتہ استوار کرنا اسے اپنی خوش نصیبی ہی تو لگ رہا تھا۔

"خیر دیکھتے ہیں۔ دونوں پروپوزلز کی تفصیلات مشائم جانتی ہے، اسی کا فیصلہ مقدم ہوگا۔" خالد نے گویا بات ختم کر دی۔

"اب یہ کیا بات ہوئی۔ عالی بھی دو بچوں کا باپ اور آفاق بھی، مگر اسٹیٹس میں زمین آسمان کا فرق، اگر دوہا جو اور دو بچوں کے باپ سے رشتہ ہی کرنا ہے تو آفاق بیسٹ ہے۔" شینا کو خالد کی بات پسند نہ آئی تھی۔

مشائم گھر میں رشتوں کے حوالے سے ہونے والی گفتگو جانتی تھی اور یہ بھی جانتی تھی کہ بھائی اب اس سے جواب مانگیں گے، سو حسب توقع خالد نے جلد ہی اسے اپنے کمرے میں بلا لیا۔

"مشائم بیٹے! کافی دن لے لیے تم نے فیصلہ کرنے میں۔ اشفاق جواب مانگ رہا ہے اور ادھر عالی کی بوا روز چکر لگاتی ہیں۔" بے حد نرمی سے بولتے ہوئے خالد نے مشائم سے دریافت کیا۔

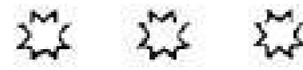
"بھائی! آپ میرے لیے ابو کی جگہ پر ہیں۔ آپ کی ہر بات سر آنکھوں پر، لیکن اگر مجھ سے رائے لی ہے تو مجھے مناہل اور سلجوق کے لاڈ اٹھانا پسند ہوگا۔" وہ جھکے ہوئے سر کے ساتھ پر سکون لہجے میں بولی تھی۔



"بچے روز کہتے، پاپا آنٹی نے صرف ایک بار گھر کا چکر لگایا، پھر کیوں نہیں آئیں، انہیں بلائیں تو میں نے سوچا کیوں نہ باضابطہ طور پر آپ کی آنٹی کو اپنے گھر لے آئیں، یہ آنے جانے کا جھنجھٹ تو نہیں ہوگا۔" مشائم کے ہاتھ سے چائے کا کپ تھامتے ہوئے عالی نے کہا اور اس کا مرمریں ہاتھ تھام کے قریب بٹھاتے ہوئے فریش موڈ میں بولا۔

"نہ آنٹی صاحبہ کو ادھر سے جانے کی جلدی ہوگی نہ ہم بے چارے خواہ مخواہ انہیں یاد کر کے دنوں اداس رہا کریں گے۔" چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے عالی اس طرف ذرا سا جھک کر شوخی سے بولا تو لفظ "ہم" پہ وہ سرخ پڑ گئی۔ شارٹ سلک کے سوٹ میں عالی کی تمام تر توجہ کا محور بنی ہوئی تھی۔

کسی کی زندگی میں آپ "نیو کلپٹس" کی سی اہمیت رکھتے ہیں، اس احساس نے مشائم کی سرزمین جان کے کینوس پر شوخ و چنچل رنگ بکھیر کے رکھ دیے تھے۔ عالی کے بھی تو من نگری میں ہولے ہولے باد نو بہار چلنے لگی تھی۔ وقت نے ایسا تعویذ محبت دونوں کے گلے میں ڈال دیا کہ موسم گل نہ ہوتے ہوئے بھی ہر بام و در، ہر رہ گزر جیسے سرخ گلوں سے آراستہ ہو گئی ہو۔ زندگی پر تو جیسے موسم گل کا پہرہ لگ چکا تھا۔ مشائم تو جیسے سلجوق اور مناہل کے لیے محبت و وارفتگی کا دریا ثابت ہوئی تھی۔



"سلجوق کے لیے کچھ اسٹیشنری کا سامان خریدنا ہے اور کچھ کچن کا سامان بھی۔" رات کو نائٹ لوشن ہاتھوں پر ملتے ہوئے مشائم عالی سے مخاطب ہوئی۔

"تو پھر اس سنڈے چلتے ہیں شاپنگ کو۔" کتاب پڑھتے ہوئے عالی نے شگفتگی سے جواب دیا۔

"آپ خود لے آئیں، پہلے بھی لے آتے تھے۔" وہ اٹک کر بولی۔

"کیا مطلب، میں جاؤں۔" عالی نے بھنویں اچکا کر اسے دیکھا۔ "مسز! جب پورا گھر سنبھال لیا ہے تو خریداری کا ذمہ بھی اٹھائیے۔" اس نے لاکھ پہلو تہی کی مگر عالی اسے مارکیٹ لے ہی آیا۔

"اف کیسی لگوں گی اس کے ساتھ گھسٹ گھسٹ کر چلتے ہوئے۔" دل کے کونوں سے کب سے دبکا ہوا احساس کمتری پھر سے عود آیا تھا۔

اس نے لسٹ عالی کو تھمائی اور وہ مطلوبہ اشیا ٹرالی

میں ڈالتا گیا۔وہ ہر چیز میں اس کی رائے کو اولیت دیتا رہا۔

"مشائم! اس دفعہ تو ٹوتھ پیسٹ بدل کر نہ دیکھیں۔"

وہ اس سے پوچھ رہا تھا' مگر جواب ندارد۔

"مشائم!" اب کے مڑ کے اسے دیکھا تو مشائم "ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم" کی تفسیر بنی سامنے دیکھے جارہی تھی۔عالی نے اس کی نظروں کا تعاقب کیا۔

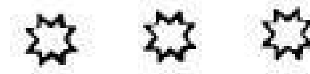
ایک ہینڈسم سا مرد بھی اسی کیفیت میں مشائم کو دیکھتا پایا گیا۔ مرد کے ساتھ ایک بے حد اسمارٹ اور اسٹائلش سی لڑکی تھی' جو غالباً" اس کی بیوی تھی۔

"ہیلو! کہاں کھو گئی ہو؟" عالی نے کندھا ہلا کر گویا اسے نیند سے جگادیا۔

"چلو چلتے ہیں۔ کافی شاپنگ کرلی۔" ایک ہاتھ سے ٹرالی کو دھکیلتے اور دوسرے ہاتھ سے مشائم کا ہاتھ تھام کر ہم قدم چلتے ہوئے وہ باہر آگئے۔

"کون تھا یہ شخص؟" عالی نے یونہی سرسری پوچھا۔

"میرا کزن تھا عمیر' کافی عرصہ بعد اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کی بیوی خاصی خوب صورت ہے۔" مشائم بالکل نارمل انداز سے بولی۔ جتنا پراعتماد وہ آج عالی کے ساتھ چلتے ہوئے محسوس کررہی تھی' اتنا زندگی بھر نہ کرپائی تھی۔ گلاس ڈور سے پار دور تک عمیر نے دونوں کو ساتھ چلتے دیکھا۔



سلجوق اور منااہل ٹی وی پہ اپنے پسندیدہ کارٹون دیکھ رہے تھے تو وہ یونہی وقت گزاری کو ٹہلتی ہوئی اسٹڈی میں چلی آئی۔ فراغت تھی' سو صفائی کا سوچ لیا' الماری کا پہلا خانہ صاف کرنے پر ایک بوسیدہ فوٹو البم ہاتھ آلگا۔ کافی پرانی تصاویر تھیں' کہیں پہ دو لڑکے تھے تو کہیں عورت و مرد کے ساتھ کوئی بچہ۔ ایک بیاہتا جوڑے کی تصویر بھی تھی۔

عالی کی بھی بے شمار تصاویر تھیں' اسکول اور کالج لائف کی۔وہ نجانے کتنی دیر بیٹھی تصاویر دیکھتی رہی۔

"اچھا تو فیملی البم دیکھا جارہا ہے۔" عالی پیچھے سے آکر بولا تو وہ مسکرادی۔

"جی ایسے صفائی کرنے کو جی چاہا تو یہ البم ہاتھ لگ گیا۔"

"آؤ۔ میں تمہیں اپنے فیملی فوٹوز کے بارے میں بتاتا ہوں۔" عالی اس کے قریب بیڈ پر بیٹھ گیا۔

"یہ دیکھو! یہ میرے اماں ابا ہیں۔ دونوں میں خوب محبت تھی۔ ایسی محبت کہ ابا کے جانے کے اگلے سال اماں نے بھی رخت سفر باندھ لیا۔" مشائم کو یوں محسوس ہوا کہ جیسے عالی کی پلکوں پہ نمی چمکی ہو۔

"اور یہ مراد بھائی۔ مجھ سے پورے سات سال بڑے تھے' مگر رعب پورا ابا والے رکھتے تھے۔ مجھے خوب کس کے رکھا۔" بتاتے ہوئے عالی کا لہجہ محبت سے معمور تھا۔

"ان کی شادی پہ میں کالج میں پڑھتا تھا۔ یہ دیکھو صباحت بھابھی۔ ہماری کزن تھیں۔ بہت لونگ اور کیئرنگ۔ بھائی جتنا رعب ڈالتے' یہ اتنا ہی مجھ سے پیار کرتیں۔"

"کیا مطلب تھیں؟" مشائم آنکھیں پھیلا کر عالی سے مستفسر ہوئی۔

"ان کی ڈیتھ ہوگئی شادی کے تیسرے سال۔" عالی کی آنکھیں لہو رنگ ہوگئیں۔ مشائم بے تحاشا دکھ میں گھر گئی۔

"بھابھی کی طبیعت خراب تھی' بھائی انہیں ڈاکٹر کے پاس لے جارہے تھے کہ راستے میں ایک ٹرالر سے ان کی گاڑی کا تصادم ہوگیا۔ تصادم اتنا خوفناک تھا کہ موقع پر ہی دونوں کی۔۔۔" عالی خاموش ہوا تو کمرے میں خاموشی بولنے لگی۔

"اور ان کے بچے؟ کیا ان کی اولاد نہ ہوسکی تھی؟" مشائم نے دھیمے سے پوچھا۔

"ہیں نا۔ سلجوق اور منااہل۔"

"کیا؟" مشائم کے تو سر پر حیرت کا پہاڑ آگرا۔

"تو کیا یہ آپ کے بچے نہیں ہیں؟" وہ لکنت زدہ آواز میں بولی۔

"نہیں۔ مگر میں ہی ان کا باپ ہوں اور تم ماں۔ کیا ماں نہیں ہو؟" عالی الٹا عجیب لہجے میں اس سے پوچھنے

لگا۔

"ہاں۔۔۔ ہاں کیوں نہیں۔ میں ہی ان کی ماں ہوں۔" وہ عالی کے انداز پہ گڑبڑا گئی تھی۔

"مشائم! سلجوق دو سال کا اور مناہل بمشکل ایک ہفتے کی تھی، جب بھائی اور بھابھی چل بسے۔ تین سال کا عرصہ ہو چکا ہے کہ ایک ماں اور باپ دونوں بن کر انہیں محبت دی ہے، خود سے عہد کیا تھا کہ کبھی ان کو ماں باپ کی کمی محسوس نہ ہونے دوں گا۔ کبھی پتا ہی نہیں چلنے دوں گا کہ میں ان کا چچا ہوں۔ سنو! کیا اس عہد کو پورا کرنے میں میری مدد کرو گی؟" وہ اب رخ موڑ کر اس سے یقین مانگ رہا تھا۔

"کیوں نہیں عالی! ان بچوں کے طفیل ہی تو مجھے آپ جیسے انسان کی ہمسفری نصیب ہوئی ہے۔ ورنہ تو خود میرا وجود میرے لیے ہی باعث آزار بنا ہوا تھا۔" وہ اس کے بازو پہ اپنا ہاتھ رکھ کر یقین سے بولی۔

"ان شاء اللہ! جب ہمارے بچے ہوں گے، تب بھی سلجوق اور مناہل سے ہماری محبت اور توجہ میں کمی نہ آئے گی۔" عالی اب کے ذرا سا مسکراتے ہوئے بولا تو مشائم کے لبوں پر شرمگیں مسکان سج گئی۔

مشائم البم بند کرنے لگی۔ وہ چلتا ہوا کھڑکی کے قریب جا کھڑا ہوا۔ نظریں سامنے لان میں کھیلتے اپنے بچوں پہ جم گئیں۔

"سوری عالی! میں کسی چیز کا سایہ تک تم پہ برداشت نہیں کر سکتی۔ کجا کہ یہ دو بچے۔ تمہیں شیئر کرنا بہت مشکل ہے۔ تمہاری محبت، توجہ اور ٹائم کی زیادہ حق دار میں ہوں تم ان دونوں کو کسی آرفن سینٹر میں۔۔۔"

"اسٹاپ اٹ ابرش! یہ کوئی یتیم بچے نہیں ہیں۔ یہ میرے بھائی کا خون ہیں۔ یہ میرے بچے ہیں۔" وہ ابرش کی بات کاٹ کر غصے سے بآواز بلند بولا۔ گردن کی رگیں ایک دم کھنچ گئی تھیں۔۔۔ ابرش اس کے انداز پہ ایک دم خائف ہو گئی تھی۔

"میری زندگی میں شامل ہونا ہے تو انہیں ماں کا پیار دینا ہو گا۔ انہیں اتنی ہی محبت اور چاہت سے پالنا ہے جتنا میں تم سے توقع کر رہا ہوں۔" عالی اب کے ٹھہرے ہوئے انداز میں بولا۔

"سوری عالی! یہ گورنس کی جاب مجھ سے نہیں ہو سکے گی۔ میں تو خود ایک میڈ کے ہاتھوں پلی ہوں کجا کہ تمہارے بھائی کے بچوں کی میڈ بنوں۔ بلکہ تمہاری زندگی میں جو بھی لڑکی آئے گی اسے یہ بٹوارہ کبھی منظور نہیں ہو گا۔" ابرش اپنی کہہ کر چلی گئی تھی۔

عالی سر جھٹک کر تلخی سے مسکرایا۔ مڑ کر دیکھا۔ مشائم کمرے سے جا چکی تھی۔

آفاق ہمدانی کے مقابلے میں عالی حسن کو منتخب کرنے پر شہنا بھابھی اب تک اسے سناتی آ رہی تھیں۔

"مشائم! جب دو بچوں کا باپ ہی تمہارا نصیب بننا تھا تو آفاق میں کیا برائی تھی۔ کم از کم ویل آف تو ہے، عالی حسن کی طرح سوکھی تنخواہ پہ گزارا کرنے والا تو نہیں۔" اس نے موبائل ہاتھ میں لے لیا۔

"آج میں بھابھی کو بتائے دیتی ہوں کہ عالی حسن کے کورے کنوارے جذبوں کی واحد امین میں ہوں۔ میں ہی مسز عالی ہوں۔ اس کے دل کی دیواروں پہ کسی کا نام نہیں لکھا ہوا۔ تقدیر نے میرا نام لکھ دیا ہے۔" اس کی انگلیاں تیزی سے شہنا کا نمبر ملا رہی تھیں۔

"کبھی ان کو پتا نہیں چلنے دوں گا کہ میں ان کا چچا ہوں۔ سنو! اس عہد کو پورا کرنے میں میرا ساتھ دو گی؟" اچانک اس کے ذہن میں کچھ دیر پہلے عالی کی کہی بات گونجی تو وہ ساکت سی بیٹھی رہی۔

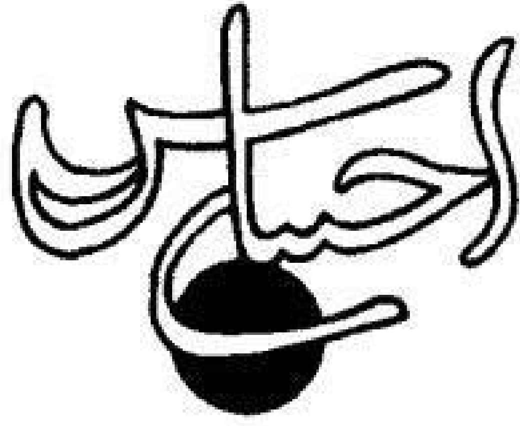
"جو دل میں بسنے والے ہوتے ہیں اگر وہ اپنے دل کی بات بتا دیں تو انہیں تاحیات دل میں رکھا جاتا ہے۔ یوں دوسروں پہ ظاہر کرنا محبت کی توہین ہوتی ہے۔" اچانک اس کے دل نے سرگوشی کی تو وہ چونک گئی۔

"ہیلو! کیسی ہو مشائم؟" شہنا کال اوکے کر چکی تھی۔ عالی کے دل کی بات اب اس کے دل کی بات ہوئی نا اور دل کی بات ہر کسی کو تھوڑی بتائی جاتی ہے۔

مشائم نے کال منقطع کر دی۔



جویریہ شاہ





"ابھی گھنٹہ ہی تو ہوا ہے کام والی کو برتن دھو کر گئے ہوئے پھر اتنا ڈھیر جھوٹے برتنوں کا ہو گیا ہے' دن میں دو دفعہ آ کر دھوتی ہے پھر بھی برتنوں کا ڈھیر لگا رہتا ہے۔" شازیہ اور ندا! تم دونوں میں ذرا بھی احساس نہیں کسی اور کا......

کپڑوں کا بھی یہی حال ہے۔ ہر روز تم دونوں کپڑے بدلتی ہو چاہے صاف ہی کیوں نہ ہوں جبکہ تم دونوں کو کہیں جانا بھی نہیں ہوتا۔ نہ کالج' نہ نوکری' نہ کسی کے گھر۔ صفائی دیکھو تو وہ بھی جو کام والی کر کے جائے بس وہی ہوتی ہے۔ مجال ہے جو تم دونوں نے بھی کوئی صفائی کی ہو۔ اب چھوٹی' چھوٹی ڈسٹنگ تو خود کر سکتی ہو ناں پر نہیں ہر کام کا بوجھ کام والی پر۔" امی حسب معمول برتنوں کا ڈھیر دیکھ کر شروع ہو گئی تھیں۔

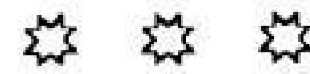
"امی! ہم پیسے دیتے ہیں کام کے' مفت تھوڑا ہی کرواتے ہیں۔ جو آپ کو اتنی ہمدردی ہو رہی ہے۔"

"ندا! پیسے دینے کا یہ مطلب نہیں کہ کسی کا خیال ہی نہ کریں ویسے بھی جب ہم پیسے ایکسٹرا نہیں دیتے تو ہمیں کام بھی ایکسٹرا نہیں کروانا چاہیے۔"

"امی! اب گھر کے اور کام تو ہم خود کرتے ہیں جو دو تین کام ماسی سے کرواتے ہیں' آپ چاہتی ہیں کہ وہ بھی خود کریں۔"

"ایک تو تم دونوں کی زبانیں بہت چلتی ہیں۔ میرے کہنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ خود کرو ہر کام۔ لیکن جان بوجھ کر کام بڑھانا' زیادہ برتن گندے کرنا' زیادہ کپڑے استعمال کرنا۔ صرف اسی وجہ سے کہ یہ کام تم خود نہیں کرتیں......بہت غلط حرکت ہے۔ اگر کسی دن خود اتنے ڈھیر سارے کام کرنے پڑ جائیں تو تب کسی دوسرے کا احساس ہو گا۔"

امی زچ ہو کر بولیں۔ وہ دونوں سمجھنے کو تیار ہی نہیں تھیں' ساری بات احساس کی تھی اور احساس کسی کے دل میں پیدا نہیں کیا جا سکتا۔



"میں کوشش کروں گی کہ کل شام تک واپس آجاؤں اگر اماں کی طبیعت زیادہ خراب ہوئی تو پھر پرسوں تک آؤں گی۔ اچھا تم دونوں آرام سے رہنا۔ لڑنا نہیں۔" رشیدہ بیگم کو ماں کی بیماری کی اطلاع ملی تو وہ فوراً" جانے کی تیاری کرنے لگیں۔ ساتھ ساتھ ہدایتوں کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ وہ دونوں بڑی سعادت مندی سے ان کی باتوں پر سر ہلا رہی تھیں۔

"اور اپنے ابو کو دوائیاں ٹائم پر دے دینا۔ وہ خود تو

ہمیشہ بھول جاتے ہیں۔"

"جی امی!"

"اچھا۔ میں چلتی ہوں' دروازہ بند کرلو کوئی آئے تو پوچھ کر دروازہ کھولنا۔"

"امی کے جانے کے بعد گھر میں کتنی اداسی ہو گئی ہے ناں ندا!"

"ہاں۔ میں تو خود بور ہو رہی ہوں۔"

"چلو کوئی فلم دیکھتے ہیں۔"

"نہیں' میرا کوئی موڈ نہیں اس وقت فلم دیکھنے کا۔"

"تو پھر۔؟"

"تو پھر چل کر کوکنگ کرتے ہیں۔"

"نہیں جی' میرا ابھی کوئی ارادہ نہیں اس گرمی میں چولہے میں جلنے کا۔"

"چلو ناں ندا! مزا آئے گا اکٹھے کوکنگ کرنے میں۔"

"نہیں۔ تمہیں تو پتا ہے شازیہ! میری اسکن کتنی جلدی خراب ہوتی ہے آگ کے قریب جانے سے۔"

"ایک تو تمہارے بہانے ختم نہیں ہوتے۔۔۔ مو یہاں بیٹھ کر میں تو جا رہی ہوں کچن۔"

"آج تو اتنی دیر ہو گئی پر ابھی تک نہیں آئی کام والی چھ بجے آ کر دھو جاتی تھی برتن۔ اب تو آٹھ بج رہے ہیں رات کے۔"

اچھا دفع کرو برتنوں کی ٹینشن۔ آج تو امی بھی نہیں کہ غصہ ہوں۔ ویسے بھی تمہیں ہی دن میں کوکنگ کا شوق چڑھا تھا۔ اس چکر میں بھی اتنے ڈھیر سارے برتن جمع ہو گئے۔"

"ہاں کہہ تو صحیح رہی ہو تم۔"

"اچھا چلو چھوڑو۔ کل آ کر دھو لے گی۔ ہم نے بھی کون سا دھو لینے ہیں۔ اور اتنے سارے برتن جو پڑے ہیں وہ کس دن کام آئیں گے۔ ہم بھی وہی استعمال کرتے رہیں گے ماسی کو بھی مزہ آ جائے گا چھٹی کرنے کا۔ جب اتنے ڈھیر سارے برتن اکٹھے دھوئے گی تو۔"

"ہاں یہ کی ناں بات تم نے کام کی شازیہ۔"

اچھا چلو چل کر ڈرامہ دیکھتے ہیں شروع ہونے والا ہے۔"

✡ ✡ ✡

"افوہ! کون ہے دروازے پہ۔؟"

"ضرور کام والی ہو گی۔"

آج تو خبر لیتی ہوں اس کی۔ ایک تو کل شام بھی نہیں آئی اور اب دن کا ایک بج رہا ہے۔ یہ بھی کوئی ٹائم ہے آنے کا۔"

"امی نے بھی بہت سر چڑھا رکھا ہے۔"

"جی السلام علیکم!"

"وعلیکم السلام۔"

"ارے تم۔۔۔ کہاں ہے تمہاری ماں' کل بھی نہیں آئی اور آج بھی اتنی دیر کر دی۔"

"وہ باجی! مجھے اماں نے یہی بتانے کے لیے بھیجا ہے کہ باجی کو بتا آؤ۔ وہ پورا ایک ہفتہ کام پر نہیں آئے گی اماں کو سخت بخار ہے اور ڈاکٹر نے انہیں آرام کے لیے کہا ہے۔"

وہ لڑکا تو اس پر بم گرا کر چلا گیا۔

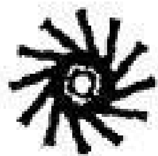
اور وہ وہیں کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔

"اگر پتا ہوتا کہ ماسی نے نہیں آنا اور یہ برتن خود دھونے ہیں تو کبھی بھی اتنے برتن نہ جمع کرتے ہم لوگ"

"اف کون دھوئے گا اتنے ڈھیر سارے برتن نا صرف برتن بلکہ صفائی اور کپڑے بھی رہتے ہیں اور تو اور امی کے آنے کا وقت بھی ہو جاتا ہے۔" ان کا ابھی گھنٹہ پہلے فون آیا تھا کہ وہ بس پر بیٹھ گئی ہیں

اسے امی کی بات شدت سے یاد آ رہی تھی کہ۔

"اگر کسی دن خود اتنے ڈھیر سارے کام کرنے پڑ گئے تو تب کسی دوسرے کا احساس ہو گا۔"





سحر ساجد

قیوم صاحب کی بیگم چودھویں بچے کی پیدائش پر فوت ہو جاتی ہیں۔ کثرت عیال کی وجہ سے قیوم صاحب بچوں کی طرف سے لاپروا ہو جاتے ہیں۔ سو حارث قیوم کی تمام ترذمہ داری زینب آپا پر آجاتی ہے' جو اس سے سولہ سال بڑی ہیں۔ حارث قیوم شروع سے ہی بدتمیز' جھگڑالو اور ڈھیٹ واقع ہوا تھا۔ اپنی حرکتوں اور زبان درازی کی وجہ سے سارے بہن بھائی اس سے نالاں اور دور رہا کرتے تھے۔ صرف زینب آپا اس سے محبت کرتی تھیں۔ اس کا خیال رکھتیں' جبکہ وہ زینب آپا سے بھی بدتہذیبی سے پیش آتا تھا۔ حارث قیوم کھیل کود میں لڑائی جھگڑے میں اکثر ہی خطرناک چوٹیں لگوالیا کرتا تھا مگر اسے تکلیف کا احساس زیادہ نہیں ہوتا تھا۔ وہ بچپن سے ہی سخت ہڈی تھا۔ وہ ابا اور بڑے بھائیوں سے مار کھا کھا کر بھی بہت ڈھیٹ ہو گیا تھا جبکہ زینب آپا اس کی چھوٹی چھوٹی تکلیف پر تڑپ جاتی تھیں۔ زینب آپا بیاہ کر چلی گئیں تب بھی اس کی پل پل کی خبر رکھتیں اور ہر موقع پر سب سے پہلے اس کے پاس پہنچ جاتیں۔ حارث قیوم کو اپنے بہن بھائیوں سے نفرت تھی مگر زینب آپا کے لیے بھی دل سے محبت اور احترام نہ رکھتا تھا۔

زینب آپا کے میاں شفیق بھائی سعودی عرب میں رہتے تھے۔ شادی کے کچھ عرصے بعد انہوں نے زینب آپا کو بلوالیا۔



ناولٹ

اس وقت حارث سولہ سال کا تھا۔ زینب آپا کو شدید رنج تھا حارث کو چھوڑ کر جانے کا مگران کے رونے دھونے سے وہ شدید چڑ رہا تھا۔ ان کے سعودی عرب جانے کے بعد زینب آپا کو اطلاع ملتی ہے کہ اس نے اپنے چند دوستوں کے ساتھ ایک لڑکی کو اغوا کر کے عصمت دری کی ہے۔ نابالغ ہونے پر اسے صرف قید کی سزا دی گئی تھی۔ اس کے ابا اور بھائیوں نے اس سے قطع تعلق کر لیا مگر زینب آپا نے سعودی عرب میں رہتے ہوئے بھی اس کا خیال رکھا۔ اگرچہ وہ اس کی اس حرکت پر بے حد شرمندہ اور ملول تھیں مگر اکثر اسے فون کرتیں۔ پاکستان میں مقیم اپنی سہیلی کے ہاتھ اس کی ضرورت کی چیزیں بھجواتی رہتیں۔ وہ فون پر روتے ہوئے کہتا۔ مجھے چھڑا لو' دو چار لاکھ روپے انہیں دے دو اور جیل سے نکلوا دو۔ زینب آپا اس سے وعدہ کرتی ہیں کہ جیل میں اچھا رویہ اور کردار رکھو۔ تمہاری سزا کم یا معاف کردی جائے گی۔ پھر میں تمہیں سعودیہ بلوالوں گی۔ حارث دل میں زینب آپا کو خوب گالیاں دیتا ہے۔ ساڑھے دس سال جیل میں گزار کر بالآخر زینب آپا اسے سعودیہ بلوا لیتی ہیں۔ زینب آپا کے اولاد نہیں ہوتی' شفیق بھائی ان سے بے حد محبت کرتے ہیں اور ان ہی کی خاطر وہ حارث کا بھی خیال رکھتے ہیں حالانکہ وہ سمجھتے ہیں کہ حارث آپا سے بہت بدتمیزی کرجاتا ہے۔ سعودیہ آکر بھی وہ اکثر زینب آپا کو طعنہ دیتا کہ تم نے پیسے بچائے اور میرے ساڑھے دس سال ضائع کیے۔ زینب آپا اس کی ساری بدتمیزیاں برداشت کرتیں کیونکہ وہ اسے ماں کی طرح چاہتی ہیں اور شفیق بھائی ان کی خاطر حارث کی بدتمیزیاں نظرانداز کرتے رہتے۔ حارث سعودی عرب دراصل اپنے ساڑھے دس سال ضائع کردینے پر زینب آپا سے بدلہ لینے آیا ہے۔ وہ یہاں آکر بھی اپنی حرکتوں سے باز نہیں آتا۔ زینب آپا اور شفیق بھائی عمرہ کرنے جاتے ہیں۔ ان کی غیر موجودگی میں وہ ایک فلپائنی عورت کو گھر لے کر آتا ہے مگر رقم کے معاملے میں جب بات نہیں بنتی تو وہ اس کے ساتھ زبردستی کرتا ہے اور تہہ خانے میں بند کردیتا ہے۔ اتفاق سے ٹکٹ بھول جانے پر زینب آپا اور شفیق بھائی کو دوبارہ گھر آنا پڑتا ہے۔ یہ صورت حال دیکھ کر وہ دونوں فق رہ جاتے ہیں اور

پھر بے حد مجبور ہو کر زینب آپا شفیق بھائی کو پولیس بلانے کی اجازت دے دیتی ہیں۔

پولیس آ کر حارث اور اس فلپائنی عورت کو گرفتار کر لیتی ہے' اور سعودی قانون کے مطابق فلپائنی عورت کو شادی شدہ ہونے کے باوجود اس گناہ کا مرتکب ہونے پر سنگسار اور حارث کو غیر شادی شدہ ہونے کی وجہ سے سو کوڑوں کی سزا ہوتی ہے۔

حارث کو اس سزا پر کوئی خوف نہیں ہوتا' کیوں کہ وہ بچپن سے پٹنے اور مار کھانے کا عادی تھا۔ ہر کوڑا لگنے پر اس کے دل میں زینب آپا کے لیے نفرت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ کوڑا لگنے کی اذیت پر وہ چیخ چیخ کر زینب آپا کو بددعائیں دیتا ہے۔

زینب آپا' حارث کے لیے' بہت دکھی ہوتی ہیں۔ لیکن حارث ان کو بہت تنگ کرتا ہے۔ وہ اس کے زخموں پر روتے ہوئے مرہم لگاتی ہیں۔ ٹھیک ہونے پر حارث' زینب آپا کے گھر سے نقدی اور ان کے زیور چرا کر امریکا بھاگ جاتا ہے۔ شفیق بھائی کے ناراض ہونے پر زینب آپا کہتی ہیں کہ وہ ان کے زیور تھے وہ اپنے بھائی کو معاف کرتی ہیں۔

امریکا پہنچنے پر حارث سے وہ زیور والا بیگ کھو جاتا ہے۔ حارث امریکا میں سخت محنت سے پیسے کماتا ہے اور غلط کاموں میں لٹا دیتا ہے۔ اپنی دانست میں اس طرح کر کے وہ زینب آپا کو دکھ دے رہا ہے۔

اسی دوران حارث خوف کا شکار ہو جاتا ہے۔ یہ خوف اس پر اتنا حاوی ہوتا ہے کہ اس کی نوکری چھوٹ جاتی ہے' اس کی دوستیاں ختم ہو جاتی ہیں۔ اس کا روم میٹ گیان سنگھ اسے ڈاکٹر حسنات کے پاس بھیجتا ہے۔ وہاں جا کر حارث کہتا ہے کہ اسے اپنی بیماری سے نجات چاہیے' وہ کہتے ہیں کہ بیماری سے نجات نہیں شفا ملتی ہے۔

تیسری اور آخری قسط

"یہ ایک کتاب ہے حارث۔ ایسی کتاب جس میں لوگوں کے لیے شفا ہے۔ رحمت ہے۔ اس کے لیے جو کچھ ان کے سینوں میں ہے۔"

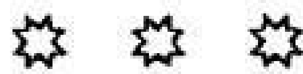
وہ ایک آیت کا مفہوم بتا رہے تھے۔

"اور جو کچھ تمہارے سینے میں ہے۔ تمہیں اس کتاب کے علاوہ کوئی شفا نہیں دے سکتا اور اگر تمہیں لگتا ہے ایسا نہیں ہے تو آزمانا چاہو تو آزما لو۔"

"ساری دنیا گھوم کر دیکھ لو۔ اچھے سے اچھا سائیکاٹرسٹ۔ پلز۔ میڈیسن آزما کر دیکھ لو۔ ہر طریقہ' ہر راستہ جانچ لو۔ اس کے بعد۔ اس کے بعد تم دیکھو گے کہ یہ تو محض اک دائرے کا سفر تھا اور تم لوٹ کر اسی کرسی پہ۔ اسی حالت' اسی بے چینی۔ اسی اضطراب کا شکار ہو کر بیٹھے ہو گے۔ فرق صرف اتنا ہو گا آج میں تمہیں یہ نسخہ شفا دے رہا ہوں' کل تم خود مانگو گے تو فیصلہ کر لو حارث قیوم۔ سوچ لو۔ دنیا میں ٹھوکریں کھانی ہیں یا پھر شفا لینی ہے۔"

ابوجہل' ابولہب' عمر بن خطابؓ' ابو سفیانؓ اور۔۔۔ اور بہت سے لوگ ان سب کی زندگیوں میں کوئی نہ کوئی۔۔۔ کبھی نہ کبھی وہ اک لمحہ ضرور آیا تھا۔ وہ لمحہ کہ جس میں انسان کے دل پہ ہدایت اتاری جاتی ہے۔ اسے جگایا جاتا ہے۔ اس کے دل کو نرم کر دیا جاتا ہے۔ ہاں۔ وہی اک لمحہ ازل ابھی۔۔۔ ابھی اس حارث قیوم کے دل پہ بھی اترا تھا۔ اس کا دل پگھلا تھا اور اس طرح سے پگھلا تھا کہ اسے محسوس ہوا' سارا جسم جیسے آگ پہ رکھی موم بن گیا ہو۔ وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ ڈاکٹر حسنات نے مایوس ہو کر گہرا سانس بھرا تھا اور اس کے آگے موجود کتاب کو اٹھانا چاہا۔ حارث نے یک دم تیزی سے۔۔۔ اچانک ان کے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھ کر انہیں روکا تھا۔

"مجھے شفا چاہیے۔" اب کہ وہ نم آنکھوں سے کہہ رہا تھا۔



وہ ان کے بارہ سالہ کیریئر کا عجیب ترین کیس تھا۔
ایسا کیس۔ جس میں ان کی مہارت۔ جواب دے گئی تھی۔

دنیا میں بہت سے لوگ موت سے ڈرتے ہیں' چاہے وہ مسلم ہوں یا غیر مسلم۔ مگر وہ اپنے اس خوف کو لے کر اس طرح سے نہیں کرتے' جس طرح کہ حارث قیوم نے کیا تھا۔ ایسے وہ سب لوگ کسی نہ کسی فلاحی' سوشل ویلفیئر یا پھر چیرٹی کے کاموں میں حصہ لیتے ہیں اور اگر مسلم ہوں تو زیادہ سے زیادہ کوشش کرتے ہیں ایسے تمام عمل اور کام کرنے کی جو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو پسند تھے۔ جن کا اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا تھا۔

لیکن۔۔۔ وہ۔۔۔ حارث قیوم۔۔۔ وہ عجیب آدمی تھا۔

اس کے جانے کے بعد وہ اگلا کوئی مریض نہیں دیکھ پائے تھے۔ وہ مسلسل اس عجیب ترین شخص کو سوچے جا رہے تھے۔

کیا اس شخص کا کوئی اور علاج ہو سکتا تھا؟" وہ۔۔۔ وہ کتاب' لے گیا تھا۔ وہ کتاب۔۔۔ جسے وہ پڑھنا نہیں جانتا تھا۔ اس سے شفا لینے کے لیے۔

اور ڈاکٹر حسنات سوچ رہے تھے کہ وہ کیسے۔۔۔ کس طرح سے۔۔۔ اور کیونکر اس سے شفا لے پائے گا' جبکہ وہ ایک حرف تک نہیں پڑھ سکتا تھا۔ بے اختیار وہ مسکرائے تھے۔

انہیں انتظار تھا اس دن کا۔۔۔ کہ جس دن حارث قیوم دوبارہ ان کے پاس آئے گا' وہی کتاب لے کر۔

اللہ اپنے بندوں سے بہت محبت کرتا ہے۔ اتنی کہ کہنے کو اس نے کہہ دیا' ستر ماؤں جتنی۔۔۔ مگر۔۔۔ درحقیقت وہ اس سے کہیں زیادہ محبت کرتا ہے۔

تو کیا اتنی محبت کے باوجود اللہ چاہے گا کہ اس کا کوئی بندہ اس راستے پہ چلے جسے وہ ناپسند کرتا ہو۔ وہ راستہ جو سیدھا دوزخ میں لے جاتا ہو۔

"کیا اللہ ایسا چاہے گا؟"

"کیا ایسا ہو سکتا تھا؟"

"ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔"

"اور اللہ کیوں کر ایسا چاہے گا۔"

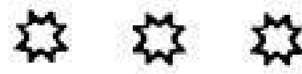
اللہ اپنے بندے کو کبھی نہیں چھوڑتا۔ یہ بندہ ہوتا ہے جو اللہ کا راستہ چھوڑ دیتا ہے۔ اللہ تو تب بھی انسان کے ساتھ ہوتا ہے جب وہ اپنے لیے غلط راستے کا انتخاب کرتا ہے۔

وہ اسے جگاتا ہے' جھنجھوڑتا ہے۔ وارن کرتا ہے۔ قدم قدم پہ۔ اسے بتاتا ہے کہ وہ غلط ہے۔ غلط راستے پہ ہے اور غلط کر رہا ہے۔ اتنا غلط۔۔۔ کہ یہ اسے بربادی اور تباہی کی طرف لے جائے گا۔

بربادی اور تباہی بھی وہ جو دنیا کی نہیں تھی۔ انجام کی تھی اور اس نے حارث قیوم کو بھی نہیں چھوڑا تھا اس حارث قیوم کو بھی بار بار جگایا گیا تھا۔ جھنجھوڑا گیا تھا۔ تب جب وہ پکڑا گیا۔ تب جب اس پہ حملہ ہوا۔ تب جب اسے جیل ہوئی اور تب بھی جب وہ جیل سے رہا ہوا۔ تب بھی جب وہ زینب آپا کے گھر میں فلپائنی عورت کے ساتھ پایا گیا اور تب بھی تو جب اسے کوڑے پڑے تھے۔

یہ انتہا تھی' یہ بس انتہا تھی۔ اس کے بعد بھی وہ انسان نہیں سنبھلا تھا۔ تو قریب تھا کہ اسے ڈھیل دے دی جاتی۔ اس کے دل کو مہر شدہ کر دیا جاتا۔ اس کی آنکھوں' کانوں پر پردہ ڈال دیا جاتا اور وہ کبھی ڈاکٹر حسنات تک پہنچ نہ پاتا اور نہ ہی کبھی ان کے ساتھ بیٹھ کر۔۔۔ قرآن پہ ہاتھ رکھ کر کہہ پاتا۔

"مجھے شفا چاہیے۔" اسے اپنی ہی گمراہی میں سرگرداں کر دیا جاتا۔ یہ سب ہوتا اور ضرور ہوتا ہے' مگر۔۔۔



وہ ڈاکٹر حسنات کے کلینک سے نکلا تو ہچکیوں سے رو رہا تھا۔ اس نے کتاب کو دونوں ہاتھوں سے بھینچ کر سینے سے لگایا ہوا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ اسے اس طرح رونا کیوں آئے جا رہا تھا۔ وہ اس لیے نہیں رو رہا تھا کہ اسے قرآن مل گیا تھا۔ ہدایت مل گئی تھی یا پھر

اس لیے کہ وہ آج سے پہلے تک کس قدر گمراہ رہا تھا یا پھر یہ کہ وہ اس کتاب کو پڑھنا نہیں جانتا تھا۔

نہیں' وہ ایسی کسی کیفیت کی وجہ سے رو نہیں رہا تھا۔ وہ تو خوشی کے آنسو تھے۔

اسے اپنے دکھ' اپنے غم' اپنی بیماری' اپنی کیفیت سے شفا ملنے والی تھی۔

وہ عذاب سے نجات پانے والا تھا۔ یہ آنسو اس لیے تھے۔

یہ ایسا ہی تھا کہ اچانک کسی کینسر کے مریض کو خبر ملے کہ اسے تو کینسر تھا ہی نہیں۔ وہ دین یا ہدایت یا ان سے جڑی کسی بھی قسم کی کیفیت کا شکار نہیں تھا۔

اس نے کتاب کو کسی میڈیسن کی طرح سمجھا تھا۔ جیسے بہت سے لوگ گھروں میں گاڑیوں میں گھوڑے کا نعل لٹکاتے ہیں یا پھر کوئی تعویذ یا کوئی دھاگا۔

اس نے دیکھا تھا کہ یہاں امریکہ میں بھی لوگ اس سے ملتی جلتی حرکات کیا کرتے تھے۔ کچھ مخصوص پرندوں کے پروں سے بنی ہوئی ونڈ چائم جیسی چیز لٹکایا کرتے تھے اور پاکستان میں بھی تو لوگ [illegible] آیات... کالی ہانڈی... کالا کپڑا اور اس طرح کی دوسری بہت سی چیزیں گھروں کے اندر اور باہر رکھا کرتے تھے۔

اس نے بھی اس کتاب کو ویسی ہی کوئی چیز سمجھا تھا جسے وہ اپنے پاس رکھے گا اور... اور پھر... سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ باوجود اس کے کہ اس کے اعمال کیا تھے؟ کسی تبرک کی طرح قرآن کو سینے سے... لگائے وہ اپنے اپارٹمنٹ میں داخل ہوا تھا۔ اپنی چابی سے اپارٹمنٹ کھول کر وہ اندر آیا تھا۔ قرآن کو اب بھی اس نے ایک ہاتھ سے سینے سے لگا رکھا تھا۔ دروازہ بند کرنے کے بعد وہ بیڈ پہ جا کر بیٹھ گیا تھا۔ چند لمحے وہ یوں ہی خالی ذہن کے ساتھ بیٹھا رہا تھا اور پھر اچانک جیسے اسے کوئی خیال آیا تھا۔ چونکہ اس نے سینے پہ بندھے ہاتھ سامنے کیے تھے۔ تھوڑی دیر تک وہ براؤن کلر کی اس کتاب کو دیکھتا رہا جس کی جلد کے اوپر سنہری رنگ سے کیلی گرافی کی گئی تھی۔

وہ اب رو نہیں رہا تھا' مگر اس کا سر درد کر رہا تھا۔ کتاب کو سائیڈ ٹیبل پہ رکھنے کے بعد وہ اٹھا۔ اپنا اوور کوٹ اتارا اور اسے ٹانگنے کے بعد وہ کچن میں آیا تھا۔ کچن میں آنے سے پہلے وہ الکتاب کو ساتھ لے کر آنا نہیں بھولا تھا۔ گیان سنگھ کھانا بنا گیا تھا۔ اسے بس اوون میں گرم کرنا اور کھانا تھا۔ بے اختیار اس کے دل میں گیان سنگھ کے لیے تشکر کے تاثرات ابھرے تھے۔ چکن بنا ہوا تھا۔ وہ کھانا نکال کر سٹنگ روم میں آیا تھا۔ ایک دفعہ پھر وہ کتاب کو ساتھ لے کر آنا نہیں بھولا تھا۔ کتاب کو سائیڈ پہ رکھتے ہوئے وہ اب کھانا کھا رہا تھا اور کتنے دنوں بعد وہ سکون سے کھانا کھا رہا تھا ورنہ تو... اپنے ذہن میں ابھرنے والی اس سوچ کے تحت اس نے منہ کی طرف جاتا ہاتھ روک کر الکتاب کو دیکھا۔ بے اختیار اس کی آنکھیں نم ہوئی تھیں۔ یہ یقیناً" اسی کتاب کی برکت کی وجہ سے تھا۔ اس نے کھانا چھوڑ کر کتاب کو پکڑا اور آنکھوں سے لگا کر چوم لیا تھا اور ایسا کرتے ہوئے بے اختیار اسے زینب آپا یاد آئی تھیں۔ اسے یاد آیا تھا کہ بچپن میں جب بھی زینب آپا اسے قرآن پڑھانے بٹھاتی تھیں تو وہ دوسرے بچوں کی دیکھا دیکھی یوں ہی سپارے کو آنکھوں سے لگا کر چومتا تھا اور زینب آپا وہ بہت نرمی سے اسے اور دوسرے بچوں کو ایسا کرنے سے روکا کرتی تھیں اور وہ کہا کرتی تھیں۔

"عبادت کے وہی طریقے ہیں... وہی اصول ہیں جو اللہ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے بتلائے ہیں...

کیا اب ہم اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقوں کو چھوڑ کر اپنے طریقوں سے عبادت کریں گے؟ کیا اب ہم وہ کریں گے... جو رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی نہ کیا ہو؟"

پھر وہ بے حد مسکرا کر اس کے بالوں پہ ہاتھ پھیرتیں اور کہتیں۔

"اس کا ادب یہ ہے کہ تم اس کو پڑھو اور سمجھو اور اس کے مطابق زندگی بسر کرو۔۔۔" اسے کبھی آپا کی باتیں سمجھ نہیں آتی تھیں۔ وہ اب بھی اس کے سر کے اوپر سے گزر گئی تھیں۔

"زینب آپا!" اس نے زیر لب نام دہرایا۔

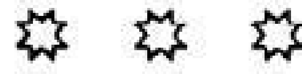
چند لمحے وہ یوں ہی خالی پن کی کیفیت میں رہا اور پھر وہ سر جھٹک کر کھانے کی طرف متوجہ ہوا تھا۔ کھانا کھانے کے بعد اس نے برتن اٹھا کر سنک میں رکھے ٹیبل صاف کیا اور پھر برتن دھونے کے بعد وہ لیٹنے کے لیے بیڈ پہ آیا تھا۔

اس نے قرآن کو اپنی دائیں طرف۔۔۔ سائیڈ ٹیبل پہ رکھا اور خود چت سونے کے لیے لیٹ گیا تھا۔

"کیا محض اس کتاب کی وجہ سے مجھے نیند آئے گی؟" وہ دانستہ چھت کی طرف دیکھے بغیر سوچ رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے سر جھٹکا اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔ "میرا خیال ہے مجھے پلز لے لینی چاہیے۔۔۔" اس کی اس سوچ نے اسے اٹھنے پہ مجبور کیا تھا۔ پلز لینے کے تھوڑی دیر تک وہ بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا اور پھر اسے نیند آگئی تھی۔ ہمیشہ کی طرح اور ہمیشہ کی طرح اس کی نیند رات کے درمیانی حصے میں ٹوٹی تھی اور ایک گہرا۔۔۔ خوف سے بھرا سانس لیتے ہوئے وہ یک دم اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ لاشعوری طور پر اس نے دائیں طرف موجود رکھی کتاب کو دیکھا۔ وہ وہیں تھی۔ اسے ڈھارس ہوئی۔ مگر اس کی نیند کیوں

ٹوٹی تھی۔۔۔ اس نے بے چینی و بے بسی سے سر کو مسلا تھا۔ اب کی بار اس نے "کتاب" اٹھائی اور اسے دیکھتا رہا۔ اب تو یہ طے تھا کہ اسے نیند نہیں آنے والی تھی۔ اس نے ہمیشہ ہی کی طرح پلز کی ایک اور خوراک لی اور اپارٹمنٹ سے باہر نکل آیا تھا۔ اب کی بار وہ اپارٹمنٹ لاک کرنا بھولا تھا اور نہ ہی کتاب اٹھانا۔ وہ ایک بار پھر "کتاب" کو دونوں ہاتھوں سے سینے میں بھینچے ہوئے سڑکوں پر چلا جا رہا تھا، مگر اب کی بار اس کی حالت پہلے جیسی نہیں تھی۔ اس کے ہاتھ میں "کتاب" تھی اور اسی "کتاب" کی وجہ سے اسے یقین تھا کہ وہ اسے کچھ نہیں ہونے دے گی۔

اسے ڈر بھی محسوس ہو رہا تھا، مگر ڈرنے کے باوجود کہیں کوئی ڈھارس بھی تھی۔ حارث قیوم نے ایک دفعہ پھر وہ رات سڑک کے کنارے لگے کسی بنچ پہ سو کر گزاری تھی۔



انہیں ہمیشہ مریضوں کا اپنے کلینک سے صحت یاب ہو کر چلے جانا خوشی دیتا تھا۔ وہ پہلا مریض تھا جس کے آنے کی انہیں بے حد خوشی محسوس ہوئی تھی۔ ان کی آنکھوں میں ایک چمک ابھری تھی اور وہ بے ساختہ مسکرائے تھے۔۔۔ یوں جیسے اس کے آجانے کا یقین ہو۔ چمکتی آنکھوں اور مسکراتے چہرے کے ساتھ وہ اسے آتا دیکھ رہے تھے۔

وہ بہت مضمحل دکھائی دے رہا تھا۔ پورے دو دن کے بعد وہ پھر سے ان کے کلینک موجود تھا، اور ایسا لگتا تھا کہ دو دن سے نہ ہی اس نے کپڑے بدلے تھے اور نہ ہی شیو کی تھی۔ خاموشی سے اندر داخل ہوتے ہوئے اس نے کتاب ان کے سامنے ٹیبل پہ رکھی تھی اور خود کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا تھا۔ ڈاکٹر حسنات بھی خاموشی سے اسے نوٹ کر رہے تھے۔

"کیا ہوا؟" اس کے جھکے سر کو دیکھ کر انہوں نے پوچھا۔

"آپ نے کہا "یہ" شفا ہے۔۔۔"

”ہاں تو؟“

”مگر یہ… یہ کتاب… میں دو راتوں سے سو نہیں پایا اور میری حالت میں اتنا بھی فرق نہیں آیا جسے میں ذرہ برابر کہہ سکوں۔“ وہ پریشان تھا اور پریشانی کی وجہ سے غصے میں بھی تھا۔

ڈاکٹر حسنات سیدھا اس کے چہرے کو دیکھ رہے تھے، جہاں پہ بے زاری تھی… بے چارگی تھی اور لاچاری بھی… انہوں نے ایک گہرا سانس بھر کر ”کتاب“ اٹھائی۔

”یہ کتاب کوئی ”تعویذ“ نہیں ہے حارث قیوم! جسے تم پاس رکھو گے تو ساری بیماری دفع ہو جائے گی۔ یہ جزدان میں لپیٹ کر سجانے کے لیے بھی نہیں ہے… یہ وہیں کسی طاق پہ سجی رہے گی، مگر تم کو کچھ فائدہ نہیں دے گی جب تک کہ تم…“ وہ رکے تھے۔

”جب تک کہ کیا… کیا کروں میں۔ بتائیے مجھے کیا کروں میں۔ میں کچھ بھی کروں گا مگر مجھے ٹھیک ہونا ہے۔“ حارث نے بے چینی سے بات کاٹی تھی۔ وہ چند لمحے اسے دیکھتے رہے۔

”حارث قیوم! جو ہاتھ اس کتاب کی طرف… جس غرض سے بڑھتا ہے۔ یہ کتاب اس کو وہ ہی دیتی ہے۔ کوئی ہاتھ کجی ڈھونڈتا ہے تو اسے کجی مل جاتی ہے (کافر لوگ جو کہتے ہیں کہ قرآن میں غلطیاں ہیں نعوذباللہ)

کوئی ہاتھ ثواب کے لیے بڑھتا ہے۔ اسے ثواب دے دیا جاتا ہے۔ کوئی ہاتھ راہ ہدایت۔ پانے کو بڑھتا ہے اور اسے مل جاتی ہے۔

اور کوئی۔ کوئی تمہاری طرح شفا چاہتا ہے اور وہ بھی اسے دے دی جاتی ہے۔

مگر حارث قیوم! یہ سب تب تک نہیں ہو سکتا یہ تب تک ممکن نہیں ہے کہ جب تک تم اسے پڑھو گے نہیں اور پڑھنے کے بعد سمجھو گے نہیں اور سمجھنے کے بعد زندگی میں اسے اپلائی نہیں کرو گے۔

تب تک… تب تک یہ کتاب تمہیں کچھ نہیں دے گی۔ کچھ بھی نہیں یہ وہیں کسی طاق میں سجی رہے گی، مگر تم کو کچھ نفع نہ دے گی اور اللہ خود اس کے لیے راہیں کھول دیتا ہے۔ جو ہاتھ اس کے سمجھنے کے واسطے کو بڑھتا ہے۔“

وہ نہیں جانتا تھا کہ اسے کیا ہوا تھا مگر کئی لمحوں تک وہ کچھ کہنے کے قابل نہیں ہو رہا تھا۔

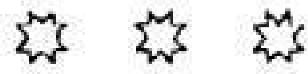
”میں تو پڑھنا نہیں جانتا۔“ پھر اس نے کہا۔

”تو اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ تم پڑھنا کبھی بھی جان ہی نہیں سکتے۔“ جواب آیا تھا۔ وہ پھر خاموش ہوا تھا۔

”کیسے… کہاں سے۔“ اس کی خاموشی دوبارہ ٹوٹی۔

اور ڈاکٹر حسنات نے اپنے سامنے موجود کارڈ ہولڈر میں رکھے کارڈز میں سے ایک کارڈ نکالا اور اس کی بیک پر کچھ لکھ کر حارث کو پکڑایا تھا۔

حارث نے کچھ حیرانی کے عالم میں کارڈ پکڑا تھا اور اسے پلٹ کر دیکھا تھا۔ ایک ایڈریس کے ساتھ۔ کارڈ کی بیک پہ لکھا تھا ”شام 5 بجے۔“ اس نے کچھ الجھن کے ساتھ ڈاکٹر حسنات کو دیکھا مگر اب وہ متوجہ نہیں تھے۔ وہ ایک اور فائل کھول کر دیکھ رہے تھے۔ اور وہ خموشی سے اٹھ کر چلا گیا تھا۔



انہوں نے ہمیشہ کی طرح کلاس میں داخل ہونے کے بعد سلام کیا تھا اور اجتماعی طور پر سب کا حال پوچھا تھا۔ اور حال پوچھنے کے بعد اپنا وہ ہی مخصوص جملہ دہرایا تھا۔

”یقیناً“ اللہ آپ سب کو اپنی رحمت کے لیے چن چکا ہے۔“ مدھم مگر مسکراتا لہجہ۔

انہوں نے مڑ کر اسٹینڈ پہ لگے وائٹ بورڈ کو سیٹ کیا تھا۔ کل کے لیکچر کے لکھے ہوئے الفاظ اس پہ سے مٹائے تھے اور آج کے لیکچر کی تیاری کرنے لگے تھے۔ انہوں نے مارکر پکڑ کر اسے چیک کرنے کے لیے وائٹ بورڈ کے کارنر پہ چند لائنیں کھینچیں اور پھر انہیں مٹا دیا۔

وہ آج لیکچر شروع کرنے میں معمول سے زیادہ وقت لے رہے تھے۔ اسی دوران انہوں نے کمرے کے

آخری سرے تک نظر دوڑائی تھی۔ وہ کہیں نہیں تھا۔ چند لمحے لگے تھے انہیں پھر سے اپنے کام کی طرف متوجہ ہونے میں۔ انہوں نے بسم اللہ پڑھی اور مڑ کر انہوں نے بورڈ پہ سورۃ کا نام اور رکوع نمبر لکھا۔ کالے، موٹے اور خوب صورت لکھائی والے حروف بورڈ پہ ابھرتے گئے تھے۔

ان کے سامنے بیٹھے لوگوں کے ہاتھوں میں بورڈ پہ لکھی گئی سورت والا پارہ تھا اور ان میں سے جن کو کل کا لیکچر یاد تھا وہ وہی رکوع نمبر کھولے ہوئے تھے، جو بورڈ پہ لکھا گیا تھا اور جن کو یاد نہیں رہا تھا وہ اب مطلوبہ رکوع نمبر کھول رہے تھے۔ ڈاکٹر حسنات نے رک کر انتظار کیا۔ یہ معمول کا حصہ تھا۔ ان کی نظروں نے اس دوران بے تابی سے دروازے کی سمت دیکھا تھا۔ اور یہ معمول کا حصہ نہیں تھا۔ جن کو آنا تھا۔ آچکے تھے۔ انہیں مایوسی تو نہیں ہوئی تھی ہاں! افسوس ضرور تھا۔ گہرا سانس بھرتے ہوئے انہوں نے لیکچر شروع کیا تھا۔

وہاں صرف مرد نہیں عورتیں بھی تھیں۔ وہ سولہ بائی بارہ کا کمرہ تھا جس کے درمیان میں پارٹیشن کی گئی تھی اور وہ سب افراد وہاں قرآن ترجمے کے ساتھ پڑھنے آئے تھے۔ ڈاکٹر حسنات عربی نہیں سکھاتے اور نہ ہی وہ کوئی عالم تھے "انہوں نے قرآن ترجمے کے ساتھ سیکھا تھا اور اب وہ اسے سکھا رہے تھے۔ عربی سیکھنے کی نسبت قرآن ترجمے کے ساتھ پڑھنا آسان تھا۔ یہ ایسا ہی تھا جیسے کوئی انگلش گرامر کو نہیں جانتا مگر انگلش پڑھ لیتا تھا۔ سمجھ سکتا تھا مگر بول نہیں سکتا تھا۔ وہ لفظی ترجمہ سکھاتے اور "ان" الفاظ کے ترجمے سے آیت کا ترجمہ مکمل کرتے تھے۔ ان کا یہ انداز سادہ تھا اور نسبتاً" آسان فہم ہی تھا۔ وہ ایک سال میں اسی طرح سے قرآن کا ترجمہ ختم کرواتے تھے اور اس ایک سال میں بہت سے نئے لوگ آتے اور بہت سے پرانے چلے جاتے۔ ٹک کر قرآن ترجمے کے ساتھ پڑھنے والے افراد کی تعداد ہمیشہ کم ہی ہوتی تھی۔ اور اکثر وہی لوگ قرآن کو ترجمے کے ساتھ مکمل کرتے جو

کہ نئے نئے اسلام میں داخل ہوئے تھے۔ اور اکثر وہ طبقہ نوجوانوں کا ہی ہوتا تھا۔ وہ انگلش اور اردو دونوں زبانوں میں ترجمہ سکھاتے تھے۔ اور آج بھی وہ اپنا لیکچر شروع کر چکے تھے۔ جس کو نہیں آنا تھا۔ وہ نہیں آیا تھا۔ اس کمرے میں ہمیشہ افراد کی تعداد کے حساب سے کرسیاں لگائی جاتی تھیں۔ اور جب بھی کوئی نئی کرسی لگائی جاتی سب ہی سمجھ جاتے کہ کوئی نیا فرد آنے والا ہے۔ آج بھی اک نئی کرسی لگائی گئی تھی مگر وہ نیا فرد نہیں آیا تھا۔

لیکچر کے دوران بھی وہ بار بار اس خالی کرسی کو دیکھتے رہے تھے اور جب انہیں یقین ہو گیا کہ وہ نہیں آئے گا تو وہ پوری طرح سے لیکچر میں مگن ہو گئے تھے۔ لیکچر کے ختم ہوتے ہی کچھ لوگ تو فوراً" مصافحہ کرتے چلے گئے تھے اور وہ۔ جن کو جلدی نہیں تھی وہ اپنی چیزیں سمیٹ رہے تھے۔ اور کچھ ایسے بھی تھے جو اپنی سیٹیں چھوڑ کر ڈاکٹر حسنات سے نا سمجھ میں آنے والے الفاظ کا مفہوم سمجھ رہے تھے۔

تھوڑی دیر بعد جب آخری شخص بھی ان سے مصافحہ کر کے چلا گیا تو انہیں پھر سے حارث کا خیال آیا تھا بے ساختہ انہوں نے اس نئی لگائی گئی کرسی کی طرف دیکھا۔

"مجھے اس دن کا انتظار رہے گا جب تم ادھر بیٹھو گے۔" اس کرسی کی طرف دیکھتے ہوئے انہوں نے سوچا تھا۔

انہوں نے رسٹ واچ کو دیکھا تھا شام کے سات بج رہے تھے اور تھوڑی دیر بعد مغرب کی نماز تھی۔ وہ کمرے کا دروازہ بند کرنے کے بعد پلٹے تھے اور یہ ان کی زندگی کا حیران کن پل تھا۔ وہ دیوار سے ٹیک لگائے۔ چہرے پہ بچوں کی سی معصومیت لیے۔ جوتے کی نوک سے زمین کو کھرچ رہا تھا۔

"حارث!" وہ شدید حیران تھے۔ اس نے سر اٹھا کر کہا تھا۔

"تم اندر کیوں نہیں آئے؟" حیرت ابھی بھی باقی تھی۔

"نہیں آ سکا۔"

"مگر کیوں؟"

"آپ جو پڑھا رہے تھے وہ مشکل تھا اور سمجھ سے باہر بھی۔" اس نے ٹھہر ٹھہر کر بات مکمل کی تھی۔

"تو تم" وہ آگے بڑھے اور اس کا کندھا تھپتھپایا تھا۔

"یہ آسان ہے۔ بہت آسان۔ تمہاری سوچ سے بھی زیادہ" وہ اب کہہ رہے تھے۔



ایسٹ گرین وچ ٹاؤن کا ایک گھر تھا۔ جس کے سولہ بائی بارہ کے ایک کمرے میں حارث قیوم بیٹھا تھا۔ اور وہ کمرہ ڈاکٹر حسنات کے گھر کا ڈرائنگ روم تھا جسے وہ بطور لیکچر روم استعمال کیا کرتے تھے۔ حارث اپنے لیے لگائی کرسی پہ کبھی بھی نہیں بیٹھ سکا تھا۔ وہ اس کلاس کا حصہ بھی کبھی نہیں بن سکا تھا۔

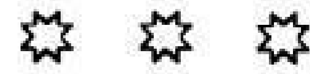
حارث کا شمار ان لوگوں میں نہیں کیا جا سکتا تھا جنہیں عام کہا جا سکتا ہو۔ عام لوگ عموماً" قرآن پڑھنا جانتے تھے۔ وہ نہیں۔ عام لوگ عموماً" دین کے بارے میں بنیادی باتوں سے آگاہ تھے۔ بد قسمتی سے اب بھی وہ نہیں۔

ڈاکٹر حسنات اسے بھی کلاس کا حصہ بنا ہی نہیں سکے تھے۔ وہ ان کے لیے کسی بچے کی طرح تھا۔ انہیں اسے ایسے ہی ٹریٹ کرنا تھا جس طرح کہ کسی بچے کو کیا جاتا ہے۔

انہوں نے اسے قرآن پڑھایا اور اس کا ترجمہ سکھایا ورنہ وہ تو صرف بسم اللہ پڑھنا جانتا تھا۔ اور حارث۔ اس نے کہا تھا کہ وہ کچھ بھی کرے گا۔ کیونکہ اسے شفا چاہیے تھی۔ اور اب کی بار بھی وہ قرآن کسی دینی جذبے یا پھر آخرت کے خوف کی وجہ سے نہیں پڑھ رہا تھا۔ وہ تو محض اسے اپنا علاج سمجھ کر سیکھ رہا تھا۔ محض اک علاج۔

"اور یہ وہ کتاب ہے کہ اس کی طرف جو ہاتھ جس غرض سے بڑھتا ہے اسے اس کی اس ہی غرض کے

ساتھ لوٹایا جاتا ہے۔"

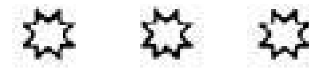


وہ اپنے حال میں کھڑا ماضی کو دیکھ رہا تھا اور اسے ماضی اک مذاق کے علاوہ کچھ محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ اور اگر آج... آج اسے ماضی میں جانے دیا جاتا تو اسے حال کبھی بھی اک مذاق کے سوا کچھ محسوس نہیں ہوتا۔ تو وہ سعد ساعتیں تھیں مگر... وہ کب آئی تھیں اس کی زندگی میں، اس نے سوچنے کی کوشش کی۔ مگر ہر کوشش اس لیے نہیں ہوتی کہ بارآور ہو سکے اور اسی کوشش میں اس نے تکلیف کی اک اور لہر کو برداشت کیا تھا۔

ہاں! تو وہ سعد ساعتیں... وہ کیا تھیں... کب تھیں کہ لوہے کو سونا بنا گئی تھیں اب کی بار اس نے آنکھیں اور ہونٹ بھینچ کر درد کی شدت کو روکا تھا۔ وہ کیا تھا جس نے اسے ایسا بنا دیا تھا۔ آخر وہ کیا تھا' وہ جاننا چاہتا تھا۔

اور پھر اسے یکدم... بہت اچانک ڈاکٹر حسنات یاد آئے تھے اور ان کی کہی بات بھی۔

تو۔ وہ۔ وہ انسان۔ جو کہ کبھی لوہا تھا وہ زنگ آلود لوہا۔ وہ لوہا ہی رہتا اگر...



"زانی مرد اور عورت کو سو سو کوڑے مارو اور نہ آئے تم کو ان دونوں پر ترس اللہ کے دین میں اگر ہو تم ایمان رکھتے اللہ اور یوم آخرت پہ اور چاہیے کہ ان کے عذاب کے وقت مسلمانوں کی ایک جماعت موجود ہو۔"

(سورہ نور)

وہ تقریباً" ایک سال سے اس کتاب کو سیکھ رہا تھا جس کے بارے میں اس کا خیال تھا کہ اس میں شفا تھی۔

اور اس ایک سال کے دوران وہ کسی آیت۔ کسی ڈراوے۔ کسی خوش خبری پہ ٹھٹک کر رکا نہیں تھا۔ وہ اسے علم سمجھ کر سیکھتا گیا اور شفا کے لیے عمل کرتا گیا

مگر آج۔ آج کیا ہوا تھا۔ وہ ٹھٹکا۔ اور ٹھٹک کر رکا۔ اور رک کر مجسم سنگ ہو گیا تھا۔

"حارث!" اسے متوجہ نہ پا کر ڈاکٹر حسنات نے اسے پکارا تھا۔ وہ چونکا اور انہیں دیکھا۔ اور دیکھ کر متوجہ ہوا۔

ڈاکٹر حسنات اس کے متوجہ ہونے پر دوبارہ بولنے لگے تھے۔ ڈاکٹر حسنات اس آیت کا مطلب واضح کرتے ہوئے اسے ایک بدکار عورت کا واقعہ سنا رہے تھے۔

"وہ عورت جو کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور بدکاری کی سزا چاہی مگر وہ حاملہ تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بچے کی ولادت ہونے تک سزا کو ٹال دیا۔ وہ پھر آئی بچہ تولد ہونے کے بعد' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر اسے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ وہ شیر خوار بچے کو دودھ پلائے۔ دودھ پلائے جانے کی عمر تک اور جب۔ جب یہ مدت بھی پوری ہوئی تو وہ عورت دوبارہ آئی اور سزا کی طلب گار ہوئی۔

اسے سزا دی گئی۔ سنگسار کیا گیا اور سنگساری کے دوران جب خون کے چھینٹے ایک صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے کپڑوں پہ پڑتے ہیں تو وہ کراہیت کا اظہار کرتے ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی کراہیت کے اظہار پر فرماتے ہیں۔

"اگر اس عورت کی توبہ مدینے کے ستر گناہ گاروں میں بھی بانٹ دی جائے تو وہ سب بھی بخشے جائیں گے۔"

(صحیح حدیث کا مفہوم)

ڈاکٹر حسنات بول رہے تھے اور وہ پھر سے اسی کیفیت کا شکار ہو رہا تھا۔

اس پہ کپکپی نہیں طاری ہو رہی تھی مگر وہ خود کو سنبھال بھی نہیں پا رہا تھا۔ وہ کیا تھا جو اس کے دل پہ ابھی ابھی اترا تھا۔ وہ کیا تھا۔ آخر وہ کیا تھا۔ اگر وہ قرآن تھا تو وہ پچھلے ایک سال سے جو پڑھ رہا تھا۔ سیکھ رہا تھا وہ کیا تھا؟ اس نے دل کی دھڑکن کو تیز ہوتے محسوس کیا۔ نہیں شاید اس نے دل کی دھڑکن کو ڈوبتے

ہوئے محسوس کیا تھا۔ ڈاکٹر حسنات کہہ رہے تھے۔ اور آواز کا سماعت سے رشتہ نہیں ٹوٹا تھا۔ یہ ذہن کا فہم سے تعلق تھا جو کہ ٹوٹ رہا تھا۔

"زینب آپا۔" اس کے ہونٹوں نے بلا آواز اس نام کو دہرایا تھا۔

اسے وہ کوڑے یاد آئے۔ اپنی کمر پہ برستے وہ کوڑے۔ وہ ننگی سڑک اور برہنہ جسم یاد آیا۔ سڑک پہ کھڑا گالیاں دیتا۔ لعنت کرتا وہ ہجوم یاد آیا۔ زینب آپا کا رونا یاد آیا اور۔ اور سمجھ میں بھی آگیا تھا۔

وہاں بیٹھے بیٹھے اس پہ جیسے ایک ایک چیز آشکار ہوتی گئی۔ واضح ہوتی چلی گئی۔

ڈاکٹر حسنات نے ایک دفعہ پھر اس کی بے توجہی بھانپی تھی۔ وہ پھر سے اس کی توجہ کو کھینچنا چاہتے تھے مگر انہیں لگا کہ کم از کم اب کی بار وہ ایسا نہیں کر پائے۔ وہ وہاں نہیں تھا۔ یقیناً" وہ وہاں۔ نہیں تھا۔ اس کا ساکت جسم۔ ٹھہری ہوئی آنکھیں۔ یہ بتانے کو۔ گواہی دینے کو کافی تھیں کہ حارث قیوم وہاں نہیں تھا تو۔ تو پھر وہ کہاں تھا۔ کہاں؟؟؟

"بعض نشان زخموں سے زیادہ اذیت دیتے ہیں۔"

اس نے بازگشت سنی۔

"یہ نشان کیسا ہے؟" ابھی ابھی سا ننھا کا لمس عین اسے اپنی کمر پر محسوس ہوا۔

اور نشان دہکنے لگا۔ سرخ انگارے کی طرح اور دہک کر جلنے لگا اور جل کر اسے بھی جلانے لگا۔ وہ پگھلا۔ اور اس طرح سے پگھلا کہ قطرہ قطرہ بہنے لگا۔ ڈاکٹر حسنات یک ٹک اسے دیکھ رہے تھے۔ یہ پہلی دفعہ تھا کہ وہ کسی آیت کو سن کر یوں ہو گیا تھا۔

وہ کیوں اسے متوجہ کرتے۔ یہ ہی تو وہ لمحہ تھا۔

انہوں نے کتاب بند کی۔ سائیڈ پر رکھی اور خموشی سے اسے اکیلا چھوڑ کر چلے گئے تھے۔

آج کا سبق کافی تھا۔ اور ان کا کام بھی یہیں تک تھا۔ اور آگے اللہ جانے اور اس کا بندہ۔ ہر شخص اپنے تعلق کا خود ذمہ دار ہے۔ اس تعلق کا جو اس کا اپنے اللہ سے ہے۔ کیا ہے... ہے بھی کہ نہیں۔ زیادہ یا کم۔ گہرا یا سطحی۔ وہ اس کا ذمہ دار خود ہے۔ یقیناً" کوئی اور نہیں۔

✡ ✡ ✡

شفیق بھائی اس کے منہ سے پولیس اسٹیشن کا نام سن کر حیران نہ ہوتے تو اور کیا کرتے۔ وہ اب کیا کر کے آرہا تھا۔ ایسا کیا کر دیا تھا کہ وہ پولیس اسٹیشن جانا چاہتا تھا۔

"حارث! کیا کر دیا؟" بے ساختہ وہ بولے۔

اس نے نظریں اٹھا کر انہیں دیکھا۔ اور پھر وہ خود بستر سے اٹھ کر جوتے پہننے لگا۔ اس نے بستر کے ساتھ رکھی گئی میز سے بھی اپنی چیزیں اٹھانی شروع کر دی تھیں۔ وہ یقیناً" خود جا رہا تھا۔ شفیق بھائی کے چہرے پہ بڑا بڑا انکار جو لکھا ہوا نظر آرہا تھا۔

"حارث!" انہوں نے کندھے سے پکڑ کر اسے روکا۔

"یار! کچھ بتاؤ۔ کچھ سمجھاؤ تو سہی۔ آج بھی تمہاری اگلے بندے کو غلط سمجھنے والی عادت نہیں بدلی۔"

اب کی بار حارث قیوم بری طرح سے شرمندہ ہوا اور اب وہ اکثر۔ ایسے ہی بری طرح سے شرمندہ ہو جایا کرتا تھا۔

"آپ مجھے لے چلیں۔ میں آپ کو راستے میں بتاؤں گا۔" وہ اسی شرمندگی کے زیر اثر بولا۔

"اچھا چلو۔" اور شفیق بھائی نے یقیناً" اسے لالی پاپ دیا تھا۔

✡ ✡ ✡

زندگی کیا ہوتی ہے۔ یہ کیا کرتی ہے۔ آخر یہ کیا کرتی ہے آپ کے ساتھ۔ کس کس طرح سے اور کہاں کہاں سے کیسی کیسی حقیقتیں آپ کے سامنے لاکر اسے آپ کے منہ پر دے مارتی ہے۔ مگر کیا واقعی یہ سب زندگی کرتی ہے؟

کیا یہ سب وہ نہیں کرتا جس کے ہاتھ میں زندگی ہے۔

تو ابھی ابھی ایسٹ گرین وچ ٹاؤن میں واقع ایک گھر کے سولہ بائی بارہ کے کمرے میں بیٹھے شخص کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔

اس کے ساتھ بھی زندگی کو ہاتھ میں رکھنے والے نے یہی کہا تھا۔ اور وہ اس وار کو سہنے اور سمجھنے کی کوشش میں تھا۔ وہ جو بہن کو ڈائن کہتا تھا اور یہ کہتا تھا کہ تم جیسی کوئی بہن نہیں کوئی گالی ہی ہو سکتی ہے۔ اسے آج۔ اتنے عرصے بعد۔ بہن سمجھ میں آئی تھی۔

پانچ سال پہلے بہن کی وجہ سے جب شرطے اسے پکڑ کر لے جا رہے تھے تو وہ کیسا حیران ہوا تھا۔ اور اس سے بھی پہلے۔ تقریباً" پندرہ سال پہلے جب بہن نے اسے جیل سے رہا کروانے سے انکار کیا تھا تب بھی وہ کیسی حیرت کا شکار ہوا تھا۔ آج تمام تر حیرتوں کے رفع ہونے کا دن تھا۔

تو زینب قیوم چاہتی تھیں کہ حارث قیوم کو کیے گئے گناہوں کی سزا دنیا میں ہی ملے' آگے جب وہ جائے تو اس کے نامہ اعمال میں یہ لکھا ہو کہ حارث قیوم ولد عبدالقیوم فلاں فلاں جرم کا سزا یافتہ ہے۔ اور وہ۔ اس نے کیا چاہا تھا۔

دنیا کا عیش اور آخرت کی۔۔۔؟ بے ساختہ اس نے کرب سے آنکھیں بند کی تھیں۔

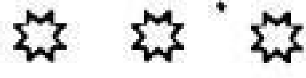
اس بدکار عورت نے توبہ کی اور ایسی توبہ جو کہ ستر گناہ گاروں کو بھی بخشوا دے مگر پھر بھی وہ شرعی "حد" سے نہ بچ سکی۔

توبہ آخرت کی نجات ہے۔ دنیا میں کیے جانے والے گناہوں کی سزا ہے۔ جو کہ پوری کرنی ہے تب بھی جب آپ توبہ کر چکے ہوں۔

اور حارث قیوم۔ کتنے اور کوڑے؟۔ کتنے اور ہنٹر؟ اس نے حساب لگانا چاہا۔ اور وہ ٹھٹھر کر رہ گیا تھا۔ ہفتہ کے پانچ دن گناہ کرنے والا شخص کس طرح سے یہ حساب لگا سکتا تھا۔

"اس نے دنیا کی سزا پوری نہیں کی تھی تو آخرت کی نجات کیسے ہو سکتی تھی۔ اس کی توبہ۔" اور اس لفظ پہ آ کر جیسے اسے چار ہزار والٹ کا جھٹکا لگا تھا۔

"اس نے توبہ کب کی تھی؟"



ڈاکٹر حسنات نے اس کے دماغ اور دل میں کسی چیز کو ٹھونسنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وعظ نہیں سنائے تھے۔ جنت و حوروں کی بشارتیں نہیں پڑھ پڑھ کر سنائی تھیں۔ جہنم۔ عذاب۔ کھولتا پانی۔ پیپ کی خوراک کی کہانی نہیں سنائی تھی۔ انہوں نے وہ ہی کیا تھا۔ جو اس جیسے انسان کے ساتھ کرنا چاہیے تھا۔ انہوں نے کتاب کھول کر اس کے سامنے رکھ دی تھی۔ قطرہ۔ قطرہ اس میں انڈیلتے گئے تھے۔ کسی امرت کی طرح۔ اور کتاب۔ یہ تو وہ ہے جو اگر پہاڑ پہ نازل کر دی جاتی تو وہ ریزہ ریزہ ہو جاتا تو انسان۔ کیا وہ اس قابل ہے کہ اسے ایک بار ہی میں۔ ایک گھونٹ میں ہی۔ سب کچھ گھول کر پلا دیا جاتا۔

اور۔ حارث قیوم! وہ یقیناً "اس قابل نہیں تھا۔

ہر الکتاب سکھانے والا استاد' نہیں ہوتا مگر اسے ہونا چاہیے۔ یہ گر الٹے ہاتھوں پہ ڈنڈے مار کر سکھائی جانے والی چیز ہوتی تو کوئی ابوجہل۔ ابولہب نہ ہوتا۔

"یہ محبت" کو محبت سے سکھایا جانے والا کام ہے۔ اور اس کے سکھانے والے کے ہاتھ اور زبان میں سختی ہو۔

"چہ معنی دارد؟"

اور حارث قیوم۔ اس نے کیا کیا تھا۔ وہ قرآن کو سیکھتا گیا۔ محض شفا کی خاطر یہ اس کے لیے کسی نسخے کی طرح تھا جس میں لکھا ہوتا تھا ایک گولی صبح۔ ایک دوپہر اور دو چمچ رات میں۔ اس نے قرآن کو ایسی ہی میڈیسن سمجھا تھا جو اسے کسی خاص مدت تک کھانی تھی۔ مگر اس کی حالت میں افاقہ نہیں ہو رہا تھا۔ وہ اب بھی راتوں کو سو نہیں پاتا تھا۔ وہ اب بھی اسی طرح سے "موت" سے خوف زدہ تھا۔ وہ ابھی سلیپنگ پلز کھاتا تھا۔

اور وہ رات۔ جب اسے قرآن سیکھتے ہوئے مسلسل سات دن ہوئے تھے۔ اس ساتویں دن کی

رات میں۔ جب وہ ساری رات گرین وچ کی سڑکوں پہ خوار ہوتا رہا تھا اس ساتویں رات کے دن میں وہ ڈاکٹر حسنات پہ برس پڑا۔

"آپ مولوی لوگ۔ آپ سب ایک جیسے ہوتے ہیں جھوٹے۔ اور فریب دینے والے۔ آپ نے جھوٹ بولا۔ آپ نے غلط کہا۔ یہ شفا نہیں ہے۔"

اس نے ڈاکٹر حسنات کے سامنے رکھی گئی کتاب پہ انگلی بجا کر کہا تھا۔

"آپ نے کیا اللہ سے ٹھیکہ لے رکھا ہے ہر انسان کو سدھارنے کا۔ ہر ایک کو جنت میں بھجوانے کا۔ کوئی آپ سے پوچھے۔ کس نے حق دیا آپ کو۔ مجھ جیسے لوگوں کے جذبات سے کھیلنے کا اور میں۔ میں۔ پاگل۔ گدھا۔ احمق۔ الو۔ کیا ہوں میں۔ جو آپ کے جھانسے میں آگیا۔ آپ کی باتیں لے ڈوبیں مجھے۔ افسوس۔ پھر سے افسوس۔ مجھے دنیا گھوم کر دیکھ لینی چاہیے تھی۔" اشتعال سے بولتے بولتے وہ آخر میں رونے لگا تھا۔ ڈاکٹر حسنات نے جذبات سے عاری چہرے کے ساتھ سامنے موجود روتے اور بلکتے شخص کو دیکھا۔

"تم اب بھی آزاد ہو۔ دنیا کو گھوم کر چیک کرنے میں مگر۔ مجھے حیرت ہے کہ تمہیں۔ میری یہ بات یاد رہی مگر یہ یاد نہ رہا کہ یہ۔ یہ مقدس کتاب۔" انہوں نے کتاب ہاتھ میں پکڑ کر فضا میں بلند کی تھی۔

"یہ تب تک آپ کو کچھ نہیں دے گی' جب تک کہ اس سے سیکھے گئے الفاظ پہ عمل نہ ہو۔" وہ ڈاکٹر حسنات کی بات کو کاٹ کر رد کرنا چاہتا تھا مگر نہیں کر سکا تھا۔

ان کا سرد لہجہ ہڈیوں میں اترتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

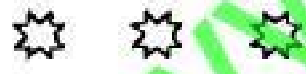
"کیا میں نے تم کو یہ نہیں بتایا تھا۔ حارث قیوم یاد کرو۔ کیا میں نے یہ حقیقت تم پہ آشکار نہیں کی تھی۔ مجھے کیا نفع۔ کیا فائدہ۔ کیا حاصل۔ کہ کسی گندگی میں لتھڑے شخص کو اٹھاؤں اور اسے بتاؤں کہ وہ کس قدر گندا ہے۔ اور یہ کہ وہ کس طرح سے صاف ہو سکتا ہے۔" وہ سیدھا اس کے چہرے پہ نظریں گاڑے بول رہے تھے۔

"یہ زبردستی کا کام نہیں محترم۔ نہیں سیکھنا تو جاؤ۔ تم نہ سہی۔ کوئی اور سہی۔ اللہ کسی اور کو لے آئے گا میرے سامنے۔ کوئی اور بالکل تم جیسا۔ اندھا۔ گونگا۔ اور بہرا۔ اور اللہ چاہے تو وہ اس کی بصارتوں کے سماعتوں کے اور لبوں کے پردے ایک ایک کر کے ہٹا دے گا اور اگر اللہ چاہے۔ تو یہ سب میرے ذریعے سے ہوگا۔ مگر وہ تم نہیں ہو گے۔ وہ یقیناً" کوئی اور ہوگا۔ کوئی اور۔ وہ کہ جسے اللہ بدل دے گا تم سے۔ مگر یہ کہ وہ تم سے بہتر ہوگا۔ وہ یوں کہ میں ارادہ کر چکا ہوں اور میرے پاس سیکھنے والوں کی کمی نہیں۔ بالکل بھی نہیں۔" بے تاثر۔ ٹھنڈا لہجہ۔ ایسا ٹھنڈا لہجہ جو گرمی میں سردی کی یاد دلا دے۔ حارث کا رنگ بدلا تھا۔ بے اختیار۔ وہ اب چیزیں سمیٹ رہے تھے۔

"اب تم جاؤ حارث قیوم۔ دنیا تمہاری منتظر ہے۔" کھڑے ہو کر قدرے نرم لہجے میں اب کے کہا گیا تھا۔

حارث قیوم کھڑا ہوا۔ اسے غصہ پھر سے آیا اور اسی غصے میں وہ زوردار ٹھوکر کرسی کو مار کر چلا گیا تھا۔

اس کے جاتے ہی ڈاکٹر حسنات کھل کر مسکرا دیے تھے۔ وہ بچہ تھا۔ بالکل بچہ۔ کیا اب کوئی نفسیات کے ڈاکٹر کو یہ بتائے گا کہ مریضوں کو کس طرح سے ہینڈل کرنا ہے۔



اور اس ساتویں دن کے ٹھیک سات دن بعد۔

"کیا دنیا گھومنے اور گھوم کر چیک کرنے کے لیے محض سات دن کافی ہوتے ہیں؟ کیا یہ کام سات دن میں ہو جاتا ہے؟" چھیڑتا ہوا مگر مسکراتا لہجہ۔ اور وہ زچ ہوتا شخص۔

"آپ کا کام ہے سکھانا۔ اس سے لاپروا ہو کر کہ سیکھنے والا کیسا ہے۔ کون ہے اور یہ کہ وہ کیا کر کے آرہا ہے۔"

اور ڈاکٹر حسنات کی مسکراہٹ سمٹی اور سمٹ کر پھر

سے پھیل گئی۔ پہلے سے قدرے زیادہ۔

"پہلی معقول بات۔" انہوں نے پھر سے چڑایا۔

اور وہ پھر سے چڑ بھی گیا تھا۔

"آپ؟" اس نے دانت پیس کر کہا۔

"عمل کرو گے؟" نرمی سے سوال کیا گیا۔

"کوشش کروں گا۔" دوسرا معقول جواب آیا تھا۔

تو ساتویں دن کے ٹھیک سات دن بعد۔ سیکھنے اور سکھانے کا عمل پھر سے شروع ہو گیا تھا۔ ساتویں دن کے ٹھیک سات دن بعد۔

"لمحہ ہدایت" یہ دیکھنے۔ سننے پڑھنے اور لکھنے میں اتنا عام سا لفظ ہے کہ ہر دوسرا شخص اسی کو دہراتا رہتا ہے مگر۔ ہاں۔ مگر۔ جب یہ کسی کی زندگی میں آتا ہے تو یہ ہرگز ہرگز بھی عام نہیں ہوتا۔ یہ دراصل کسی سعد ساعت کی طرح ہوتا۔ کوئی جادوئی لمحہ۔ اور ایسا دو مرتبہ ہوتا ہے۔ پہلی مرتبہ تب جب انسان یہ فیصلہ کرتا ہے کہ اسے دین کی طرف آنا ہے اور دوسری دفعہ تب۔ جب وہ یہ فیصلہ کرتا ہے اب اسے اسی طرز زندگی پہ قائم رہنا ہے۔ کچھ عرصے پہلے جب حارث قیوم ڈاکٹر حسنات کے کلینک پہ بیٹھا الکتاب پہ ہاتھ رکھ کر کہہ رہا تھا کہ اسے شفا چاہیے۔

وہ لمحہ۔ وہ اس انسان کی زندگی کا پہلا پارس لمحہ تھا۔

اور آج جب وہ اٹھارہویں پارے کی دوسری سورت پہ ٹھٹک کر رکتا ہے تو وہ ایک سولہ بائی بارہ کے کمرے کی کرسی پہ بیٹھا سنگ ہوا شخص۔ کہ جس کی کمر کے لہرسیے دار نشان دہک رہے تھے۔ اور وہ جل رہا تھا۔ ہاں۔ وہ جل رہا تھا۔ بنا آگ کے۔ اور اس کی آنکھوں میں جمع ہونے والا پانی۔ اس بنا آگ والی جلن کی تپش سے سوکھ کر دھواں بن رہا تھا اور وہ سارا کا سارا دھواں اس کے اندر ہی جمع ہوتا چلا جا رہا تھا۔ دھواں ہو کر راکھ ہوتا اور راکھ ہو کر خاک ہوتا اور خاک ہو کر بکھرتا وہ شخص۔

مگر اے مقام حیرت۔ کہ وہ ابھی بھی سنگ ہو کر کرسی پہ بیٹھا تھا۔ اور دور سے بالکل صحیح سلامت دکھتا تھا۔

تب ہی۔ تب ہی اس نے دور سے آتی آواز سنی۔

مدہم۔ خوب صورت۔ خوش الحان آواز۔

"اللہ سب سے بڑا ہے۔ اللہ سب سے بڑا ہے۔"

تو یقیناً" بڑا ہی ہے۔ سب سے بڑا۔ تب ہی تو میرے جیسا شخص ادھر یہاں اس کمرے میں بیٹھا ہے۔

"میں گواہی دیتا ہوں کہ تیرے سوا کوئی معبود نہیں۔"

"ہاں! دی گواہی۔ دی میں نے گواہی اور آج صدق دل سے دی۔ کیا کسی اور میں اتنی طاقت تھی کہ وہ مجھے یہ راہ دکھلاتا۔"

اس نے دل کو چیختے ہوئے کہتے سنا مگر اس کے ہونٹ چپ تھے۔

"میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔" ان الفاظ پہ اس نے اپنے دل کی حالت کو عجیب تر ہوتے محسوس کیا تھا۔ تو اس کا بھی کوئی نبی تھا۔

"آؤ نماز کی طرف۔ آؤ نماز کی طرف۔" اور وہ اٹھ گیا تھا۔ بے ساختہ بے اختیار۔ اس لمحے کتنے لوگ ہوں گے جو اس طرح۔ محض اک آواز پہ اٹھ جاتے ہوں گے۔

حارث قیوم نے خود کو اس لمحے خوش قسمت ترین شخص محسوس کیا تھا کہ وہ اسی گروہ کا حصہ بنا دیا گیا تھا۔

"دوڑو کامیابی کی طرف۔ دوڑو کامیابی کی طرف" اس آواز پہ اٹھ کر کھڑے ہو کر۔ ہر بڑھتے قدم کے ساتھ۔ وہ خود کو کامیابی کی دوڑ میں شامل کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔

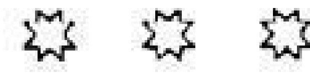
اک دوسرا جادوئی لمحہ۔ اک اور سعد ساعت۔

"اللہ اکبر۔ اللہ اکبر۔"

مسجد کی طرف چھوٹے چھوٹے مگر مضبوط قدموں کے ساتھ چلتے شخص سے زیادہ بہتر کون جان سکتا تھا کہ اللہ کتنا بڑا ہے۔

"نہیں کوئی معبود مگر سوائے اللہ کے" اس آخری پکار پہ اس نے سر اٹھا کر آسمان کو دیکھا۔ کس نظر سے

دیکھا۔ کیا اب بھی بتانا چاہیے کہ کس نظر سے دیکھا۔



"توبہ کیا ہوتی ہے؟"

"کامیابی کی طرف پہلا قدم۔"

"اور آخری قدم؟"

"ایسی توبہ جو ستر گناہ گاروں میں بانٹی جائے تو وہ انہیں بھی بخشوا دے۔"

ڈاکٹر حسنات نے اس سے پوچھا تھا کہ۔

"عمل کرو گے؟" اور اس نے کہا تھا کہ کوشش کروں گا۔

مگر وہ ایسی کوشش تھی کہ ایک سال سے الکتاب سیکھنے کے باوجود وہ "شفا" کے مفہوم کو بھی جان نہیں پایا تھا۔ اس کو بھی کسی دوا کی طرح ہی سمجھا تھا۔ پھر وہ ہی طرز سوچ۔

اور اللہ کو کیا غرض کہ آپ دن میں کتنی دفعہ زمین پر ٹکریں مارتے ہیں۔

اسے سجدہ چاہیے۔

اور وہ جو کرتا تھا۔ وہ کچھ بھی ہو سکتا تھا مگر "سجدہ" نہیں۔ رٹے رٹائے چند الفاظ۔ بے دلی سے کی گئی چند حرکتیں۔

اور توبہ۔

یہ اس کی زندگی میں کہیں نہیں تھی اور نہ ہی اس نے کبھی اس کی ضرورت محسوس کی تھی اور نہ ہی وہ یہ سمجھتا تھا کہ اس نے کوئی گناہ کیے تھے۔ تو پھر۔ پھر۔ یہ کہاں سے آگئی تھی اور اس کی زندگی کو یوں کر دیا تھا جیسے کسی بھرے پیالے کو پکڑ کر الٹ دیا جائے۔

ہر چیز جیسے اپنے مقام سے ہل کر رہ گئی تھی۔ اور اپنی جڑ کے مقام سے اکھاڑ کر پھینک دی گئی تھی۔ وہ اگلے دن نہیں آیا تھا۔ وہ اگلے سے اگلے دن بھی نہیں آیا تھا۔ اور پھر تیسرے دن وہ ڈاکٹر حسنات کے سامنے موجود تھا۔

ستا ہوا چہرہ۔ بڑھی ہوئی شیو اور سرخ آنکھیں لیے۔ یوں جیسے وہ پچھلی دو راتوں سے سخت تکلیف میں تھا۔ سخت بے چینی و اضطراب کا شکار رہا تھا۔

انہوں نے بس اک نظر اس کے چہرے کو دیکھا تھا۔ جھکا ہوا سر۔ بھنچے ہوئے ہونٹ۔ کچھ کہنے کی کوشش کرتے ہوئے۔ اور اسی کوشش میں ناکام ہوتے ہوئے۔

"حارث!" انہوں نے تسلی کے سے انداز میں اس کے گھٹنے پہ ہاتھ رکھا تھا۔

اس نے نظریں اٹھا کر ڈاکٹر حسنات کو دیکھا بس اک نظر۔ ایسی نظر جو کہ شکستہ تر تھی۔

"ایک سال سے شفا کو ڈھونڈ رہا ہوں۔ یہ ہی تلاش مجھے اس کتاب تک لے آئی۔ میں سیکھتا رہا۔ مگر یہ احساس تک نہ ہوا کہ کیا سیکھ رہا ہوں۔ گناہ۔ توبہ۔ سزا۔ جزا۔ سب پڑھتا مگر یہ تک جان نہیں پایا کہ آخر مجھے کرنا کیا ہے۔ اور توبہ۔ اس کا خیال مجھے اٹھارہویں پارے کی دوسری سورت پہ آتا ہے۔ پہلے پارے کی پہلی سورت پہ کیوں نہیں آیا۔ آخر وہ کیا چیز تھی جو کہ میری سماعت اور دل کے درمیان حائل تھی کہ میں سن کر بھی دل میں اتار نہ سکا۔ آخر ایسا کون سا پردہ تھا کہ دیکھ کر بھی سمجھ نہ سکا۔ میں اتنا اندھا تھا کیا؟ یہ اب ہی کیوں ہوا؟ یہ پہلے کیوں نہ ہو گیا۔

آخر کیوں؟؟" اس کی آواز۔ اس کا چہرہ جیسے ہر تاثر کا آئینہ بن گیا تھا۔ دکھ۔ پشیمانی۔ شرمندگی۔ اضطراب ہر چیز کا۔

"قرآن تب تک کسی کے دل پہ اثر نہیں کرتا۔ جب تک کہ اس کا دل شفاف نہ ہو۔ اور دل کی شفافیت کیا ہوتی ہے۔ حارث قیوم؟" وہ ان کو منہ اٹھا کر دیکھ ہی سکتا تھا سو دیکھ رہا تھا۔

"جب کوئی مسلمان گناہ کرتا ہے تو اس کے دل پہ ایک سیاہ نقطہ لگا دیا جاتا ہے اور پھر اگر وہ توبہ کرے اور گناہ کو چھوڑ دے اور اللہ سے معافی مانگے تو اس کے دل کو صاف کر دیا جائے گا۔ لیکن اگر وہ گناہ میں بڑھ جائے تو اس کے دل کی سیاہی بھی بڑھ جائے گی۔ (مفہوم حدیث) تو سوچو حارث قیوم جب دل کی سیاہی بڑھتی ہے تو کیا ہوتا ہے۔ جب انسان گناہ پہ گناہ کرتا

ہے تو اس کا دل کیسا سیاہ ہوتا ہے۔ کیا یہ ایسا نہیں ہوتا۔"

یہ کہہ کر ڈاکٹر حسنات نے ہاتھ میں پکڑے پین کی سیاہی قریب رکھے پانی کے گلاس میں ڈالی تھی۔ سیاہی تیزی سے پانی میں حل ہو کر اسے سیاہ کر رہی تھی۔

حارث دم بخود اس عمل کو ہوتے دیکھ رہا تھا۔ پانی اب مکمل طور پہ سیاہ ہو چکا تھا۔ وہ پانی نہیں اس کا دل تھا۔ وہ سیاہی نہیں۔ اس کے گناہ تھے۔ اس نے دکھ سے آنکھیں زور سے بند کی تھیں۔

"تم نے پوچھا کہ تمہارے ساتھ یہ اٹھارہویں پارے کی دوسری سورت پہ کیوں ہوا؟ پہلے پارے کی پہلی آیت پہ کیوں نہ ہو گیا۔ کیا اب تم سمجھ سکتے ہو۔ ایسا کیوں نہیں ہوا؟"

ڈاکٹر حسنات کی آواز پہ اس نے آنکھیں کھول کر سیاہ محلول والے گلاس کو دیکھا تھا۔

"اب بھی تو میرا دل۔" انہوں نے حارث کی بات کاٹی۔

"نہیں۔ حارث۔ نہیں اب یہ سیاہ نہیں ہے پچھلے ایک سال سے قرآن، تمہارے دل کو صاف کر رہا تھا۔ اس طرح۔"

اب کی بار انہوں نے صاف پانی والے جگ کو پکڑ کر آہستہ آہستہ صاف پانی سیاہ محلول والے گلاس میں ڈالنا شروع کر دیا تھا۔

پہلے گلاس کناروں تک بھرا اور پھر وہ کالا پانی بہنے لگا یوں کہ وہ بہہ کر میز کی سطح پہ پھیلا اور پھیل کر نیچے فرش پہ گرنے لگا۔ وہ ایک دفعہ پھر سے ساکت ہوا تھا۔

گلاس کا پانی صاف ہو رہا تھا۔ آہستہ آہستہ۔ مگر وہ صاف ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر حسنات مسلسل جگ سے پانی انڈیلتے گئے تھے۔ یہاں تک کہ گلاس ایک دفعہ پھر صاف اور شفاف پانی سے بھر گیا تھا۔

"اور اب۔ تمہارا دل صاف ہے تو جان سکتے ہو کہ جو تم پڑھ رہے ہو وہ کیا ہے۔ کیوں ہے۔ کس کے لیے ہے۔ تمہیں اس قابل بنایا گیا ہے کہ تم اس کو سمجھ سکو۔ گناہ پہ پشیمان ہو سکو اور توبہ کو سمجھ سکو۔ اور یہ یہ سمجھ سکو کہ ڈرنے والی چیز موت نہیں۔ موت کے بعد کا انجام ہے۔"

سرسراتی ہوئی آواز اس کی سماعتوں تک پہنچی تھی اور کسی کپکپی کی طرح پورے بدن میں پھیل گئی تھی۔

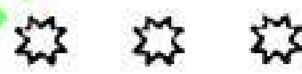
"تمہارا سوال بجا ہے۔ درست ہے یہ ہو سکتا تھا۔ پہلے پارے کی پہلی ہی آیت پہ مگر اس کے لیے شرط تھی کہ یہاں۔ اس کمرے میں اس کرسی پہ تمہارے بجائے ایسا شخص بیٹھا ہوتا جو صدق دل سے توبہ کر کے آیا ہوتا' یہ تمہارے ساتھ نہیں ہو سکتا تھا۔ اور جانتے ہو توبہ کیا کرتی ہے؟" وہ اب دوبارہ گلاس کے پانی میں سیاہی ملا رہے تھے۔ اور پھر انہوں نے ایک جھٹکے سے اس پانی کو دور پھینک دیا تھا۔ وہ حیران ہوا اور حیران ہو کر انہیں دیکھا۔

"توبہ یہ کرتی ہے۔" خالی گلاس اس کی آنکھوں کے سامنے کر کے کہا گیا تھا۔

اب کی بار اس نے کسی ٹھنڈی چیز کو اپنے پیروں سے اوپر لہر کی صورت اٹھتے ہوئے محسوس کیا تھا۔ کوئی بوجھ سا تھا جو یکدم اس کے سر کے عین اوپر گرا تھا۔ یہ کام ایک سیکنڈ میں ہو سکتا تھا۔ محض اک لمحے میں۔ دل کے ایک پختہ ارادے سے اور بس۔ اور وہ۔

"مجھے اکیلا چھوڑ دیں۔" ڈاکٹر حسنات نے اسے کہتے سنا۔ انہوں نے ایک نظر اسے دیکھا۔ جھکا سر۔ جھکی نظر اور جھکی نظروں سے گرتے چند قطرے۔

وہ اٹھ کر چلے گئے تھے۔ حارث خود کو ملال۔۔۔ دکھ۔۔۔ پچھتاوے کے پہاڑ کے بوجھ تلے دبا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ "ہاں! وہ ایسا ہی محسوس کر رہا تھا۔"



"میں نے آپ سے کہا تھا کہ مجھے پولیس اسٹیشن لے جائیں' نہ۔" "تم نے مجھے کہا تھا کہ تم راستے میں مجھے وجہ بتاؤ گے۔"

"شفیق بھائی۔"

"تم نے وجہ نہیں بتائی۔ میں تمہیں لے کر نہیں گیا' حساب برابر۔" انہوں نے بچوں کی طرح اسے

ڈیل کیا اور وہ زچ ہوا۔

"اندر آؤ۔" دروازہ کھولتے ہوئے وہ پہلے اندر داخل ہوئے تھے۔ چند لمحے ٹھہر کر حارث داخل ہوا تھا۔

گھر کے بیرونی گیٹ کو عبور کرتے ہی کارپورچ تھا اور اگر آنے والے کا رخ اندرونی دروازے کی طرف ہو تو دائیں ہاتھ پہ لان تھا اور لان کے ساتھ ہی مغرب کی طرف بیسمنٹ کا دروازہ تھا۔ اندر داخل ہونے کے بعد لاشعوری طور پر اس کی نظر بیسمنٹ کے دروازے پہ پڑی تھی اور وہ ٹھٹک کر ساکت ہو گیا تھا۔ اس کے سر کے عین اوپر احد پہاڑ آ گرا تھا۔

"حارث!" اپنے پیچھے اسے محسوس نہ کرتے ہوئے شفیق بھائی نے مڑ کر اسے پکارا۔

وہ وہاں نہیں تھا۔ شفیق بھائی نے اسے کسی ٹرانس کی سی کیفیت میں بیسمنٹ کے دروازے تک جاتے ہوئے دیکھا۔ وہ چند لمحے دروازے کے سامنے کھڑا رہا تھا۔

شفیق بھائی اس کے پیچھے نہیں گئے تھے۔ وہیں رک کر اسے دیکھنے لگے تھے۔ آخر وہ وہاں کیا کرنے گیا تھا؟ پھر شفیق بھائی نے اسے بیسمنٹ کا دروازہ کھولتے دیکھا۔ وہ ایک دفعہ پھر سے ٹرانس کی سی حالت میں اندر دیکھ رہا تھا۔ آخر وہ اب... وہاں کیا دیکھ رہا تھا؟ شفیق بھائی حیران ہوئے۔

"حارث!" انہوں نے آواز دی۔

اس نے مڑ کر شفیق بھائی کو دیکھنے کی کوشش نہیں کی تھی' بلکہ جھک کر اپنا چہرہ آستین سے صاف کیا تھا۔ واپس آ کر وہ شفیق بھائی کو دیکھے بغیر اندر کی طرف گیا تھا۔

شفیق بھائی اس کی حرکت پہ حیران تھے۔ مگر درگزر کر گئے تھے اور جب وہ دونوں گھر کے اندرونی حصے میں داخل ہوئے تو حارث بہت مغموم دکھائی دے رہا تھا اور حارث کیوں مغموم تھا؟ کیا اسے زینب کی وفات نے دکھی کیا تھا یا ان کی یاد نے...؟ ان میں سے کچھ بھی ایسا نہیں تھا۔ جس نے اسے مغموم کیا تھا۔

"تو تم کیوں پولیس اسٹیشن جانا چاہتے تھے؟" پانی کا گلاس حارث کو پکڑاتے ہوئے شفیق بھائی نے پوچھا۔ اس نے پانی کا گلاس پیے بغیر ٹیبل پہ رکھ دیا تھا۔ وہ اگر یہ سوال نہ کرتے تو یقیناً" حارث پانی پی چکا ہوتا۔

وہ ایک دفعہ پھر سے غمگین نظر آنے لگا تھا۔ یوں جیسے وہ کسی چیز کو ضبط کر رہا تھا۔ "آخر کس چیز کو؟" دونوں ہاتھوں کو ایک دوسرے میں پھنسائے وہ سر جھکائے ہوئے تھا۔

"حارث!"

اس نے گہرا سانس بھر کر نظر اٹھا کر انہیں دیکھا اور دیکھ کر نظریں پھیر لی تھیں۔ وہ بتا نہیں پا رہا تھا۔ یہ صاف ظاہر تھا۔ "حارث! کیا کچھ کر دیا ہے۔ کوئی سیریس مسئلہ ہے؟" شفیق بھائی نے اپنی طرف سے موزوں ترین الفاظ کا چناؤ کیا تھا' مگر پھر بھی وہ تڑپ کے رہ گیا تھا اور تڑپ کر برق رفتاری سے اک تیز نظر سے انہیں دیکھا تھا۔

"میں عمرہ کر کے آ رہا ہوں شفیق بھائی۔" بھرائی ہوئی آواز میں کہا تھا۔ اور وہ چھلک پڑے... جس کو وہ ضبط کر رہا تھا۔ آخر وہ چھلک ہی پڑے۔ شفیق بھائی نے ہکا بکا ہو کر اسے دیکھا اور دیکھتے ہی رہ گئے۔

"میں نے حارث کے لیے کچھ اتنی اور ایسی دعائیں مانگ رکھی ہیں کہ مجھے یقین ہے کہ میرا اللہ مجھے وہ ہی دے گا جو میں نے مانگا۔" اک بازگشت۔

اور شفیق بھائی نے دعا کو مقبول ہو کر اپنے سامنے بیٹھا دیکھا تھا اور وہ کہہ رہا تھا۔

"میں کبھی زینب آپا کو نہ سمجھ سکا اور نہ ہی ان کی محبت کو اور نہ خود کو' اور نہ اپنے خون کے ساتھ ساتھ بہنے والے جذبے کو... جسے میں نفرت کہتا رہا۔ مگر وہ کیا جذبہ تھا یہ مجھے ایسٹ گرین وچ کی سڑکوں پہ خوار ہو کر روتے ہوئے اور رو کر زینب آپا کو یاد کرتے ہوئے بھی نہ سمجھ میں آیا۔ میرے جیسے آدمی کو یہ تب سمجھ میں آیا' جب قرآن کے اٹھارہویں پارے کی دوسری سورت کی آیت پڑھی جاتی ہے۔

یہ مجھے تب سمجھ میں آیا... ہاں... ہاں... تب ہی

تو۔۔۔ اور میں نے کہا کہ میں زینب آپا کو دکھاؤں گا۔ ویسا ہی بن کر۔۔۔ جیسا وہ چاہتی تھیں۔ اتنا ہی اچھا بن کر۔۔۔ جتنا وہ مجھے کرنا چاہتی تھیں۔

مگر آج۔۔۔ آج۔۔۔

کیا ہونا چاہیے تھا میرے ساتھ۔۔۔ یہ ہی۔۔۔ بالکل یہ ہی تو۔۔۔

اسلام۔۔۔ اسلام۔۔۔ دین۔۔۔ دین۔۔۔ کہنا آسان ہے۔ بہت آسان۔۔۔ مگر اسلام اور دین کو سمجھنا اور سمجھ کر اس پہ چلنا اور چل کر ڈٹے رہنا۔۔۔ یہ کس قدر مشکل اور جان لیوا کام ہے۔ یہ کوئی آج مجھ سے پوچھے۔ میں کتنے قدم اور پیچھے دھکیل دیا گیا ہوں۔ یہ میں ہی جانتا ہوں۔ زینب آپا ہوتیں تو میں سمجھتا کہ منزل مل گئی۔ مگر۔۔۔" آنسوؤں نے اسے بات جاری رکھنے سے روکا تھا۔

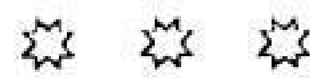
"میں کس قدر خالی ہاتھ ہوں۔۔۔ کس قدر کہ ساری عمر۔۔۔ میں اپنی باقی ساری عمر زینب آپا کو یہ نہیں بتا سکتا کہ ان کا حارث۔۔۔ بدل گیا ہے۔ میں ان سے یہ نہیں کہہ سکتا کہ زینب آپا مجھے معاف کریں۔ میں زینب آپا کو۔۔۔ زینب آپا کہہ کر پکار نہیں سکتا۔

ایسے میں جبکہ مجھے اپنی پشت پہ ان کا ہاتھ چاہیے تھا۔ میری پشت بے سہارا ہے اور میں کس قدر بے توازن ہوں۔۔۔ کاش کہ کوئی جان سکتا۔۔۔ کاش کہ۔۔۔"

اس نے دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر اونچی آواز سے رونا شروع کر دیا تھا۔

"زینب آپا۔۔۔ آپا۔۔۔" وہ درد سے بھری پکار۔۔۔ شفیق بھائی نے بے ساختہ دکھ سے آنکھیں بند کی تھیں۔

شفیق بھائی نے اٹھ کر اسے اپنے کندھے سے لگایا تھا۔ انہوں نے اسے پانی پلانا چاہا۔ مگر۔۔۔ اور پھر کچھ بے بس ہوتے ہوئے ان کے بھی آنسو بہہ نکلے تھے۔



اک گہرا سانس بھر کر انہوں نے الکتاب کو بند کیا اور مسکرا کر اسے دیکھا۔

جو سر جھکائے کافی سنجیدہ اور کچھ مغموم سا بیٹھا تھا۔ چند لمحے اسے دیکھتے رہنے کے بعد وہ کرسی پیچھے دھکیل کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس کی اور ان کی کرسی کے درمیان ایک چھوٹی ٹیبل دھری تھی۔ جس پر الکتاب رکھی ہوئی تھی۔ وہ کرسی اور ٹیبل کے درمیان میں سے نکلے اور ذرا دور ہٹ کر اپنے دونوں بازو پھیلا دیے تھے۔ کسی نامحسوس احساس کے تحت اس نے سر اٹھایا تھا اور دو کھلے بازو اور اک مسکراتا چہرہ اس کا منتظر تھا۔

وہ ٹھٹکا۔۔۔ پھر جھجکا اور جھجک کر اٹھ گیا اور اب وہ ان کے گلے ~ لگ رہا تھا۔

"مبارک ہو حارث قیوم! آج تم نے دنیا کا اہم اور عظیم ترین کام سرانجام دے لیا ہے۔" وہ ہلکا سا مسکرایا یا پھر مسکرانے کی کوشش کی۔

"تم یقینا" یہ خبر سب سے پہلے اپنی ماں کو دو گے۔"

اس نے ہلکے سے نفی میں سر ہلایا اور پھر ڈاکٹر حسنات نے اک مدھم سی آواز میں اک نام سنا۔

"نہیں۔۔۔ زینب آپا کو۔۔۔" وہ خاموش ہوئے تھے۔

"اس خبر پہ تمہاری ماں کا سب سے پہلا حق ہے حارث۔۔۔"

"مگر میں پھر بھی یہ زینب آپا کو ہی بتاؤں گا۔"

"کیوں؟"

"حارث نے ماں نہیں دیکھی سر۔۔۔ ماں کے نام اور جگہ پہ زینب آپا کو دیکھا تھا۔"

"حارث یہ نہیں جانتا کہ فیملی کیا ہوتی ہے سر۔۔۔ کیونکہ اس نے فیملی کے نام پہ صرف اک بہن کو ہی پایا ہے۔ وہ ہی۔۔۔ ہاں۔۔۔ وہ ہی تو۔۔۔ وہ ہی تو حارث کا ہر رشتہ ہے۔۔۔ ہر رشتہ۔"

ڈاکٹر حسنات نے حارث کے چہرے کو کچھ اور مغموم ہوتے محسوس کیا تھا۔ انہوں نے تسلی کے سے انداز میں اس کا کندھا تھپتھپایا۔

"جاؤ۔۔۔ اور جا کر اپنی ماں جیسی بہن کو بتاؤ کہ تم نے کیا کر لیا ہے۔" وہ اب کہہ رہے تھے۔

اس نے ایک غمگین سی مسکراہٹ کے ساتھ

انہیں دیکھا تھا۔

"آپ کا بہت شکریہ۔"

"نا... بس... خاموش۔" ڈاکٹر حسنات نے حارث کی بات کاٹی۔

"حارث قیوم! اللہ سب کو دل و دماغ عطا کرتا ہے... ایک برابر... ایک ایسا... مگر وہ کسی کسی کو ایسا ذہن اور صلاحیت بخشتا ہے، جو کہ اس قابل ہوتا ہے کہ کسی علم کو کسی دوسرے ذہن میں ویسے ہی انڈیل سکے جیسا کہ اس کے اپنے ذہن میں ہے... تو ایسی صلاحیت کو استعمال نہ کرنا، یہ ناانصافی ہوگی... کسی کے ساتھ نہیں... میرے اپنے ساتھ... یہ ناشکری ہوگی۔ میں تو صرف اپنے حصے کا شکر ادا کر رہا ہوں۔ تم بھی کرو، مگر اس طرح سے نہیں جس طرح تم ابھی میرا کرنے جارہے تھے۔ اس طرح سے کرو جس طرح سے کہ وہ تم سے چاہتا ہے۔" اس نے ہلکا سا سر ہلایا تھا۔ مگر وہ جانتا تھا کہ وہ ایسا نہیں کرپائے گا۔ اس نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

"ملتے رہنا۔" مسکرا کر کہا گیا۔

"اس کے سوا چارہ نہیں۔" جواباً کچھ بے بسی سے کہا گیا تھا۔

حارث نے باہر کی طرف قدم بڑھائے۔ ڈاکٹر حسنات قدرے فاصلے پر کھڑے اس کی پشت کو دیکھ رہے تھے۔

وہ ایک دم مڑا... اور مڑ کر دو کرسیوں کے درمیان رکھی گئی چھوٹی سی میز پہ موجود اس کتاب کو دیکھا۔ ڈاکٹر حسنات نے حارث کی آنکھوں میں کسی چیز کو اس طرح سے چمکتے ہوئے محسوس کیا جس طرح کہ پانی کی سطح سورج پڑنے سے چمکتی ہے۔

"حارث!" انہوں نے پکارا۔

اس نے دیکھا۔

اور پھر انہوں نے حارث سے کچھ کہا تھا۔ اس نے بے یقینی سے ڈاکٹر حسنات کو دیکھا اور سوچا اور اگر ایسا نہ ہوتا اور اگر وہ اسی حالت میں مرجاتا... تو اللہ اس کے ساتھ کیا کرتا؟

یک دم اس نے کپکپی کی ایک شدید لہر کو اپنے اندر اٹھتے ہوئے محسوس کیا تھا۔ جسے روکنے میں وہ ناکام رہا تھا۔



وہ ایک دفعہ پھر ایسٹ گرین وچ کی سڑکوں پہ چل رہا تھا۔ رات کے وقت دونوں ہاتھ پینٹ کی جیب میں ڈالے۔ سر قدرے جھکائے... ارد گرد سے تھوڑا بے نیاز... یوں جیسے کچھ سوچ رہا ہوں... مگر... وہ خالی ذہن تھا۔ یوں جیسے دل میں کچھ چل رہا ہو۔ مگر... وہ خالی دل تھا۔ وہ رو نہیں رہا تھا۔ آج... اسے رونا نہیں آرہا تھا۔ وہ جنون کی سی کیفیت میں بھی نہیں تھا۔

اس نے سگریٹ بھی نہیں پیا تھا اور سلیپنگ پلز کی ڈوز بھی نہیں لی تھی۔

وہ آج سونا نہیں چاہتا تھا۔ وہ محسوس کرنا چاہتا تھا اس فرق کو... جو کہ آج کے حارث قیوم اور دو سال کے پہلے حارث قیوم میں تھا۔ سو وہ قدرے سر جھکائے... پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے... تھوڑا بے نیاز... ذرا سا لاپروا ہو کر... خالی ذہن کے ساتھ، وہ تھا اور گرین وچ کی سڑکیں اور پھر خالی دل... ایک بھرا تالاب بن گیا جس میں زینب آپا نام کا کنکر گرا اور دور، دور تک اس کی ذات میں بھنور بنتے گئے تھے۔ ایک کے بعد ایک... اک ردھم اور تسلسل کے ساتھ اسے حیرت ہوئی کہ اس کی یادداشت میں محض اک نام ہی محفوظ تھا۔ حالانکہ یہ حیرت اسے نہیں ہونی چاہیے تھی۔ وہ کچھ تھک کر ایک بینچ پہ بیٹھا تھا۔ یوں ہی جیبوں میں ہاتھ ڈالے ہوئے۔ اک سانس بھر کر اس نے آسمان کو دیکھا۔ نہیں... اس نے آسمان سے بھی پرے دیکھنا چاہا۔

"بصارت اس کو پا نہیں سکتی... مگر یہ دل ہوتا ہے جو اس کو دیکھ لیتا ہے۔"

اور حارث قیوم کا دل؟؟

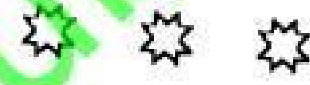
اس نے چاہ کی اور ایسی چاہ کی جو کسی شیر خوار روتے بلکتے بچے کی ماں کے لمس کے لیے ہوتی ہے۔

اس نے مجسم دعا بن کر پکارا تھا اور پھر اس نے سر جھکا لیا تھا۔ وہیں بیٹھے بیٹھے اس کو وہ فرق محسوس ہوا۔ اسے وہ بوجھ یاد آیا جسے دو سال پہلے اپنے دل پہ لیے وہ ان ہی سڑکوں پہ دوڑا پھرا کرتا تھا۔

اور آج… آج… وہ کتنا ہلکا محسوس کر رہا تھا یوں جیسے اس پر کوئی بوجھ ہو۔

اور وہیں بیٹھے بیٹھے اک اور فیصلہ بھی ہو گیا تھا۔ وہاں جانے کا جو دنیا کی سب سے مقدس ترین، پاک اور نور میں ڈھلی جگہ ہے۔ وہاں جہاں کہ ہر لمحہ… ہر گھڑی… ہر ساعت… ہر پل رحمتیں نازل ہوتی ہیں، ایسی معطر جگہ… اور کیسے کیسے گندگی سے بھرے لوگ… سیاہ دل… سیاہ چہرہ لیے وہاں جاتے ہیں۔

”کس لیے؟“ ہاں… ہاں… اسی لیے… بالکل… اسی کے لیے ہی تو…



اسے سعودیہ جانا تھا… عمرہ کے لیے اور جب یہ ہی بات اس نے ڈاکٹر حسنات کو بتائی تو…

”تمہیں خوف نہیں آتا… شرمندگی نہیں محسوس ہو گی اس کے سامنے… وہاں کھڑے ہوتے ہوئے جو اس کا گھر کہلاتا ہے… جو کہ بیت الحرم ہے۔“ اس بات پہ ڈاکٹر حسنات نے اس کے چہرے کے رنگ کو بدلتے ہوئے محسوس کیا تھا۔ وہ سفید ہوا تھا یا سیاہ… نہیں وہ تو سرخ ہو رہا تھا۔ یا حیرت کہ وہ سرخ ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر حسنات نے بھی اس کے سرخ ہوتے چہرے کو قدرے تعجب سے دیکھا۔

”حارث…“ انہوں نے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر کہا اور حارث نے اپنے اندر کے ابال کو اندر ہی دباتے ہوئے انہیں دیکھا۔

”کیا دنیا میں کوئی ایسی جگہ ہے ڈاکٹر! جہاں میں اس پورے یقین کے ساتھ جا سکوں کہ وہاں سے میں اس طرح سے لوٹوں گا جس طرح سے کہ آج ہی پیدا ہوا ہوں کیا ہے ایسی جگہ۔ یقیناً“ نہیں… تو پھر میں وہاں کیوں نہ جاؤں۔

تو کیا یہ بہتر نہیں کہ موت…“ وہ ذرا لڑکھڑایا… یہ لفظ ادا کرنا کبھی بھی اس کے لیے آسان نہیں رہا تھا۔

”پہلے میں نئے سرے سے زندہ ہو کر آؤں۔ رہی بات شرمندگی اور خوف کی تو کیا یہ دوسروں کو بتانے کی باتیں ہیں یہ میرے پرسنلز ہیں میں انہیں کبھی بھی دوسروں کے سامنے عیاں کرنا پسند نہیں کروں گا۔“

ڈاکٹر حسنات نے جو کہ کرسی کی بازو پر کہنی ٹکائے ہاتھ کی انگلیوں پہ چہرے کا وزن ڈالے اسے دیکھ رہے تھے بے ساختہ اک گہرا سانس بھرا تھا۔ اسے جتنا سبق پڑھانا تھا… وہ پڑھا چکے تھے۔ اب عمل کا وقت تھا۔

ان کی زندگی میں حارث قیوم واحد نہیں تھا جو کہ اس طرح سے دین کی طرف آیا تھا۔ مگر وہ منفرد ضرور تھا، کیونکہ اکثر لوگ محض اپنے گناہوں کی شرمندگی کی وجہ سے حج یا عمرہ نہیں جا پاتے اور اس نے یہ فیصلہ فوراً“ کیا تھا۔ گناہ بخشوانا… کوئی مذاق تھوڑا ہی تھا جو وہ اسے ٹالتا۔ اسے زینب آپا سے ملنے کی اتنی جلدی نہیں تھی، جتنی جلدی عمرہ ادا کرنے کی تھی۔

یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ سعودیہ جاتا اور زینب آپا سے نہ ملتا اور یہ کس طرح سے ہو سکتا تھا کہ وہ زینب آپا سے ملتا، مگر ان کی رقم کو (جو چرائی گئی تھی) نہ لوٹاتا اور ان دونوں باتوں کے درمیان… اک بڑا سا مگر حائل تھا۔

وہ عمرہ کے لیے رقم اکٹھی کرتا یا پھر زینب آپا کی رقم واپس کرتا… اور وہ بھی کافی رقم… حارث اب پہلے والی کمپنی سے منسلک نہیں تھا۔ اس کی ذہنی حالت اور خراب کارکردگی کی وجہ سے اسے نکالا جا چکا تھا۔

اور اب وہ گیان سنگھ کے ساتھ اپارٹمنٹ بھی شیئر نہیں کرتا تھا۔ ایک مسلم ہونے کے ناتے اب اس کے اپنے مسئلے مسائل تھے۔ وہ اب کھانے پینے میں پہلی جیسی لاپروائی برت ہی نہیں سکتا تھا۔ ہاں… البتہ گیان سنگھ سے دوستی ضرور تھی اور وہ اس کا احسان مند بھی تھا۔ گیان سنگھ اس کے لیے اللہ کا بھیجا ہوا وسیلہ تھا۔

حارث اب ایک اور کمپنی سے منسلک ہو چکا تھا۔

اس کی پے پہلے کی نسبت کم تھی اور وہ پارٹ ٹائم جابز بھی چھوڑ چکا تھا۔ ان سب تلخ حقائق کے باوجود اسے عمرہ بھی کرنا تھا اور زینب کی رقم بھی لوٹانی تھی۔

حارث نے زندگی میں پہلی دفعہ کسی رشتے کو پیر کی زنجیر بنتے دیکھا تھا۔ وہ اگر چار' چھ ماہ کماتا۔۔۔ پارٹ ٹائم نوکری کرتا۔۔۔ بچت کرتا۔۔۔ تو وہ اس قابل ہو جاتا کہ عمرہ ادا کر سکے' مگر چار' چھ ماہ میں وہ کبھی اس قابل نہ ہو پاتا کہ زینب آپا کی رقم واپس کر سکے۔ وہ کوئی چھوٹی موٹی رقم تو تھی نہیں اور حارث قیوم کو ایسا کرنے کے لیے پھر سے گدھا بننا پڑا۔ چوبیس گھنٹوں میں ایک وقت کا کھانا کھانا پڑا۔۔۔ اور رہی بات نیند کی تو۔۔۔ اب یہ اس کے لیے مسئلہ نہیں تھی۔۔۔ وہ جاگ سکتا تھا۔۔۔ اگر اسے ساری رات ایک ٹانگ پہ کھڑا کر کے بھی جگایا جاتا۔۔۔ تو وہ یہ کر سکتا تھا۔

اسے تین سال لگ گئے تھے۔۔۔ تین سال۔۔۔ مگر پھر بھی وہ اس قابل نہیں ہو سکا تھا کہ مطلوبہ رقم جمع کر پاتا۔ وہ آج کل بہت پریشان نظر آ رہا تھا۔

"کوئی مسئلہ ہے حارث؟" اس دن وہ ڈاکٹر حسنات سے ملنے آیا تھا۔ جب اچانک انہوں نے پوچھا تھا۔

اس نے چائے پیتے ہوئے چونک کر انہیں دیکھا اور پھر مدھم سا مسکرا دیا۔

"زندگی مسئلوں سے کب خالی ہوتی ہے سر؟" وہ اب کہہ رہا تھا۔

"مگر مسئلے شیئر کر لینے سے دل ضرور خالی ہو جاتا ہے۔" وہ اب کی بار کچھ کہہ نہیں سکا تھا۔ وہ اک کشمکش کا شکار ہو رہا تھا۔ بتائے یا نہ بتائے۔

"تم کہہ دو حارث۔۔۔ تم ہر بات کہہ سکتے ہو۔" اس کی آنکھوں کے حلقوں کو کچھ اور گہرا محسوس کرتے ہوئے انہوں نے کہا تھا۔

"آپ جانتے ہیں میں نے زینب آپا کی رقم چرائی تھی۔" اس کی زردی مائل رنگت اب کہ سرخ سی ہونے لگی تھی۔

"ہاں۔۔۔ تو پھر؟"

"میرے لیے یہ ممکن نہیں کہ میں عمرے پہ جاؤں' زینب آپا سے نہ ملوں' اور یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ زینب آپا سے تو مل لوں۔۔۔ مگر ان کی رقم نہ واپس کروں۔۔۔ پچھلے تین سال سے میں اسی کوشش میں ہوں' مگر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے پاؤں کسی چکنی مٹی پہ رکھے ہیں۔۔۔ پھسل پھسل جاتے ہیں' تو وزن قائم ہی نہیں رہتا۔" وہ قدرے تھکا لگ رہا تھا۔

"کتنی رقم چاہیے؟" ہاتھ میں موجود چائے کا کپ ساسر میں رکھتے ہوئے انہوں نے پوچھا۔ اس نے چونک کر انہیں دیکھا۔۔۔ وہ کیا کرنا چاہتے تھے؟

"بہت بڑی رقم ہے سر۔۔۔"

"پھر بھی؟"

"تقریباً" ہزار ڈالر موجود ہیں میرے پاس۔۔۔ اور مزید کچھ چاہئیں؟"

"میں نے پوچھا کتنی؟"

"سات ہزار ڈالر۔" وہ یک دم خاموش ہو گئے تھے۔ اس نے کچھ کہتی نگاہوں سے انہیں دیکھا۔ وہ کچھ سوچ رہے تھے۔

"ضروری تو نہیں تم اپنی بہن کو ساری رقم ایک دفعہ ہی لوٹا دو۔۔۔ وہ بہن ہے تمہاری یقیناً" اس بات پہ کمپرومائز کر لیں گی۔

کچھ رقم کا بندوبست میں کر دیتا ہوں۔ کچھ دوستوں سے مانگیں گے' مگر سوال یہ ہے کہ حارث کہ اتنی بڑی رقم کا قرض تم کیسے واپس لوٹا پاؤ گے؟"

وہ ٹھیک کہہ رہے تھے۔۔۔ اتنی بڑی رقم لوٹاتے اسے سالوں لگ سکتے تھے۔ تو یہ ہی ٹھیک تھا کہ وہ زینب کو ساری رقم نہ لوٹاتا۔ تھوڑی کر کے دے دیتا۔

"آپ کتنی رقم کا ارینج کر سکتے ہیں؟"

"تقریباً" تین ہزار ڈالر۔"

"کیا اب مجھے آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہیے؟" قدرے توقف کے بعد وہ بولا تھا۔ اس کا چہرہ اب پہلے سے بہتر نظر آ رہا تھا۔ ڈاکٹر حسنات ہنس دیے تھے۔

"اور وہ جو تمہارا اتنا بڑا حلقہ احباب ہے ان سے لو تا کچھ مدد۔"

"نہیں! ان سب سے جو میں نے لینا تھا' لے

چکا۔" وہ مسکرایا۔۔۔ نہایت مقدس سی مسکراہٹ۔۔۔

"کیا لے چکو ہو؟"

"تحفے۔" انہیں اچنبھا ہوا۔ اس کی فیملی تو نہیں تھی اور خود اسے جتنی اشیاء کی ضرورت تھی وہ جانتے تھے۔

"کس کے لیے ہیں تحفے۔" مقدس سی مسکراہٹ کچھ اور شفاف ہوئی۔

"زینب آپا کے لیے۔" اور اس کے منہ سے الفاظ کسی سیپ کے موتی کی طرح ادا ہوئے تھے۔ ڈاکٹر حسنات اب اس کے چہرے پہ پھیلنے والی روشنی کو دیکھ رہے تھے۔



حارث کے ان گزرے تین سالوں میں ڈاکٹر حسنات کے ساتھ روابط کچھ اور گہرے ہو چکے تھے۔ وہ ان کے توسط مختلف مذہبی کاموں میں بھی حصہ لیا کرتا تھا۔ جس کی وجہ سے اسے دوسرے شہروں اور ریاستوں میں موجود اسلامک سینٹرز والے بھی جاننے لگے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے حلقہ احباب کی تعداد بہت ہو گئی تھی۔ جس میں مختلف النسل لوگ موجود تھے۔

ایرانی، پاکستانی، افغانی، انڈین، کشمیری، عربی، افریقین، نائجیرین اور بہت سے۔ وہ ان سب سے زینب آپا کے لیے کچھ نہ کچھ منگواتا رہتا تھا۔ اس کی الماری میں اپنی چیزیں اتنی نہیں تھیں، جتنی کہ زینب آپا کے لیے تھیں۔

کشمیری شالیں۔۔۔ ایرانی پارچہ جات۔۔۔ انڈین دوپٹے۔۔۔ عربی عبایا اور کاجل۔۔۔ (کیونکہ زینب آپا سرمہ لگاتی تھیں) پاکستانی چاول بھی اس نے منگوا رکھے تھے اور ہاں۔۔۔ امریکہ کے سوئٹرز اور بیگز، اگر اس کے دوستوں میں ہر نسل شامل تھی تو اس کی الماری میں زینب آپا کے لیے ہر قوم کی سوغات موجود تھی۔

کہنے کو وہ چیزوں کا ایک ڈھیر تھا۔ مگر وہ ڈھیر نہیں تھا۔ وہ حارث قیوم کی محبت تھی۔ بے غرض محبت، ویسی ہی جیسی زینب نے اس سے کی۔ بے ریا اور معصوم سی۔ اس کے تین سال اس خواہش، اس چاہ، اس آس میں گزرے تھے کہ اک دن بہرحال کسی اک دن وہ زینب آپا سے جا ملے گا۔ اپنا دکھ، ہر ملال۔۔۔ ہر غم اپنے ہاتھوں سے مٹانے۔ وہ زینب کی آنکھوں کا تارا تھا اور زینب کیا تھی اس کے لیے؟

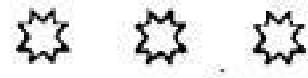
جسم میں زندگی نہیں۔۔۔

دل کی دھڑکن نہیں۔۔۔

اس کے وجود کا حصہ نہیں؟

تو پھر آخر یہ زینب تھی کیا؟

"زینب وہ روح تھی جو اس کے اندر پھونک دی گئی تھی۔"



اس نے دیکھا اور کیا دیکھا۔۔۔ آخر کیا دیکھ لیا۔ مجسم زندگی کی حالت میں۔۔۔ وہ زینب آپا کو دیکھ رہا تھا۔ یہ ناممکن تھا۔۔۔ مگر ممکن کی فہرست میں آ چکا تھا۔ وہ نیند کی حالت میں نہیں تھا۔ مگر پھر بھی اک خواب کا سا گمان ہو رہا تھا۔

ان کا شفاف چہرہ۔۔۔ بے داغ اجلا لباس، موتیوں کی سی مسکراہٹ لیے وہ اسے ہی دیکھ رہی تھیں۔ درد کی اک لہر اٹھی تھی اور اسے ڈاکٹر حسنات کی کہی بات یاد آئی۔ ڈاکٹر حسنات کی بات یاد آئی تو زینب آپا یاد آئیں اور جیسے ہی وہ یاد آئیں تب۔۔۔ تب۔۔۔ وہ سامنے موجود تھیں۔۔۔ بالکل سامنے۔

وہ انہیں دیکھ رہا تھا اور محسوس کر رہا تھا کہ سانس بس رکنے کو ہے۔

تب ہی۔۔۔ تب ہی۔۔۔ اک اور تیز لہر درد سے بھرپور۔ وہ بے ساختہ کراہا تھا۔ زینب آپا کا عکس دھندلایا تھا۔ اسے خدشہ ہوا کہ نظر پھر سے انہیں کھو نہ دے۔ اس نے گھبرا کر اس طرف دیکھا۔ وہ۔۔۔ وہ کہیں نہیں تھیں۔

ابھی وہ ٹھیک طرح سے بدحواس بھی نہیں ہو پایا تھا کہ اس نے اپنی پیشانی پہ کسی ٹھنڈک کا سا گمان

ہوا۔۔۔ ایسی ٹھنڈک۔ جو پور پور میں اتر جائے اور سکون کا باعث بن جائے۔ وہ زینب آپا کا لمس تھا۔ہاں۔۔۔ وہی لمس جس کے لیے وہ ترستا رہا تھا۔ پور پور میں اترتی ٹھنڈک۔۔۔ روم روم میں گھلتا سکون۔۔۔ اس کے تنفس کی رفتار آہستہ آہستہ نارمل ہونے لگی تھی۔ اور پھر نارمل ہوتے ہوتے۔۔۔ مدھم۔۔۔ مدھم۔۔۔ بہت ہی مدھم۔۔۔ مگر پرسکون۔۔۔

کعبہ پہ پہلی نظر پڑتے ہی اس نے کیا دعا مانگی؟ کیا مانگ سکتا تھا بھلا وہ؟ ظاہر ہے اس سا انسان معافی مانگنے کے علاوہ کیا مانگ سکتا تھا اور دوسری نظر پہ اس نے زینب کے دل میں جگہ مانگی۔

کیا ہی بے عقل دماغ پایا تھا اس شخص نے۔ ماں کے دل میں اولاد اپنی جگہ مانگ رہی تھی۔ حد ہے۔ وہ جب یہاں سے گیا تھا تو رابطے کا ہر ممکن ذریعہ بند کر کے گیا تھا اور اپنی اس حرکت پہ پچھلے پانچ سال سے جتنا وہ پچھتا رہا تھا شاید ہی اس بھری دنیا میں کوئی پچھتایا ہو اور اس کی زندگی میں تھا کیا۔ سوائے پچھتاؤوں اور کاش کے۔۔۔

کل بھی اور آج بھی۔۔۔

اس کی پوری زندگی کاش سے اٹی پڑی تھی۔

اور جب وہ زینب کے گھر کی طرف سفر کر رہا تھا تو وہ کن کن کیفیات کا شکار نہیں ہوا تھا۔ پشیمانی، شرمندگی، خوشی، ملال، سکون اور پھر بے سکونی بھی۔ اس نے لمبا انتظار کیا تھا بہت لمبا انتظار۔

پانچ سال پورے پانچ سال، پانچ سالوں کے ایک ہزار آٹھ سو پچیس دنوں میں اور ان دنوں کے گھنٹوں میں اور ان گھنٹوں کے منٹوں میں اور ان منٹس کے سیکنڈز میں اور ان سیکنڈز کی ہر ساعت میں اس کا انتظار لمبا تھا۔ واقعی ہی لمبا تھا اور جیسے وہ زینب آپا کے دروازے پہ پہنچا ہے گھنٹی بجاتا ہے زینب آپا کے چہرے کے بجائے شفیق بھائی کا چہرہ دیکھتا ہے تو۔۔۔ کیا آپ اس شخص کی کیفیات کا اندازہ لگا سکتے ہیں؟

وہ جو زینب آپا کو ہر چیز۔۔۔ ہر جگہ دیکھنے کا عادی تھا۔ ایک ہزار آٹھ سو پچیس دنوں کے بعد اسے پتا چلا کہ زینب آپا تو کہیں نہیں تھیں۔ کہیں بھی نہیں۔ وہ واقعی کئی قدم اور پیچھے دھکیل دیا گیا تھا۔ آپ کیا سمجھتے ہیں کہ اسلام کو سمجھنے۔۔۔ پڑھنے اور توبہ کے بعد عمل کر لینے سے آپ بری الذمہ ہو جاتے ہیں۔

نہیں۔۔۔ امتحان بھی تو ہونا ہوتا ہے۔ منہ سے مذہب۔۔۔ مذہب کہنے اور کسی امتحان کا شکار ہو کر اس میں پاس ہونے میں بہت فرق ہوتا ہے۔

حارث کو بھی یہ ہی محسوس ہوا تھا۔ اسے لگا پچھلے پانچ سالوں میں کچھ بھی مشکل نہیں تھا۔ کچھ بھی تو نہیں، نہ گرین وچ کی سڑکوں کی خواری۔۔۔ نہ اس کا خوف۔۔۔ نہ برائی کو چھوڑنا اور نہ اسلام پہ عمل پیرا ہونا۔

"یہ سب تو جیسے شروعات تھیں۔ اصل چیز تو اب آئی تھی۔"

"امید" بڑی چیز ہوتی ہے۔ بہت بڑی، اتنی کہ انسان ساری عمر اسی کے سہارے گزار سکتا ہے۔ مگر جس کی امید ختم ہو گئی ہو اور اس انسان کو یہ بھی معلوم ہو چکا ہو کہ مایوسی کفر ہے۔ تو۔۔۔ تو کیا حال ہو گا اس شخص کا۔

کس عذاب سے گزر رہا ہو گا وہ شخص۔

"آگہی کا عذاب۔۔۔ کس قدر دردناک اور جان لیوا۔۔۔ یہ کوئی حارث قیوم سے پوچھتا۔"

پھوٹ پھوٹ کر رونے اور رو لینے کے بعد وہ کتنی ہی دیر ہاتھوں کی بند مٹھی ہونٹوں پہ رکھے خاموش بیٹھا رہا تھا۔ شفیق بھائی اسے اپنے سامان کی طرف بدلتے رنگوں والے چہرے کے ساتھ پلٹتے دیکھتے ہوئے نوٹ کر رہے تھے۔

وہ کل پانچ سوٹ کیس تھے۔

یک دم حارث اٹھا تھا اور سوائے ایک سب سے چھوٹے بیگ کو چھوڑ کر وہ چاروں بڑے سوٹ کیس شفیق بھائی کے سامنے لایا تھا۔ وہ اب انہیں کھول رہا تھا اور کھول کر ایک ایک چیز کو باہر نکالتے ہوئے وہ انہیں بتا رہا تھا کہ اس نے کب کہاں اور کیسے وہ چیز کس سے منگوائی تھی۔ کس کے لیے منگوائی تھی۔ یہ بتانے

کی ضرورت نہیں تھی۔ شفیق بھائی اسے دیکھتے رہے، یہاں تک کہ چاروں سوٹ کیس خالی ہو گئے تھے۔

"میں ان سب چیزوں کا کیا کروں شفیق بھائی۔" عجیب ماتم کرتی ہوئی بے بسی سے وہ بولا تھا۔

شفیق بھائی کا دل پھٹ جانے کو تیار تھا۔ نہ جانے وہ اسے کیسے سنبھالے ہوئے تھے۔ وہ چند لمحے ہونٹ کاٹتے ہوئے سر جھکائے کھڑا رہا تھا اور پھر وہ اس چھوٹے بیگ کی جانب بڑھا تھا۔

اس نے وہیں بیٹھ کر اس میں سے کچھ نکالا تھا اور شفیق بھائی کے سامنے رکھا تھا۔ وہ پیکٹ میں بند کچھ تھا۔ شفیق بھائی نے سوالیہ انداز سے اسے دیکھا۔

"آپ کی امانت ہے۔" وہ یہ نہیں کہہ پایا کہ وہ چرائے ہوئے پیسے لوٹا رہا ہے۔ ہمت ہی نہیں ہوئی۔ عجیب شرمندگی سی شرمندگی تھی اور شفیق بھائی شروع ہی سے بہت سمجھ دار رہے تھے۔

"جب تم یہ امانت لے کر جا رہے تھے تو میں نے چاہا کہ میں پولیس کو انفارم کروں، جانتے ہو زینب نے کیا کہا۔" اور وہ نظر جھکائے کسی مجرم کی طرح کھڑا رہا تھا۔ خاموش..... بالکل ہی خاموش۔

"اس نے کہا۔ وہ میری چیزیں تھیں شفیق اور میں نے اسے معاف کیا۔ زینب نے اسے معاف کیا' یہ میرا اور میرے بھائی کا معاملہ ہے۔"

حارث نے سختی سے ہونٹوں کو بھینچتے ہوئے کسی چیز کو گلے سے اتارا تھا۔

"تمہیں میں اتنا بے غیرت لگتا ہوں حارث قیوم کہ زینب قیوم نے جسے اپنی زندگی میں معاف کر دیا..... وہ رقم میں اس کی موت کے بعد لیتا پھروں..... کیا تمہیں شفیق خان اتنا ہی بے غیرت لگتا ہے۔" اور وہ شخص.....

ہاں وہ ہی شخص..... جس کا چہرہ پل پل میں رنگ بدل رہا تھا۔ اس نے عجیب احساس زیاں کے ساتھ اس پیکٹ کو دیکھا۔

اسے وہ محنت یاد آئی۔ جو اس نے وہ رقم جمع کرنے کے لیے کی تھی۔ ایک ایک ڈالر کے لیے اپنی پریشانی یاد آئی۔ چوبیس گھنٹوں میں ایک وقت کا کھانا کھانے والا بھوکا پیٹ یاد آیا۔ اس نے اپنے ہاتھوں کو پھیلایا۔ ان میں پڑنے والی گانٹھوں کو دیکھا اور وہ ان گانٹھوں کو ہونٹوں سے لگا کر پھر سے پھوٹ پھوٹ کر رو دیا تھا۔ معلوم نہیں وہ کس کس غم کو یاد کر کر کے رویا تھا۔

شفیق بھائی نے اس سے پوچھا کہ وہ پولیس اسٹیشن کیوں جانا چاہتا ہے۔

"اس نے کہا گناہ کی سزا پانے۔ کوڑے کھانے۔"

"کون سے گناہ؟"

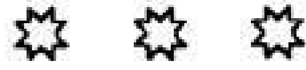
"وہ جو امریکا میں کیے۔"

"کمال کرتے ہو حارث قیوم امریکا میں کیے جانے والے گناہوں کی سزا سعودیہ میں نہیں ملتی۔"

"اعتراف جرم کی تو ملتی ہو گی؟"

"ہاں ملتی ہے۔" وہ رکے۔

"ثبوت ہے تو لاؤ....." اور وہ اک گہرا سانس بھر کر رہ گیا تھا۔ جب سزا نہیں پانا چاہتا تھا۔ تب ملی تھی اور کیا ہی خوب ملی تھی اور جب پانا چاہا تو.....



وہ سعودیہ بوجھ اتارنے گیا تھا۔ وہ وہاں سے بوجھ لاد کر لا رہا تھا پہلے سے دگنا۔ یہ اس کے ساتھ کافی عرصے کے بعد ہوا تھا کہ وہ یوں قبرستان دیکھ کر بے ہوش ہو گیا تھا۔ خوف وہ ہی تھا۔ نوعیت بدل چکی تھی۔ اب انجام اسے ڈراتا تھا۔

پہلے نہ پاکبازی تھی' نہ توبہ..... اور نہ عمل' پھر بھی کوئی خوف نہیں تھا' کوئی ڈر نہیں تھا' اک عالم بے پروائی تھی۔

اور اب.....

سب کچھ تھا' مگر وہ عالم بے پروائی نہ رہی تھی۔

وہ زینب آپا کی قبر پہ بھی نہیں جا سکا تھا۔ وہ کس طرح کیوں کر کیسے انہیں منوں مٹی تلے دفن دیکھتا۔ یہ بڑا حوصلے اور بڑے جگرے کا کام تھا۔ وہ نہیں کر پایا تھا۔ وہ جو کبھی سفاک اور بے رحم ہوا کرتا تھا۔

وہ اپنی بہن کو یوں ابدی نیند سوتا نہیں دیکھ پایا تھا تو

حارث قیوم واپس آگیا۔ شفیق بھائی سے ہی اسے پتا چلا تھا کہ اس کا باپ بھی وفات پا چکا تھا اور بہن ' بھائی وہ تھے ' اس نے ان سے رابطہ کیا۔ ان سے ملنا چاہا۔ فرائض کی جو پٹی اسے پڑھائی گئی تھی انہیں ادا کرنا چاہا۔ مگر۔۔۔ اس کی بہنوں میں سے ایک بھی زینب قیوم کی سی نہیں تھی۔ حتیٰ کہ آمنہ بھی نہیں اور بھائی۔۔۔ بہنوں کا یہ حال تھا تو بھائی کیسے اس کو پوچھتے۔۔۔ وہ سب اسے مار چکے تھے۔ ان کے لیے وہ قاتل اور مجرم تھا۔ تقریباً" دس سال کا سزایافتہ۔۔۔ حارث قیوم بری طرح سے دل برداشتہ ہوا تھا۔ جھکے کندھوں ' ٹوٹے دل اور زخم زخم جگر کے ساتھ وہ واپس آگیا تھا۔

اس ٹوٹنا ایسے ہی ہوتا ہے جیسے کہ ریڑھ کی ہڈی پہ ضرب لگادی جائے۔

اس کی بھی بیک بون بری طرح سے متاثر ہوئی تھی اور اس بری طرح سے کہ وہ خود کو زندگی کے افعال سرانجام دینے میں لاچار پاتا تھا۔

مگر وہ جان چکا تھا کہ تمام تر لاچاری اور بے چارگی کے باوجود اسے جینا تھا اور زندگی کے تمام افعال سرانجام دینے تھے۔ یہ جان جانے کا عذاب ہی تو تھا۔

وہ گوتم بدھ کی طرح تمام آسائشوں کو لات مار کر گوشہ نشین نہیں ہو سکتا تھا۔

اور نہ ہی گرونانک کی طرح فقیری کو اپنا سکتا تھا۔

وہ اس نبی صلی اللہ علیہ کا امتی اور پیروکار تھا جو شعب ابی طالب جیسی آزمائش کے بعد بھی دنیا کے سارے کام سرانجام دیا کرتے تھے۔ وہ کیسے تارک الدنیا ہو جاتا۔۔۔ حالانکہ دل دنیا سے اٹھ چکا تھا مگر۔۔۔

"آہ! کہ یہ جان جانے کا عذاب۔۔۔" یہ ان ہی دنوں کی بات تھی کہ اس کی پیلی رنگت مزید پیلی ہونے لگی تھی۔

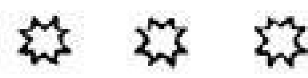
وہ دراصل پچھلے تین سالوں سے بھی بھرپور صحت کو انجوائے نہیں کر سکا تھا۔ اتنی تھکا دینے والی محنت کے بعد ' وہ کبھی بھی فریش ' فٹ نہیں رہ پایا تھا۔

مگر اب کی بار اس کا بخار جیسے اس کے پیچھے ہی پڑ چکا تھا۔ یہ ڈاکٹر حسنات ہی تھے جو کہ زبردستی اسے اسپتال لے کر گئے تھے۔ اس کے بخار کی نوعیت جان کر اس کے سر سے پاؤں تمام ٹیسٹ لیے گئے تھے۔

"میں اسی لیے یہاں نہیں آنا چاہتا تھا۔ آپ جانتے ہیں یہ ڈاکٹر۔۔۔ یہ بندے میں کچھ نکال کر ہی دم لیتے ہیں۔" اس نے چڑ کر ڈاکٹر حسنات سے کہا تھا اور وہ جانتے تھے کہ وہ کیوں اسپتال اور بیماری سے خوف زدہ تھا۔

وہ اب بھی موت سے ڈرتا تھا اور اس کا خوف یہاں آکر بڑھ جایا کرتا تھا۔ حارث جس سے کچھ نہیں نکلا تھا۔

بلکہ۔۔۔



اس پور پور میں اترتی ٹھنڈک اور روم روم میں بستا سکون اس کو غنودگی محسوس ہونے لگی ' قریب تھا کہ وہ سو جاتا ' مگر۔۔۔ اس نے اپنی زندگی کا دوسرا بڑا جھٹکا کھایا تھا۔ دروازے میں سے اب کہ جو شخص اندر داخل ہوا تھا اس نے حارث قیوم کو اپنی آنکھیں کھولنے پر مجبور کیا تھا۔ وہ اس کا باپ تھا۔ اس کے جسم کو ایک جھٹکا لگا اور اس نے کہنیوں کے بل اوپر اٹھنا چاہا۔ یک دم اس کی پیشانی پر وزن پڑا تھا۔ جو اس کو لیٹے رہنے کا اشارہ تھا۔ حارث قیوم بری طرح سے گھبرایا اور اس طرح سے گھبرایا کہ ایک انوکھی اور ایسی گھبراہٹ اس نے کبھی بھی محسوس نہیں کی تھی۔ ایسی وحشت تھی کہ وہ سڑکوں پہ خوف سے بے ہوش ہو جانے کو بھول گیا۔ تب ہی اس نے چند لوگوں کو تیزی سے اپنی طرف آتے ہوئے محسوس کیا۔

ایک نے آکسیجن ماسک لگایا تھا ' دوسرے نے کسی نوکیلی چیز کو اس کے بازو میں کھبویا تھا۔ اور تیسرا مسلسل اس کے سینے پہ دونوں ہاتھوں کا دباؤ ڈال رہا تھا۔ مگر وہ اس سارے عمل کو اس طرح محسوس نہیں کر پا رہا تھا جس طرح سے عام انسان کرتا ہے اس کا دماغ ماؤف ہوتا جا رہا تھا۔ تب ہی اس نے باپ کے ساتھ کچھ اور لوگوں کو دیکھا وہ سب اس کے بیڈ کے

پاس پہنچ چکے تھے۔

اس کا باپ اسے مسکرا کر دیکھ رہا تھا اور وہ اسے پھٹی پھٹی آنکھوں سے زینب آپا کا نظر آنا سمجھ آتا تھا۔ اسے زینب آپا سے محبت تھی۔ باپ کا نظر آنا سمجھ نہیں آرہا تھا۔ اک وحشت اور گھبراہٹ کا سا عالم تھا۔ اس نے کسی اجنبی چہرے کو اپنے پاس آتا دیکھا۔ اور۔ اک لمحے کا سا وقت۔۔۔ اک ساعت کا فرق۔ وہ ٹھنڈک اس کے پورے بدن میں اتنی اور اس طرح سے پھیل گئی کہ اس کے منہ سے آکسیجن ماسک ہٹا لیا گیا تھا۔ دونوں ہاتھوں سے سینے پہ دباؤ ڈالنے والا بھی رک گیا تھا۔

اور اس نے اک نظر مشینوں اور آلات میں جکڑے اس شخص کو دیکھا اس کے چہرے پہ ابدی سکون تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ ہونٹ ہلتے ہلتے ساکت ہوگئے تھے۔ وہ کسی نافہم زبان میں کچھ پڑھتے پڑھتے یک دم خموش ہو چکا تھا۔

وہ سو چکا تھا۔ اک ابدی نیند۔ حارث قیوم سو چکا تھا۔

☆ ☆ ☆

حارث قیوم کے کیے گئے ٹیسٹ میں سے کچھ نہیں نکلا تھا' بلکہ اس کے کچھ اور ٹیسٹ کیے گئے تھے۔ ڈاکٹر اس کی گرتی ہوئی صحت کو دیکھ کر مطمئن نہیں تھا اسے ایڈز تھی۔

اور حارث نے پورا ڈیڑھ سال موت کا انتظار اس سے خوفزدہ ہونے کے باوجود کیا تھا۔

دنیا میں کتنے لوگ ہوتے ہوں گے جو ایسی کسی بیماری کا شکار ہوتے ہوں گے اور پھر انگلیوں پہ دن گن گن کر زندگی کے ختم ہونے کا انتظار کرتے ہوں گے۔ یہ آسان نہیں۔ یہ بالکل بھی آسان نہیں۔ سوچ و خیال۔ گمان و دھیان سے بڑھ کر تکلیف وہ چیز ہے۔ اور ایسا اک شخص اگر حارث قیوم ہو تو۔ وہ ڈیڑھ سال اس نے کیسے گزارا ہوگا۔ کیا کوئی تصور کر سکتا ہے؟ خوف سے بے ہوش ہوتے ہوئے؟ سلیپنگ پلز کی ایکسٹرا ڈوز لیتے ہوئے؟ سڑکوں پر خواری کرتے ہوئے؟ روتے۔ بلکتے ہوئے؟۔ اللہ سے زندگی کی بھیک مانگتے ہوئے؟

آخر کس طرح سے اس نے یہ ڈیڑھ دو سال گزارا تھا؟ اگر اک لفظ میں کہو تو "صبر سے۔"

اگر اک لفظ میں بیان کرو تو "سکون سے۔"

جب ہی تو جب وہ مرا۔ تو یوں لگتا ہے تھا سو گیا ہے۔ بس ابھی اٹھا کہ اٹھا۔

اس بیماری کا سن کر وہ شدید شاکڈ ہوا تھا۔ مگر۔ تقدیر وہ سخت چیز ہے۔ جس کا "صبر" کے علاوہ چارہ نہیں۔ وہ خود حیران ہوتا کہ موت سے ڈرنے کے باوجود۔ وہ اتنا پُرسکون کس طرح سے ہو گیا تھا۔

یہ اللہ کا انعام تھا اس شخص پہ وہ جان نہیں پایا تھا۔ اس کی بے چینی ختم کردی گئی تھی۔ اس کے دل کو مضبوط بنادیا گیا تھا۔ ایمان کے ساتھ یہ اجر تھا۔ اس کی توبہ کا۔ اس کا دل اب سیاہ نہیں تھا۔ وہ خالص تھا۔ اس بچے کی طرح جو ابھی ابھی پیدا ہوا ہو۔

ہر کسی کو کوئی نہ کوئی چیز ایمان کی طرف لے ہی آتی ہے۔ اور اسے اس کا خوف لایا تھا اور اک اور چیز بھی تو تھی۔ "دیگر کیا؟" قریب تھا کہ اس کے دل کو مہر ثبت کردیا جاتا۔ اور وہ زنگ آلود لوہا۔ زنگ آلود لوہا ہی رہتا اگر۔ اگر وہ اس عورت کی دعا کے حصار میں نہ ہوتا۔ وہ زینب آپا کی دعا کا اثر تھا۔

ڈاکٹر حسنات نے بھی اس سے یہ ہی کہا تھا کہ "حارث قیوم تم پر کسی کی دعا کا سایہ ہے۔"

تب ہی تو اس نے جانا تھا کہ اس جیسا شخص کس طرح سے الکتاب تک پہنچ پاتا ہے اور پھر اس کو پڑھ بھی پاتا ہے اور عمل کے قابل بھی ہو جاتا ہے۔

اگر اس کا خوف اسے ایمان تک لایا تھا تو یہ زینب کی دعا تھی، جو وہ ثابت قدم رہا تھا۔ اور اک پارس بن گیا تھا۔ کیا ایسا نہیں تھا۔ کیا ہر وہ انسان پارس نہیں تھا، جو اک طرز زندگی کو محض اس بنا پہ چھوڑ دے کہ یہ اللہ اور اس کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رضا نہیں ہے۔

وہ محض اس لیے اپنے سر اور چہرے کو جھکا دے کہ اسے ایسا کرنے کو کہا گیا ہے۔

وہ خود کو ویسا ہی بنالے۔ جیسا کہ الکتاب میں حکم دیا گیا ہے۔

یقیناً!! ہر وہ شخص "پارس" ہی ہے۔

ہاں۔ وہ "پارس" ہی ہے۔

موت نے اسے نہیں بخشا تھا۔ اور موت نے تو کسی کو بھی بخشا نہیں، ہزار سالہ زندگی کے بعد بھی۔ تو کیا یہ لمحہ۔ آپ کی زندگی کا۔ لمحہ ہدایت بن سکتا ہے۔

بالکل وہ ہی لمحہ جو ابھی ابھی آپ کی آنکھوں کے نیچے سے گزر رہا ہے۔

کیا یہ سعد ساعت ہو سکتا ہے وہ ہی سعد ساعت جو انسان کو انسان نہیں رہنے دیتی۔ "پارس" بنا دیتی ہے۔

"کیا ایسا ہو سکتا ہے؟"

"کیا یہ ممکن ہے؟"

✡ ✡ ✡

کامیابی کی طرف پہلا قدم؟

"توبہ۔"

"اور آخری قدم؟"

"ایسی توبہ۔ جو ستر گناہ گاروں میں بھی بانٹ دی جائے تو ان کے گناہ بھی بخشوا دے۔"

اور اک توبہ وہ بھی تو تھی۔ جو حارث قیوم نے کی تھی۔ تو کیا وہ بخشا گیا؟ یہ کوئی نہیں جان سکتا۔

یہ دوسری دنیا ہے جہاں پہ جائے بغیر کسی راز کو پایا نہیں جاسکتا۔

مگر! دوسرے کے راز جاننے سے، بہتر ہے کہ اپنا "راز" ڈھونڈ لیا جائے۔ کیونکہ۔ جانا تو ہے نا۔

دے بلھیا اساں مرنا نہیں۔

گور پیا کوئی ہور۔

گور پیا کوئی ہور

✡ ✡ ✡

وہ نوشہرہ تھا۔ پاکستان کا ایک شہر۔ اور وہ۔ وہاں کا قبرستان تھا۔

وہاں موجود۔ بہت سی قبروں کے درمیان قیوم نامی شخص کی قبر کے دائیں طرف اک اور قبر تھی۔ جس کی مٹی ابھی گیلی تھی اور اس کے پاس اک شخص نم آنکھوں کے ساتھ کھڑا تھا۔ اور وہ کون تھا۔

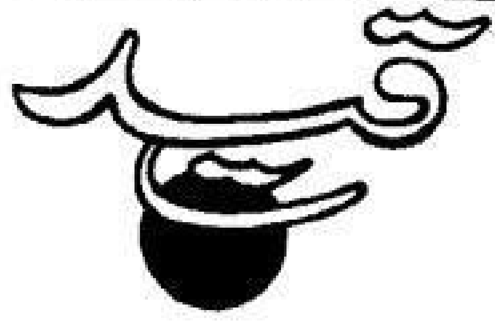
شفیق خان کے علاوہ اور کون ہو سکتا تھا۔ اس کچی قبر کے کتبے پہ کوئی نام نہیں لکھا گیا تھا۔

اس قبر کی اور قبر والے کی بس اک ہی شناخت تھی۔

"غریق رحمت"

✡

مومنہ افتخار



بجلی کڑکنے کی زوردار آواز پر وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ کمرے میں اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ بجلی کڑکنے کی وجہ سے کمرے میں تھوڑی سی روشنی ہوئی تو اس نے حیرت سے اردگرد کا منظر دیکھا۔ کمرے میں عجیب پُراسراریت چھائی ہوئی تھی۔ اسے اس کمرے سے خوف و وحشت محسوس ہو رہی تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ کہاں ہے۔ وہ جلدی سے بستر سے نیچے اتری، اور دروازے کی جانب بڑھی۔ اس نے دروازہ ٹٹولتے ہوئے اندھیرے میں دروازے کی ناب گھمائی۔ مگر دروازہ تھا کہ کھلنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ وہ کافی دیر دروازہ کھولنے کی کوشش کرتی رہی مگر وہ نہ کھلا۔

بجلی ایک بار پھر کڑکی۔ مدھم سی روشنی میں اسے ایک جانب کھڑکی دکھائی دی۔ وہ اس کی جانب لپکی۔ کھڑکی کے آگے جالی لگی ہوئی تھی، وہ کھڑکی سے باہر کا منظر دیکھنے لگی۔

مُکمل ناول



کھڑکی کے اس پار گھنے درخت تھے جن کے پتے ہوا چلنے کی وجہ سے ہلتے ہوئے عجیب آواز پیدا کر رہے تھے۔ رات کے اندھیرے میں درخت کافی خوفناک لگ رہے تھے۔ وہ گھبرا کر دروازے کے پاس آئی اور زور زور سے اسے بجانا شروع کر دیا۔

"پلیز' دروازہ کھولو۔ مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔ پاپا! علیزے ....! مجھے گھر جانا ہے۔ مجھے .... مجھے پاپا کے پاس جانا ہے۔ پلیز' خدا کے لیے مجھے جانے دو۔" کہتے ہوئے وہ بلک بلک کر رو دی۔ دروازہ بجا بجا کر اس کے ہاتھ سرخ ہو گئے تھے۔

"خدا کے لیے ... مجھے جانے دو۔ مجھے گھر ... گھر جانے دو۔"

وہ ہچکیاں لیتے ہوئے بولی۔

"پاپا کے پاس جانا ہے۔ علیزے کے پاس ..." کہتے ہوئے وہ زمین پر بیٹھتی چلی گئی۔

پچھلے ایک ہفتے سے وہ اسی کیفیت میں اس کمرے میں بند تھی اور اس ایک ہفتے پہلے اس کے ساتھ کیا ہوا' اسے کچھ یاد نہیں تھا۔ یاد تھا تو صرف یہ کہ وہ پچھلے کئی دنوں سے اپنے گھر سے دور ہے۔

پاپا' ماما' علیزے' سدرہ' سمیر سب اس کے لیے کتنے پریشان ہوں گے۔ اور ان سب سے بڑھ کر وہ جتنی اذیت سہہ رہی تھی یہ وہی جانتی تھی۔

اس ایک ہفتے میں ایک آدمی جو اسے کھانا دینے کی غرض سے کمرے میں آتا اور کھانا رکھ کر چلا جاتا۔ وہ کھانا جسے مجبوراً کھانے کے بعد وہ بے ہوشی کی حالت میں چلی جاتی اور جب ہوش میں آتی تو کمرے کا دروازہ بجانے لگتی کہ شاید کوئی معجزہ ہو جائے اور پاپا اسے اس قید سے چھڑا لیں۔



اس وقت وہ ریوالونگ چیئر پر بیٹھا سگریٹ کے کش لے رہا تھا۔ جب کسی نے دروازہ بجایا اور اندر داخل ہوا۔ اس نے نظریں اٹھا کر آنے والے کی طرف دیکھا۔ جو ہاتھ باندھے اس کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔

"السلام علیکم صاحب!" اس نے سلام کیا۔

"وعلیکم السلام! گل خان کیسے ہو۔" اس نے خوش دلی سے کہا۔

"ام ٹھیک ہے صاحب! آپ کے واسطے خبر لایا ہے۔" وہ نہایت مودب انداز میں بولا۔

"ہوں تو بتاؤ گل خان! کیا خبر لائے ہو ہمارے لیے؟"

"خان صاحب ...! آپ نے جو کام ہمارے ذمے لگایا تھا ام نے کر دیا ہے۔ شاہ میر صاحب کو کاروبار کے سلسلے میں کراچی بھجوا دیا ہے۔ کم از کم ایک مہینے تک وہ نہیں آئیں گے۔" وہ ساری تفصیل اس کے گوش گزار کرتے ہوئے بولا۔

"بہت خوب گل خان ہم تمہیں اس کا انعام ضرور دیں گے۔ مگر ابھی نہیں۔" اس کی بات سن کر وہ ابھی خوش بھی نہ ہو پایا تھا کہ اگلی بات سن کر مایوس ہو گیا۔

"ارے ہاں۔ اس لڑکی کا کیا حال ہے پریشان تو نہیں کیا اس نے۔" کچھ یاد آنے پر وہ بولا۔

"نہیں صاحب۔ ہم اس کے کھانے میں نیند کی گولیاں ڈال دیتا ہے۔ اسی واسطے وہ زیادہ دیر سوتی رہتی ہے۔ آپ اس کی طرف سے بے فکر رہیں۔"

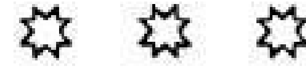
"جو تمہیں ٹھیک لگے وہ کرو۔ مگر ایک بات یاد رکھنا' مجھے وہ لڑکی زندہ چاہیے۔ اس کا زندہ رہنا بہت ضروری ہے۔ شاہ میر کو اس بارے میں بالکل بھی پتا نہیں چلنا چاہیے اور اگر اسے پتا چل گیا۔ تو یاد رکھنا' میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔" وہ آخری الفاظ درشتی سے بولا۔

"جی صاحب! آپ فکر نہ کریں آپ کو شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔"

"ہوں ٹھیک ہے۔ اب تم جاؤ۔" اس نے اسے جانے کا اشارہ کیا تو وہ خاموشی سے باہر نکل گیا۔

"اب دیکھوں گا شاہ میر کہ اپنی محبت کو بچانے کے لیے تم کیا کرتے ہو؟" ایک زہریلی مسکراہٹ اس کے

ہونٹوں پر بکھر گئی۔



میٹنگ سے فارغ ہو کر اپنے آفس میں داخل ہوتے ہوئے اس نے اپنے پی۔اے سے اگلے دن کی مصروفیات کے بارے میں پوچھا اور تھکے تھکے انداز میں کرسی پر آکر بیٹھ گیا اور اپنا فون اٹھا کر نمبر ملانے لگا۔ اس نے اپنے قریب کھڑی پی۔اے کو جانے کا اشارہ کیا۔ دوسری طرف سے فون اٹھا لیا گیا تھا۔

"ہیلو!" دوسری طرف وہ غنودگی میں بولا۔ شاید ابھی سو رہا تھا۔

"السلام علیکم فراز...!" اس کی آواز سنتے ہی وہ بولا۔

"ہاں بولو یار۔" وہ اس کے سلام کا جواب دیے بغیر بے زاری سے بولا۔

"فراز! وہ میں نے تم سے پوچھنا تھا کہ..."

"اب کہہ بھی چکو، شاہ میر... مجھے دیر ہو رہی ہے۔" وہ اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔

"فراز... تم ابھی تک آفس نہیں گئے۔"

"اوہ پلیز شاہ میر میں تمہارا لیکچر سننے کے موڈ میں نہیں ہوں۔" وہ دانت پیس کر بولا تو وہ ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

"تم نے فون کیوں کیا تھا؟"

"ہاں، تم سے پوچھنا تھا کہ انیہ کا کچھ پتہ چلا۔ ایکچوئلی میں کام میں اتنا بزی تھا کہ ہماری اس حوالے سے بات ہی نہیں ہو سکی۔" اس نے پوچھا۔

"نہیں شاہ میر! ابھی تک اس کے بارے میں کوئی انفارمیشن نہیں ملی۔ جیسے ہی کوئی کچھ پتا چلا میں تمہیں انفارم کر دوں گا۔ اب پلیز مجھے بار بار فون کر کے تنگ مت کرنا۔" اتنا کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔

اف... انیہ! دس سال... دس سال ہو گئے، تمہیں دیکھے تم سے ملے۔ میں صرف تمہارے لیے یہاں آیا اور تم... تم کہاں چلی گئیں انیہ... تم کہاں چلی گئیں۔" کہتے ہوئے اس نے سر ہاتھوں میں گرا لیا۔



جانے اس کی زندگی میں اور کتنی مشکلات آنا باقی تھیں۔ جب سے اس نے ہوش سنبھالا تھا۔ سب کی آنکھوں میں اپنے لیے نفرت ہی دیکھی تھی۔ مما تو اسے دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتی تھیں۔ وہ صرف سمیر، سارہ، اور علیزے کی مما تھیں۔ وہ جب بھی علیزے یا سارہ کو پیار کر رہی ہوتیں تو وہ حسرت بھری نظروں سے انہیں دیکھتی رہتی اگر وہ سارہ یا علیزے سے کسی کے ساتھ کھیلنے کی کوشش کرتی تو وہ انہیں اٹھا کر کمرے میں لے جاتیں یا اسے ڈانٹ دیتیں۔ کھانے کی ٹیبل پر بھی پاپا کی غیر موجودگی میں اس کے ساتھ یہی سلوک کیا جاتا۔ مما نے اسے سب کے ساتھ بیٹھ کر کھانے کی اجازت کبھی نہیں دی تھی۔ جب سب کھانا کھا لیتے، تب وہ بچا ہوا کھانا اسے دے دیتیں۔ اس کو اسٹور روم میں سلاتیں اور سارہ کے پرانے کپڑے اسے پہننے کے لیے دیتیں۔

پاپا اکثر بیرون ملک ہوتے۔ مہینے گزر جاتے اسے ان کے انتظار میں، کیونکہ جب وہ گھر میں ہوتے تب وہ

کھل کر سانس لیتی تھی۔ ان کے ساتھ وقت گزارتی۔
ان کی موجودگی میں مما اسے کچھ نہیں کہتی تھیں۔

اور پاپا کو اس نے کبھی مما کے رویے کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ بتانے کا فائدہ بھی کیا ہوتا۔ گھر کا ماحول خراب ہوتا اور پاپا کے جانے کے بعد مما کا رویہ اور خراب ہوتا سو اس نے کبھی پاپا کو کچھ بھی بتانے کی کوشش نہیں کی۔

وہ کھڑکی کے سامنے کھڑی گزرے ہوئے کل کی یادوں میں کھوئی تھی کہ اچانک دروازے پر کھٹکا ہوا۔ اور وہی آدمی اندر داخل ہوا۔

کھانا ٹیبل پر رکھ کر۔ وہ مڑنے ہی لگا تھا کہ وہ بول اٹھی۔

"سنو۔" اس نے مڑ کر اسے دیکھا۔

"یہ سب کس نے کروایا ہے؟" اس کے سوال کے جواب میں اس آدمی نے عجیب نظروں سے اسے دیکھا اور واپس مڑ گیا۔

"ارے رکو۔ میں تم سے کچھ پوچھ رہی ہوں۔"
اس کے دوبارہ پکارنے پر وہ آدمی پھر مڑا اور بولا۔

"میں تمہارے کسی بھی سوال کا جواب دینے کا پابند نہیں ہوں۔" اتنا کہہ کر وہ وہاں سے چلا گیا اور وہ خالی خالی نظروں سے بند دروازے کو دیکھتی رہی۔



"تمہیں پتا ہے علیزے۔۔۔! جب میں حویلی میں تھی ناں۔ تو مجھے کبھی کسی چیز کی ٹینشن نہیں ہوتی تھی، کہ مجھے ہوم ورک کون کروائے گا۔ ناشتہ ملے گا یا نہیں۔ میں اسکول وقت پر کیسے پہنچوں گی۔ میرے کچھ بھی کرنے سے پہلے شاہ میر میری ساری پرابلمز سولو کر دیتا۔ ہوم ورک کروانے میں مدد کرتا تھا۔ ناشتہ نفیلت ممانی بنا دیتیں۔ وہ بہت کیئرنگ تھا۔"

شاہ میر کا نام لبوں پر آتے ہی اس کی آنکھیں چمک اٹھتیں اور ہونٹوں پر خوب صورت مسکراہٹ بکھر جاتی اور علیزے کتنی دیر ٹکٹکی باندھے۔ اس کے چہرے پر آتے جاتے خوب صورت رنگوں کو دیکھتی رہتی۔

"علیزے! تمہیں پتا ہے۔ نفیلت ممانی مجھ سے بہت پیار کرتی ہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ میں بالکل باربی ڈول لگتی ہوں۔ اس عید پر انہوں نے میرے لیے اتنا پیارا باربی ڈریس بھیجا ہے۔" اس کی آنکھوں میں ایک نیا منظر روشن ہوا۔ جہاں وہ بہت پرجوش انداز میں اسے وہ چیزیں دکھا رہی تھی۔ جو تھوڑی دیر پہلے ارتضیٰ ماموں اسے دے کر گئے تھے۔

"علیزے! میں شاہ میر کو بہت مس کروں گی۔ کیا اب ہم دونوں کبھی نہیں ملیں گے۔" وہ بہت معصوم انداز سے اس سے پوچھ رہی تھی۔

"علیزے۔۔۔! یہ دیکھو یہ مجھے شاہ میر نے دیا ہے۔ اسے فرینڈشپ بینڈ کہتے ہیں۔ جب تک یہ میرے پاس رہے گا۔ ہم اچھے دوست رہیں گے۔" وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

بیل ڈور کی آواز پر علیزے اپنے خیالوں سے چونکی۔ رانیہ اور رانیہ کی باتیں، اس کے خیالوں کو ذہن سے جھٹکتے ہوئے۔ اس نے رخ موڑ کر سارہ کی طرف دیکھا۔ جو مزے سے ٹی وی دیکھنے میں مصروف تھی۔

"سارہ! تمہیں سنائی نہیں دے رہا بار بار بیل ہو رہی ہے۔" علیزے بولی۔

"تو۔" وہ لاپروائی سے ٹی وی دیکھتے ہوئے بولی۔

"سارہ۔۔۔!" علیزے نے اسے گھور کر دیکھا۔

"اوہو۔۔۔ علیزے! اگر تمہیں اتنی پرابلم ہو رہی ہے تو اٹھ کر دیکھ لو ناں۔ مجھے کیوں ڈسٹرب کر رہی ہو۔" وہ تنگ کر بولی۔ اسی اثنا میں دوبارہ بیل بجی۔

علیزے نے افسوس بھری نظروں سے اسے دیکھا اور پھر اپنے مفلوج پیر کو اور پھر بیساکھی کا سہارا لیتی اٹھ کھڑی ہوئی اور آہستہ آہستہ چلتی دروازے تک آئی اور دروازہ کھولا۔

سامنے ہی پاپا کھڑے تھے۔ وہ پہلے سے کافی کمزور ہو گئے تھے۔ وہ اسے دیکھ کر ہلکا سا مسکرائے۔

"السلام علیکم پاپا!" وہ پرجوش انداز میں بولی۔

"وعلیکم السلام بیٹا۔ آپ نے کیوں تکلیف کی۔

آپ کا پاؤں۔"
"پاپا پلیز۔یہ کہہ کر مجھے شرمندہ مت کریں۔" وہ ان کے پیچھے آہستہ آہستہ چلتے ہوئے بولی۔وہ دونوں ٹی وی لاؤنج میں داخل ہوئے۔ سارہ اب وہاں پر نہیں تھی وہ ان کے ہمراہ صوفے پر آکر بیٹھ گئی۔
"اور سنائیں پاپا! انیہ کا کچھ پتا چلا۔" اس کے سوال پر وہ خاموش ہو گئے۔ ان کے کندھے جھک گئے اور چہرے پر پریشانی کے آثار صاف دکھائی دینے لگے۔
"نہیں بیٹا انیہ کا کچھ پتا نہیں چلا۔جانے کہاں چلی گئی ہے۔ پچھلے ایک مہینے سے پاگلوں کی طرح تلاش کر رہا ہوں۔ مگر اس کا کوئی اتا پتا نہیں۔" کہتے ہوئے ان کی آنکھیں نم ہو گئیں۔
"پاپا آپ پلیز ٹینشن مت لیں سب ٹھیک ہو جائے گا۔ علیزے نے کہا۔
"کیسے ٹھیک ہو جائے گا علیزے! لوگ طرح طرح کی باتیں بنا رہے ہیں۔اوپر سے تمہاری ماما کا رویہ اس طرح کہتے ہوئے وہ بہت بے بس لگے۔
"پاپا پلیز۔ آپ مما کی باتوں کو دل پر مت لیا کریں آپ کو تو ان کی عادت کا پتا ہے ناں۔وہ تو شروع سے ہی ایسی ہیں اور رہی بات لوگوں کی تو آپ ان کی بھی پروا مت کیا کریں۔ ان کا تو کام ہے باتیں بنانا۔" علیزے کی بات پر انہوں نے نم آنکھوں سے مسکراتے ہوئے۔اپنی اس نرم دل بیٹی کو دیکھا۔
"چائے بنواؤں آپ کے لیے؟" ان کا موڈ بہتر دیکھ کر وہ پھر بولی۔
"ہاں ضرور۔" انہوں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ تو وہ بیساکھی کا سہارا لے کر اٹھ کھڑی ہوئی۔



وہ اپنے آفس میں داخل ہو رہا تھا جب اس کے موبائل کی بیپ بجی۔ اس نے موبائل آن کر کے اسکرین کی جانب دیکھا۔ جہاں مس احمد کا نام جگمگا رہا تھا۔ اس نے کال کاٹ دی۔ ان کی کافی مس کالز آئی ہوئی تھیں۔ اس کے چہرے پر ایک کمینی مسکراہٹ بکھر گئی۔ اس نے کال ملائی اور فون کان سے لگا لیا۔
"السلام علیکم! میڈم! کیسی ہیں آپ۔"
"وعلیکم السلام میں بالکل ٹھیک ہوں۔ مگر مجھے لگتا ہے کہ تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔" وہ غصے سے بولیں۔
"کیا ہوا مس احمد! کیا کوئی غلطی ہو گئی ہم سے۔" وہ مسکراہٹ دباتے ہوئے بولا اور پاس رکھی کرسیوں میں سے ایک پہ آکر بیٹھ گیا۔
"کہہ تو ایسے رہے ہو کہ جیسے تم نے کچھ کیا ہی نہ ہو۔"
"ارے میڈم! آپ کھل کر بات کریں ناں کیا کہنا چاہتی ہیں۔" اب وہ سگریٹ نکال رہا تھا۔
"بات تو صاف ہے۔ تم نے اپنا کام تو نکلوا لیا۔اب ہمارا کام کب کرو گے۔" وہ بھنا کر بولی۔
"میڈم آپ کو اندازہ نہیں ہے۔یہ کام کتنا مشکل ہے۔ تھوڑا وقت لگے گا۔ مگر ان شاء اللہ ہو جائے گا۔" وہ لائٹر سے سگریٹ جلاتے ہوئے بولا۔
"میں کچھ نہیں جانتی۔ میرا کام جلد از جلد ہو جانا چاہیے۔ ایک مہینہ ہو گیا ہے۔ ٹال مٹول سے کام نہیں چلے گا۔"
"او کے میں کچھ کرتا ہوں۔" وہ جان چھڑانے والے انداز میں بولا۔
"ہوں۔ جو کرنا ہے جلدی کرو۔ میں مزید انتظار نہیں کر سکتی۔" کہتے ہوئے انہوں نے ٹھک سے فون بند کر دیا۔
اس نے فون کان سے ہٹا کر ایک نظر فون کو دیکھا اور پھر اسے ٹیبل پر رکھ دیا اور سگریٹ کے کش لینے لگا۔



آج وہ پھر کھڑکی کے پاس کھڑی۔ سامنے نظر آتے درخت کی ٹہنی پر بیٹھے چڑیا کے گھونسلے کو دیکھ رہی تھی جو اپنی چونچ میں خوراک کا ٹکڑا دبائے باری باری اپنے بچوں کے منہ میں ڈال رہی تھی۔ یہ کھڑکی اس کمرے

میں اس کی واحد تفریح تھی۔

پچھلے ایک مہینے میں وہ اتنی بار رو چکی تھی۔ اتنی بار ٹوٹ چکی تھی کہ باوجود تکلیف اور اذیت کے اب اس کے آنسو ہی نہیں نکلتے تھے۔ وہ ایک بار پھر ماضی کی یادوں میں کھو گئی۔

پاپا کے علاوہ اگر اس کی ذات میں کسی کو دلچسپی تھی تو وہ علیزے تھی۔ وہ اس سے دو سال چھوٹی تھی۔ مگر اپنے انداز و اطوار سے وہ اس سے بڑی لگتی تھی۔ پاپا کے بعد ایک وہی تھی جو اس کا خیال کرتی۔ اس کے ساتھ کھیلتی۔ اس کے ساتھ وقت گزارتی۔ مما بھی علیزے کو کچھ نہ کہتیں۔

علیزے مما کی سگی اولاد ہونے کے باوجود ان سے دور تھی۔ وجہ اس کا معمولی صورت اور مفلوج پیر ہونا تھا۔

وہ مزاج میں پوری اپنے باپ کا پرتو تھی۔ حساس اور خیال رکھنے والی، جبکہ سارا اور میر دونوں خوب صورتی اور عادات کے لحاظ سے مما پر گئے تھے۔

ایسا نہیں تھا کہ مما علیزے کو پیار نہیں کرتی تھیں وہ جیسی بھی تھی ان کی اولاد تھی۔ وہ اسے پیار بھی کرتی تھیں۔ اس کی ہر ضرورت بھی پوری کرتیں بس یہ علیزے ہی تھی جو ان سے کچھی کچھی رہتی تھی، اس کے اسی رویے نے انہیں اس سے دور کر دیا۔

علیزے کی زندگی کا محور وہ اور پاپا تھے یا پھر اس کی کتابیں اور علیزے کا سہارا ہونا اس کے لیے بہت بڑی بات تھی۔

☼ ☼ ☼

"پاپا! فراز کہاں ہے؟" وہ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی کراچی سے واپس آیا تھا اور سب سے ملنے کے بعد وہ ان کے پاس چلا آیا۔

"وہ آفس میں ہے۔ آج ضروری میٹنگ تھی اس کی۔" وہ اخبار ایک طرف رکھتے ہوئے بولے۔

"ویسے تم کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"وہ، ایک کام کا کہا تھا اسے وہی پوچھنا تھا۔" وہ سرسری سے انداز میں بولا۔

"کیا وہ کام انیہ کے حوالے سے تھا۔" انہوں نے کہا۔

"جی پاپا۔" وہ مختصراً بولا۔

"شاہ میر! انیہ پچھلے ایک ماہ سے گمشدہ ہے۔"

"میں جانتا ہوں۔" وہ بولا۔

"شاہ میر۔ ! میری بات غور سے سنو۔"

"پاپا پلیز۔ میں اس حوالے سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتا۔" وہ ان کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔

"دیکھو بیٹا۔ ایک مہینہ گزر گیا ہے۔ مگر انیہ کا کچھ پتا نہیں چلا۔ وہ کہاں ہے۔ کیسی ہے۔ کس حال میں ہے۔ شبیر نے اسے ڈھونڈنے کی سرتوڑ کوشش کی مگر نتیجہ تمہارے سامنے ہے۔ میرے خیال میں تمہارے لیے بہتر یہی ہے کہ تم انیہ کو بھول جاؤ۔" ان کی آخری بات پر شاہ میر نے چونک کر حیرانی سے اپنے باپ کی جانب دیکھا۔

"پاپا۔ انیہ آپ کی اکلوتی بہن کی اکلوتی نشانی ہے، اور آپ کے اکلوتے بیٹے کی محبت ہے۔ یہ آپ کیسے بھول گئے۔" وہ درشتی سے بولا۔

"مگر بیٹا۔"

"پاپا! پلیز۔ میں اب مزید کچھ نہیں سننا چاہتا۔ یہ مت بھولیے کہ آپ بھی تین بیٹیوں کے باپ ہیں اگر اللہ نہ کرے۔ گل نین، فاطمہ گل یا عائشہ گل کے ساتھ ایسا کچھ ہوا ہوتا تو کیا آپ تب بھی یہی کہتے کہ بھول جاؤ۔"

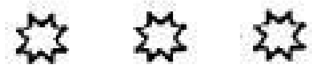
"شٹ اپ شاہ میر۔" وہ غصے سے بولے۔

"آئی ایم سوری پاپا! مگر آپ کے رویے نے مجھے بہت مایوس کیا ہے۔" اتنا کہہ کر وہ کمرے سے نکل گیا۔

☼ ☼ ☼

پھر اس کی زندگی میں ایک نیا موڑ آیا۔ وہ سات سال کی تھی جب ایک دن مرتضیٰ ماموں اور ارتضیٰ ماموں آئے۔ انہوں نے پاپا سے اسے حویلی ساتھ لے جانے

کی بات کی۔ پاپا مان گئے اور وہ ان کے ہمراہ حویلی آگئی۔
یہاں اس کی توقع کے برعکس سب نے پرجوش انداز میں اس کا استقبال کیا۔ نفیلت ممانی، سکینہ ممانی اور ان کے بچوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ سب نے اسے بہت پیار دیا۔ آخر وہ ان کی اکلوتی نند کی بیٹی تھی۔ سب سے بڑے ارتضٰی ماموں تھے۔ ان کی بیوی سکینہ ممانی ان کے پانچ بچے سب سے بڑے عمر بھائی پھر عثمان اس کے بعد فراز اور آخر میں زرگل۔ جبکہ مرتضٰی ماموں اور نفیلت ممانی کے چار بچے تھے۔
سب سے بڑی فاطمہ گل۔ پھر شاہ میر اور آخر میں عائشہ گل اور گل نین۔
وہ جلد ہی ان سب سے گھل مل گئی۔ اور اس میں سب سے بڑا ہاتھ خان ولا کی بچیوں (لڑکیوں) کا تھا۔ جو دن اس نے حویلی میں گزارے وہ اس کی زندگی کے حسین ترین دن تھے۔
اس کی سب سے زیادہ دوستی شاہ میر سے تھی۔ وہ اس کا بہت خیال رکھتا۔ اس کے ساتھ کھیلتا۔ اپنی چیزیں، کھلونے اس کے ساتھ شیئر کرتا۔
اسے پتا بھی نہ چلا کہ چھٹیاں ختم ہو گئیں اور پاپا اسے لینے آگئے۔ واپس جانے کا سن کر وہ بہت اداس ہو گئی تھی مگر کیا کرتی۔ جانا تو تھا ہی دل پر پتھر رکھ کر وہ واپس آگئی۔ وہ وہاں سے آنے کے بعد بہت بدل گئی تھی۔ بات بات پر حویلی کے مکینوں کا ذکر کرتی رہتی۔ علیزے تو اس کا شاہ میر نامہ سن سن کر تنگ آچکی تھی۔ ہر وقت وہ اس کی باتیں کرتی رہتی۔
"شاہ میر کو گاجر کا حلوہ بہت پسند ہے۔ وہ چاکلیٹ نہیں کھاتا۔ اسے بلیو کلر پسند ہے۔ اس کے زیادہ دوست نہیں ہیں۔ اسے انگلش مووی بہت پسند ہیں۔" حیرت تو تب ہوئی جب پاپا نے اسے بتایا کہ وہ اگلے ہفتے واپس کویت جا رہے ہیں تو وہ کتنی دیر خالی خالی نظروں سے انہیں دیکھتی رہی اور پھر اچانک پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔
تب زندگی میں اس نے پہلی مرتبہ پاپا کو مما کے رویے کے بارے میں بتایا۔ اس نے ان سے ڈھیر سارے شکوے کیے۔ تب وہ حیرانی سے اپنی اس بیٹی کو دیکھ رہے تھے۔ وہ کتنی بدل گئی تھی۔
اس نے پاپا سے التجا کی کہ وہ یہاں نہیں رہنا چاہتی۔ پاپا اسے حویلی واپس بھیج دیں۔ شبیر صاحب نے انکار کیا اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ بیمار پڑ گئی۔ اس کی حالت دیکھ کر وہ خود بھی کافی پریشان ہو گئے اور بالآخر انہوں نے اسے حویلی جانے کی اجازت دے دی۔ اور یوں وہ دوبارہ حویلی آگئی۔ اپنی دنیا میں اپنے ونڈر لینڈ میں جہاں سارے رشتے محبت اور پیار سے بھرے تھے۔



"فراز۔۔۔! انیہ کا کچھ پتا چلا۔" وہ اس وقت فراز کے کمرے میں موجود تھا۔
اس کی بات پر فراز پہلو بدل کر رہ گیا۔
"آں۔۔۔ نہیں۔ ابھی تک تو کچھ پتا نہیں چلا۔ مگر تم فکر مت کرو۔ میں جلد تمہیں اچھی خبر سناؤں گا۔"
"فراز۔۔۔ مجھے ایسا کیوں لگ رہا ہے کہ تم انیہ کو ڈھونڈنے کی کوشش ہی نہیں کر رہے ہو۔" وہ مشکوک انداز میں اسے دیکھتے ہوئے بولا۔
"شاہ میر۔۔۔! یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ میں بھلا ایسا کیوں کروں گا اور تم یہ مت بھولو کہ اس کا مجھ سے بھی کوئی رشتہ ہے۔ وہ میری کزن ہے۔ مجھے بہت افسوس ہو رہا ہے تمہاری سوچ پر۔" وہ اسے شکوہ کناں نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔
"آئی ایم سوری فراز! میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ آئی ایم ریئلی ویری سوری۔" وہ شرمندگی سے بولا۔
"اٹس اوکے۔" وہ بولا۔
"اور سناؤ۔ بزنس کیسا جا رہا ہے۔ سنا ہے تم نے اپنی فیکٹری کھولی ہے۔" فراز نے گفتگو کا رخ دوسری جانب موڑا۔
"ہاں کھول تو لی ہے۔ مگر ہینڈل کرنا تھوڑا مشکل ہو رہا ہے۔ کام کا پریشر زیادہ ہے۔" وہ کھوئے ہوئے لہجے میں بولا۔

"کوئی بات نہیں۔ شروع شروع میں پرابلمز ہوتی ہیں۔ آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔" فراز نے کہا۔

"اللہ کرے ایسا ہی ہو۔"

"اچھا میں چلتا ہوں رات کافی ہو گئی ہے۔ تم بھی آرام کرو۔" کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

☆ ☆ ☆

"میری تو خود کچھ سمجھ میں نہیں آرہا شاہ میر بیٹا! میں کیا کروں، بہت پریشان ہوں۔ انیہ کا ابھی تک کچھ پتا نہیں چلا۔ اگر یہ کڈنیپنگ کا کیس ہے تو ابھی تک کسی کڈنیپر کا فون کیوں نہیں آیا؟" شبیر صاحب اس وقت ٹی وی لاؤنج میں بیٹھے فون پر شاہ میر سے بات کر رہے تھے۔ وہ بہت پریشان لگ رہے تھے۔

"پولیس میں رپورٹ بھی درج کروائی ہے کوئی مثبت جواب نہیں ملا۔" ٹی وی لاؤنج کے پاس سے گزرتی سعدیہ بیگم ایک دم ٹھٹک کر رک گئیں۔

"او کے۔ ٹھیک ہے بعد میں بات کرتے ہیں۔" سعدیہ بیگم کو اندر آتا دیکھ کر انہوں نے فون بند کر دیا۔

"کوئی فائدہ نہیں ہے شبیر! تم یہ مان کیوں نہیں لیتے کہ انیہ کا اغوا نہیں ہوا بلکہ ...." وہ معنی خیزی سے بات ادھوری چھوڑ کر انہیں دیکھنے لگیں۔

"تم کہنا کیا چاہتی ہو؟" وہ ان کے لفظوں پر غور کرتے ہوئے بولے۔

"میں کون سی پہیلیاں بجھوا رہی ہوں۔ صرف اتنا کہہ رہی ہوں کہ اگر اس کا اغوا ہوتا تو کوئی تو آپ سے رابطہ کرتا۔ مگر مہینہ ہو گیا ہے۔ انیہ کا کچھ پتا نہیں کہ کہاں ہے۔ اب اللہ جانے اس کا اغوا ہوا بھی ہے کہ نہیں۔"

وہ حیرانی سے بیوی کا چہرہ دیکھنے لگے۔

"دیکھو سعدیہ! تم نے جو کہنا ہے۔ صاف کہو۔"

"کہنا کیا ہے۔ اب کہنے کو بچا ہی کیا ہے۔ شبیر صاحب! انیہ کا اغوا نہیں ہوا۔ مجھے تو لگتا ہے کہ انیہ کسی کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔"

"سعدیہ۔۔۔! شٹ اپ۔۔۔ جسٹ شٹ اپ! تمہیں شرم نہیں آئی میری بیٹی کے بارے میں اس طرح کی بات کرتے ہوئے۔" وہ غصے سے بولے۔

"چلانے یا مجھے چپ کروانے سے بات ختم نہیں ہو جائے گی شبیر صاحب! یہ میں نہیں سارا زمانہ کہہ رہا ہے۔ بس ایک آپ ہی اپنی آنکھیں بند کیے بیٹھے ہیں۔" وہ بھی غصے سے بولیں۔

"اس سے پہلے کہ میں کچھ کر بیٹھوں تم میری نظروں سے دور ہو جاؤ۔" وہ درشتی سے بولے اور وہ اونہہ کرتی وہاں سے چلی گئیں۔

☆ ☆ ☆

اور پھر وہ تین سال اس نے حویلی کی خوب صورت فضاؤں میں گزارے۔ صرف گرمیوں کی چھٹیوں میں پاپا کے کہنے پر وہ کچھ دنوں کے لیے گھر چلی جاتی۔

مرتضیٰ ماموں نے اسے شاہ میر، فاطمہ، گل وغیرہ کے اسکول میں داخل کروا دیا۔ وہ ان کے ساتھ اسکول جاتی۔ شاہ میر بہت اچھا تھا۔ اگر اسے ہوم ورک کرنے میں کوئی پرابلم ہوتی تو وہ اس کی مدد کر دیتا۔ اگر وہ لوگ کوئی گیم کھیلتے تو وہ ہمیشہ شاہ میر کی طرف سے کھیلتی۔

اور پھر ایک دن پاپا اسے لینے آ گئے۔ وہ مدد طلب نظروں سے ارتضیٰ ماموں کو دیکھنے لگی۔ اس کا اترا ہوا چہرہ دیکھ کر انہوں نے پاپا سے بات کی کہ وہ انیہ کو مستقل یہیں رہنے دیں۔

ان کی بات سن کر وہ غصے میں آ گئے اور اسے زبردستی وہاں سے لے آئے۔ اور اس کے بعد اس کے لاکھ منتیں کرنے کے باوجود انہوں نے اسے وہاں جانے کی اجازت نہ دی۔

☆ ☆ ☆

"بس شاہ میر! بہت ہو گیا۔ اب کی بار میں تمہاری کوئی بات نہیں سنوں گی۔ کل میں تمہارے تایا کے گھر جا رہی ہوں۔ تمہارے لیے ان کی بیٹی زر گل کا ہاتھ مانگنے۔"

ان کی بات پر وہ جو صوفے پر بیٹھا موبائل پر میسج

کرنے میں مصروف تھا۔ ایک دم سیدھا ہوا۔

"مام! یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ مجھے زرگل سے شادی نہیں کرنی ہے۔"

"بس شاہ میر! بہت ہو گیا۔ آخر کب تک تم انیہ کے نام پر بیٹھے رہو گے۔ جس کا پچھلے دو مہینوں سے کچھ پتا نہیں ہے اور ویسے بھی جب تمہاری شادی ہو جائے گی ناں تو دیکھنا تم جلد ہی انیہ کو بھی بھلا دو گے۔"

ان کی بات سن کر وہ حیرت سے اپنی ماں کا چہرہ دیکھتا رہا۔

"مام... کم از کم مجھے آپ سے تو یہ امید نہیں تھی۔ پتا نہیں کیوں مجھے یقین تھا کہ ساری دنیا بھی میرا ساتھ چھوڑ دے گی۔ تو آپ میرا ساتھ نہیں چھوڑیں گی۔"

وہ افسوس سے انہیں دیکھتا وہاں سے اٹھ کر چلا گیا۔

"شاہ میر... شاہ میر بیٹا! میری بات تو سنو... شاہ میر۔" وہ پیچھے سے آوازیں دیتی رہ گئیں۔

"تمہاری مام نے بتایا کہ تم نے زرگل سے شادی سے انکار کر دیا ہے۔" رات کے کھانے پر اس کی ملاقات پاپا سے ہوئی اور انہوں نے یہ بات چھیڑ دی۔

اس نے سر اٹھا کر ماں کی طرف دیکھا جنہوں نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

"ہم اس بارے میں بعد میں بات کر سکتے ہیں۔" وہ بولیں تو مرتضیٰ خان نے اپنی بیوی کی طرف گھور کر دیکھا۔

"تم خاموش رہو۔ ہم اپنے بیٹے سے مخاطب ہیں، اب تم بتاؤ۔ تم نے اسے رشتے سے انکار کیوں کیا۔ کیا کمی ہے زرگل میں۔" وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔

"یہی بات تو میں آپ کو سمجھانا چاہتا ہوں کہ اس میں کوئی کمی نہیں ہے۔ اسے مجھ سے بہتر مل سکتا ہے۔"

"مگر تم کیوں نہیں۔ تم میں بھی کوئی کمی نہیں ہے۔"

"مگر میں اس سے محبت نہیں کرتا۔" اس نے جواز پیش کیا۔

"یہ معقول جواب نہیں۔"

"میں انیہ سے محبت کرتا ہوں۔ اس لیے میں زرگل سے شادی نہیں کر سکتا۔" وہ بولا۔

"تمہیں کیا لگتا ہے کہ میں اپنے بڑے بھائی کو انکار کروں گا ہرگز نہیں۔ تمہارے انکار کرنے سے فاطمہ کا رشتہ خطرے میں پڑ سکتا ہے۔" انہوں نے کہا تو اس نے فاطمہ کو دیکھا جو سر جھکائے بیٹھی تھی۔ اپنا نام سن کر کھانا ادھورا چھوڑ کر وہاں سے چلی گئی۔

"تو آپ انکار نہیں کریں گے۔" اس نے پوچھا۔

"نہیں ہرگز نہیں۔" وہ ہٹ دھرمی سے بولے۔

"ٹھیک ہے تو پھر آپ اپنے اکلوتے بیٹے کو کھو دیں گے۔" اتنا کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا اور وہ ہکا بکا اسے جاتے دیکھتے رہے۔

"دیکھا۔ کس طرح بدتمیزی کر کے گیا ہے میرے ساتھ یہ... یہ تمہاری پرورش کا نتیجہ ہے۔ اب کیا منہ دکھاؤں گا اپنے بھائی کو۔"

فاطمہ گل کی عثمان خان کے ساتھ بچپن سے نسبت طے تھی۔ شاہ میر اور زرگل کے رشتے کا شوشا انیہ کی گمشدگی کے بعد چھوڑا گیا اور اس بات پر وہ بوکھلا کر رہ گیا۔ پاپا کو راضی کرنا مشکل تھا۔ مگر وہ یہ جانتا تھا کہ تایا ابا خاصے سمجھ دار ہیں۔ بات کو سنبھال لیں گے۔ اور ہوا بھی یہی انہوں نے کوئی ایشو نہیں بنایا اور بات ختم کر دی۔

وہ رات دیر تک لیپ ٹاپ پر کام کرتا رہا۔ کام ختم کرنے کے بعد وہ جیسے ہی لائٹ آف کرنے کے لیے اٹھا۔ تو اس کی نظر کھڑکی کے باہر والے منظر پر پڑی۔ لان میں شاید کوئی ٹہل رہا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر دیکھا اور حیران رہ گیا۔ یہ اس وقت کیوں جاگ رہی ہے۔

وہ کمرے سے باہر نکل آیا۔ لاؤنج خالی تھا۔ وہ سیڑھیاں اترتا نیچے چلا آیا۔ نیچے والے پورشن میں بھی اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ وہ لابی کا دروازہ کھول کر باہر نکل آیا اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا اس تک آیا۔ وہ اسے دیکھ کر چونک گئی۔

"اوہ... آ... آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟" وہ اپنا چہرہ صاف کرتے ہوئے بولی۔

"یہ سوال تو مجھے تم سے پوچھنا چاہیے کہ اتنی رات کو لان میں کیا کر رہی ہو؟" وہ بولا۔

"مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ اس لیے باہر چلی آئی۔" وہ آہستگی سے بولی۔

"دیکھو زرگل! رات بہت ہو چکی ہے۔ تمہیں اس وقت یہاں نہیں ہونا چاہیے۔ اپنے کمرے میں جاؤ۔" اسے جانے کا اشارہ کرتے وہ مڑا۔ جب ہی وہ بولی۔

"آپ نے مجھ سے شادی سے انکار کیوں کیا؟" اس کی بات سن کر وہ چونک کر پلٹا۔

"میں تمہیں جواب دہ نہیں ہوں۔" اس نے نگاہ چرائی۔

"مگر مجھے جواب چاہیے۔ ایسی کیا کمی ہے مجھ میں جس کی وجہ سے آپ نے مجھے ٹھکرا دیا۔" اس کی آنکھیں لبالب آنسوؤں سے بھر گئیں۔

"تم میں کوئی کمی نہیں ہے زرگل! کمی تو مجھ میں ہے۔ میں کسی اور سے محبت کرتا ہوں۔" وہ نرمی سے بولا۔

"اور میں جو آپ سے محبت کرتی ہوں۔ اس کا کیا۔"

"وہ یک طرفہ ہے۔ تم جذباتی ہو رہی ہو۔"

"اور جو محبت آپ انیہ سے کرتے ہیں وہ یک طرفہ نہیں ہے کیا۔ کیا انیہ آپ سے محبت کرتی ہے؟ اس نے تو پچھلے دس سال سے آپ کو نہیں دیکھا۔ اسے تو شاید آپ یاد بھی نہیں ہوں گے۔"

"زرگل! اپنے کمرے میں جاؤ۔"

"سچائی سے منہ موڑ لینے سے سچ بدل نہیں جاتا۔"

"زرگل...! یہاں سے جاؤ۔" وہ زور سے بولا اور وہ تقریباً" بھاگتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔ اور وہ سر پکڑ کر وہیں پر رکھی کرسی پر بیٹھ گیا۔



وہ ٹی۔ وی لاؤنج میں بیٹھا ٹی۔ وی دیکھ رہا تھا جب اقرا بھابھی (عمر کی بیوی) کچھ پرانی البمز لیے وہاں آئیں۔

"گل نین یہ کچھ البمز ملے ہیں مجھے اسٹور روم کی صفائی کرتے ہوئے۔" انہوں نے شاہ میر سے کچھ فاصلے پر بیٹھی گل نین سے کہا۔

"ہاں یہ میری البمز ہیں۔ میں ہی رکھ کر بھول گئی تھی۔" وہ بولی۔

"تو کیا میں یہ دیکھ سکتی ہوں۔" بھابھی نے کہا۔

"ہاں کیوں نہیں' لائیں میں آپ کو دکھاتی ہوں۔" وہ ان کے پاس آ کر بیٹھ گئی اور تصویریں دکھانے لگی۔

"یہ دیکھیں۔ یہ ہم سب بچپن میں یہ عمر بھائی' زرگل' فاطمہ گل' یہ فراز' عائشے گل' عثمان بھائی اور ... یہ میں۔" وہ پرجوش انداز میں انہیں تصویریں دکھا رہی تھی۔

"اس میں شاہ میر کی کوئی تصویر نہیں ہے۔" اقرا بھابھی نے کہا۔

"نہیں۔ انہیں تصویریں کھنچوانا سخت ناپسند ہے۔" وہ شاہ میر کی طرف دیکھ کر بولی۔ جو بظاہر میچ دیکھ رہا تھا۔ مگر اس کی توجہ انہیں کی طرف تھی۔

"ارے یہ وہی لڑکی ہے ناں جو میری شادی پر آئی تھی۔" اقرا بھابھی پرجوش انداز میں بولیں۔

"ہاں یہ وہی ہے۔" گل نین نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"کیا نام تھا اس کا۔" انہوں نے پوچھا۔

"انیہ... انیہ نام ہے اس کا۔ میری مرحوم پھوپھو کی بیٹی ہے۔" وہ بولی۔

ان کی باتوں کو وہ بخوبی سن رہا تھا۔

"تو یہ اب آتی کیوں نہیں؟" انہوں نے کہا۔

"ہاں۔ اس کے بعد پھر انیہ اور فراز بھائی کا کسی بات کو لے کر جھگڑا ہو گیا۔ پھر اس کے اگلے دن...."

"کیا کہا تم نے 'انیہ اور فراز کا جھگڑا۔" وہ ابھی بات پوری بھی نہ کر پائی تھی کہ شاہ میر ایک دم اٹھ کھڑا ہوا۔

"وہ.... وہ.... بھائی۔"

"گل نین! مجھے بتاؤ کیا ہوا تھا۔"

"بھائی.... وہ.... میں۔"

"گل نین! فار گاڈ سیک۔ مجھے بتاؤ کیا ہوا تھا۔"

"شاہ میر! آرام سے۔ بچی کو ڈراؤ تو مت۔" اقرا بھابھی نے کہا تو وہ ذرا پیار سے بولا۔

"پلیز بتاؤ مجھے۔ ان دونوں کا جھگڑا کیوں ہوا تھا۔"

"بھائی.... ! میں.... مجھے نہیں پتا.... وہ 'وہ تو جب میں انیہ آپی کے کمرے میں جا رہی تھی تو کمرے سے فراز بھائی کی اونچا بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔" وہ ہچکچاتے ہوئے بولی۔

"کچھ یاد ہے' وہ آپس میں کیا باتیں کر رہے تھے۔" اس نے پوچھا۔

"نہیں کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ ان پر غصہ ہونے کے بعد وہ چلے گئے مگر.... انیہ آپی بہت دیر تک روتی رہیں پھر اگلے دن ہی وہ واپس چلی گئیں۔"

بہت سی باتیں ایسی تھیں جو ابھی بھی اس کی نظروں سے اوجھل تھیں اور ان سب سوالوں کے جواب صرف ایک شخص سے مل سکتے تھے۔

وہ پرسوچ انداز میں وہاں سے نکل گیا۔

☆ ☆ ☆

اسے یاد تھا' بابا نے اس کے حویلی جانے پر پابندی لگا دی تھی۔ اگر وہ غلطی سے بھی حویلی جانے کا نام لیتی تو وہ غصے میں آ جاتے۔

پھر وہ بھی خاموش ہو گئی۔ ان کے سامنے حویلی جانے کا نام نہیں لیتی۔ مگر حویلی کے مکین ابھی بھی اس کے دل میں زندہ تھے۔ وہ علیزے سے ہر وقت حویلی کی باتیں کرتی رہتی جس میں زیادہ ذکر شاہ میر کا ہی ہوتا۔ وقت کا کام تھا گزرنا سو گزرتا گیا۔

جب وہ اٹھارہ سال کی تھی تب ایک دن ارتضیٰ ماموں چلے آئے۔ بابا بھی ان دنوں کویت سے آئے ہوئے تھے۔ وہ اپنے بڑے بیٹے عمر کی شادی کا کارڈ لے کر آئے تھے۔ انہوں نے بابا کو شادی کی دعوت دی اور انہیں اس بات پر بمشکل راضی کیا کہ وہ انیہ کو پندرہ دن کے لیے حویلی لے جائیں۔ خلاف توقع وہ مان گئے۔

اس دن اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ سامان پیک کر کے وہ ماموں کے ساتھ حویلی آ گئی۔ اس کی آمد کا سن کر پوری حویلی میں ہلچل مچ گئی۔ ہمیشہ کی طرح سب لوگ اس سے بہت گرم جوشی سے ملے۔ وہ سب سے ملی سوائے اس شخص کے جس سے ملنے کی خواہش میں وہ یہاں تک آئی تھی۔ جب شام تک وہ اسے کہیں نظر نہ آیا تو عائشہ گل سے پوچھ بیٹھی۔

"عائشہ.... ! یہ شاہ میر نظر نہیں آ رہا ہے۔ کہاں ہے وہ؟" وہ سرسری انداز میں بولی۔

"وہ یہاں پر ہے ہی نہیں تو نظر کیسے آئے گا۔" وہ کپڑے الماری میں سیٹ کرتے ہوئے بولی۔

"کیا مطلب یہاں نہیں ہے۔" وہ حیران ہوئی۔

"وہ تو پڑھائی کے سلسلے میں لندن میں مقیم ہے۔"

"اچھا کب۔" وہ آنکھیں کھولے اسے دیکھ رہی تھی۔

"تمہیں نہیں پتا؟" عائشہ گل حیران ہوئی۔

"نہیں تو...."

"اچھا۔" عائشہ چپ ہو گئی۔

"مگر اسے شادی پہ تو آنا چاہیے تھا۔" وہ پھر بولی۔

"ہاں آنا تو چاہیے تھا مگر کیا کرے' وہ بھی مجبور ہے۔ اسے چھٹی نہیں ملی۔

اگر اسے پتا ہوتا کہ تم آ رہی ہو تو چھلانگیں لگاتا ہوا آتا۔" وہ شرارت سے بولی تو انیہ نے حیرانی سے اسے دیکھا۔

"تم ایسے کیوں دیکھ رہی ہو۔" وہ کنفیوز ہو گئی۔

"نہیں۔ بس ایسے ہی۔ اللہ تمہیں نظر بد سے بچائے۔" وہ اس کے ماتھے پر بوسہ دیتے ہوئے بولی۔

اور پھر اس کی ساری دلچسپی ختم ہو گئی۔ جیسے تیسے کر کے شادی ختم ہوئی اور اس نے جانے کا ارادہ کیا۔

سب کچھ ٹھیک تھا۔ وہ اگلے دن واپس جا رہی تھی اور اپنے کمرے میں پیکنگ کرنے میں مصروف تھی کہ اچانک دروازہ کھلا اور فراز اندر آیا۔ اور جو کچھ اس نے

کہا۔ اس نے اس کی ذات کے پرخچے اڑا دیے۔ وہ کتنی دیر بے حس و حرکت اس دروازے کی جانب دیکھتی رہی جہاں سے وہ گیا تھا۔

اور اس کے بعد اس نے فیصلہ کرلیا کہ وہ کبھی خان ہاؤس دوبارہ نہیں آئے گی۔ اور آج کے بعد اس کا اس شخص سے رشتہ ختم۔۔۔

☆ ☆ ☆

آج پھر وہ کھڑکی کے سامنے کھڑی تھی۔ جب وہی آدمی دوپہر کا کھانا لے کر آیا۔ کھانا ٹیبل پر رکھ کر وہ واپس جانے کو مڑا ہی تھا کہ وہ بول اٹھی۔

"یہ سب فراز نے کروایا ہے ناں؟"

اس کی بات سن کر وہ رکا اور حیرت سے اس نے اس کی جانب دیکھا۔ اس آدمی کے اس طرح دیکھنے سے اسے اپنے سوال کا جواب مل گیا۔ ایک طنزیہ مسکراہٹ اس کے چہرے پر بکھر گئی۔

"ایک بات کہوں بابا۔۔۔! انسان کو اتنا خود غرض بھی نہیں ہونا چاہیے کہ وہ اللہ کا خوف دل سے نکال دے۔"

"اس سے جاکر کہہ دینا میں اس سے نہیں ڈرتی اور جو وہ چاہتا ہے میں وہ ہرگز نہیں ہونے دوں گی۔" کہتے ہوئے وہ رو پڑی۔

"تم نے میری زندگی برباد کردی فراز۔۔۔ میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔" گل خان اس لڑکی کو روتا چھوڑ کر باہر نکل گیا۔

☆ ☆ ☆

وہ بہت غصے میں اس کے کمرے میں داخل ہوا تھا۔ فراز سامنے ہی صوفے پر بیٹھا سگریٹ کے کش لے رہا تھا۔ اسے دیکھ کر ایک دم اٹھ کھڑا ہوا اور سگریٹ ڈسٹ بن میں پھینکی۔

"ارے شاہ میر! تم کیسے ہو یار۔" وہ اس سے ملنے کے لیے آگے بڑھا ہی تھا جب شاہ میر نے اس کے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اسے پرے دھکیلا۔

"انیہ۔۔۔ کہاں ہے فراز۔۔۔؟" وہ درشتی سے بولا۔

"مجھے ابھی کچھ پتا نہیں چلا جیسے ہی کچھ پتا۔۔۔"

"چٹاخ۔۔۔!" اس نے ایک زوردار تھپڑ اس کے منہ پر رسید کیا۔

"شاہ۔۔۔ شاہ میر! میں سچ کہہ رہا ہوں۔ مجھے نہیں پتا وہ کہاں ہے۔" وہ اپنا گال سہلاتے ہوئے بولا۔

"اچھا تو تم نے دو سال پہلے اسے ایسا کیا کہا تھا جس کی وجہ سے وہ یہاں سے چلی گئی۔" وہ غصے سے بولا۔

"ک۔۔۔ کب میں۔۔۔ میری تو اس سے کوئی بات نہیں ہوئی۔"

"فراز۔۔۔! دو سال پہلے تم اس کے ساتھ کس بات پر لڑے تھے۔" وہ غصے سے ایک ایک لفظ چباتے ہوئے بولا۔

"دیکھو شاہ میر! تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ میری اور انیہ کی ایسی کوئی سیریس بات نہیں ہوئی۔" وہ پھر بولا۔

"میری ایک بات کان کھول کر سن لو فراز۔۔۔! جس دن مجھے پتا چلا کہ انیہ کی گمشدگی کے پیچھے تمہارا ہاتھ ہے۔ تو یاد رکھنا مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔"

وہ اسے متنبہ کرتا الٹے قدموں واپس مڑ گیا۔ اس کے فون کی بیپ بجی اس نے بنا دیکھے فون اٹھالیا۔

"ہیلو۔۔۔!"

"فراز! دو مہینے ہوگئے ہیں میرا کام نہیں ہوا۔ تم کر کیا رہے ہو؟" ریسیو کرتے ہی وہ دوسری طرف سے بولیں۔

"کچھ نہیں۔"

"یہ کیا بات ہوئی فراز۔۔۔! دو مہینے ہوگئے اور میرا کام۔"

"ارے بھاڑ میں گیا تمہارا کام۔ ادھر میں اتنے برے طریقے سے پھنس گیا ہوں اور تمہیں اپنے کام کی پڑی ہے۔ ایک بات یاد رکھنا اگر میں پکڑا گیا ناں تو چھوڑوں گا تمہیں بھی نہیں۔" اتنا کہہ کر اس نے غصے سے فون بند کردیا۔

"آپ نے بلایا صاحب!" گل خان کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولا۔ فراز جو کرسی سے ٹیک لگائے

آنکھیں موندے بیٹھا تھا۔ اسی وقت سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

"ہاں، مجھے تم سے کچھ کام تھا۔"

"جی کہئے صاحب...!" وہ مودب انداز میں بولا۔

"وہ فارم ہاؤس والی لڑکی ہے ناں۔"

"جی صاحب۔" اس نے سر ہلا دیا۔

"اسے رات کو فیض کے کچھ لوگ لینے آئیں گے۔ ان کے حوالے کر دینا۔"

گل خان اس کی بات سن کر حیران رہ گیا۔ وہ فیض کو اچھی طرح جانتا تھا فراز اکثر اس کے ساتھ جوا کھیلتا تھا۔ اور انیہ کو اس کے حوالے کرنے کا مطلب تھا۔

"کیا ہوا گل خان! کہاں کھو گئے بھئی۔"

"صاحب! میں سوچ رہا تھا۔ اس لڑکی کو فیض کے حوالے... میرا... مطلب ہے۔"

"او ہیلو گل خان! اپنی زندگی عزیز ہے کہ نہیں اور تمہیں اس سے کیا میں لڑکی کو فیض کے حوالے کروں کسی اور کے تم اپنے کام سے کام رکھو اور جتنا کہا ہے اتنا ہی کرو۔" وہ اسے ڈپٹتے ہوئے بولا۔

"جی... صاحب۔" وہ بولا۔

"اب جاؤ یہاں سے۔" اس کے کہتے ہی وہ وہاں سے چلا گیا۔

رات کے دس بجے کے قریب گاڑی فارم ہاؤس کے پاس آ کر رکی۔ گاڑی سے چار آدمی برآمد ہوئے جو شکل اور حلیے سے ہی بدمعاش نظر آتے تھے۔ ان چاروں کا رخ فارم ہاؤس کی طرف تھا۔

گل خان انہیں دیکھ چکا تھا۔ اس نے اپنا موبائل نکالا اور فون ملانے لگا۔ مگر مطلوبہ نمبر سے جواب موصول نہیں ہو رہا تھا۔ وہ آدمی اب فارم ہاؤس کے اندر داخل ہو رہے تھے۔ ان میں سے ایک آدمی کی نظر گل خان پر پڑی۔

"او بڈھے! لڑکی کہاں ہے۔" ان میں سے ایک آدمی انتہائی بدتمیزی سے بولا۔ گل خان نے چاروناچار سامنے کمرے کی جانب اشارہ کیا اور سر جھکا لیا۔

وہ چاروں کمرے کی جانب بڑھے۔ وہ جو گھٹنوں میں سر دیے بیٹھی تھی ایک دم ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی اور سامنے کا منظر دیکھ کر سن ہو گئی۔ اب اس سے بڑی اذیت اور دکھ کی بات اور کیا ہو سکتی ہے... تو... تم اس حد تک گر گئے فراز۔ وہ دل ہی دل میں بولی۔

"ارے واہ! یہ لڑکی تو چاند کا ٹکڑا ہے۔" ان میں سے ایک آگے بڑھتے ہوئے بولا۔ جبکہ ان تینوں نے زوردار قہقہہ لگایا۔ وہ جیسے جیسے آگے بڑھ رہا تھا۔ وہ الٹے قدم پیچھے جا رہی تھی۔

اس سے پہلے کہ وہ اسے ہاتھ لگاتا۔ انیہ نے اسے زور کا دھکا دیا۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا پاس رکھی ٹیبل پر جا گرا جس کا کونا اس کے سر پر لگا۔ موقع دیکھ کر وہ دروازے کی جانب بڑھنے ہی لگی تھی کہ ان میں سے ایک نے اسے بازو سے پکڑ کر روکا اور ایک زوردار تھپڑ اس کے منہ پر رسید کرتے ہوئے اسے بیڈ پر پھینکا۔ جبکہ دو آدمی پہلے والے کو اٹھا رہے تھے۔ اس آدمی نے پہلے اپنے سر سے گرتے خون اور پھر بیڈ پر گری انیہ کو دیکھا اور پھر غصے سے خود کو چھڑاتا وہ انیہ کی جانب لپکا۔

"سالی مجھے مارتی ہے۔ مجھ پر حملہ کرتی ہے کمینی..."

اس نے ایک دو، تین کتنے ہی تھپڑ اس کے منہ پر مارے اور اسے بالوں سے پکڑ کر سامنے دیوار پر دے مارا۔ وہ ایک دم زمین پر گری اس کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ اس کی جانب بڑھتا۔ دروازہ کھلا اور وہ ولید کے ہمراہ اندر داخل ہوا۔ اس نے ہوائی فائر کیا کمرے میں ہلچل مچ گئی۔ وہ سب بھاگ گئے۔ وہ تقریباً" دوڑتا ہوا اس کے پاس آیا۔ تب تک وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔ اس کے سر سے خون بہہ رہا تھا اور چہرے پر جابجا تھپڑوں کے نشان تھے۔ اس کا ہونٹ بھی پھٹ چکا تھا۔ اس کی حالت دیکھ کر غصہ عود کر آیا اور وہ اس شخص کی جانب بڑھا۔ جسے اندر آتے ہوئے اس نے انیہ کی جانب بڑھتے دیکھا تھا۔ اور آگے بڑھ کر اس نے اس کے منہ پر زوردار تھپڑ دے مارا۔

"تیری ہمت کیسے ہوئی اسے ہاتھ لگانے کی۔" کہتے ہوئے۔ اس نے دو، تین تھپڑ اور رسید کیے۔

"شاہ میر! کول ڈاؤن۔ اس وقت تمہیں اپنی کزن کو دیکھنا چاہیے۔ اس کی حالت کافی خراب ہے۔" کہتے ہوئے ولید نے اسے انیہ کی جانب متوجہ کیا۔ وہ دوبارہ انیہ کی جانب آیا اور اسے اٹھا کر باہر گاڑی کی پچھلی سیٹ پر لٹا کر وہ خود فرنٹ سیٹ پر آکر بیٹھ گیا۔

اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اسے اس وقت کہاں لے کر جائے۔ اسے اس حالت میں نہ وہ ـــ اپنے گھر لے جا سکتا تھا اور نہ ہی انیہ کے گھر۔ شبیر انکل کو ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔ وہ ہسپتال میں تھے۔ اور سعدیہ آنٹی پر وہ کسی صورت بھروسہ نہیں کر سکتا تھا اور گھر میں فراز کی موجودگی میں وہ انیہ کو نہیں لے جا سکتا تھا۔ ولید کا ہی گھر تھا جہاں وہ انیہ کو لے جا سکتا تھا۔ اس نے سوچا اور گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

"حنا! یہ ٹھیک تو ہو جائے گی ناں۔" وہ فکر مندی سے بولا۔

"ان شاء اللہ یہ بہت جلد ٹھیک ہو جائے گی تم فکر مت کرو۔" وہ اس کا معائنہ کرتے ہوئے بولی۔ اسی اثنا میں ولید چائے لے آیا۔

"لو بھائی! میرے ہاتھ کی گرما گرم چائے پیو۔" وہ بولا۔

"تھینک یو۔" اس نے مسکراتے ہوئے اس کے ہاتھ سے کپ لیا۔

"ویسے شاہ میر! تم نے بتایا نہیں، یہ سب کیا کس نے؟" ولید نے پوچھا۔ تو وہ اسے سب کچھ بتاتا چلا گیا۔

"او مائی گاڈ! مجھے تو یقین ہی نہیں آرہا کہ یہ سب فراز نے کیا ہے۔" وہ اس کی بات سن کر حیرانی سے بولا۔

"ہوں۔ یقین تو مجھے بھی نہیں ہوا تھا۔ مگر یہ سچ ہے۔"

"مگر اس نے ایسا کیا کیوں؟" اب کی بار حنا بولی۔

"مجھے نہیں پتا۔" وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔

"اچھا اب تم لوگ سو جاؤ، میری وجہ سے ڈسٹرب ہوئے۔" وہ بولا۔

"نو پرابلم۔ ہمیں تمہاری مدد کر کے خوشی ہوئی۔ شکر ہے تم نے ہمیں اس قابل سمجھا۔" ولید نے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

"میں تمہارے لیے بستر لگا دیتا ہوں۔" وہ بولا۔

"نہیں۔ اس کی ضرورت نہیں، میں لاؤنج میں سو جاؤں گا۔ تم دونوں آرام کرو۔"

"اب مجھے شرمندہ مت کرو شاہ میر! جانتا ہوں میرا گھر چھوٹا ہے مگر میرا دل چھوٹا نہیں ہے۔۔۔"

"ولید۔۔۔ میں کہہ رہا ہوں ناں میں ایڈجسٹ کر لوں گا، تم جاؤ۔" حنا جا چکی تھی۔ وہ بھی خاموشی سے وہاں سے چلا گیا۔ جانتا تھا وہ ماننے والا نہیں ہے۔

ولید اس کے بچپن کا دوست تھا وہ ڈاکٹر تھا۔ پچھلے سال ہی اس کی حنا سے شادی ہوئی تھی۔

دونوں اسلام آباد کے پوش علاقے میں رہتے تھے۔

حنا اس کی کلاس فیلو تھی۔ یہ سب سوچتے ہوئے وہ انیہ کی جانب متوجہ ہوا۔ جو پر سکون تھی۔ اس کے چہرے پر زخموں کے نشان واضح تھے۔ سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ ہونٹ سوجے ہوئے تھے اور آنکھوں کے گرد گہرے حلقے پڑ گئے تھے۔

بے اختیار اس کے دل میں درد کی لہر اٹھی۔ یہ سب سوچتے ہوئے اسے پتا ہی نہ چلا کہ کب اس کی آنکھ لگ گئی۔

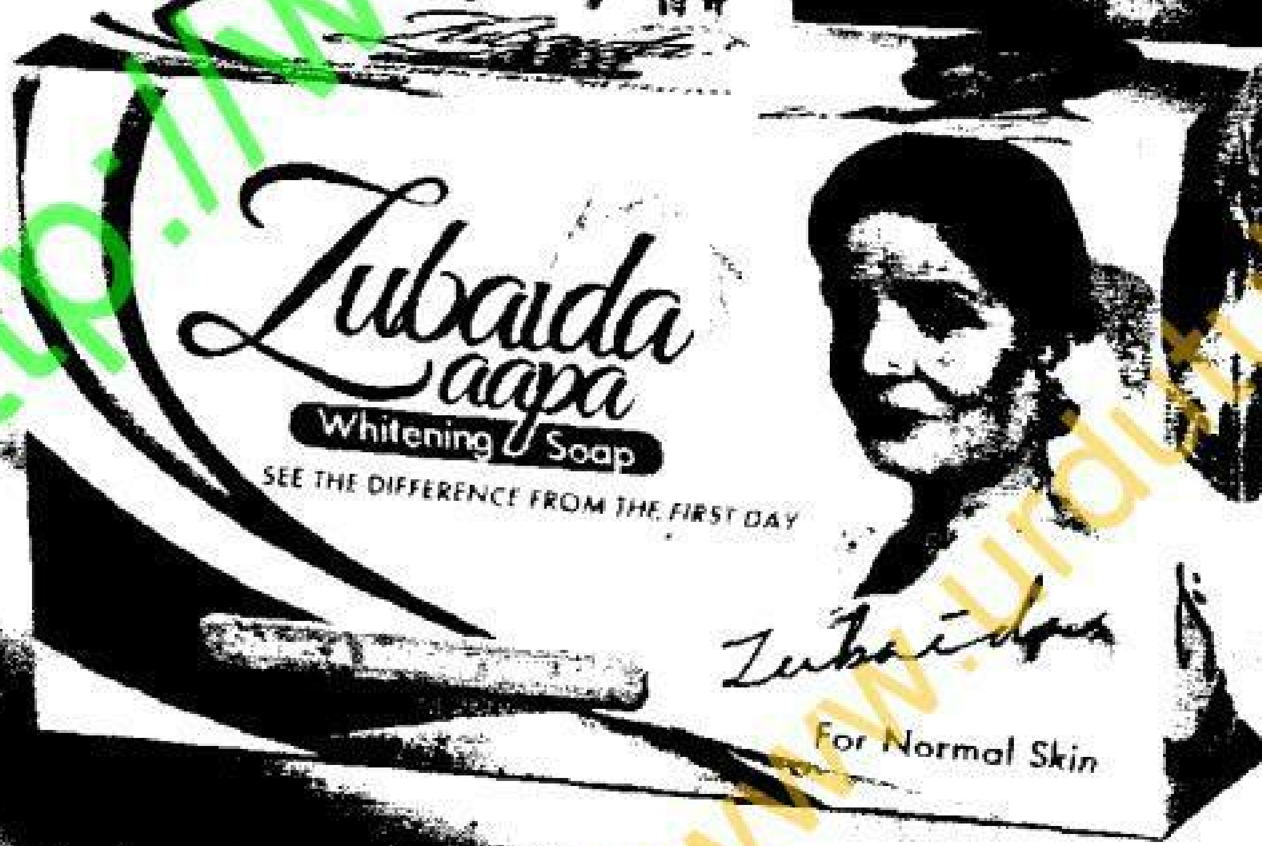
صبح آٹھ بجے کے قریب اس کی آنکھ کھلی۔ وہ اسی حالت میں صوفے پر لیٹا تھا۔ اس نے بیڈ پر لیٹی انیہ کو دیکھا۔ وہ ابھی تک سو رہی تھی۔ وہ خاموشی سے باہر نکل آیا۔ سامنے ہی حنا بیٹھی تھی۔ اسے دیکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"حنا۔۔۔! ولید کہاں ہے۔" اس نے پوچھا۔

"وہ تو صبح ہی ہاسپٹل چلے گئے۔" اس نے جواب دیا۔

"اچھا۔ میں ایک ضروری کام سے جا رہا ہوں۔ شام تک آجاؤں گا۔ تم انیہ کا دھیان رکھنا اور اگر وہ تم سے کچھ بھی پوچھے تو ٹال دینا۔ اور اسے کہیں جانے بھی مت دینا میں۔" اس نے کہا۔

"ٹھیک ہے جناب! میں اسے کچھ نہیں بتاؤں گی۔ اس کا اچھے سے خیال رکھوں گی۔ مگر پہلے تم ناشتہ کر لو۔"


Zubaida
aapa
Whitening Soap
SEE THE DIFFERENCE FROM THE FIRST DAY
For Normal Skin

حنا نے کہا۔
"آئی ایم سوری حنا! میں ناشتہ نہیں کر سکتا۔ مجھے کچھ ضروری کام ہے۔ بعد میں بات کرتے ہیں۔" اتنا کہہ کر وہ باہر نکل گیا۔ اس نے گاڑی اسٹارٹ کی اب اس کا رخ شبیر انکل کے گھر کی جانب تھا۔
دوسری بیل پر دروازہ کھل گیا۔ دروازہ کھولنے والا سمیر تھا۔
"السلام علیکم!" شاہ میر نے سلام کیا۔
"وعلیکم السلام! آپ۔۔۔ شاہ میر ہیں ناں؟" وہ اندازہ لگاتے ہوئے بولا اس نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلا دیا۔
"آئیں۔۔۔" اس نے اسے اندر آنے کے لیے راستہ دیا۔ بائیں جانب چھوٹے سے لان میں ایک خوب صورت سی لڑکی فون پر باتیں کر رہی تھی' وہ بھی اسے ہی دیکھ رہی تھی اس نے نظریں پھیر لیں۔ وہ سارہ تھی۔ وہ سمیر کے ہمراہ چلتا ہوا ڈرائنگ روم میں آ گیا۔
"کیا لیں گے آپ چائے یا کافی۔" اس نے پوچھا۔
"نو تھینکس۔ میں کچھ نہیں لوں گا۔ شبیر انکل کی طبیعت کیسی ہے۔" اس نے اسے منع کرتے ہوئے پوچھا۔
"شاہ میر بھائی! پاپا تو ابھی تک ہسپتال میں ہی ہیں۔" اس نے جواب دیا۔ "میری ڈاکٹر سے بات ہوئی تھی تو وہ کہہ رہے تھے کہ اس ہفتے تک ڈسچارج کر دیں گے۔" اس نے حیرانی سے کہا۔
"اور انیہ کے بارے میں کچھ پتا چلا؟" اس نے پوچھا۔ شاہ میر ایک دم گڑبڑا گیا۔ وہ چاہتا تھا کہ پہلے شبیر انکل کو بتائے۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتا علیزے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔
"السلام علیکم! کیسے ہیں آپ؟ کب آئے۔" اس نے آتے ہی کتنے سوال کر دیے۔
"وعلیکم السلام! میں بالکل ٹھیک ہوں اور ابھی تھوڑی دیر پہلے آیا ہوں۔"
"سمیر! تم نے ان سے چائے وغیرہ کا پوچھا نہیں۔" وہ اب اپنی بیساکھی اتار کر صوفے پر بیٹھ رہی تھی۔
"نہیں۔ اس کی ضرورت نہیں' سمیر مجھ سے پوچھ چکا ہے۔" اس نے رکھائی سے جواب دیا۔
"ارے ایسے کیسے چلے گا۔ سمیر! جاؤ فرید سے کہو چائے لائے گا۔" علیزے نے سمیر سے کہا تو وہ اس کے نہ نہ کرنے کے باوجود چلا گیا۔
"اور سنائیں انیہ کا کچھ پتا چلا؟" اس کے اگلے سوال نے اسے کشمکش میں ڈال دیا۔ علیزے کو بتائے یا ناں۔ کیا اس پر بھروسا کرنا ٹھیک ہوگا۔ شاید نہیں۔ مجھے انکل کے آنے کا انتظار کرنا چاہیے۔ اس نے سوچا اور علیزے کی جانب دیکھا۔
"نہیں۔ ابھی تک کچھ پتا نہیں چل سکا۔ میرے خیال میں مجھے اب چلنا چاہیے۔ کافی دیر ہو گئی ہے۔" کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔
"ارے چائے تو پیتے جائیں۔" وہ بولی۔
"نہیں علیزے پھر کبھی۔ مجھے انکل سے ملنا تھا۔" وہ کہتے ہوئے باہر کی جانب بڑھا۔ لان میں وہی لڑکی ابھی بھی موجود تھی۔ اس نے جاتے ہوئے ایک نظر اسے دیکھا اور باہر نکل گیا۔
گاڑی میں بیٹھتے ہی پاپا کی کال آ گئی۔ اس نے کال اٹینڈ کرتے ہوئے فون کان سے لگایا۔
"السلام علیکم پاپا۔۔۔!" اس نے کہا مگر انہوں نے جو کچھ کہا اسے سن کر وہ سکتے میں آ گیا۔
"مگر پاپا! میں تو۔۔۔" وہ حیرانی سے ان کی باتیں سن رہا تھا۔
"اچھا آپ فون رکھیے۔ میں ابھی حویلی آ رہا ہوں۔" کہتے ہوئے اس نے فون بند کر دیا اور اگنیشن میں چابی گھمائی۔

حویلی میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ہر طرف خاموشی کا راج تھا۔ وہ اندر داخل ہوا۔ سامنے ہی ٹی وی لاؤنج تھا جہاں سب موجود تھے۔ پاپا' ماما' تایا' تائی' عثمان' عمر' زرگل' گل نین' عائشہ گل۔ سب وہیں تھے سوائے فراز کے اور اسے ہونا بھی نہیں چاہیے تھا۔
اسی اثنا میں سب کی نظر اس پر پڑی۔ وہ اندر آتے ہوئے ذرا سا مسکرایا۔ مگر ان کے دیکھنے کے انداز میں

کچھ ایسا تھا جو اسے کھٹکا' وہ سب عجیب نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔

"کیا ہوا؟ آپ سب مجھے ایسے کیوں دیکھ رہے ہیں؟" وہ حیرانی سے بولا۔

سب سے پہلے تایا ابا آگے بڑھے۔ "انیہ... کہاں ہے شاہ میر!" ان کی بات سن کر وہ ہکا بکا رہ گیا۔

"ہاں... تایا ابا! میں آپ کو بتانے ہی والا تھا... وہ فراز..."

"میرے بیٹے کا نام بیچ میں مت لو۔ جتنا پوچھا ہے اس کا جواب دو۔" وہ اس کی بات کاٹ کر درشتی سے بولے۔ وہ حیرانی سے ان کا چہرہ دیکھ رہا تھا... جو غصے کے مارے سرخ پڑ چکا تھا۔ انہوں نے پہلے کبھی اس سے اس طرح سے بات نہیں کی تھی۔

"شاہ میر...! انیہ کہاں ہے؟" اسے خاموش دیکھ کر وہ دوبارہ غصے سے بولے۔

"تایا ابا... میں آپ کو... بتا تو رہا ہوں۔ فراز نے..."

"بکواس بند کرو اپنی۔ سیدھا سیدھا جواب دو۔" وہ ایک بار پھر اس کی بات کاٹ کر بولے۔

"تایا ابا فراز نے... انیہ۔"

"شاہ میر...! انیہ تمہارے پاس ہے یا نہیں۔" وہ اونچی آواز میں بولے۔

"تایا ابا!... وہ۔"

"ہاں یا ناں۔" وہ اور غصے سے چلائے۔

انہیں دیکھنے کے بجائے شاہ میر نے رخ موڑ کر اپنی بہنوں کو دیکھا جو خوف زدہ سی کھڑی --- اسے حیرت سے دیکھ رہی تھیں۔ اس کی نظر ماں پر پڑی جن کی آنکھوں میں خوف تھا اور یقین بھی۔

اس کے کانوں میں آواز گونجی۔ اس نے اپنے باپ کی طرف دیکھا۔ جو بے یقینی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ ایک تلخ مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر بکھری۔ مشکل وقت میں سارے ساتھ چھوڑ دیتے ہیں دوست' رشتے دار' حتیٰ کہ بھائی بہن اور باپ بھی مگر ماں... ماں کبھی اپنی اولاد کو نہیں چھوڑتی۔ اس نے دوبارہ ماں کو دیکھا۔

جس کی آنکھیں محبت سے لبریز تھیں۔

"شاہ میر...! میں تم سے بات کر رہا ہوں۔ ہاں یا ناں۔" وہ دوبارہ کرخت لہجے میں بولے۔ ان کی آواز پر اس نے رخ موڑ کر تایا ابا کو دیکھا اور بولا۔

"ہاں۔ وہ میرے پاس ہے۔" اس کا اتنا ہی کہنا تھا کہ ایک زوردار تھپڑ اس کے منہ پر پڑا اور تھپڑ مارنے والے تایا نہیں بلکہ پاپا تھے۔ تو انہیں بھی اس پر بھروسا نہیں تھا۔ اس سے زیادہ تکلیف دہ بات اور کیا ہو سکتی ہے۔

"شرم نہیں آئی اتنی گھٹیا حرکت کرتے ہوئے۔ مجھے نہیں پتا تھا کہ تم اتنے بے غیرت ہو گئے ہو۔ ارے شادی کرنی تھی تو مجھ سے کہتے' یہ اس طرح کی گھٹیا حرکت کرنے کی کیا ضرورت تھی۔" وہ کچھ نہیں بولا حیرت سے باپ کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ کیا کچھ نہیں تھا ان کی آنکھوں میں بدگمانی' غصہ' نفرت ان کے الزامات کی بوچھاڑ نے اس کی ذات کے پرخچے اڑا دیے تھے۔

"ارے یہ سب کرنے سے پہلے کم از کم میرے مرنے کا انتظار تو کیا ہوتا۔" وہ پھر غصے سے بولے۔ ان کی بات پر اس نے بولنے کی کوشش کی۔

"پاپا...! ایسے تو مت کہیں۔ یقین کریں میں نے کچھ نہیں کیا ہے۔ میں کبھی ایسا سوچ بھی نہیں سکتا۔" کہتے ہوئے وہ رونے لگا۔

"پاپا! یہ سب فراز نے کیا ہے۔ اس نے... اس نے انیہ کو..." ایک اور تھپڑ اس کے چہرے پر پڑا لیکن اس بار تایا ابا نے اسے مارا۔

"بس کرو شاہ میر! اپنے کرتوت چھپانے کے لیے تم میرے بیٹے پر الزام کیوں لگا رہے ہو۔" وہ غصے سے بولے۔

"نہیں تایا ابا... میں سچ کہہ رہا ہوں' یہ سب فراز نے کیا ہے۔ یہ سب اسی کا کیا دھرا ہے۔ پاپا آپ میری بات کا یقین۔"

"بس...!" پاپا نے ایک دم کہا۔

"بس کرو شاہ میر! اور کتنا گرو گے۔ میں بقائمی ہوش

وحواس سے تمہیں اپنی جائیداد سے عاق کرتا ہوں۔ آج سے تمہارا ہم سے۔۔۔ اور اس گھر کے ہر فرد سے رشتہ ختم۔"

ان کی بات سن کر کمرے میں سناٹا چھا گیا۔ اس نے بے یقینی سے اپنے باپ کو دیکھا۔ یہ وہی باپ تھا جو اس سے محبت کا دعوا کرتا تھا۔ جس نے اسے چلنا سکھایا تھا۔ آج اسی نے اس کے قدموں تلے سے زمین کھینچ لی سب کچھ کھینچ لیا۔ وہ حواس باختہ حیرت سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ سب سے پہلے ہوش ماں کو آیا۔ باقی سب تماشائی بنے کھڑے تھے۔

وہ بھاگتی ہوئی اس کے قریب آئیں اور بے اختیار اسے گلے سے لگالیا۔ جیسے ابھی وہ بھاگ جائے گا۔

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ ہوش میں تو ہیں آپ! بیٹا ہے یہ ہمارا۔ آپ ایسا کیسے کرسکتے ہیں۔" وہ اس کا ہاتھ مضبوطی سے تھامے بولیں۔

"تم۔۔۔ دفع ہو جاؤ اس گھر سے۔ آیندہ اپنی شکل مت دکھانا مجھے۔" وہ انہیں نظرانداز کرتے ہوئے بولے۔

"میں آپ سے بات کر رہی ہوں۔ آپ ایسا کیسے کرسکتے ہیں۔ یہ بیٹا ہے ہمارا۔" وہ پھر بولیں۔ جبکہ وہ خاموشی سے بت بنا کھڑا تھا۔

"فضیلت۔۔۔! تم بیچ میں مت آؤ۔" وہ غصے سے غرائے۔

"یہ دیکھیں۔ میں آپ کے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ میرے ساتھ ایسے مت کریں۔ یہ میرا اکلوتا بیٹا ہے۔ خدا کے لیے ایسا مت کریں۔" وہ ان کے آگے ہاتھ جوڑتے ہوئے بولیں۔

"تم یہاں کیا کر رہے ہو۔ دفع ہو جاؤ یہاں سے۔" انہوں نے کہتے ہوئے اسے پیچھے کی جانب دھکا دیا۔

"آپ کو اللہ کا واسطہ میرے ساتھ اتنا بڑا ظلم مت کریں۔ میں آپ کے پیر پکڑتی ہوں۔" کہتے ہوئے وہ ان کے آگے ہاتھ جوڑتی ان کے قدموں میں گر گئیں۔ شاہ میر نے حیرت سے اپنی ماں کو باپ کے قدموں میں گرے دیکھا۔

"تم دفع کیوں نہیں ہو رہے یہاں سے۔" وہ غصے میں اس کی جانب بڑھے اور اسے باہر کی جانب دھکیلنے لگے۔

"خدا کے لیے ایسا مت کریں۔" وہ ان کے ساتھ گھسٹتی چلی گئیں۔

"ارے ہٹو تم۔۔۔" انہوں نے اپنا پاؤں جھٹکا تو وہ ایک طرف گریں۔

"ماں۔۔۔!" وہ تڑپ کر ان کی طرف بڑھا اور انہیں سہارا دے کر اٹھایا اور انہیں اپنے گلے سے لگالیا۔

"نہیں شاہ میر! تم کہیں نہیں جارہے۔ تم کہیں نہیں جاؤ گے میں۔۔۔ میں تمہیں کہیں نہیں جانے دوں گی۔" وہ پھر سے رونے لگیں۔

اس نے اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے انہیں خود سے الگ کیا۔ ایک نظر خاموش کھڑے باقی سب کی طرف دیکھا۔

"اب جاؤ یہاں سے۔" تایا ابا نے آگے بڑھ کر باہر کی جانب دھکا دیا۔ دوسرے ہی پل میں وہ گھر سے باہر تھا۔

تایا ابا نے دروازے کی چوکھٹ پر بیٹھے شاہ میر پر ایک نفرت بھری نظر ڈالی اور پھر دروازہ بند کرلیا اور اسے لگا جیسے اس کی سانسیں رک گئیں۔

کتنی آسانی سے انہوں نے اسے اپنی زندگی سے بے دخل کردیا۔ کتنی آسانی سے خود سے الگ کردیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اسی وقت اس کے موبائل کی بیل بجی۔ اس نے آنسو پونچھتے ہوئے فون جیب سے نکالا۔

"شبیر انکل کالنگ۔" اسکرین پر جگمگا رہا تھا۔ امید کی کرن نظر آئی۔ شاید وہ اس کی بات سن لیں۔ شاید وہ اس کا یقین کریں۔ اس نے یس کا بٹن دبا کر فون کان سے لگایا۔

"السلام علیکم! انکل۔"

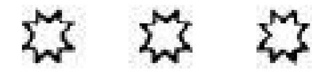
"شاہ میر! انیہ کہاں ہے؟" ان کا سوال سن کر اسے یہ امید بھی ٹوٹتی ہوئی نظر آئی۔

"شاہ میر! مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی۔ میں نے

تمہارا کیا بگاڑا تھا۔ کیوں کیا تم نے ایسا۔ بولو شاہ میر۔" وہ غصے سے بول رہے تھے۔

"شاہ میر! میں تمہیں اس کے لیے کبھی معاف نہیں کروں گا۔"

"جائیں جو کرنا ہے کرلیں۔ میں کسی سے نہیں ڈرتا اور ہاں۔۔۔ ہاں میں نے انیہ کو اغوا کیا۔ میں نے ہی سب کچھ کیا ہے۔ سب کچھ میرا ہی کیا دھرا ہے۔" کہتے ہوئے اس نے فون بند کر دیا۔ آخری امید بھی ٹوٹ گئی۔ وہ دوبارہ اٹھ کھڑا ہوا اور پھر سے چل پڑا۔ کہتے ہیں اگر تکلیف کی آخری حد پار ہو جائے۔ تو اثر ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے ساتھ بھی شاید ایسا ہی ہوا تھا۔ وہ خاموشی سے چلا جا رہا تھا کہ اچانک اسے اپنے پیچھے آہٹ محسوس ہوئی۔ اس سے پہلے کہ وہ مڑتا۔ کسی نے زوردار چیز اس کے سر پر ماری اور پھر۔۔۔ پھر وہ زمین پر بیٹھتا چلا گیا۔ سب کچھ دھندلا گیا تھا۔ اسے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ آہستہ آہستہ اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ آخر میں اسے جس کا خیال آیا وہ انیہ تھی۔



اس کی آنکھ ہسپتال میں کھلی۔ اس نے دھیرے سے آنکھیں کھولتے ہوئے اردگرد کا جائزہ لیا۔ اس کے پاس ولید بیٹھا مسکرا رہا تھا۔

"شکر ہے۔ تمہیں ہوش تو آیا۔ اب کیسا فیل کر رہے ہو۔" ولید نے پوچھا۔ اس نے دھیرے سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"میں یہاں کیسے پہنچا؟" کچھ سوچتے ہوئے وہ بولا۔

"ایک آدمی لے کر آیا تھا۔ اس نے بتایا کہ تم اسے سڑک پر پڑے ہوئے ملے ہو اور تمہارے سر سے خون بہہ رہا تھا۔ اس نے تمہیں ہسپتال پہنچا دیا اور میری ایمرجنسی میں ہی ڈیوٹی تھی۔

بھلا ہو اس آدمی کا اگر وہ تمہیں بروقت ہسپتال نہ پہنچاتا تو زیادہ خون بہنے کی وجہ سے تم کومے میں جا سکتے تھے۔ مگر اللہ کا شکر ہے کہ تم ٹھیک ہو۔" ولید نے کہا۔

تو وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"ارے شاہ میر! لیٹے رہو تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔" ولید نے کہا۔

"نہیں میں ٹھیک ہوں۔"

"شاہ میر! میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں پھر گھر چلیں گے۔" وہ باہر نکل گیا۔ تو شاہ میر اپنی سوچوں میں گم ہو گیا۔ اس کے سامنے دن کے سارے منظر آ رہے تھے۔ شبیر انکل کے گھر جانا' اس کے بعد پاپا کا فون آنا' تایا کی باتیں' پاپا کا رویہ' ماں کے آنسو اسے سب یاد آتا جا رہا تھا۔

اور پھر۔۔۔ پھر کیا ہوا تھا۔ شبیر انکل کی کال۔ اس کے بعد کسی نے اس کے سر پر کوئی چیز ماری تھی اور پھر وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔ مگر۔۔۔ مگر وہ شخص کون تھا؟

وہ سوچ رہا تھا۔ ایک دم اس کے دماغ میں جھماکا ہوا۔ فراز۔۔۔! ہاں۔۔۔ فراز۔۔۔ سے کسی بھی چیز کی توقع کی جا سکتی ہے۔ اس نے تلخی سے سوچا۔ اسی وقت ولید کمرے میں آیا۔

"چلو۔" اس نے اس کے پاس آکر کہا۔ وہ ایک دم اپنے خیالوں سے باہر آیا۔ "اوں۔۔۔ ہاں۔۔۔ چلو۔" اس نے کہا۔

"شاہ میر۔۔۔! ایک بات پوچھوں۔" ولید اسے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

"ہاں پوچھو۔"

"تمہیں کیا ہوا تھا۔ جو تم اس طرح سڑک پر پڑے تھے۔" اس نے پوچھا تو شاہ میر نے ایک گہرا سانس لے کر اسے ساری بات بتا دی۔ سوائے خان ہاؤس (حویلی) میں ہوئے جھگڑے کے۔

"یہ سب کیا کس نے تھا؟" ساری بات سننے کے بعد وہ بولا۔

"مجھے نہیں پتا کہ یہ سب کس نے کیا۔" اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"کون ہو سکتا ہے۔" ولید سوچ میں پڑ گیا۔

"چھوڑو ان باتوں کو' خوشی کی بات یہ ہے کہ میں بالکل ٹھیک ہوں۔" شاہ میر نے کہا۔

وہ نہیں چاہتا تھا کہ ولید اس کے معاملے میں زیادہ پڑے۔ اس سے اسے بھی نقصان پہنچ سکتا تھا۔ وہاں سے واپس آتے ہوئے اس نے فیصلہ کرلیا کہ وہ یہاں سے بہت دور چلا جائے گا۔

گھر پہنچ کر سب سے پہلے اس کا سامنا حنا سے ہوا۔ وہ افسوس سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"ابھی کل صبح کی بات ہے' تم کہہ کر گئے تھے میں شام تک آجاؤں گا۔ شام تک گھر آنے کے بجائے ہسپتال پہنچ گئے اور اب یہ ماتھا سجا کر آگئے ہو' شاباش ہے لڑکے۔" وہ بولی تو وہ اس کی بات پر مسکرا دیا اور سامنے صوفے پر آکر بیٹھ گیا۔

"اب بتاؤ' کیا کھاؤ گے۔" اس نے پوچھا۔

"کچھ نہیں بھابھی! مجھے بھوک نہیں ہے۔" وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔

"ہیں یہ بھابھی کس کو بولا۔ دو سال ہو گئے ہیں ہماری شادی کو مگر تم نے کبھی مجھے بھابھی بلانے کا تکلف نہیں کیا۔ اب ایسا کیا ہو گیا جو تم تکلف میں پڑ رہے ہو۔ میں حنا ہی ٹھیک ہوں۔ میں تمہارے لیے جوس لے کر آتی ہوں۔ اگر نخرے دکھائے ناں تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہو گا۔" وہ کہتے ہوئے کچن کی جانب بڑھی۔

"ویسے بیوی! تم سے برا ہے بھی کوئی نہیں۔" ولید آہستگی سے بولا۔ مگر وہ سن چکی تھی۔

"آپ چپ رہیں تو بہتر ہے۔" وہ غصے سے کہتی کچن کی جانب بڑھ گئی۔

تھوڑی دیر بعد ہی وہ اس کے لیے جوس لے آئی اس نے بنا چوں چراں کیے جوس پی لیا۔

"حنا! انیہ کیسی ہے۔" شاہ میر نے پوچھا' اس کی بات پر ولید نے حنا کو اور حنا نے ولید کو دیکھا۔

"کیا ہوا! سب ٹھیک تو ہے ناں۔" وہ پریشان ہوا۔

"شاہ میر! ایکچوئلی.... وہ۔" وہ گڑبڑائی۔

"دیکھو حنا! جو کہنا ہے' کھل کر کہو۔" وہ چونکا۔

"شاہ میر.... ! وہ بہت ڈپریسڈ ہے۔ میرا مطلب ہے' وہ اچھا محسوس نہیں کر رہی مگر تم پریشان نہ ہو' سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"کوئی سیریس بات تو نہیں ہے۔" وہ اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔

"شاید نہیں...." وہ مایوسی سے بولی۔ وہ اٹھا اور اس کے کمرے کی جانب بڑھا۔ کمرے میں اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ اس نے لائٹ آن کی۔ بیڈ خالی تھا۔ اس نے کمرے میں چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ وہ ایک کونے میں دیوار سے ٹیک لگائے۔ گھٹنوں میں سر دیے بیٹھی تھی۔ اس نے پیچھے مڑ کر حنا اور ولید کو دیکھا جو دروازے کے پاس کھڑے تھے۔ اور پھر دوبارہ رخ موڑ کر انیہ کی جانب متوجہ ہوا۔ وہ ابھی بھی اسی انداز میں بیٹھی تھی۔

وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا۔ اس کے پاس گھٹنوں کے بل بیٹھا اور آہستگی سے بولا۔

"انیہ...!" اس کی آواز پر اس نے دھیرے سے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

اس کی آنکھوں کے گرد گہرے حلقے پڑے ہوئے تھے۔

"انیہ.... ! میں.... میں۔" اس نے اس کے بال پیچھے کرنے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا ہی تھا کہ وہ بولی۔

"میرے قریب مت آؤ۔" وہ اسے اپنے سے دور کرتے ہوئے بولی۔

"انیہ! میں۔"

"میں کہتی ہوں' چلے جاؤ یہاں سے۔ چلے جاؤ۔" وہ غصے سے بولی۔

وہ حیرانی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ کیا کچھ نہیں تھا اس کی آنکھوں میں۔ خوف.... ڈر' بے بسی' وہ خاموشی سے وہاں سے اٹھ کھڑا ہوا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ حنا اور ولید بھی اس کے پیچھے چلے آئے۔ وہ صوفے پر آ کر بیٹھ گیا۔ اور اپنا سر ہاتھوں میں گرا لیا۔

"حنا! اسے کیا ہو گیا؟ وہ کیوں ایسے ری ایکٹ کر رہی ہے؟" کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں نمی در آئی۔

"شاہ میر.... ! پلیز سنبھالو خود کو' وہ بالکل ٹھیک ہے

اسے کچھ نہیں ہوا۔" اس کی آنکھوں میں نمی دیکھ کر وہ بولی۔

"تو پھر وہ ایسے بی ہیو کیوں کر رہی ہے۔"

"شاہ میر! پچھلے دو ماہ میں اس کے ساتھ جو بھی حادثات ہوئے ان کی وجہ سے وہ سنبھل نہیں پا رہی' اس لیے وہ ڈپریشن میں ہے' سر پر چوٹ کی وجہ سے وہ کافی باتیں بھول بھی چکی ہے۔ اسے تھوڑا وقت دو۔ وہ جلد ٹھیک ہو جائے گی۔" حنا اسے سمجھانے والے انداز میں بولی۔ اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

"اب جاؤ جا کر آرام کرو۔ تمہیں اس کی ضرورت ہے۔" اس نے کہا تو وہ خاموشی سے اٹھ کر اندر چلا گیا۔



"ہو گئی نیند پوری۔" ولید کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولا۔

"ہاں۔" اس نے جواب دیا۔

"شاہ میر! پرسوں رات تمہارے ساتھ کیا ہوا تھا۔" ولید کی بات پر اس نے چونک کر اسے دیکھا۔

"کیا ہوا تھا۔" وہ خود کو سنبھالتے ہوئے کندھے اچکا کر بولا۔

"یہی تو میں تم سے پوچھ رہا ہوں۔" اب کی بار وہ خاموش رہا۔

"افسوس ہو رہا ہے مجھے تم پر' مجھے اس قابل نہیں سمجھا تم نے۔" وہ افسوس سے اسے دیکھتے ہوئے بولا۔

"تمہیں کم از کم مجھے تو بتانا چاہیے تھا۔" جبکہ شاہ میر بیڈ کی چادر پر نظریں گاڑے خاموش بیٹھا تھا۔

"اب کچھ منہ سے پھوٹو گے بھی کہ نہیں۔" وہ اسے ڈپٹتے ہوئے بولا۔

اس کے کہنے پر شاہ میر نے اسے سب کچھ بتا دیا۔ ساری بات سن کر ولید کتنی دیر خاموش رہا۔ پھر بولا۔

"شاہ میر! تم بہت ہمت والے ہو۔ اگر خدانخواستہ میرے ساتھ۔" ولید نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا' وہ کچھ کہنا چاہتا تھا کہ اسی وقت حنا کی آواز آئی۔

"او ہو میں تو بھول ہی گیا۔ حنا نے کھانا لگا دیا ہے۔ جلدی سے فریش ہو کر نیچے آجاؤ۔ میں بھی نیچے جا رہا ہوں۔ یہ نہ ہو کہ وہ اوپر آجائے۔" اتنا کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا جبکہ شاہ میر واش روم کی جانب بڑھ گیا۔

"انیہ کیسی ہے۔" شاہ میر نے کھانا کھاتے ہوئے پوچھا۔ حنا نے ایک نظر ولید کو دیکھا اور پھر بولی۔

"ابھی تک ویسی ہی ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"شاہ میر! تمہارے پی اے کا فون آیا تھا۔ تم سو رہے تھے اس لیے میں نے ریسیو کر لیا۔" وہ اس وقت لاؤنج میں بیٹھا ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ جب ولید نے کہا تو وہ سیدھا ہوا۔

"کیا کہا اس نے؟"

"کچھ خاص نہیں' کہہ رہا تھا کہ تم سے بات کروا دوں مگر تم تو سو رہے تھے تو اس نے کہا' وہ بعد میں فون کرے گا۔" ولید نے تفصیل سے جواب دیا۔

شاہ میر نے فون اٹھایا اور اپنے پی۔ اے کو کال ملائی۔

"ہیلو! السلام علیکم انعام صاحب!" دوسری طرف سے فون اٹھاتے ہی شاہ میر نے کہا۔ اس کے بعد انہوں نے جو کچھ اسے بتایا۔ اس نے اسے شاکڈ کر دیا۔

"تو آپ نے آخری کسر بھی پوری کر ہی لی پاپا۔" وہ فون بند کرتے ہوئے بڑبڑایا۔

"شاہ میر! کیا ہوا۔" اسے یوں بیٹھے دیکھ کر بولا۔

"پاپا نے مجھے اپنی ساری جائیداد سے بے دخل کر دیا ہے اور صرف یہی نہیں میری ذاتی پراپرٹی سے بھی اپنے شیئرز واپس لے لیے ہیں۔" شاہ میر نے بتایا۔

"او مائی گاڈ! یہ تو بہت برا ہوا۔" ولید نے کہا۔

"وہ ایسا کیسے کر سکتے ہیں؟" وہ رندھی ہوئی آواز میں بولا۔ "میں بیٹا ہوں ان کا وہ اتنی آسانی سے مجھے خود سے الگ کیسے کر سکتے ہیں؟"

جبکہ ولید اسے دیکھ کر رہ گیا۔ اس کے علاوہ وہ اور کر بھی کیا سکتا تھا۔



"شبیر انکل بھی ایک دو دن میں آرہے ہیں۔" اس نے کہا۔

"تو اب کیا ہو گا؟" ولید اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے بولا۔

"ہونا کیا ہے۔ وہ آئیں گے۔ انیہ کے کیس کی دوبارہ انکوائری ہو گی۔ میرے خلاف پرچہ کٹے گا۔" وہ کندھے اچکا کر بولا۔

"تو پھر تم کیا کرو گے؟" ولید پریشانی سے بولا۔

"مجھے جو کرنا تھا' وہ میں کر چکا ہوں۔" وہ اطمینان سے بولا۔

"مطلب تم کیا کر چکے ہو؟"

"میں اگلے ہفتے تک یہاں سے چلا جاؤں گا۔" وہ آرام سے بولا۔

"کہاں؟" ولید حیران ہوا۔

"بہت دور۔" وہ بولا۔

"شاہ میر! دیکھو پہیلیاں مت بجھواؤ' مجھے بتاؤ تمہارے دماغ میں کیا چل رہا ہے۔ تم کہاں جا رہے ہو؟" ولید اب کی بار کچھ غصے سے بولا۔

"میں روس جا رہا ہوں۔" ولید کو شاک لگا۔

"کیا۔۔۔ کیا روس؟"

"ہاں۔ میں اور انیہ۔" وہ اطمینان سے بولا۔

"مجھے اندازہ تھا کہ شبیر انکل سب سے پہلے میرے خلاف پرچا کروائیں گے۔ اس لیے میں نے پہلے ہی اپنی فیکٹری بیچ کر اس سے ملنے والے پیسے اپنے اکاؤنٹ میں جمع کروائے اور جانے کی تیاری کی۔ ظاہر سی بات ہے میں اس ملک کے کسی بھی کونے میں چلا جاؤں وہ لوگ مجھے ڈھونڈ لیں گے۔ اس لیے میں نے ماسکو جانے کا فیصلہ کیا۔ اور انیہ۔۔۔ اسے میں اب کھونا نہیں چاہتا اور میں اس کا علاج وہاں کے کسی اچھے سائیکاٹرسٹ سے کرواؤں گا۔ مجھے امید ہے کہ ان شاء اللہ وہ جلد ٹھیک ہو جائے گی۔ پھر۔۔۔ پھر میں اسے اپنے بارے میں سب کچھ بتا دوں گا۔ اس کے بعد۔" ساری تفصیل اس کے گوش گزارتے ہوئے وہ ایک دم رک گیا۔

"اس کے بعد کیا۔۔۔ شاہ میر۔" ولید نے پوچھا۔

"اس کے بعد وہ فیصلہ کرے گی کہ اسے میرے ساتھ رہنا ہے یا۔۔۔ واپس جانا ہے۔" وہ کمزور لہجے میں بولا۔

"اور اگر اس نے کہا کہ اسے واپس جانا ہے تو تم کیا کرو گے شاہ میر۔؟ اتنی آسانی سے اسے جانے دو گے۔ جسے پانے کے لیے تم نے اپنا سب کچھ کھو دیا۔" ولید حیرت سے بولا۔

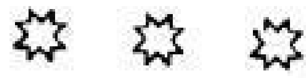
"ہوں۔۔۔ یہ بعد کی باتیں ہیں۔" وہ سنجیدگی سے بولا۔

"ایک بات پوچھوں شاہ میر۔"

"ہاں پوچھو۔" وہ اس کی طرف دوبارہ متوجہ ہوا۔

"تم نے مجھے یہ سب پہلے کیوں نہیں بتایا۔ کیا تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں تھا۔" وہ بولا۔

"نہیں ایسی بات نہیں ہے۔ میں نے تمہیں یہ سب اس لیے نہیں بتایا کیونکہ میں نہیں چاہتا تھا کہ تم میری وجہ سے کوئی تکلیف اٹھاؤ۔ اور اگر میں تمہیں بتا دیتا تو کیا تم مجھے جانے دیتے اور رہی بات اعتبار کی تو اگر مجھے تم پر اعتبار نہ ہوتا تو اب بھی نہ بتاتا۔" وہ مسکرا کر بولا۔



اس سب کے بعد اس نے کبھی خان ہاؤس (حویلی) جانے کی کوشش نہیں کی اور نہ ہی کبھی خان ہاؤس کے مکینوں کا دوبارہ ذکر کیا۔ پہلے پہل تو علیزے نے کریدنے کی کوشش کی مگر اس نے کچھ نہیں بتایا۔ وقت کا کام تھا گزرنا اور وہ گزر رہا تھا۔

ان دنوں مما کے بھائی دلاور کے چکر ان کے گھر کچھ زیادہ ہی لگ رہے تھے۔ دلاور مما (سعدیہ) کا چھوٹا بھائی تھا۔ شادی کے چھ ماہ بعد ہی اس کی بیوی کی ڈیتھ ہو گئی تھی۔ اسے مما کے تیور بھی عجیب لگ رہے تھے اور دلاور کا گھر آنا بھی کھٹک رہا تھا۔ شروع میں تو اس نے نظر انداز کیا مگر وہ اپنی حد سے بڑھتا جا رہا تھا۔ اس نے مما سے بات کی۔


MEDICAM
Dentist's Recommendation
10 PROBLEMS SOLUTION
TGP (Teeth Gum Protection) Advanced Formula with Fluoride
MEDICAM DENTAL CREAM
MEDICAM DENTAL CREAM
Active ingredients • Clove • Salt • Eucalyptus Oil • Spearmint • Sylobilanc
میڈی کیم ڈینٹل کریم جیسے ۔ ۔ دانتوں کی لائف ٹائم انشورنس۔

"تم میرے بھائی کی نیت پر شک کر رہی ہو۔" اس کی بات سن کر وہ بھڑک اٹھیں۔
"میں نے ایسا کب کہا۔" وہ اکتا کر بولی۔
"تو پھر تمہارے کہنے کا مطلب کیا ہے؟" وہ اسے چبھتی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولیں۔
"میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ مجھے ان کی حرکتیں بالکل پسند نہیں ہیں اور اگر انہوں نے دوبارہ میرے ساتھ کوئی بدتمیزی کی تو میں پاپا سے شکایت کر دوں گی۔" وہ بھی غصے سے ایک ایک لفظ چبا کر بولی۔ یہ پہلی دفعہ تھا جب اس نے مما سے اس طرح بات کی تھی۔ ورنہ وہ بہت آرام سے بات کرتی تھی۔ اس کے رویے نے سب کو حیران کر دیا تھا۔ وہ اب پہلے والی انیہ نہیں تھی بہت بدل چکی تھی۔

☆ ☆ ☆

"شاہ میر! انیہ کا دھیان رکھنا۔ تم جانتے ہو ناں۔ وہ ابھی ٹھیک نہیں ہے اور ہاں اس کے سامنے فی الحال تم اپنی شناخت چھپا کر رکھو۔" وہ اسے ہدایات دیتے ہوئے بولی۔
"وہ کیسے۔" وہ حیران ہوا۔
"میں بتاتی ہوں۔ آج سے تمہارا نام عمیر ہے۔" حنا کی بات سن کر وہ مزید حیران ہوا۔
"عمیر یہ کیسا نام دیا ہے۔" وہ ناک سکوڑ کر بولا۔
"بکو مت اور دھیان رہے، وہ تمہارے بارے میں کچھ نہیں جانتی اور اس کی نظروں میں ہم سب فراز کے آدمی ہیں۔" حنا نے کہا۔
"ڈاکٹر نے منع کیا ہے کہ اسے کسی بھی قسم کے اسٹریس یا شاک سے دور رکھا جائے۔" حنا نے کہا۔
"اور اگر اسے پتا چل گیا کہ تم ہی شاہ میر ہو۔ تو اسے شاک نہیں ہارٹ اٹیک آئے گا۔" وہ بولی۔
"خدا کا خوف کرو حنا! کیسی باتیں کر رہی ہو۔" وہ کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولا۔
"ارے تم لوگ کیا بحث کیے جا رہے ہو۔ فلائٹ کا ٹائم نکلا جا رہا ہے۔" اسی وقت ولید ٹی وی لاؤنج میں داخل ہوا۔
"ہاں، ہاں بس اب چلو! یہ تمہاری بیوی دماغ کھائے جا رہی ہے میرا۔" کہتے ہوئے وہ ولید کے ہمراہ باہر نکل گیا۔ جبکہ وہ اس کی پشت کو گھور کر رہ گئی۔

☆ ☆ ☆

وہاں پہنچتے ہی شاہ میر نے ولید کو فون کر کے اپنے پہنچنے کی اطلاع دے دی۔ وہ دونوں ایک فلیٹ میں تھے جو شاہ میر کے ایک دوست حیدر کا تھا۔
انہیں یہاں آئے مہینہ گزر گیا تھا اس نے ایک بہت اچھے سائیکاٹرسٹ سے انیہ کے سیشن کروائے۔ جس کی وجہ سے وہ کافی بہتر ہو گئی تھی۔
انیہ کی حالت سنبھلتے دیکھ کر اس کی توجہ کام کی جانب ہو گئی تھی۔
اس کی آنکھ صبح نو بجے کے قریب کھلی۔ وہ جلدی سے تیار ہو کر لاؤنج میں آ گیا۔ سامنے ہی انیتا (میڈ) ناشتے کی تیاری کر رہی تھی۔ جبکہ انیہ وہیں اس کے قریب گم صم بیٹھی تھی۔
وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا آگے بڑھا اور کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔
"کیسی ہو؟" وہ اب اس سے پوچھ رہا تھا۔
"ٹھیک ہوں۔" وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔
"تمہارے چہرے سے تو نہیں لگ رہا۔" وہ اسے بولنے پر اکسا رہا تھا۔
"کیوں انسان کی شکل پر لکھا ہوتا ہے کہ وہ ٹھیک ہے کہ نہیں اور ویسے بھی اس سے تمہیں کیا فرق پڑتا ہے کہ میں جیوں یا مروں۔" وہ چیخ کر بولی اور پیر پٹختی اپنے کمرے میں چلی گئی۔
اس نے بے دلی سے ناشتہ کیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔
"اسے ناشتہ کروا دینا۔" اسے ہدایت دے کر وہ باہر نکل آیا۔ باہر کافی سردی تھی۔ برف باری ہو رہی تھی۔
حیدر اس کا یونیورسٹی فرینڈ تھا۔ امریکہ میں دونوں نے ایک ساتھ پڑھائی کی تھی۔ اپنے پاپا کی ڈیتھ کے بعد اس نے اپنے پاپا کا لیدر گارمنٹس کا کاروبار سنبھال

لیا جو کئی ملکوں میں پھیلا ہوا تھا۔ شاہ میر اس کی فیکٹری میں منیجر کی پوسٹ پر تھا۔ وہ یہ کام سیکھنا چاہتا تھا۔

انیہ آہستہ آہستہ کافی بہتر ہو گئی تھی اور شاید نارمل بھی ہو رہی تھی۔ مگر کبھی کبھی وہ چڑ جاتی اور اسے خوب تنگ کرتی اکثر وہ خود کو اس کے آگے بے بس محسوس کرتا۔

انہیں یہاں آئے کافی عرصہ ہو چکا تھا۔ شاہ میر اس وقت گھر پر نہیں تھا اور۔۔۔ انیتا اپنا کام ختم کرنے کے بعد سامنے صوفے پر سو رہی تھی۔ اس نے آہستگی سے اس کے پاس رکھا فون اٹھایا اور اسے کمرے میں لے آئی اس نے نمبر یاد کرنے کی کوشش کی پھر کانپتے ہاتھوں سے نمبر ڈائل کیا اور فون کان سے لگایا دوسری طرف بیل جا رہی تھی مگر کوئی فون نہیں اٹھا رہا تھا۔ اس نے فون کان سے ہٹا کر کال ڈس کنیکٹ کی اور کچھ سوچتے ہوئے پاپا کا نمبر ڈائل کیا۔

مگر اسے سخت مایوسی کا سامنا کرنا پڑا کہ ان کا نمبر بند ہے اور گھر والے نمبر پر کوئی کال ریسیو نہیں کر رہا۔ اسی وقت اسے انیتا کی آواز آئی شاید وہ جاگ گئی تھی۔ اس نے گھبرا کر جلدی سے فون کچن میں جا کر رکھ دیا۔

✡ ✡ ✡

وہ جب اس کے کمرے میں داخل ہوا تو ارسلان پریشانی سے۔۔۔ اِدھر۔۔۔ اُدھر چکر کاٹ رہا تھا۔ "کیا ہوا ارسلان کچھ تو بولو۔" اس نے اسے دیکھ کر پوچھا۔

"آئی ایم فنشڈ شاہ میر! آئی ایم فنشڈ (میں ختم ہو گیا شاہ میر! ختم)" کہتے ہوئے وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

"ارسلان پلیز، مجھے بتاؤ کیا ہوا؟" اسے یوں دیکھ کر وہ پھر بولا۔

"میرے روسی پارٹنر نوف نے مجھے دھوکا دیا ہے۔ اس نے مجھے لیدر جیکٹس کا ایک بڑا آرڈر دیا۔ اور کہا کہ اس کی مارکیٹ میں بہت زیادہ ڈیمانڈ ہے اور یہ بھی کہ میٹریل وہ دے گا اور میٹریل کی ڈبل رقم وصول کرے گا اور جیکٹس کی فروخت میں اس کا کوئی حصہ نہیں ہو گا۔ اس نے میٹریل کی رقم مجھ سے پہلے وصول کی اور آہستہ آہستہ اپنے شیئرز بھی۔۔۔ مگر جب جیکٹس تیار کر کے میں نے مارکیٹس کے بندوں سے اس کی ڈیلنگ کی تو پتا چلا کہ اس کی مارکیٹ ویلیو زیرو ہے۔"

کہتے ہوئے وہ پھر سے سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ "یہ تو بالکل بھی اچھا نہیں ہوا۔" شاہ میر افسوس سے بولا۔

"ارسلان! اگر روس میں اس کی ڈیمانڈ زیرو ہے تو پھر کون سا ملک ہے جو اس کی ڈیمانڈ کرے گا۔"

"جرمنی، امریکا اور شاید ایران۔۔۔ اوہ مائی گاڈ یہ خیال مجھے کیوں نہیں آیا۔" وہ مسکرایا۔

"مگر اس کے لیے انویسٹر کی ضرورت ہے۔" ارسلان نے کہا۔ تو شاہ میر نے اپنی جیب سے کیش بک نکالی۔

"کتنا چاہیے؟" اس کی بات پر ارسلان نے حیرانی سے اسے دیکھا۔

"شاہ میر!" وہ تشکر بھری نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ جبکہ شاہ میر مسکرا رہا تھا۔

"اب یونہی دیکھتا رہے گا۔ یا کچھ منہ سے پھوٹے گا بھی۔" اسے یونہی سکتے میں دیکھ کر شاہ میر نے کہا۔ تو وہ مسکرا دیا۔

شاہ میر کے ان ممالک میں اچھے تعلقات تھے۔ وہاں کے معروف بزنس مین اس سے واقف تھے۔ سو اس معاملے میں کوئی پریشانی نہیں ہوئی اور ارسلان ایک بڑے نقصان سے بچ گیا۔ اس کے بعد شاہ میر اس کی کمپنی میں 40٪ کا حصہ دار ہو گیا۔ اس سے اس کے آگے بڑھنے کے چانسز زیادہ ہو گئے۔

انیہ کے مزاج میں بھی کچھ ٹھہراؤ سا پیدا ہو گیا تھا۔ شاید وہ سمجھوتا کر چکی تھی۔ انہیں یہاں آئے چھ ماہ ہو گئے تھے۔ صبح جب انیہ سو رہی ہوتی تو شاہ میر کام پر چلا جاتا اور رات گئے لوٹتا۔ انیہ کو اس کی مصروفیات کے بارے میں بالکل بھی اندازہ نہیں تھا اور نہ ہی اسے اس میں کوئی دلچسپی تھی۔

رات میں وہ ٹی۔ وی لاؤنج میں بیٹھا ٹی۔ وی دیکھ رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد انیہ بھی وہاں آ گئی۔ اس کے ہاتھ

میں دو کافی کے مگ تھے۔ اس نے ایک مگ اس کی جانب بڑھایا۔ اس نے اپنی حیرت کو چھپاتے ہوئے خاموشی سے مگ لے لیا۔

"شاہ میر کو بھی انگلش فلمیں پسند تھیں۔" اس نے سوچا' کبھی کبھی اسے اس شخص میں شاہ میر کی شباہت نظر آتی تھی اور اس کے سامنے والے صوفے پر آکر بیٹھ گئی۔

"کیسے ہو۔" اس کے جملے نے اسے مزید حیران کر دیا۔

"ٹھیک۔" اس نے جواب دیا۔

"ہوں۔" پھر وہ کچھ نہ بولی اور سامنے ٹی وی دیکھنے لگی۔

"تم مجھے کب آزاد کرو گے؟" تقریباً" پانچ منٹ بعد اس کی آواز لاؤنج میں گونجی۔ اس نے ٹی وی سے نظر ہٹا کر اسے دیکھا۔

"فی الحال تو اس بات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" اس نے کہا۔

"تم نے آخر مجھے قید کر کے کیوں رکھا ہے؟" وہ پھر سے بولی۔

"یہ میں نہیں بتا سکتا۔"

"مگر مجھے جواب چاہیے۔" وہ غصے سے بولی۔

"آخر کیوں تم نے میری زندگی اجیرن کی ہوئی ہے۔" کہتے ہوئے وہ رونے لگی۔ "مجھے اپنے گھر جانا ہے۔"

"میں نہیں بھیج سکتا۔" شاہ میر نے کہا۔

"مگر کیوں۔" وہ بولی۔

"کیونکہ فراز یہ نہیں چاہتا جب تک زرگل کی شادی نہیں ہو جاتی۔" اس کے ذہن میں جو آیا' اس نے بول دیا۔

"زرگل' فراز کی بہن مگر اس کی شادی سے میرا کیا تعلق ہے۔" وہ چونکی۔

"تعلق ہے بہت گہرا تعلق ہے۔ اس کی شادی سے نہیں مگر شاہ میر سے تو ہے۔" اس کے جو منہ میں آیا اس نے کہہ دیا۔

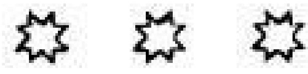
"شاہ میر... شاہ میر سے تعلق۔ نہیں' میرا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔" وہ اٹک کر بولی۔

"مگر وہ تو تم سے محبت کرتا ہے۔ اس لیے اس نے زرگل کو ٹھکرا دیا اور یہی بات فراز کو ہضم نہیں ہوئی۔ شاید اس لیے اس نے تمہارے ساتھ ایسا کیا۔" اس حوالے سے شاہ میر کے بھی کچھ ایسے ہی خیالات تھے۔

"ارے بھاڑ میں جائے شاہ میر' یہ سب اس کی وجہ سے ہوا ہے۔ وہ شادی کیوں نہیں کر لیتا زرگل سے۔" وہ غصے سے بولی۔

"مگر وہ تم سے محبت کرتا ہے۔" وہ بے اختیار بولا۔ تو وہ خاموش رہی۔

"کیا تم اس سے محبت نہیں کرتیں؟" اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔



اتوار کا دن تھا۔ آج وہ فارغ تھا۔ صبح دیر سے اٹھنے کے بعد اس نے بھرپور ناشتہ کیا اور اخبار لے کر بیٹھ گیا۔ اسی وقت انیہ اس کے پاس آئی۔

"عمیر! میں چھ ماہ سے اس چار دیواری میں بند ہوں۔ میرا دم گھٹ رہا ہے' پلیز تھوڑی دیر کے لیے مجھے باہر لے چلو۔" وہ ملتجی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔ وہ کتنی دیر تک اسے دیکھتا رہا پھر بولا۔

"تم تیار ہو جاؤ۔ میں باہر تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔"

تھوڑی دیر بعد ہی وہ تیار ہو کر آ گئی اور اس کے ہمراہ چل پڑی۔ باہر کافی ٹھنڈ تھی۔

روس کا صدیوں پرانا تاریخی و ثقافتی مرکز اس کی عظمتوں کا لینڈ مارک اس کے تعمیراتی حسن کا نمائندہ ریڈ اسکوائر ان کے سامنے تھا۔ وہ دونوں اسٹیشن کی عمارت میں داخل ہوئے۔ کاؤنٹر پر جا کر اس نے دو کارڈ لیے۔ اور انہیں خودکار گزرگاہ کی مشینوں سے مس کیا ٹھک کی آواز گونجی وہ زمین کے اندر والے حصے پر پہنچے انڈر گراؤنڈ دنیا نے اپنی خوب صورتی اور

کشادگی سے حیران کر دیا۔ دائیں بائیں بکھری ریل کی پٹریاں اور اس پر بکھرا آسمان جسے حیرت سے دیکھتے ہوئے بے اختیار رانیہ کے منہ سے نکلا۔ "واؤ۔"

کیا یہ تعمیر کا کوئی طلسم تھا یا رنگ و روغن کا کمال جیسے صحرا میں چمکتی ریت دریا کا گمان دے۔

غار کے ایک دہانے سے چھک چھک کرتی کئی رنگوں کی گاڑیاں گزر گئیں۔

وہ اسٹیشن سے باہر آ گئے۔ زیر زمین دنیا سے باہر آسمان نکھرا ہوا تھا۔ دھوپ روشن تھی۔ سڑکوں کی کشادگی، پختگی، سیاہی اور اطراف میں کھڑی بلند و بالا عمارتوں کا رعب و دبدبہ متاثر کرتا تھا۔

زیر زمین ایک اور راستے سے وہ اسے الیگزینڈر گارڈن کے وسطی حصے میں لے آیا۔ جہاں ریڈ اسکوائر تھا۔ باغ کی ہریالی اور تازگی نے اسے بہت متاثر کیا۔ سامنے کریملن کی سرخ دیوار دور تک جاتی نظر آ رہی تھی۔ گھاس کی خوب صورت ڈھلوانی بیلٹ کے آگے کریملن کی دیوار نے جیسے اسے مسحور کر دیا۔

"یہ سب کتنا خوب صورت ہے۔" انیہ کے منہ سے نکلا۔

"ہاں ہے تو..." وہ بولا۔

"ماسکو کے تاریخی ورثوں، اس کی خوب صورتی اور دنیا کے بڑے شہروں میں اس کا شمار ہونے کی وجہ سے اسے بالعموم تیسرا روم کہا جاتا ہے۔ روم، استنبول، لزبن اور ٹوکیو کی طرح یہ بھی پہاڑیوں میں آباد ہے اور وہ بھی سات پر۔" شاہ میر نے بتایا۔

آج اس نے اسے بہت سیر کروائی۔ ریڈ اسکوائر، سینٹ بارسل، دیوار کریملن اور لینن کا مقبرہ وہ تھک کر الیگزینڈر گارڈن کے ایک خالی حصے میں آ کر بیٹھ گئے۔ شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے اور وہ صبح بارہ بجے سے یہاں تھے۔

"مزا آیا؟" شاہ میر نے پوچھا۔

"بہت، بہت زیادہ۔" وہ پرجوش انداز میں بولی۔

"چلیں۔" شاہ میر نے کہا۔

"نہیں مجھ میں اب مزید چلنے کی ہمت نہیں ہے۔"

وہ بیزاری سے بولی۔

"کچھ کھاؤ گی؟" اس نے پوچھا۔

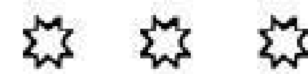
"ہاں۔" اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ "ٹھیک ہے پھر چلو یہاں کچھ ہی فاصلے پر ریسٹورنٹ ہے وہاں سے بھی میل کھاتے ہیں۔" شاہ میر اٹھ کھڑا ہوا تو وہ بھی اس کے ہمراہ چل پڑی۔ کھانا آرڈر کرتے ہوئے انیہ نے ویٹر سے کہا۔

"دو چاکلیٹ شیک۔"

"نو او نلی ون چاکلیٹ شیک۔" وہ فوراً بولا تو انیہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"تمہیں چاکلیٹ شیک نہیں پسند۔"

"نہیں مجھے چاکلیٹ بالکل پسند نہیں ہے۔" اس نے کہا تو انیہ چونکی۔ "شاہ میر کو بھی چاکلیٹ نہیں پسند تھی۔" اس کے اندر سے آواز آئی۔ اس نے عمیر کو دیکھا جو بڑی دلچسپی سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔



ان دنوں وہ بہت خوش تھا۔ اپنی محنت کے بل بوتے پر وہ پھر سے اپنا مقام بنانے میں کامیاب رہا۔ زندگی کے اس نازک موڑ پر اسے ماں باپ کی کمی بہت محسوس ہوئی۔ اس سب میں حیدر نے اس کا بہت ساتھ دیا۔ بہت جلد اس نے وہاں قدم جما لیے۔ وہ حیدر کے فلیٹ سے ایک گھر میں شفٹ ہو گیا تھا مگر اسے امید تھی کہ وہ بہت جلد اپنا گھر بھی بنا لے گا۔ مگر یہاں نہیں پاکستان۔

آج پھر انیتا کا موبائل اس کے ہاتھ لگ گیا۔ وہ موبائل لے کر کمرے میں آئی اور جلدی جلدی پاپا کا نمبر ڈائل کیا۔ ان کی سم بند تھی۔ اس نے گھر کے نمبر پر فون کیا۔ تیسری بیل پر فون اٹھا لیا گیا۔

"ہیلو!" یہ مما کی آواز تھی۔

"ہیلو!" وہ دوبارہ بولیں۔ مگر وہ خاموش رہی۔

"ہیلو مما! میں... میں انیہ بات کر رہی ہوں۔" اس نے اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ دوسری طرف خاموشی چھائی رہی۔ پھر بولیں۔

"تم۔۔۔ اب کیوں فون کیا ہے تم نے۔۔۔ سارے زمانے میں ہماری بے عزتی کروا کر دل نہیں بھرا تمہارا۔ خبردار جو آئندہ یہاں فون کیا۔ تو۔۔۔"

"مم! میری بات۔۔۔" اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ انہوں نے ٹھک سے فون بند کر دیا۔ وہ کتنی دیر فون دیکھتی رہی۔ اور پھر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

پچھلے کچھ ماہ سے وہ عمیر سے اسی لیے طریقے سے بات کر رہی تھی کہ کوئی موقع ہاتھ آئے اور وہ پاپا یا علیزے سے رابطہ کر سکے۔ اور عمیر سے اپنا پاسپورٹ حاصل کر سکے۔ مگر مما کی باتوں نے اس کی امیدوں پر پانی پھیر دیا۔

اس کے بعد اس نے کبھی دوبارہ فون کرنے کی کوشش نہ کی۔ وہ ان حالات سے سمجھوتا کر چکی تھی۔ اور عمیر کی عادی ہوتی جا رہی تھی۔ ایک دن اس نے اس کے لیے رات کا کھانا بنایا بریانی، فش کٹلس، رشین سلاد اور گاجر کا حلوہ اس کے آنے پر اس نے کھانا ٹیبل پر لگایا۔ اس نے باری باری ہر چیز چکھی مگر جیسے ہی اس کی نظر گاجر کے حلوے پر پڑی تو بولا۔

"اوہ گاجر کا حلوہ۔ مجھے بہت پسند ہے۔" وہ بہت شوق سے کھانے لگا۔

"عمیر! یہ فش کٹلس بھی لو ناں۔" انیہ نے اسے فش کٹلس کی جانب متوجہ کیا۔

"نہیں میں صرف یہی لوں گا۔ مجھے گاجر کا حلوہ بہت پسند ہے۔" اس نے کہا وہ چونکی۔ گاجر کا حلوہ تو شاہ میر کو بھی پسند ہے۔ اوں ہوں میں کیوں ہر بات پر شاہ میر اور عمیر کا موازنہ کرنے بیٹھ جاتی ہوں۔ میں کیوں بھول جاتی ہوں کہ میری منزل ان دونوں میں سے کوئی بھی نہیں ہے۔ سوچتے ہوئے اس نے سر جھٹکا اور کھانے کی جانب متوجہ ہوئی۔

☼ ☼ ☼

"انیہ! تمہارے لیے ایک اچھی خبر ہے۔" وہ ٹی وی لاؤنج میں بیٹھی ٹی۔ وی دیکھ رہی تھی۔ جب شاہ میر چلا آیا۔ اس نے رخ موڑ کر سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"کیا۔"

"تم پاکستان واپس جا رہی ہو۔" اس نے بتایا۔ پتا نہیں اس کی آنکھوں میں ایسا کیا تھا کہ وہ ٹھیک سے مسکرا بھی نہ سکی۔

"کب؟" اس نے پوچھا۔

"بس کچھ دنوں تک۔"

"تمہارے باس کا کام ہو گیا۔" اس نے کہا تو شاہ میر پہلے چونکا پھر سنبھل کر بولا۔

"ہوں۔۔۔ ہاں۔"

"تو شاہ میر نے شادی کر لی۔" وہ ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولی۔ وہ اسے دیکھ کر رہ گیا۔ کچھ کہہ نہیں سکا۔

"ہوں۔ اس کی شادی کے چکر میں میری زندگی برباد ہو گئی۔" اس نے بمشکل اپنے آنسو روکے اور تقریباً بھاگتے ہوئے اپنے کمرے میں چلی گئی۔

☼ ☼ ☼

"تم نے ایسا کیوں کیا شاہ میر!" وہ اپنے آفس میں تھا اور حنا سے اسکائپ پر بات کر رہا تھا۔

"مجھے جو ٹھیک لگا، وہ میں نے کیا۔ میں اب اسے مزید دھوکا نہیں دے سکتا۔ میں آج گھر جاؤں گا اور اسے سب کچھ سچ سچ بتا دوں گا۔"

"اگر وہ حقیقت کو قبول کر لیتی ہے تو ٹھیک ہے، نہیں تو اس کی مرضی۔" وہ بولا۔

"شاہ میر! تم ایسا کیسے کر سکتے ہو۔ وہ محبت ہے تمہاری۔ تم اتنی آسانی سے اسے جانے دو گے۔ جسے پانے کے لیے تم نے اپنا سب کچھ کھو دیا۔۔۔"

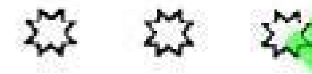
"تو اور کیا کروں میں حنا۔ ساری عمر اسے دھوکے میں رکھوں صرف اس لیے کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں؟ اس سب میں اس کا کیا قصور ہے۔ اسے کس چیز کی سزا مل رہی ہے۔" وہ اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔

"تو پچھلے پانچ ماہ سے تم کیا کر رہے ہو؟ کیوں نہیں بتایا اسے سب کچھ۔" حنا بھی غصے سے بولی۔

"شاہ میر تم پہلے بھی غلط تھے۔ اور اب بھی غلط ہو۔ تم نے کبھی سوچا ہے کہ روس جیسے آزاد ملک میں اس نے بھاگنے کی کوشش کیوں نہیں کی۔

تم جانتے ہو اس نے ان پانچ ماہ میں ایسی کوئی حرکت کیوں نہیں کی۔ کیونکہ وہ تم سے متاثر تھی۔ وہ تمہاری طرف کھنچی چلی آتی ہے' یہ جانے بنا کہ تم ہی وہ شخص ہو جس سے وہ محبت کرتی ہے۔۔۔" حنا بولتی چلی گئی۔

"مجھے ایک ضروری کام یاد آگیا ہے۔ بعد میں بات کرتے ہیں۔" اتنا کہہ کر اسے بولنے کا موقع دیے بغیر اس نے لیپ ٹاپ بند کر دیا۔



"انیہ۔۔۔! میں آج تمہاری ٹکٹس کنفرم کروادوں گا اور ہاں یہ رکھ لو آج مارکیٹ چلی جانا۔ میں نے ڈرائیور سے کہہ دیا ہے۔ وہ تمہیں لے جائے گا۔" کہتے ہوئے شاہ میر نے اس کے ہاتھوں میں پیسے تھمائے۔

"مجھے اس کی ضرورت نہیں۔" وہ بولی تو اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

"دو تین دن میں تم پاکستان چلی جاؤ گی کیا ماسکو کی یادوں کو نہیں سمیٹو گی۔" شاہ میر نے کہا تو وہ کتنی دیر اس شخص کا چہرہ دیکھتی رہی۔ بے اختیار اس کا دل چاہا کہ کہہ دے مجھے کہیں نہیں جانا۔۔۔

وہ جا چکا تھا۔ وہ بھی ڈرائیور کے ساتھ ریڈ اسکوائر آ گئی۔ اور کافی دیر ادھر ادھر گھومتی رہی کہ اس کی نظر سامنے دکان پر پڑی۔ کچھ سوچتے ہوئے وہ وہیں چلی آئی۔

اس نے وہاں سے عمیر کے لیے بلیو کلر کی شرٹ لی۔ وہ جانتی تھی کہ اسے بلیو کلر بہت پسند ہے۔ اس نے اس کے لیے کافی چیزیں لیں وہ چاہتی تھی کہ وہ اسے کبھی نہ بھولے۔ پے منٹ کے بعد وہ جیسے ہی دروازہ کھول کر شاپ سے باہر نکلی سامنے سے آنے والی لڑکی سے ٹکرا گئی۔ اس کے ہاتھوں سے شاپنگ بیگز گرے۔ "اوہ آئی ایم سوری۔" وہ لڑکی بھی نیچے بیٹھ کر اس کی ہیلپ کرنے لگی۔

"اٹس اوکے۔"

انیہ نے کہا اور اس کی طرف دیکھے بغیر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"انیہ۔۔۔" اپنا نام سن کر وہ چونکی۔ اس نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔



وہ اپنے آفس میں بیٹھا انیہ کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ حنا ٹھیک کہتی ہے کم از کم مجھے ایک بار تو کوشش کرنی چاہیے۔ میں اسے اتنی آسانی سے کیسے جانے دے سکتا ہوں۔ کیا میں اس کے بغیر رہ پاؤں گا۔ محبت کرتا ہوں میں اس سے۔ میں آج اس سے بات ضرور کروں گا پھر جو ہو گا دیکھا جائے گا۔

گھر میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ وہ گاڑی پورچ میں کھڑی کر کے داخلی دروازے سے اندر داخل ہوا۔ ٹی وی لاؤنج میں داخل ہوتے ہوئے۔ اس نے لائٹ آن کی۔ ٹی وی لاؤنج روشنی میں نہا گیا۔ تب ہی اس کی نظر صوفے پر بیٹھی انیہ پر پڑی وہ منہ ہاتھوں میں چھپائے بیٹھی تھی۔ اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

"اوہ۔۔۔ میں تو ڈر ہی گیا تھا۔" اسے اس طرح بیٹھے دیکھ کر وہ چونکا۔

"ہوں۔ تو کیسا رہا آج کا دن۔" وہ اس کے سامنے والے صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"بہت اچھا شاہ میر۔" وہ سر اٹھا کر بولی۔ اس کا چہرہ سرخ تھا۔ آنکھیں بھی سوجی ہوئی تھیں اور ناک بھی لال تھی۔ وہ چونکا اس کا چہرہ دیکھ کر اور نہ ہی اس کی لفظوں میں گھلی کڑواہٹ محسوس کر کے بلکہ۔۔۔ اس کے منہ سے اپنا نام سن کر۔ وہ کتنی دیر حیرت سے اسے دیکھتا رہا۔

"چپ کیوں ہو گئے شاہ میر۔۔۔" وہ نفرت سے اسے

دیکھتے ہوئے بولی۔ جبکہ اس کی سمجھ میں ہی نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے۔

"یہ کیا بولے گا اب... اس کا بھانڈا تو پھوٹ چکا ہے۔" ایک اور آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

"زرگل۔" اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"ہاں۔ شاہ میر! زرگل بقول انیہ کے تم سے میری شادی ہو رہی ہے۔" وہ طنزیہ انداز میں بولی۔

"تمہیں پتا ہے شاہ میر! جس دن بابا اور چاچو نے تم پر انیہ کی کڈنیپنگ (اغوا) کا الزام لگایا تھا ناں۔ اس دن مجھے لگا کہ شاید تم سچ کہہ رہے ہو۔ انیہ کی کڈنیپنگ کے پیچھے تمہارا کوئی ہاتھ نہیں ہو گا۔ مگر نہیں شاہ میر! میں غلط تھی۔ وہ تم ہی تھے جس نے انیہ کی کڈنیپنگ کروائی اور سارا الزام میرے بھائی پر لگانے کی کوشش کی۔ انیہ کو یقین دلانے میں کامیاب بھی ہو گئے کہ سب کچھ فراز نے کیا ہے اور اسے یہاں لے آئے۔ تاکہ اسے حقیقت کا پتا نہ چل سکے۔ تم جیسا شخص چاہے جانے کے قابل ہی نہیں۔"

وہ ایک ایک لفظ نہایت غصے اور حقارت سے بول رہی تھی۔ اور وہ ایک دفعہ پھر خاموش تھا۔ اس کے پاس اپنی صفائی میں کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ اس نے انیہ کی طرف دیکھا۔ وہ رو رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں اس کے لیے نفرت تھی۔ اس نے نظر جھکالی۔ انیہ نے اس کی طرف دیکھا۔

"نہیں، مجھے چاکلیٹ بالکل پسند نہیں ہے۔"

آنسو لڑیوں کی صورت میں اس کے چہرے پر پھسل رہے تھے۔

"واؤ گاجر کا حلوہ مجھے بہت پسند ہے۔"

"بلیو کلر تو میرا فیورٹ ہے۔" وہ آہستہ آہستہ پیچھے ہٹ رہی تھی اور پھر بھاگتے ہوئے باہر چلی گئی۔

اسے جاتے دیکھ کر وہ اس کی جانب لپکا۔ وہ اسے اتنی آسانی سے کیسے جانے دے سکتا تھا اور زرگل تماشائی بنی انہیں دیکھ رہی تھی۔ الیگزینڈر گارڈن گھر کے قریب تھا۔ اسے یقین تھا وہ وہیں ہو گی۔

وہ اس وقت الیگزینڈر گارڈن کے ایک کونے میں بیٹھی تھی۔ یہ وہی جگہ تھی۔ جہاں پہلی مرتبہ وہ شاہ میر کے ساتھ آئی تھی۔ وہ زور و شور سے رونے لگی۔

آہٹ پر وہ چونکی نہیں۔ وہ جانتی تھی کہ وہ کون تھا۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ چھوٹے قدم اٹھاتا اس کے سامنے آکر گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔

"میں تمہیں کوئی صفائی پیش نہیں کروں گا۔ میں صرف اتنا کہوں گا کہ میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں انیہ۔" وہ بولا۔

"میں نے تمہارے ساتھ کچھ غلط نہیں کیا۔ بس یہ سمجھ لو کہ زندگی مجھ سے تنگ آگئی ہے۔ شاید اس لیے مجھ سے میری جینے کی وجوہات رفتہ رفتہ چھن رہی ہیں۔ میں پچھلے ایک سال سے ایک ناکردہ گناہ کی سزا کاٹ رہا ہوں۔ جو میری ذات پر ایک دھبہ ہے۔ اب... ایک بار پھر میرے اپنوں نے ہی میری زندگی میں زہر گھول دیا ہے۔

خیر تم جانا چاہتی ہو جاؤ۔ میں تمہیں نہیں روکوں گا۔ مگر میں اتنا ضرور کہوں گا انیہ... میں نے کچھ نہیں کیا ہے۔ میں نے ایک سال پہلے بھی بابا سے یہی الفاظ کہے تھے۔ انہوں نے تو یقین نہیں کیا۔ مگر مجھے تم سے امید ہے...

انیہ! میں ایک دفعہ پھر کہتا ہوں۔ میں نے کچھ نہیں کیا ہے... کچھ نہیں کیا۔" وہ کھڑا ہوا واپسی کے لیے مڑا ہی تھا۔ جب وہ بولی۔

"پسند کرنے لگی تھی میں تمہیں۔ تم سے دور جانے کا تصور بھی مجھے مشکل لگتا تھا۔ مگر... مگر میں اب کیا کروں شاہ میر! ایک وہ شخص جسے میں نے دل کی گہرائیوں سے چاہا اور ایک وہ جس کی کشش مجھے اپنی جانب کھینچتی تھی۔ ایک وہ جو اپنا ہو کر بھی اجنبی تھا اور ایک وہ جو اجنبی ہو کر بھی اپنا اپنا سا لگتا تھا۔ تم نے مجھے کہاں لا کر کھڑا کر دیا ہے۔ تم کون ہو۔ شاہ میر کہ عمیر! میری زندگی کا مذاق بنا دیا ہے تم نے یہ کیسی محبت ہے تمہاری جس نے مجھے محض ایک کٹھ پتلی بنا دیا ہے۔

اس قید کی صورت میں ذلت اور رسوائی کی صورت میں۔"

شاہ میر نے مڑ کر ایک نظر انیہ کو دیکھا اور پھر شکستہ قدموں سے وہاں سے ہٹ گیا۔ آج کی رات ان پر بھاری تھی۔ دونوں نے آج بہت کچھ کھو دیا تھا۔

اور پھر وہ چلی گئی۔ شاید اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو وہ بھی یہی کرتا۔ وہ چاہتے ہوئے بھی اسے روک نہ سکا۔

آج اس کے پاس جینے کی آخری وجہ بھی ختم ہو گئی۔ وہ تو چلی گئی مگر اس کے لیے بہت سے سوال چھوڑ گئی۔

وہ اپنے کس گناہ کی سزا کاٹ رہا تھا؟ انیہ سے محبت کے جرم کی۔

اسے فراز سے بچانے کے جرم کی۔

یا پھر اس کا علاج کرانے اور دنیا کی نظروں سے بچانے کے لیے ماسکو لانے کے جرم کی؛ ان سوالوں کا جواب جاننے کے لیے یہ جاننا ضروری تھا کہ فراز نے انیہ کو قید کیوں کیا۔۔۔ اور اس رات انیہ اور فراز کے درمیان کیا جھگڑا ہوا تھا۔۔۔

☆ ☆ ☆

اسے اچھی طرح یاد تھا۔ اس دن وہ مارکیٹ گئی تھی۔ کچھ ضروری چیزیں لینے واپسی کے لیے گاڑی کے پاس آئی تو دروازہ کھلا تھا۔ اسے یاد تھا کہ وہ گاڑی لاک کر کے گئی تھی۔ حیران پریشان ہوتی وہ گاڑی میں آ بیٹھی تو اسی وقت کسی نے اس کے منہ پر رومال رکھ دیا۔ اس نے رومال ہٹانا چاہا مگر گرفت کافی مضبوط تھی۔ وہ اپنے حواس کھو رہی تھی۔ سامنے کا منظر دھندلا رہا تھا۔

اس کے بعد اس نے خود کو اس چار دیواری کے درمیان پایا۔ پہلے تو وہ بہت روئی۔ خوف زدہ بھی تھی' اور پریشان بھی' مگر آہستہ آہستہ وہ اس سب کی عادی ہو گئی۔ اسے دیے جانے والے کھانے میں موجود نیند کی گولیاں اسے ان کا عادی بنا رہی تھیں۔

یہاں سے اس کا امتحان شروع ہوا۔ صبر' اذیت' دکھ ان کے حقیقی معنی اسے اس دن پتا چلے۔

☆ ☆ ☆

ایئرپورٹ سے وہ ٹیکسی میں بیٹھ گئی۔ اس نے ابھی تک گھر میں سے کسی کو بھی فون کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اب جانے سب لوگ اسے دیکھ کر کیسے ری ایکٹ کرتے ہیں۔

ٹیکسی گھر کے سامنے آ کر رکی۔ وہ اپنے سامان سمیت نیچے اتری۔ جانے آگے کیا ہونے والا تھا۔ ڈرتے ڈرتے آگے بڑھی اور بیل بجائی۔ علیزے نے دروازہ کھولا اور اسے دیکھ کر ششدر رہ گئی۔ کتنی دیر خاموشی چھائی رہی۔

"ان۔۔۔ انیہ۔۔۔ تم۔" وہ حیرانی سے بولی۔

"ہاں میں۔" وہ گہرا سانس لے کر بولی۔

"مگر۔۔۔ تم۔"

"علیزے! کیا مجھے اب اندر بھی نہیں آنے دو گی؟" وہ اس کی بات کاٹ کر بولی۔

"آں۔۔۔ ہاں آ جاؤ۔" اس نے اسے اندر آنے کا راستہ دیا۔ وہ اندر آئی اور ایک بھرپور نظر گھر پر ڈالی۔ سب کچھ ویسے کا ویسا ہی تھا۔ سر جھٹک کر وہ اس کے ہمراہ لاؤنج میں چلی آئی۔

وہاں سب موجود تھے۔ سارہ' سمیر' مما۔۔۔ وہ دروازے پر ہی رک گئی۔ ماحول میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ انیہ انہیں حیرت سے دیکھ رہی تھی۔

سب سے پہلے مما اٹھیں اور اس کی جانب بڑھیں۔ وہ بہت کمزور لگ رہی تھیں۔ آنکھیں بھی سوجی ہوئی سفید کلر کی شلوار قمیص پہنے وہ بہت پریشان اور ویران لگ رہی تھیں۔

اسے لگا وہ اسے ماریں گی اور دھکے دے کر گھر سے نکال دیں گی۔ مگر۔۔۔ ایسا کچھ نہیں ہوا۔ وہ اس کے قریب آ کر بولیں۔

"کہاں۔۔۔ کہاں چلی گئی تھیں تم۔۔۔؟" وہ کچھ نہیں بولی۔ بس خاموشی سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

"بولو کہاں تھیں تم۔۔۔؟ اور۔۔۔ اگر چلی گئی تھیں تو اب کیا لینے آئی ہو؟" وہ رونے لگیں۔ انیہ حیران پریشان انہیں دیکھ رہی تھی۔

"جاؤ انیہ! واپس چلی جاؤ۔ جہاں سے آئی ہو۔ اس گھر میں اب تمہارا کوئی ہمدرد نہیں ہے۔ سوتیلے بہن بھائی۔۔۔ سوتیلی ماں۔۔۔" وہ کھوئے ہوئے لہجے میں بولیں۔ ان کی بات پر انیہ چونکی اور اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں' علیزے' سارہ' سمیر۔۔۔ سب۔

"پاپا۔۔۔ پاپا کہاں ہیں۔" وہ بولی۔ اس کی آنکھوں میں کیا کچھ نہ تھا۔ خوف' حیرت' پریشانی' خدشے۔

"تم نے بہت دیر کر دی انیہ۔۔۔ بہت دیر کر دی۔" مما بولیں۔ تو وہ اپنے خدشات کی نفی کرتی ان کی طرف متوجہ ہوئی۔

"مما! پاپا۔۔۔ پاپا کہاں ہیں؟ وہ۔۔۔ وہ ٹھیک تو ہیں ناں۔" اسے اپنے ہی الفاظ کمزور لگ رہے تھے۔ "مما آپ کچھ بول کیوں نہیں رہیں۔" وہ رونے لگی۔

"انیہ! پاپا کی ڈیتھ ہو گئی ہے۔" جواب علیزے کی طرف سے آیا۔ اس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ وہ ساکت نظروں سے سب کو دیکھ رہی تھی۔

"ایسا۔۔۔ نہیں ہو سکتا۔۔۔ تم' تم سب جھوٹ بول رہے ہو۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ مجھے چھوڑ کر کیسے جا سکتے ہیں۔" وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔

"انیہ۔۔۔!" علیزے چیخی' انیہ بے ہوش ہو گئی تھی۔

"پاپا چلے گئے۔ پچھلے ہفتے ان کی ڈیتھ ہوئی۔ اپنے آخری لمحوں میں انہوں نے تمہیں بہت یاد کیا۔ ہر وقت ان کی زبان پر ایک ہی بات ہوتی۔ مجھے انیہ سے ملوا دو۔ مگر۔۔۔ تم۔" اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"انیہ۔۔۔ تمہیں اس بات کا گلہ تھا ناں کہ مما تم سے پیار نہیں کرتیں۔ مجھے یہ تو پتا نہیں کہ وہ تم سے پیار کرتی ہیں یا نہیں۔ مگر یہ ضرور پتا ہے کہ پاپا تم سے بہت پیار کرتے تھے۔ ہم سب سے زیادہ۔۔۔ وہ تمہارے لیے بہت پریشان تھے۔" وہ اسے بتا رہی تھی اور وہ بیڈ کراؤن کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھی تھی اور مسلسل روئے جا رہی تھی۔

"انیہ۔۔۔ تم کہاں تھیں۔ تم کیوں چلی گئیں؟" علیزے بولی۔

"میں۔۔۔ میں کہاں تھی علیزے۔۔۔ مجھے خود نہیں پتا۔۔۔"

"صاف صاف کہو انیہ! تم کہاں تھیں؟" علیزے نے پھر پوچھا۔

"قید میں۔" وہ بولی۔

"قید۔۔۔ کیا مطلب ہے؟ میں سمجھی نہیں۔" انیہ نے رخ موڑ کر اسے دیکھا اور پھر۔۔۔ اس کا ضبط ٹوٹ گیا۔ وہ اسے سب کچھ بتاتی چلی گئی۔ اور وہ حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی۔ ساری باتیں سننے کے بعد وہ بولی۔

"انیہ تمہیں واقعی لگتا ہے کہ شاہ میر نے تمہیں کڈنیپ کروایا تھا۔"

"مجھے لگتا نہیں ہے۔ مجھے یقین ہے علیزے!"

"مگر۔۔۔"

"پلیز میں اب اس بارے میں مزید بات نہیں کرنا چاہتی۔" وہ اس کی بات کاٹ کر بولی۔ تو وہ سر ہلا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ٹھیک ہے۔ تم آرام کرو۔" وہ جانے ہی لگی تھی کہ انیہ چونکی۔

"علیزے! تمہارا پاؤں۔" علیزے نے مسکرا کر اسے دیکھا اور بولی۔

"ہاں اب یہ بالکل ٹھیک ہے۔ پاپا نے آپریشن کروا دیا تھا۔" وہ بولی۔ انیہ نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا۔ وہ بہت بدل گئی تھی۔ اس کے لمبے بال اب شانوں پر جھول رہے تھے۔ چہرہ بھی نکھرا ہوا تھا۔ وہ کافی اچھی لگ رہی تھی۔



وہ جب سے آئی تھی۔ اس گھر کے افراد کے رویے دیکھ کر حیران ہو رہی تھی۔ سمیر جو اس سے بات کرنا بھی گوارا نہیں کیا کرتا تھا۔ اب روز اس کا حال چال پوچھتا

گھنٹوں اس کے پاس بیٹھا رہتا۔ اور مما بھی اس سے بہت اچھے طریقے سے بات کرتیں۔ اس سے باتیں کرتیں اور ان باتوں میں پاپا کا ذکر ہی ہوتا۔ علیزے تو اس کے ہر غم کی ساتھی تھی۔ اس کی سب سے پیاری بہن۔

بس سارا کا برتاؤ کچھ عجیب سا تھا۔ اگر وہ اسے بلانے کی کوشش کرتی۔ تو جواب دینے کے بجائے۔ تنفر بھری نظروں سے اسے دیکھتی۔ یا پھر ایسا جواب دیتی کہ وہ اپنا سا منہ لے کر رہ جاتی۔

اس وقت وہ اپنے کمرے کی کھڑکی کے سامنے کھڑی باہر لان کو دیکھ رہی تھی۔ جب کوئی کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے چونک کر پیچھے دیکھا۔ یہ دلاور تھا۔

"آپ کو اندر آنے کی اجازت کس نے دی؟" وہ غصے سے بولی۔ اندر ہی اندر وہ کانپ رہی تھی۔

"ارے میری جان! میں تو تم سے ملنے آیا ہوں۔ کتنا عرصہ ہو گیا تم سے ملے ہوئے۔ تمہارے آنے کا پتا چلا تو رہ نہیں سکا۔ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر آ گیا۔" وہ کمینگی سے اسے اوپر سے نیچے تک دیکھتے ہوئے بولا۔ انیہ کو گھبراہٹ محسوس ہو رہی تھی۔

"دفع ہو جاؤ یہاں سے۔ ذلیل انسان۔" وہ غصے سے بولی۔ اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا' دروازہ کھلا اور سارہ اندر داخل ہوئی۔

"ماموں! آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟" وہ بولی۔

"ہاں۔۔۔ وہ۔۔۔ میں انیہ سے ملنے کے لیے آیا تھا۔" وہ خود کو کمپوز کرتے ہوئے بولا۔ جبکہ انیہ حقارت بھری نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"تو مل لیا۔ اب چلیں۔" سارہ نے کہا۔

"ہاں تم چلو میں آتا ہوں۔" دلاور نے اسے جانے کا اشارہ کیا۔ "ماموں میں آپ سے کہہ رہی ہوں ناں کہ نیچے چلیں۔" اب کے سارہ غصے سے بولی۔ تو وہ پہلے حیران ہوا پھر ایک نظر اس پر ڈالتا چلا گیا۔ سارہ بھی وہاں سے چلی گئی تو اس نے ایک گہرا سانس لیا۔

اس دن کے بعد دلاور کا آنا جانا مزید بڑھ گیا تھا۔ مگر وہ پہلے کی طرح اسے تنگ نہیں کرتا۔ بلکہ نظر انداز کر کے گزر جاتا۔ یہ سب انیہ کے لیے حیران کن تھا۔ شاید سارہ نے مما کو بتایا ہوگا۔ وہ سوچتی۔

☆ ☆ ☆

اس دن بھی وہ ٹی۔ وی لاؤنج میں بیٹھی ٹی۔ وی دیکھ رہی تھی جب ممانی وی لاؤنج میں داخل ہوئیں۔ اسے بیٹھے دیکھ کر ہلکا سا مسکرائیں اور اس کے پاس آ کر بیٹھ گئیں۔

"انیہ! مجھے تم سے کچھ ضروری بات کرنی ہے۔" وہ بولیں۔

"جی کہیں۔" انیہ ان کی جانب متوجہ ہوئی۔

"وہ بات دراصل یہ ہے کہ دلاور تم سے شادی کرنا چاہتا ہے۔" وہ کتنی دیر کچھ بول نہیں سکی۔ بس حیرانی سے انہیں دیکھتی رہی۔

"دیکھو انیہ! انکار مت کرنا میں اب مزید تمہیں اس گھر میں نہیں رکھ سکتی۔ جب سے تم آئی ہو۔ خاندان والے طرح طرح کی باتیں بنا رہے ہیں۔ بہتر یہی ہے کہ تم شادی کر لو۔" وہ بولیں۔

"مگر مما! میں دلاور سے شادی نہیں کر سکتی۔" وہ دبے دبے غصے سے بولی۔

"تو پھر کس سے کرنا چاہتی ہو۔" انہوں نے پوچھا۔

"پتا نہیں مگر میں دلاور سے شادی کسی صورت نہیں کروں گی۔" وہ غصے سے کہتی وہاں سے چلی گئی۔

☆ ☆ ☆

جس دن سے اس نے مما کو دلاور سے شادی کرنے سے انکار کیا تھا۔ گھر میں سب کا رویہ اس کے ساتھ عجیب سا ہو گیا تھا۔ ہر کوئی اس سے کھنچا کھنچا رہتا' ٹھیک سے بات بھی نہیں کرتا اور مما تو اسے دیکھتے ہی منہ پھیر لیتیں' دلاور کا آنا جانا بند ہو گیا تھا۔ پہلے تو وہ نظر انداز کرتی رہی۔ مگر پھر علیزے کے رویے میں بھی تبدیلی دیکھ کر وہ حیران رہ گئی۔

"دیکھو انیہ! مجھے نہیں لگتا کہ مما غلط کہہ رہی ہیں۔ تمہیں شادی کر لینی چاہیے۔ تمہیں اس وقت کسی مضبوط سہارے کی ضرورت ہے۔" علیزے اسے

سمجھاتے ہوئے بولی۔

"علیزے! مما صرف شادی کی بات نہیں۔ بلکہ دلاور سے شادی کی بات کر رہی ہیں۔" انیہ دلاور پر زور دیتے ہوئے بولی۔

"تو۔؟" علیزے نے کہا۔

"تم جانتی ہو تم کیا کہہ رہی ہو۔" انیہ نے اسے گھور کر دیکھا۔

"میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ میں کیا کہہ رہی ہوں۔"

"نہیں ایسا نہیں ہو سکتا میں دلاور سے شادی ہرگز نہیں کروں گی۔" انیہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔

"تمہیں کیا لگتا ہے انیہ! کہ تمہارے لیے رشتوں کی لائن لگی ہوئی ہے۔ جس پر انگلی رکھو گی وہ تمہارے نصیب میں لکھ دیا جائے گا۔ نہیں انیہ! اس داغ کا کیا جو تمہارے دامن پر لگا ہے۔ اسے کیسے صاف کرو گی۔ کیا جواب دو گی زمانے کو ایک سال کہاں گزار کر آئی ہو۔ کون دے گا تمہاری پاکی کا ثبوت۔ معاف کرنا انیہ! مگر یہی سچ ہے۔ خدا کا شکر کرو کہ تمہیں دلاور جیسا شخص مل رہا ہے۔

ہمارے معاشرے میں تو ایک رات کی غائب ہوئی لڑکی کو کوئی قبول نہیں کرتا تم تو پھر۔۔۔" کہتے ہوئے وہ چپ ہو گئی۔ جبکہ انیہ اس کی باتیں سن کر ششدر رہ گئی۔ علیزے وہاں سے ہٹ گئی۔

وہ بیڈ پر بیٹھ گئی۔ یہ علیزے کیا کہہ گئی تھی اسے کیا کچھ غلط کہا۔ شاید۔۔۔ نہیں سب کچھ ٹھیک ہی تو کہہ گئی ہے۔ آئینہ دکھا گئی ہے مجھے۔۔۔ مگر مجھے اب کیا کرنا چاہیے۔ دلاور سے شادی۔۔۔ اے اللہ میں کیا کروں۔ دلاور سے شادی نہیں کروں گی تو مما کے تیور دیکھ کر لگتا ہے مجھے گھر سے نکال دیں گی۔ اف۔۔۔ کیا کروں۔۔۔ آگے کنواں ہے اور پیچھے کھائی۔

اگلے دن ناشتے کی ٹیبل پر خلاف توقع وہ بھی موجود تھی۔ سب نے حیرانی سے اسے دیکھا مگر خاموش رہے۔

ناشتے کے بعد چائے سرو ہوئی تو وہ ہمت کرتے ہوئے بولی۔

"مما! میں۔۔۔ میں دلاور سے شادی کے لیے تیار ہوں۔" مما، علیزے، سارہ، سمیر سب حیرت سے اسے دیکھ رہے تھے۔ مما کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔

"تم۔۔۔ تم سچ کہہ رہی ہو۔" وہ حیرت اور خوشی کے ملے جلے تاثرات سے بولیں۔

"جی۔" اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ علیزے اور سمیر بھی مسکرا دیے۔

"تھینک یو بیٹا! جی خوش کر دیا ہے تم نے میرا۔" وہ بے اختیار اٹھ کر اس کے پاس آ کر بولیں اور اسے گلے سے لگا لیا۔

سب ہی خوش لگ رہے تھے مگر۔۔۔ سارہ عجیب نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کا انداز اس کو کھٹک رہا تھا۔ جانے اسے کیا ہو گیا تھا۔ اس نے غور سے اسے دیکھا پھر نظریں چرا لیں۔

"انیہ! میرے کمرے میں آنا' مجھے تم سے ضروری بات کرنی ہے۔" وہ اپنے کمرے میں جا رہی تھی۔ جب مما نے کہا تو اس نے دھیرے سے اثبات میں سر ہلا دیا اور ان کے ساتھ کمرے میں آ گئی۔

"جی۔" وہ بولی۔

"ادھر میرے پاس آ کر بیٹھو۔" انہوں نے بیڈ کی طرف اشارہ کیا۔ وہ خاموشی سے بیڈ پر آ کر بیٹھ گئی۔

"میں نے تمہیں بتانا تھا کہ میں اگلے جمعہ کو تمہارا اور دلاور کا نکاح کر رہی ہوں۔ تمہیں کوئی اعتراض۔"

"اگلے جمعہ۔" وہ چونکی۔ "مما! اتنی جلدی میرا مطلب ہے کہ ابھی پاپا کی ڈیتھ ہوئے مہینہ ہوا اور آپ۔۔۔" وہ حیرانی سے بولی۔

"پھر ایسا کرتے ہیں کہ اگلے مہینے کی پانچ تاریخ رکھ لیتے ہیں۔ اب تو تمہیں کوئی اعتراض نہیں ہے نا۔" وہ بولیں۔

"ٹھیک ہے مما جیسے آپ کی مرضی۔" اس نے سر جھکایا اور باہر آ گئی۔

شادی کی تیاریاں شروع ہو چکی تھیں گو کہ سادگی

سے ہو رہی تھی پھر بھی کچھ انتظام تو کرنا تھے' آج علیزے اسے زبردستی بازار لے کر آئی تھی اور اب پچھلے تین گھنٹے سے وہ بازار میں خوار ہو رہے تھے۔

"علیزے! اب بس بھی کرو۔ میں بہت تھک گئی ہوں۔" انیہ تھکے تھکے انداز میں بولی۔

"ارے ابھی سے ہی تھک گئیں۔ ابھی کافی شاپنگ رہتی ہے۔" علیزے حیرت سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔

"نہیں۔ میں اب مزید نہیں چل سکتی۔ بہت تھک گئی ہوں اور مجھے بھوک بھی بہت لگی ہے۔" انیہ تھکے تھکے انداز میں بولی۔

"اچھا پھر ایسا کرو۔ وہ سامنے والے ریسٹورنٹ میں جا کر بیٹھو اور کھانا آرڈر کرو۔ میں باقی کے کام نپٹا کر آتی ہوں۔" علیزے نے کہتے ہوئے سامنے ریسٹورنٹ کی جانب اشارہ کیا۔

"ٹھیک ہے میں جا رہی ہوں۔ تم باقی کی شاپنگ کر کے آجانا۔" انیہ نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا اور ریسٹورنٹ کی جانب بڑھ گئی۔

وہ ایک کونے والی میز پر آ کر بیٹھ گئی۔ ریسٹورنٹ میں زیادہ لوگ نہیں تھے۔ اس نے سوچا علیزے آئے گی تو کھانا آرڈر کر دے گی۔ وہ اپنے موبائل کی جانب متوجہ ہوئی اور بلاوجہ ہی اس کے بٹن پریس کرنے لگی۔

"کیسی ہو انیہ؟" آواز پر اس نے حیرت سے سر اٹھا کر دیکھا وہ حنا تھی۔

"میں... میں بالکل ٹھیک ہوں۔" وہ گڑبڑائی۔

"اور سناؤ' یہاں کیسے؟ ماسکو سے کب واپس آئیں؟" وہ بے تکلفی سے اس کے سامنے والی چیئر پر آ کر بیٹھ گئی۔

"ڈیڑھ مہینہ ہو گیا ہے۔" اس نے کہا۔

"شاہ میر بھی آیا ہے؟" وہ پرجوش انداز میں بولی۔

"کیوں کیا اسے آنا چاہیے تھا؟" وہ طنزیہ انداز میں بولی۔

"تو وہ نہیں آیا۔" حنا نے کہا۔ وہ سمجھ نہیں پائی کہ وہ طنز کر رہی ہے یا پوچھ رہی ہے۔

"نہیں اور اب میرا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ میں مزید اس کے بارے میں کوئی بات نہیں کرنا چاہتی۔" انیہ سختی سے بولی۔

"مطلب تم نے... تم نے اسے چھوڑ دیا؟" حنا بے یقینی سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔

"ہاں۔" وہ سنجیدگی سے بولی۔

"تم ایسا کیسے کر سکتی ہو۔" حنا صدمے سے بولی۔

"یہ سوال تم نے اس سے کیوں نہیں پوچھا کہ اس نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا۔ میری زندگی کا مذاق بنا دیا ہے اس نے اور تم مجھ سے پوچھ رہی ہو کہ میں اس کے ساتھ ایسا کیسے کر سکتی ہوں۔" وہ غصے سے دانت پیس کر بولی۔ حنا نے افسوس سے اسے دیکھا۔

"اس نے تمہارے ساتھ کچھ نہیں کیا۔ بلکہ تمہاری وجہ سے اس کا سب کچھ داؤ پر لگ گیا۔ سب کچھ کھو دیا ہے۔ اس نے گھر' رشتے' ماں' باپ' بہن سب کچھ... تم اسے بلیم نہیں کر سکتیں۔"

"تو تم اس کی وکالت کرنے آئی ہو۔" انیہ لاپروائی سے بولی۔

"میں اس کی وکالت کرنے نہیں آئی انیہ! تمہیں تصویر کا دوسرا رخ دکھانے آئی ہوں۔ جو ابھی بھی تمہاری نظروں سے اوجھل ہے۔"

"میں سب کچھ جانتی ہوں۔" وہ بولی۔

"کیا جانتی ہو؟" حنا نے پوچھا۔

"یہی کہ میری کڈنیپنگ (اغوا) سے لے کر ماسکو تک کے سفر کے پیچھے شاہ میر کا ہاتھ تھا۔" وہ بولی۔

حنا کو اس بے وقوف لڑکی کی باتیں سن کر افسوس ہوا۔

"کچھ نہیں جانتیں تم' کچھ بھی نہیں..."

"انیہ! وہ شاہ میر تھا جس نے تمہیں فراز کے چنگل سے بچایا۔" اس کی بات پر انیہ نے سر اٹھا کر حنا کو دیکھا۔ وہ ششدر رہ گئی۔

"نہیں... تم... تم جھوٹ بول رہی ہو۔ فراز... نہیں۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "تم شاہ میر کو

بچانے کے لیے فراز پر الزام لگا رہی ہو۔ مجھے بھی یہی لگا تھا۔ مگر پھر زرگل۔۔۔"

"یہ مت بھولو کہ زرگل فراز کی بہن ہے انیہ۔" حنا اس کی بات کاٹ کر بولی۔

"میں بھی یہ کیسے بھول جاؤں کہ تم شاہ میر کی دوست ہو۔" وہ دوبدو بولی۔ حنا نے اس کی طرف دیکھا اور پھر خود کو کمپوز کرتے ہوئے بولی۔

"دیکھو انیہ! اس وقت میں شاہ میر کی دوست ہونے کے ناتے نہیں انسانیت کے ناتے تمہارے بھلے کے لیے کہہ رہی ہوں انیہ! شاہ میر نے تمہیں فراز کے چنگل سے چھڑایا۔ مجھے نہیں پتا کہ فراز نے ایسا کیوں کیا۔ شاہ میر کا کہنا ہے کہ تم اچھی طرح جانتی ہو کہ فراز نے ایسا کیوں کیا۔" انیہ نے نظریں چرالیں۔

"اس رات وہ تمہیں ہمارے گھر لایا' تمہاری حالت بہت خراب تھی۔ جو حادثات تمہارے ساتھ ہوئے ان کی وجہ سے تم کافی زخمی تھیں۔ ان ہی دنوں شاہ میر کے والدین نے شاہ میر کو گھر سے نکال دیا۔ جانتی ہو کیوں۔۔۔" حنا نے رک کر اس سے پوچھا۔

"کیوں؟" وہ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

"کیونکہ وہ بھی یہی سمجھتے تھے کہ شاہ میر تمہیں بھگا کر لے گیا ہے۔ اسے جائیداد سے عاق کر دیا گیا اور گھر کے دروازے ہمیشہ کے لیے اس پر بند ہو گئے۔"

"یہ سب کس نے بتایا ماموں کو۔" وہ بولی۔

"تم بہتر جانتی ہو۔" حنا ٹھنڈی سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔

"فراز۔۔۔" انیہ کے منہ سے نکلا' حنا نے کندھے اچکائے۔

"شاید۔۔۔"

"اس کے بعد وہ بہت ڈسٹرب رہنے لگا۔ اوپر سے تمہارے رویے نے بھی اس کو پریشان کر دیا اور رہی سہی کسر تمہارے پاپا نے پوری کر دی۔ انہوں نے بھی تمہاری کڈنیپنگ کا ذمہ دار شاہ میر کو ٹھہرایا۔ شاہ میر پھنس چکا تھا۔ اسی لیے وہ تمہیں لے کر ماسکو چلا گیا۔"

"اس نے مجھے پاپا کے حوالے کیوں نہیں کیا اور پاپا کو سچ کیوں نہیں بتایا۔" انیہ نے پوچھا۔

"شاہ میر نے تمہیں تمہارے پاپا کے حوالے اس لیے نہیں کیا کہ وہ تمہیں کھونا نہیں چاہتا تھا۔ اور انہیں سچ اس لیے نہیں بتا سکا کہ وہ ہسپتال میں تھے۔ بعد میں تمہاری طرح انہوں نے بھی اسے صفائی دینے کا موقع نہیں دیا۔" حنا نے کہا۔ انیہ خاموش رہی۔

"اب بتاؤ کیا تمہیں ابھی بھی لگتا ہے کہ شاہ میر غلط تھا۔" حنا نے پوچھا۔ اس کی آنکھوں میں نمی در آئی۔

"زرگل نے مجھ سے جھوٹ بولا۔ وہ کہتی تھی کہ شاہ میر مجھے ماسکو اس لیے لے کر گیا کہ مجھے سچائی کا پتا نہ چل سکے کہ شاہ میر نے مجھے۔۔۔" وہ رو دی۔

"سچائی یہ ہے کہ تمہاری کڈنیپنگ کا ذمہ دار فراز ہے اور شاہ میر تمہیں کھونا نہیں چاہتا تھا اس لیے یہاں سے لے گیا۔ مگر وہ جاتے ہوئے یہ کہہ کر گیا تھا کہ جس دن تمہاری حالت ٹھیک ہو گئی۔ وہ تمہیں سب کچھ بتا دے گا اور پھر فیصلہ تمہارا ہو گا۔ اس کے ساتھ رہنا چاہو گی تو ٹھیک ورنہ وہ تمہیں واپس بھیج دے گا۔"

"اس نے مجھے بتایا کیوں نہیں کہ وہ شاہ میر ہے۔ عمیر نہیں۔"

"اسے لگا تم ابھی ٹھیک نہیں ہو بعد میں بتائے گا۔ شاید اس کی غلطی یہی تھی اسے بتانا چاہیے تھا۔ ویسے وہ بتانے والا تھا۔ مگر زرگل نے سب کچھ خراب کر دیا۔" حنا نے جواب دیا۔

انیہ کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ اسی وقت اسے سامنے سے علیزے آتی نظر آئی۔ اس نے جلدی سے آنسو پونچھے۔

"سوری انیہ! آنے میں تھوڑی دیر۔۔۔" بولتے ہوئے اچانک علیزے کی نظر حنا پر پڑی۔ اس نے

سوالیہ نظروں سے انیہ کی جانب دیکھا۔

"یہ... یہ میری کالج فیلو ہے۔ ابھی اتفاقاً" ملاقات ہوئی ہے۔" انیہ نے بات بنائی۔ حنا تھوڑی حیران ہوئی۔ مگر بولی کچھ نہیں۔ علیزے نے اسے سلام کیا۔

"اچھا انیہ! اب میں چلتی ہوں۔" حنا اٹھ کھڑی ہوئی۔

"انیہ! اپنی فرینڈ کو اپنے نکاح پر انوائیٹ نہیں کرو گی۔" علیزے نے اچانک کہا تو حنا نے چونک کر انیہ کو دیکھا۔ انیہ خاموش رہی۔

"انیہ... کا نکاح۔" وہ ابھی تک حیران تھی۔

"ہاں... پرسوں انیہ کا نکاح ہے۔ ایک سادہ سی تقریب ہے گھر میں۔ آپ بھی ضرور آیئے گا۔" علیزے نے خوش دلی سے کہا۔ حنا نے انیہ کی طرف دیکھا۔ وہ سپاٹ چہرہ لیے کھڑی تھی۔ شاید اپنے آنسو روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"اچھا میں چلتی ہوں۔" حنا کہہ کر چلی گئی۔

علیزے اب اس کی جانب متوجہ ہوئی۔

"ارے، تم نے ابھی تک کھانا آرڈر نہیں کیا۔" وہ حیرت سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔

"علیزے! مجھے بھوک نہیں ہے۔ کافی دیر ہو گئی ہے۔ میرے خیال میں ہمیں گھر چلنا چاہیے۔" انیہ بولی۔

"ہائیں! ابھی گھنٹہ پہلے تو تم نے بھوک کا شور مچایا ہوا تھا۔" علیزے حیران ہوئی۔

"تم چل رہی ہو یا میں اکیلی چلی جاؤں؟"

"چلے جاتے ہیں۔ اب کھانا تو کھا لو۔" علیزے حیرانی سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔

"ٹھیک ہے تم یہاں بیٹھ کر کھانا کھاؤ۔ میں جا رہی ہوں۔" انیہ غصے سے کہتی دروازے کی جانب بڑھی۔ علیزے اسے جاتے دیکھ کر اس کی جانب لپکی۔

گھر آتے ہی وہ اپنے کمرے بند ہو گئی۔ اس کا سر درد سے پھٹا جا رہا تھا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ حنا کی باتوں نے اسے حیران پریشان کر کے رکھ دیا تھا۔ تو جو کچھ اس کے ساتھ ہوا اس میں شاہ میر کا کوئی ہاتھ نہیں تھا۔ اس کے کانوں میں شاہ میر کی آواز گونجی۔

"انیہ! میں ایک دفعہ پھر کہتا ہوں۔ میں نے کچھ نہیں کیا ہے... کچھ نہیں کیا۔" اس کا ٹوٹا ہوا لہجہ اسے آج بھی یاد تھا۔ اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو گرے۔

"میں نے تمہیں کھو دیا... میں بہت بری ہوں شاہ میر مجھے معاف کر دو۔ میں بہت بری ہوں۔" وہ رو رہی تھی۔ مگر یہاں کوئی نہیں تھا۔ جو اس کی بات سنتا یا اس کے آنسو پونچھتا۔



آج اس کا نکاح تھا۔ اس کی زندگی کا سب سے بڑا دن۔ نکاح کا جوڑا، زیورات سب کچھ بیڈ پر بکھرا پڑا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں مہندی بھی لگ چکی تھی اور خلاف توقع اس کی مہندی کا رنگ بھی کافی تیز تھا۔ جسے دیکھ کر وہ تلخی سے مسکرائی۔

اس وقت وہ آئینے کے سامنے بیٹھی تھی۔ ابھی تھوڑی دیر بعد مہمانوں نے آجانا تھا اور اس کا نکاح ہو جانا تھا۔... مگر کیا وہ اس نکاح کے لیے دل سے راضی ہے؟ کیا وہ دلاور جیسے شخص کے ساتھ گزارا کر سکے گی؟ مگر یہ سب اس نے پہلے کیوں نہیں سوچا۔

وہ دلاور سے نکاح کر لیتی۔ اس کے ساتھ سمجھوتا بھی کر لیتی مگر... مگر کاش حنا اسے اس دن نہ ملی ہوتی۔ اسے اس ساری سچائی سے ناواقف ہی رہنے دیتی۔ اب کیا سچ جاننے کے بعد وہ یہ نکاح کر سکے گی؟ کتنی دیر سوچوں کے تسلسل میں کھوئے رہنے کے بعد وہ ایک نتیجے پر پہنچی۔ کام تھوڑا مشکل تھا۔ مگر اس سے اس کی زندگی برباد ہونے سے بچ سکتی تھی۔

"علیزے! نکاح کا وقت ہونے والا ہے۔ جاؤ دیکھو انیہ تیار ہوئی کہ نہیں۔ تھوڑی دیر تک مہمانوں نے بھی آجانا ہے۔" مما نے علیزے سے کہا تو وہ اثبات میں سر ہلاتی ہوئی انیہ کے کمرے کی جانب چل دی۔ وہ کمرے میں داخل ہوئی اور ٹھٹک کر رک گئی۔

نکاح کا جوڑا زمین پر پڑا تھا۔ اور پورے کارپٹ پر زیورات اور چوڑیاں بکھری پڑی تھیں۔
اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے انہیں دیکھا۔ اور نظریں ادھر ادھر گھما کر انیہ کو ڈھونڈا۔ وہ سامنے ہی صوفے پر گھٹنوں میں سر دیے بیٹھی تھی۔ آہٹ پر اس نے سر اٹھا کر علیزے کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں کچھ ایسا تھا۔ جس نے اسے چونکا دیا۔
"انیہ! یہ سب کیا ہے۔ تم ابھی تک تیار کیوں نہیں ہوئیں۔ اور یہ کپڑے اس طرح کیوں پھینک دیے۔"
علیزے اپنے خدشات کی نفی کرتی زمین سے چیزیں اٹھاتے ہوئے بولی۔ انیہ خاموش رہی۔
"انیہ! میں تم سے کچھ پوچھ رہی ہوں۔" علیزے نے کپڑے اٹھا کر بیڈ پر رکھے اور اس کے پاس آ کر بولی۔
"مجھے یہ نکاح نہیں کرنا علیزے۔" اس کی بات سن کر وہ ششدر رہ گئی۔ اسے لگا کہ شاید اس نے کچھ غلط سنا ہے۔
"کیا۔ کیا کہا تم نے؟" علیزے نے کہا۔
"مجھے یہ نکاح نہیں کرنا۔" اب کی بار وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔
"تم۔ تمہارا دماغ تو نہیں خراب ہو گیا۔ تم جانتی ہو، تم کیا کہہ رہی ہو۔ ہوش میں تو ہو تم۔" علیزے نے اسے جھنجھوڑ کر کھڑا کیا۔
"انیہ! مہمانوں کے آنے کا وقت ہونے والا ہے۔ گھنٹے دو گھنٹے میں تمہارا نکاح ہو جانا ہے اور تم۔" علیزے کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کرے۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ انیہ کے منہ پر تھپڑ دے مارے۔
"جسٹ اسٹاپ اٹ علیزے! مجھے تمہاری کسی بات کی کوئی پروا نہیں ہے۔ میں تمہیں بتا رہی ہوں۔ مجھے یہ نکاح نہیں کرنا تو نہیں کرنا۔" وہ خود کو اس سے چھڑاتے ہوئے بولی۔
اسی وقت مما کمرے میں داخل ہوئیں۔
"مما۔ وہ۔" علیزے نے کچھ کہنا چاہا مگر انہوں نے ہاتھ اٹھا کر روک دیا اور آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اس کے پاس آئیں۔
انیہ نے انہیں دیکھا اور پھر نظریں پھیر لیں۔
"کیا کہا تم نے۔ یہ نکاح نہیں کرو گی۔"
"نہیں۔" وہ بولی۔ مما نے پوری قوت سے ایک زوردار تھپڑ اس کے منہ پر جڑ دیا۔ علیزے تماشائی بنی کھڑی تھی۔ وہ لڑکھڑائی مگر بروقت سنبھل گئی۔
"ایک دفعہ پھر کہنا کیا کہا تم نے۔" وہ اسے سیدھا کر کے جھنجھوڑتے ہوئے بولیں۔ "جان سے مار دوں گی اگر دوبارہ یہ الفاظ تمہاری زبان پر آئے۔"
"تو مار دیں، مجھے کوئی پروا نہیں۔" وہ ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔
"دیکھو انیہ۔ یہ بے وقوفانہ باتیں بند کرو۔ میری بچی! جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ ایسے مت کرو۔ کیا۔ کیا دلاور نے کچھ کہا ہے۔ اگر اس نے کوئی غلطی کی ہے تو میں تم سے معافی مانگتی ہوں۔ مگر پلیز! ایسے عین وقت پر انکار مت کرو۔" وہ اسے پچکارتے ہوئے بولیں۔
انیہ ان کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ اسے ان پر ترس آ رہا تھا۔ مگر نہیں۔ وہ کمزور پڑنا نہیں چاہتی تھی۔ یہ اس کی زندگی کا سوال تھا۔
"آئی ایم سوری۔ مجھ پر آپ کی باتوں کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ میں نے آپ کو کہہ دیا۔ مجھے یہ نکاح نہیں کرنا تو نہیں کرنا۔" وہ بولی۔
وہ کچھ دیر اس کا چہرہ دیکھتی رہیں پھر انہوں نے اسے مارنا شروع کر دیا۔ تھپڑ کے ان پر ایک جنون سوار تھا۔ انیہ مار کھا رہی تھی اور وہ اسے بری طرح سے پیٹ رہی تھیں۔ علیزے کو ہوش آیا تو وہ دوڑتی ہوئی ان کے پاس آئی اور مما کو بمشکل اس سے الگ کیا۔
"مما۔ پلیز بس کریں۔" انیہ روتی، سسکتی سامنے دیوار سے جا لگی تھی۔ اسی وقت دلاور اندر داخل ہوا۔
"کیا ہوا آپی۔ کیا بات ہے۔" وہ بولا اور پھر اس کی نظر دیوار کے ساتھ لگی روتی ہوئی انیہ پر پڑی۔ اس کے گالوں پر تھپڑوں کے نشان واضح تھے۔ ہونٹ سے خون بہہ رہا تھا۔

"ہونا کیا ہے، بے غیرت نکاح سے انکار کر رہی ہے۔" مما غصے سے ہانپتے ہوئے بولیں۔ اور سامنے صوفے پر تھکے تھکے انداز میں بیٹھ گئیں۔

"کیوں اب کیا مسئلہ ہے اسے۔" وہ غصے سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"اللہ جانے اب کیا چاہتی ہے یہ لڑکی۔" مما پھر بڑبڑائیں۔

"ایک بات کان کھول کر سن لو انیہ! نکاح ہو گا اور آج اسی وقت ہو گا۔ چاہے اس میں تمہاری مرضی شامل ہو یا نہ ہو۔" وہ اسے خبردار کرنے والے انداز میں بولا۔

اسے اپنے سامنے کھڑا دیکھ کر وہ اپنے آنسو پونچھتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"تو ٹھیک ہے جو کرنا ہے کرلو۔ میں بھی دیکھتی ہوں کہ یہ نکاح میری مرضی کے بغیر کیسے ہوتا ہے۔"

"میری مردانگی کو مت للکارو انیہ۔" وہ انگلی اٹھا کر بولا۔

"ایک لڑکی پر اپنی مردانگی کا رعب ڈالنا مرد کی بہادری نہیں بزدلی ہوتی ہے اور تم جیسے بیچ انسان۔۔۔"

وہ ابھی بات پوری نہ کر سکی تھی کہ اس نے ایک زوردار تھپڑ اس کے منہ پر مارا اور اسے زور کا دھکا دیا۔

وہ لڑکھڑا کر گرنے ہی والی تھی کہ کسی نے اسے تھاما۔ وہ زور سے اس کے سینے سے ٹکرائی۔

اپنے حواسوں پر قابو پاتے ہوئے اس کی نظر ساتھ کھڑی سارہ پر پڑی اور پھر وہ چونکی۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا اور حیران رہ گئی۔ وہ۔۔۔ وہ اور کوئی نہیں شاہ میر تھا۔

"شاہ میر۔۔۔" انیہ بنا پلکیں جھپکے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

شاہ میر نے دوبارہ اس کی طرف دیکھا اور ہاتھ بڑھا کر اس کے ہونٹ کے کنارے پر لگا خون صاف کیا۔ وہ بے اختیار رونے لگی۔ اس نے اس کے آنسو صاف کیے اور خود سے الگ کیا اور آگے بڑھ کے ایک زوردار تھپڑ دلاور کے منہ پر دے مارا۔

"ہمت کیسے ہوئی اسے ہاتھ لگانے کی۔" شاہ میر غصے سے بولا۔

"تیری تو میں۔۔۔" اس سے پہلے کہ دلاور کچھ کرتا۔ مما آگے بڑھیں اور دلاور کو پیچھے کیا۔

"ایک منٹ دلاور! تم یہاں سے جاؤ۔"

"آپی! یہ۔۔۔"

"دلاور! میں تم سے کہہ رہی ہوں نا۔ جاؤ یہاں سے۔" وہ کچھ کہنے ہی والا تھا جب سعدیہ بیگم پھر بولیں۔ وہ گہرے سانس لیتا نفرت بھری نگاہوں سے شاہ میر کو دیکھتا ہوا بولا۔

"تجھے تو میں نہیں چھوڑوں گا۔" کہتا وہاں سے چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد مما اس کی جانب متوجہ ہوئیں۔

"ہاں اب تم بتاؤ۔ کیا چاہتے ہو۔"

"انیہ کو چھوڑ دیں۔" وہ بولا۔ اس کی بات پر انہوں نے انیہ کی طرف دیکھا جو سارہ کے ساتھ کھڑی رو رہی تھی۔ اور سارہ اسے چپ کروا رہی تھی۔

"اگر میں نہ مانوں تو۔۔۔" مما نے کہا۔

"تو کوئی بات نہیں۔ میرے پاس اور بھی بہت سے راستے ہیں اپنی بات منوانے کے۔" شاہ میر کندھے اچکا کر بولا۔

"مثلاً۔" وہ تھوڑا حیران ہوئیں۔ تو شاہ میر طنزیہ مسکرایا۔

"میں کہنا تو نہیں چاہتا مگر آپ مجھے مجبور کر رہی ہیں۔ اب ظاہر سی بات ہے کورٹ کچہری کے چکر کاٹنا تو آپ پسند نہیں کریں گی ناں۔" شاہ میر نے معنی خیزی سے کہا۔ تو وہ چونکیں۔ وہ اس کی باتوں کا مطلب سمجھ چکی تھیں۔ پھر کچھ سوچتے ہوئے بولیں۔

"چلو ٹھیک ہے۔ ہم آرام سے بیٹھ کر ڈیل کر لیتے ہیں۔" شاہ میر نے حیرانی سے انہیں دیکھا۔ پھر کندھے اچکا کر آرام سے بیٹھ گیا۔ وہ بھی اس کے سامنے صوفے پر بیٹھ گئیں۔

"میں انیہ کو اس طرح تمہارے ساتھ کیسے جانے دوں۔ تمہیں اس سے نکاح کرنا پڑے گا۔۔۔"

ان کی بات سن کر وہ ششدر رہ گیا۔ کمرے کے سارے نفوس حیران رہ گئے۔ انیہ نے سر اٹھا کر شاہ میر کو دیکھا اور شاہ میر نے انیہ کو۔

"نہیں۔ یہ نکاح نہیں ہو سکتا۔ ہرگز نہیں۔" سب سے پہلے علیزے کو ہوش آیا۔ وہ ہذیانی انداز میں چیخی۔ اب حیران ہونے کی باری انیہ کی تھی۔

"مما! آپ سب کچھ جانتے بوجھتے ایسا کیسے کر سکتی ہیں۔ نہیں۔ میں انیہ کو کبھی شاہ میر کا ہونے نہیں دوں گی۔ کبھی نہیں۔"

وہ نفرت بھری نظروں سے انیہ کو دیکھتے ہوئے بولی۔ جبکہ انیہ حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"مما! انیہ اور شاہ میر کبھی نہیں۔ اگر اتنے پاپڑ بیلنے کے باوجود بھی یہ شخص میری جانب متوجہ نہیں ہو سکا تو میں اسے انیہ کا بھی نہیں ہونے دوں گی۔" وہ پاگلوں کی طرح بول رہی تھی۔ اور انیہ نے تو اذیت کے مارے آنکھیں میچ لیں۔

علیزے۔۔۔! یہ اس کی وہ ہم راز دوست جیسی بہن جس سے اس نے سگی بہنوں سے زیادہ پیار کیا۔ اس پر بھروسا کیا۔ اس پر اعتبار کیا اور آج وہی اس کی خوشیوں کے بیچ کا سب سے بڑا کانٹا بنی تھی۔

"میں انیہ سے ابھی اور اسی وقت نکاح کرنے کے لیے تیار ہوں۔" شاہ میر نے کہا۔ تو علیزے ایک دم چپ ہو گئی۔ وہ بے یقینی سے شاہ میر کو دیکھ رہی تھی پھر تقریباً بھاگتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔ مما بھی حیران رہ گئیں۔ پھر بولیں۔

"ٹھیک ہے۔ سمیر۔۔۔ سمیر!" کہتے ہوئے انہوں نے سمیر کو آواز لگائی ان کی آواز سنتے ہی وہ دوڑا چلا آیا۔

"جی مما۔" اس نے کہا۔

"میں نے تمہیں جو فائل دی تھی وہ لے آؤ۔" انہوں نے کہا تو وہ اثبات میں سر ہلاتا واپس مڑ گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ فائل کے ہمراہ کمرے میں داخل ہوا۔

"یہ لیں۔" اس نے فائل مما کی جانب بڑھائی۔ انہوں نے فائل تھام لی۔ شاہ میر الجھی نظروں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔

"میں تم دونوں کا نکاح ابھی اور اسی وقت کروا دوں گی اور عزت سے انیہ کو تمہارے ساتھ رخصت کروں گی۔ مگر۔۔۔" وہ رکیں اور انیہ کی طرف دیکھا وہ بھی الجھی نظروں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

"انیہ کو ان پیپرز پر سائن کرنے ہوں گے۔" انہوں نے فائل ٹیبل پر رکھی۔

"کیا ہے ان پیپرز میں؟" شاہ میر نے پوچھا۔

"شبیر نے اپنی ساری جائیداد اپنی وصیت میں انیہ کے نام کی تھی۔ بس انیہ کو ان پیپرز پر سائن کرنے ہیں۔"

"ان پیپرز میں کیا لکھا ہے۔" شاہ میر نے اپنا سوال دوہرایا۔

"یہی کہ انیہ اپنی ساری جائیداد میرے نام کرتی ہے۔" انہوں نے اپنا آخری مہرہ پھینکا۔

"مما! آپ ایسے کیوں کر رہی ہیں۔" اب کی بار سارہ بولی۔

"اپنا منہ بند رکھو سارہ۔" مما نے اسے ڈپٹا۔

"نہیں۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔" شاہ میر نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

انیہ اپنی جگہ سے اٹھی اور مما کے پاس آ کر فائل جھپٹی اور پین کھول کر پاگلوں کی طرح دھڑا دھڑ سائن کرنے لگی۔

"انیہ۔۔۔" شاہ میر بولا۔ مگر وہ سائن کر چکی تھی۔ سائن کرنے کے بعد اس نے فائل مما کی گود میں پھینکی۔

"یہ لیں کر دیے سائن۔ اتنے پاپڑ بیلنے سے اچھا تھا کہ آپ مجھے ایک دفعہ کہتیں تو میں کبھی انکار نہ کرتی۔ اس طرح میرا مذاق تو نہ بناتیں۔ آپ کی وجہ سے میری زندگی برباد ہو جاتی۔ یہی مقصد تھا ناں میری ولاور سے شادی کروانے کا۔" کہتے ہوئے وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

"میں نکاح کا بندوبست کرتی ہوں۔" اتنا کہہ کر مما کمرے سے نکل گئیں۔ سارہ بھی وہاں سے ہٹ گئی۔

"تمہیں سائن نہیں کرنے چاہیے تھے۔" شاہ میر

بولا۔

"مجھے ایسی دولت نہیں چاہیے شاہ میر! جو میری زندگی برباد کرنے کی وجہ بنے۔ ساری فساد کی جڑ یہ دولت ہی تو تھی۔" وہ نخوت سے سر جھٹک کر بولی۔ جبکہ شاہ میر اسے دیکھ کر رہ گیا۔

پھر سب کچھ افراتفری کے عالم میں ہوا۔ سارہ نے اسے جلدی سے تیار کردیا۔ ریڈ اور سلور کلر کا خوب صورت فراک اس پر کافی جچ رہا تھا۔ ہلکے پھلکے سے میک اپ کے ساتھ وہ بہت پیاری لگ رہی تھی۔

نکاح ہوا اور وہ انیہ شبیر احمد سے انیہ شاہ میر مرتضیٰ بن گئی۔ نکاح میں خاندان کے بزرگ بھی شامل تھے۔

نکاح کے بعد وہ سارہ کے ساتھ اپنے کمرے میں آ گئی۔ وہ صوفے پر بیٹھی جانے کن سوچوں میں گم تھی۔ جب سارہ نے اسے پکارا۔

"انیہ! کیا سوچ رہی ہو۔" وہ اس کے کپڑے اور ضروری سامان پیک کر رہی تھی۔ ابھی کچھ دیر بعد ہی اس کی رخصتی ہونی تھی۔

"علیزے نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا سارہ؟" وہ کھوئے ہوئے لہجے میں بولی۔

"وہ ایسی ہی ہے انیہ! خود غرض، مطلب پرست اور ظالم۔" سارہ بولی۔

"نہیں سارہ! وہ ایسی نہیں تھی۔ وہ بہت اچھی تھی۔ میری دوست، میری بہن۔۔۔ میرے سکھ دکھ کی ساتھی۔۔۔" کہتے ہوئے اس کا گلا رندھ گیا۔

"تم واقعی میں اتنی بھولی ہو یا ناٹک کر رہی ہو۔" سارہ اس کی طرف تیکھے انداز میں دیکھتے ہوئے بولی۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" انیہ نے چونک کر اسے دیکھا۔

"کچھ نہیں انیہ! غلطی تمہاری نہیں ہے۔ تم بہت سادہ ہو۔ علیزے کی چالاکیوں کو کبھی سمجھ ہی نہیں سکیں۔ وہ شروع سے ہی تم سے حسد کرتی تھی۔" سارہ نے صاف گوئی سے جواب دیا۔

"خیر، سمجھ تو میں کبھی تمہیں بھی نہیں سکی۔" انیہ نے سارہ سے کہا۔

"میری بھی تمہارے بارے میں یہی رائے ہے۔ تم ہر وقت اسی چڑیل کے ساتھ ہوتی تھیں۔ اس لیے میں کبھی تمہاری نیچر کو سمجھ نہ سکی۔ خیر وہ جیسی بھی ہے، میری بہن ہے۔" سارہ افسردگی سے بولی۔

"اب کہاں ہے وہ۔" انیہ نے پوچھا۔

"اپنے کمرے میں ہے ماتم منا رہی ہے اپنی ہار کا۔" سارہ ناک بھوں چڑھا کر بولی۔

"اور دلاور۔۔۔"

"وہ۔۔۔ وہ تو چلے گئے۔ ان کا کام جو ہو گیا۔" سارہ نے کہا۔

"کام۔۔۔ کیسا کام۔" وہ بولی۔

"انہیں تم سے زیادہ تمہاری پراپرٹی میں انٹرسٹ تھا۔ وہ مما کے نام ہو گئی۔ سمجھو ان کا کام ہو گیا۔"

"ایک بات پوچھوں سارہ۔" کچھ یاد آنے پر وہ بولی۔

"ہاں پوچھو۔" وہ اس کے پاس آکر بیٹھ گئی۔

"شاہ میر کو تم نے فون کیا تھا؟" اس کی بات سن کر وہ دھیرے سے مسکرائی۔

"ہاں میں نے فون کیا تھا۔"

"تم مانو یا نا مانو انیہ! سارہ تم سے بہت پیار کرتی ہے۔" وہ اس کے گالوں پر چٹکی کاٹتے ہوئے بولی۔ انیہ کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

سب سے ملنے کے بعد وہ گاڑی میں آکر بیٹھ گئی۔ اس کے بیٹھتے ہی شاہ میر نے گاڑی اسٹارٹ کر دی تمام راستے گاڑی میں خاموشی چھائی رہی۔ اس نے گاڑی ایک ہوٹل کے پارکنگ لاٹ میں پارک کی۔ وہ خاموشی سے اس کے پیچھے چلتی رہی۔ لفٹ کے ذریعے وہ تیسرے فلور پر پہنچے۔ وہ اسے ایک شاندار کمرے میں لے آیا۔

"ہم کچھ دن یہیں رکیں گے۔ پھر واپس ماسکو چلے جائیں گے۔" اس نے کہا۔ انیہ خاموشی سے ایک طرف کھڑی رہی۔

"تم چینج کرلو۔" اس نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ پھر وہ واش روم میں گھس گیا۔ انیہ نے ٹھنڈی

سانس بھری، پھر آہستہ آہستہ چلتی ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ اور اپنے زیورات اتارنے لگی۔

کپڑے چینج کر کے وہ جیسے ہی باہر آئی۔ وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑا تولیے سے اپنے بال خشک کر رہا تھا۔

"میں ایک ضروری کام سے جا رہا ہوں۔ ذرا دیر ہو جائے گی تم سو جانا۔" اتنا کہہ کر اس نے تولیا صوفے پر پھینکا اور گاڑی کی چابی اٹھا کر چلا گیا۔

انیہ خالی خالی نظروں سے سامنے دروازے کو دیکھتی رہی۔ جہاں سے وہ گیا تھا۔

شادی کی پہلی رات ایسا کیا کام آن پڑا کہ بندہ اپنی دلہن کی بھی پروا نہ کرے۔ دل میں ایک ہوک سی اٹھی۔

ان ہی سوچوں کے تسلسل میں کھوئے جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی۔ اسے پتا ہی نہ چلا۔

صبح چھ بجے کے قریب اس کی آنکھ کھلی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ اور بیڈ پر پڑا دوپٹا جلدی سے گلے میں ڈالا۔ اس کی نظر سامنے صوفے پر پڑی۔ وہ صوفے پر سو رہا تھا۔ وہ بیڈ سے اتری اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی اس کے پاس چلی آئی۔

وہ سو رہا تھا۔ سوتے ہوئے وہ اسے اتنا اچھا لگا کہ وہ بے اختیار مسکرا دی۔ وہ کافی دیر ٹکٹکی باندھے اسے دیکھتی رہی۔

اسی وقت ٹیبل پر رکھا شاہ میر کا فون بجنے لگا۔ اس نے گردن گھما کر ٹیبل پر رکھا فون اٹھالیا۔ اسکرین پر ٹینا کا نام جگمگا رہا تھا۔ انیہ کو حیرت ہوئی۔ اس سے پہلے کہ وہ یس کا بٹن پریس کرتی۔ کسی نے موبائل اس کے ہاتھ سے جھپٹا۔ انیہ نے رخ موڑ کر دیکھا۔ شاہ میر غصے سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"تمہاری ہمت کیسے ہوئی میرے موبائل کو ہاتھ لگانے کی۔" وہ غصے سے بولا۔

"وہ... وہ میں۔"

"جسٹ شٹ اپ' آئندہ میرے فون کو ہاتھ لگانے کی کوشش مت کرنا۔"

وہ بولا۔ فون ابھی بھی بج رہا تھا۔ اب وہ فون کی جانب متوجہ ہوا اور یس کا بٹن پریس کرتا بالکونی کی طرف چلا گیا۔ جبکہ انیہ کی آنکھوں میں نمی در آئی۔



شام میں ولید اور حنا آئے۔ شاہ میر نے انہیں فون کر کے بلایا تھا اور اپنے اور انیہ کے نکاح کے بارے میں بتایا تھا۔ وہ بہت خوش ہوئے۔ وہ کچھ ناراض بھی تھے کہ ان کے ہوتے ہوئے وہ دونوں ہوٹل میں رہ رہے ہیں۔ شاہ میر نے بات سنبھال لی۔ وہ لوگ رات کا کھانا کھانے کے بعد چلے گئے۔

شاہ میر کا رویہ اس کے ساتھ ویسے کا ویسا ہی تھا۔ ضرورت سے زیادہ بات نہیں کرتا اور اس سے کھنچا کھنچا رہتا اور اکثر اسے ڈانٹ بھی دیتا۔ انیہ کے لیے اس کا رویہ سمجھ سے باہر تھا۔

اگلے دن شام کی فلائٹ سے اسے اور انیہ کو ماسکو چلے جانا تھا۔ جانے سے پہلے اس نے سوچا' ماں سے مل لے۔ اس نے ماں کو فون کیا اور گھر کے قریبی ریسٹورنٹ میں ملنے کو کہا۔

انہیں دیکھ کر وہ ساکت رہ گیا۔ وہ پہلے سے زیادہ کمزور ہو چکی تھیں۔

اسے دیکھ کر ان کی آنکھوں میں نمی اور ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ شاہ میر بھی آگے بڑھ کر ان سے گرم جوشی سے ملا۔

"کیسی ہیں آپ؟"

"تمہیں دیکھ لیا ہے ناں تو ٹھیک ہوں۔" وہ مسکرا کر بولیں۔

شاہ میر نے انہیں بٹھایا اور خود بھی بیٹھ گیا۔

"مجھے تو کہیں سے بھی ٹھیک نہیں لگ رہیں۔ کتنی کمزور ہو گئی ہیں۔" وہ فکر مندی سے بولا۔

"کیا کروں بیٹا! بوڑھی ہو گئی ہوں ناں۔" وہ افسردگی سے مسکراتے ہوئے بولیں۔

"اپنا خیال رکھا کریں اپنے لیے نہ سہی میرے لیے ہی سہی۔" وہ ان کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے

بولا۔

”اور سنائیں گھر میں سب کیسے ہیں۔“ شاہ میر نے پوچھا۔

”سب ٹھیک ہیں۔ فاطمہ کی چھ مہینے پہلے شادی کی ہے۔ عائشہ کی بھی منگنی طے ہو گئی ہے۔“

”اور پاپا...“ شاہ میر نے پوچھا۔

”وہ بھی ٹھیک ہیں۔ پہلے کی طرح نہیں رہے۔ اب وہ کافی کمزور ہو گئے ہیں۔“ وہ افسردگی سے بولیں۔

”خیر تم بتاؤ انیہ کیسی ہے۔“ انہوں نے گفتگو کا رخ اس کی جانب موڑا۔

”ٹھیک ہے وہ۔ میں نے پچھلے جمعے نکاح کر لیا۔“ اس نے کہا تو فضیلت بیگم ہکابکا رہ گئیں۔

”تم نے... نکاح کر لیا اور مجھے اب بتا رہے ہو۔“ وہ بولیں۔

”حالات ہی ایسے ہو گئے تھے، میں کیا کرتا۔“ وہ بولا۔

”کیا... کیا مطلب ہے تمہارا۔“ وہ ناسمجھی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولیں۔

جواب میں شاہ میر نے ساری بات ان کے گوش گزار کر دی۔

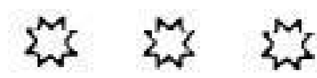
”اب کہاں ہے وہ۔“ ساری بات سننے کے بعد بولیں۔

”ہوٹل میں ہے کل چلے جائیں گے۔“ شاہ میر نے کہا۔

”اس کا خیال رکھنا شاہ میر...“ وہ اتنا ہی کہہ سکیں۔

کچھ دیر ان کے درمیان خاموشی چھائی رہی۔

”میں کچھ کھانے کو منگواتا ہوں۔“ شاہ میر کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ اپنے آنسو روکنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ آج وہ ایک سال دو ماہ تین دن بعد ملا تھا۔ اگلی دفعہ پتا نہیں کب ملے گا یا شاید ملے گا بھی یا نہیں۔



ہوٹل پہنچ کر اس نے جلدی جلدی پیکنگ کی۔

”جلدی سے تیار ہو جاؤ میں تمہیں سارہ کے پاس چھوڑ دوں۔ دو گھنٹے بعد پھر وہیں سے ایئرپورٹ چلیں گے۔“ شاہ میر نے کہا تو وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے تیار ہونے چل دی۔

وہ اسے بابا کے گھر کے باہر چھوڑ کر چلا گیا۔ وہ خاموشی سے اندر آ گئی۔ سارہ اسے لان میں ہی مل گئی

”انیہ... ! کیسی ہو۔ کب آئیں شاہ میر بھائی کے ساتھ آئی ہو۔ کہاں ہیں وہ؟“ اس نے اس سے ملتے ہی کئی سوال کر ڈالے۔

”میں بالکل ٹھیک ہوں۔ شاہ میر کے ساتھ آئی ہوں۔ وہ چلے گئے ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر تک آئیں گے۔“ انیہ نے رسانیت سے جواب دیا۔

”بڑی پیاری لگ رہی ہو۔“ اب وہ اسے اوپر سے نیچے تک دیکھتے ہوئے بولی۔ وہ دھیرے سے مسکرا دی۔

”آؤ اندر چلتے ہیں۔“ وہ اسے اندر لے آئی۔ لاؤنج خالی تھا۔

”اب تم آ گئی ہو ناں تو آج میں تمہیں نہیں جانے دوں گی۔“ سارہ چہک کر بولی۔

”نہیں سارہ! میں زیادہ دیر نہیں رک سکوں گی۔“

”کیوں۔“ وہ حیران ہوئی۔

”آج شام چھ بجے کی فلائٹ ہے ہماری۔“ انیہ نے دھیرے سے کہا۔

”تم جا رہی ہو؟“ سارہ بے یقینی سے بولی۔

”ہاں۔“ انیہ نے کہا۔ اسی وقت ممانی وی لاؤنج میں داخل ہوئیں اور اسے دیکھ کر ٹھٹھکیں۔

”السلام علیکم!“ انیہ نے کہا۔

”وعلیکم السلام!“ وہ اسے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولیں۔

”کیسی ہو۔“ انہوں نے پوچھا۔

”پہلے سے بہت اچھی۔“ وہ طنزیہ انداز میں بولی۔

”شاہ میر نہیں آیا۔“ وہ دوبارہ بولیں۔

”نہیں، وہ یہاں آنا پسند نہیں کرتا۔“ انیہ نے کہا۔

”ٹھیک ہے۔ تم کھانا کھا کر جانا۔ میں چلتی ہوں۔“

وہ اس کے رویے کو نظر انداز کرتے ہوئے بولیں۔
"اس کی ضرورت نہیں۔ شاہ میر آنے والا ہو گا۔ میں جا رہی ہوں۔" انیہ نے کہا۔ وہ ایک نظر اس پر ڈالتی وہاں سے چلی گئیں۔
"میں ذرا علیزے سے مل آؤں۔" انیہ سارہ سے کہتی علیزے کے کمرے کی جانب بڑھی، جبکہ سارہ رشک بھری نظروں سے اس کی پشت کو دیکھ رہی تھی۔
اس نے کمرے کا دروازہ کھولا۔ کمرے میں اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ اس نے دروازہ بند کیا اور کمرے کی لائٹ آن کی۔ کمرہ روشنیوں سے نہا گیا۔ علیزے بیڈ کے ساتھ ٹیک لگائے آنکھیں موندے بیٹھی تھی۔ اس کی بند آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔
"لائٹ آف کر دو سارہ اب مجھے روشنی اچھی نہیں لگتی۔" وہ آنکھیں بند کیے ہوئے بولی۔
"آنکھیں کھولو علیزے! مجھے اندھیرا اچھا نہیں لگتا۔" اس کی بات سن کر علیزے نے آنکھیں کھول کر حیرت سے اسے دیکھا۔ کتنی دیر وہ ایسے ہی بے یقینی سے اسے دیکھتی رہی۔
"انیہ...!" وہ بولی۔
سرخ اور پیلے رنگ کا خوب صورت سوٹ زیب تن کیے انیہ نے لمبے ریشمی بال اپنے کندھے پر ڈال رکھے تھے۔ ہلکے سے میک اپ کے ساتھ وہ بہت پیاری لگ رہی تھی۔ علیزے کو اس سے حسد محسوس ہوا۔
"انیہ شاہ میر مرتضیٰ۔" انیہ اس کے پاس آکر بولی۔
"تو تم نے اسے پا ہی لیا۔" وہ دھیرے سے بولی۔
"میں نے اسے نہیں پایا، اللہ نے اسے میری قسمت میں لکھ دیا تھا۔" انیہ اب اس کے پاس بیٹھ گئی۔
"تم نے میرے ساتھ اچھا نہیں کیا علیزے۔" انیہ نے دکھ سے اسے دیکھا۔
"تو میں کیا کرتی محبت کرنے لگی تھی میں شاہ میر سے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ تم سے محبت کرتا ہے۔ میں نے بہت کوشش کی تم دونوں کو ایک دوسرے سے الگ کرنے کے لیے... مگر نہیں کر پائی۔ مجھے معاف کر دو انیہ! میں بہت گر گئی تھی۔" علیزے روتے ہوئے کہا۔
"میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی علیزے کبھی نہیں۔" انیہ کھڑے ہوتے ہوئے بولی اور علیزے کو یونہی روتا چھوڑ کر باہر آگئی۔
تھوڑی دیر بعد شاہ میر آگیا اور وہ سارہ سے مل کر گاڑی میں جا بیٹھی۔
"ارے اتنی جلدی کیا ہے۔ شاہ میر بھائی کو اندر تو آنے دو۔" سارہ نے اسے گاڑی میں بیٹھے دیکھ کر کہا۔ شاہ میر مسکراتے ہوئے باہر نکلنے ہی لگا تھا کہ انیہ فوراً بولی۔
"نہیں۔ اس کی ضرورت نہیں۔ ہمیں دیر ہو رہی ہے۔ چلتے ہیں۔" وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔
"انیہ! تم مما کی باتوں کا برا مت مانو، وہ تو ایسے ہی ہیں۔"
"سارہ پلیز۔ میں اب اس بارے میں مزید بات نہیں کرنا چاہتی۔" وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔ شاہ میر نے حیرت سے ان دونوں کو دیکھا۔
"چلیں۔" وہ شاہ میر کی طرف دیکھ کر بولی۔
اس نے سر اثبات میں ہلاتے ہوئے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔
"کیا بات ہے، پریشان لگ رہی ہو؟" انیہ کے تاثرات ہی ایسے تھے کہ وہ پوچھے بنا نہ رہ سکا۔
"مما نے میرے ساتھ اچھا نہیں کیا۔" وہ رندھی آواز میں بولی۔ شاہ میر نے حیران ہو کر اسے دیکھا۔
چاہتے ہوئے بھی وہ اسے علیزے کے بارے میں نہیں بتا سکی۔ اس نے بمشکل اپنے آنسو روکے۔ شاہ میر نے گاڑی ایک سائڈ پر روکی اور اس کی جانب متوجہ ہوا۔
"کیا بات ہے انیہ۔" وہ اس کی طرف مڑ کر بولا۔
"ک... کچھ نہیں۔" وہ اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے بولی۔
"انیہ! مجھے بتاؤ کیا بات ہے۔" وہ سنجیدگی سے بولا۔

"آج وہ گھر بہت اجنبی لگ رہا تھا اور اس گھر کے افراد ایسے ملے جیسے میرا ان سے کوئی رشتہ ہی نہیں۔" وہ کہتے ہوئے رو دی۔

شاہ میر نے مسکراتے ہوئے اس کے آنسو صاف کیے۔ "کیا کرتی ہو لڑکی! رو رو کر آنکھیں سجا لیتی ہو۔" وہ شرارتی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بولا۔

"آپ تو مجھ سے ناراض تھے ناں۔" وہ اسے حیرت سے دیکھ رہی تھی۔

"ہاں مگر اب نہیں ہوں۔" وہ مسکراہٹ دباتے ہوئے بولا۔

"اور جو رویہ پچھلے ایک ہفتے سے میرے ساتھ تھا۔ اس کا کیا۔" وہ خفگی سے بولی۔

"وہ..... تم نے پورا ایک سال میرا ناک میں دم کیے رکھا۔ اب میرا بھی تو تنگ کرنا بنتا ہے ناں۔" وہ اس کے چہرے پر جھولتی لٹ کو کانوں کے پیچھے اڑستے ہوئے بولا۔

"لیٹ ہو رہے ہیں....." وہ دھیرے سے بولی۔

"کیا۔" وہ چونکا۔

"ہم لیٹ ہو رہے ہیں۔" وہ زور سے بولی۔ وہ سیدھا ہو کر بیٹھا۔ انیہ نے مسکراہٹ دباتے ہوئے رخ کھڑکی کی جانب موڑا۔



دسمبر کی ایک خوب صورت صبح تھی۔ سفید روئی جیسے بادلوں کی اوٹ سے آج خلاف توقع سورج چمک رہا تھا اور ماسکو کی برف کو پگھلانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔

سائیڈ ٹیبل پر رکھا الارم چیخ چیخ کر بجنے کا اعلان کر رہا تھا۔ انیہ نے ہاتھ بڑھا کر الارم بند کیا اور جمائی لیتی اٹھ بیٹھی، اس نے ایک مسکراتی نظر اپنے دائیں طرف سوئے شاہ میر اور حیدر پر ڈالی، دونوں سوتے ہوئے بہت کیوٹ لگ رہے تھے۔ ان سے نظریں ہٹا کر وہ بیڈ سے اتری۔

فریش ہو کر باہر آئی تو کچن کا رخ کیا۔ جلدی جلدی ناشتہ تیار کیا۔ سب کچھ تیار کرنے کے بعد وہ کمرے میں واپس آئی۔ وہ دونوں ابھی تک مزے سے سو رہے تھے۔

"شاہ میر! حیدر اٹھ جاؤ صبح ہو گئی ہے۔" وہ اونچی آواز میں بولی۔

"حیدر! بیٹا اٹھ جاؤ اسکول سے دیر ہو رہی ہے۔" وہ اب حیدر کو اٹھا رہی تھی۔ وہ کسمساتا ہوا اٹھ بیٹھا۔

"شاباش اب جلدی سے منہ ہاتھ دھو کر آؤ۔ مما آپ کے کپڑے نکالتی ہیں۔"

وہ اسے بیڈ سے نیچے اتار کر واش روم کی جانب دھکیلتے ہوئے بولی۔

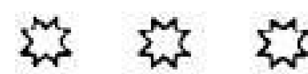
"شاہ میر اب آپ بھی اٹھ جائیں ورنہ آفس کے لیے دیر ہو جائے گی۔" وہ الماری سے کپڑے نکال کر صوفے پر رکھتی اب اس کی جانب متوجہ ہوئی۔ اور آہستہ آہستہ چلتی اس کے قریب آ کر بیٹھ گئی۔

"شاہ میر آپ لیٹ ہو رہے ہیں۔ اٹھ جائیں۔" وہ اس کا کندھا ہلاتے ہوئے بولی۔ وہ کسمسایا اور آنکھیں مسلتا ہوا اٹھ بیٹھا۔

"دل تو کر رہا ہے آج چھٹی کر لوں۔" وہ اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولا۔

"ابھی بتاتی ہوں آپ کو جلدی سے تیار ہو جائیں۔ میں ناشتہ ٹیبل پر لگاتی ہوں۔" وہ خود کو اس سے چھڑاتی اٹھ کھڑی ہوئی۔ اسی وقت حیدر باتھ روم سے باہر نکلا۔ انیہ اس کی جانب متوجہ ہوئی اور اسے جلدی جلدی تیار کرنے لگی۔

اسے تیار کر کے وہ ڈائننگ روم میں لے آئی اور ناشتہ ٹیبل پر لگانے لگی۔ اتنی دیر میں شاہ میر بھی وہاں آ گیا اور آرام سے بیٹھ کر ناشتہ کرنے لگا۔



رات کے کھانے کے بعد جب وہ کچن صاف کر کے کمرے میں واپس آئی تو شاہ میر جاگ رہا تھا۔

"آپ ابھی تک سوئے نہیں۔" انیہ اندر آتے

بولی۔

"نہیں تمہارا انتظار کر رہا تھا۔" وہ ہلکا سا مسکرا کر بولا۔ وہ بیڈ کی سائیڈ پر آکر بیٹھ گئی۔

"کیوں کوئی خاص بات تھی۔"

"نہیں بس یونہی تم سے باتیں کرنے کو جی چاہ رہا تھا۔" وہ کہتا ہوا اس کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گیا۔ اس کی اس حرکت پر وہ دھیرے سے مسکرا دی۔ وہ اکثر ایسے ہی کرتا تھا۔

"انیہ تم سے ایک بات پوچھنا تھی۔" کچھ یاد آنے پر وہ بولا۔

"پوچھیں۔" وہ اسی طرح اس کے بالوں میں ہاتھ چلاتے ہوئے مگن انداز میں بولی۔

"یاد ہے جب تم عمر کی شادی پر حویلی گئی تھیں۔" شاہ میر نے اسے یاد دلایا۔

"ہاں۔" وہ دھیرے سے مسکراتے ہوئے بولی۔

"آپ کو دیکھنے 'آپ سے ملنے کی امید لے کر۔" وہ کھل کر مسکرائی۔ مگر شاہ میر الجھی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"مگر میں تو وہاں نہیں تھا۔"

"جانتی ہوں بد قسمتی سے۔" وہ ناک چڑھا کر بولی۔

"انیہ! فراز نے تم سے کیا کہا تھا۔" شاہ میر کی اگلی بات سن کر اس کی مسکراہٹ سمٹ گئی۔ اس کے تاثرات دیکھ کر وہ اٹھ بیٹھا۔ انیہ خاموشی سے اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

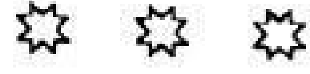
"انیہ! بتاؤ اس دن تمہاری فراز سے کیا بات ہوئی تھی۔"

"شاہ میر.....! فراز نے کہا تھا کہ میں..... میں تمہاری زندگی سے چلی جاؤں۔ کیونکہ وہ اپنی بہن کی خوشیاں چاہتا ہے۔ زرگل شاہ میر کو پسند کرتی ہے اور اگر میں نے اس کی بات نہ مانی تو وہ..... وہ..... تمہیں مار دے گا۔" کمرے میں خاموشی چھا گئی۔

"تم نے اس کی کون سی بات نہ مانی۔" تھوڑی دیر بعد وہ بولا۔

"یہی کہ میں تمہاری زندگی سے نکل جاؤں۔" شاہ میر ششدر رہ گیا۔

"میں تمہیں کھونا نہیں چاہتی تھی۔" وہ اس کے سینے سے لگ کر رونے لگی۔ جبکہ شاہ میر گہری سوچ میں گم تھا۔



ڈور بیل کی آواز پر ڈسٹنگ کرتے اس کے ہاتھ رک گئے انیہ نے دروازے کی طرف دیکھا۔ بارہ بج رہے تھے۔ شاہ میر آفس اور حیدر اسکول گیا ہوا تھا۔ اس وقت کون ہو سکتا ہے۔ سوچتے ہوئے اس نے دروازہ کھولا۔ سامنے کوریر کھڑا مسکرا رہا تھا۔ اس نے ایک لیٹر اس کی طرف بڑھایا۔ اس نے الجھی نظروں سے لیٹر لیا اور اس کے دیے ہوئے پیپر پر سائن کر کے اندر آگئی۔ اس نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے لیٹر کو الٹ پلٹ کر کے دیکھا۔ اوپر پاکستان کی مہر لگی تھی۔ بے چینی سے لفافہ چاک کر کے خط باہر نکالا اور اسے کھول کر پڑھنا شروع کیا۔

ڈیئر انیہ!

کیسی ہو؟ امید ہے کہ تم شاہ میر کے ساتھ اچھی زندگی بسر کر رہی ہو گی۔ تم سوچ رہی ہو گی کہ مجھے تمہارے گھر کا ایڈریس کیسے ملا اور میں نے یہ خط تمہیں کیوں بھیجا؟

تو میں بتائے دیتی ہوں کہ میں نے حنا کے ذریعے یہ ایڈریس حاصل کیا۔ گزشتہ روز وہ مجھے کلینک میں ملی تھی۔ میں تمہیں فون یا ای میل بھی کر سکتی تھی مگر مجھے یہی درست لگا۔

انیہ! میں نے یہ خط تمہیں یہ بتانے کے لیے لکھا ہے کہ انیہ تمہاری بربادی کی سب سے بڑی گناہ گار میں ہوں۔ وہ میں ہی تھی جس نے تمہیں اغوا کرایا۔ وہ میں ہی تھی جس نے تمہیں برباد کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔

مجھے نہیں پتا سب سن کر تم کبھی مجھے معاف کرو گی بھی کہ نہیں اس سب میں فراز کا کوئی قصور نہیں تھا۔ میں نے اسے مجبور کیا تھا۔ وہ سارہ کو پسند کرتا تھا۔ میں

نے اسے بلیک میل کیا کہ اگر وہ میرا یہ کام نہیں کرے گا تو میں اسے سارہ کی نظروں سے گرانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑوں گی اور دوسری طرف یہ اس کی بہن کی زندگی کا سوال تھا۔ اگر تم شاہ میر کی جان چھوڑ دیتیں تو زرگل آسانی سے شاہ میر سے شادی کر لیتی۔

چاروناچار وہ مان گیا۔ تمہارے اغوا کے بعد میرا کام ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ میں تمہیں مار ڈالنا چاہتی تھی۔ اور جب یہ بات فراز کو پتا چلی تو وہ ڈر گیا اس نے کہا کہ وہ شاہ میر کو سب بتا دے گا۔ ان ہی دنوں شاہ میر کو اس پر شک ہونے لگا اور میرے مجبور کرنے پر اس نے تمہیں بیچ دیا۔

انیہ! میں جانتی ہوں یہ سب سن کر تمہیں مجھ سے نفرت محسوس ہو رہی ہو گی۔ اور ہونی بھی چاہیے' میں بہت بری ہوں۔ میں نے خود کو پس منظر میں چھپا کر مس احمد بن کر فراز کا استعمال کیا۔

اور آج میں اپنے کیے کی سزا بھگت رہی ہوں۔ مجھے بلڈ کینسر ہے اور میں جانتی ہوں' مجھے تب تک موت نہیں آئے گی جب تک تم مجھے معاف نہیں کرو گی۔ کرنا بھی مت میں بہت بری ہوں۔ مجھے سزا ملنی چاہیے۔

مگر فراز... انیہ! اس کو معاف کر دو۔ اس کا قصور صرف اتنا ہے کہ وہ میری بلیک میلنگ میں آ گیا۔ مجھے نہیں پتا کہ تمہیں سارہ نے فراز کے بارے میں بتایا کہ نہیں۔ وہ فراز کو پسند کرتی تھی۔ مگر اپنے کام میں کامیاب نہ ہونے کی وجہ سے میں نے فراز کے پرانے افیئرز کے سارے قصے سارہ کے آگے رکھ دیے۔

اور ہاں اس رات میں نے ہی شاہ میر کو غنڈوں سے پٹوایا تھا۔

انیہ! میری تم سے ایک التجا ہے کہ انیہ پلیز صرف ایک دفعہ واپس آؤ۔ مجھے میرے گناہوں کی سزا بتاؤ۔ میں... میں جب تم سے معافی مانگوں تو تم مجھے دھتکار دو میں دھاڑیں مار کر روؤں مگر تم مجھے معاف نہ کرو۔ میں اس لائق نہیں کہ مجھے معاف کیا جا سکے۔

فقط

علیزے شبیر

خط پڑھنے کے بعد انیہ خالی خالی نظروں سے سامنے دیکھنے لگی۔ دل ٹوٹنا' رونا دھونا یہ اس کے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ مگر آج اتنے سال بعد وہ پھر وہاں آ کر کھڑی ہو گئی تھی جدھر سے وہ چلی تھی۔ اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہنے لگے۔ قطرہ... قطرہ۔

موبائل کی آواز پر اس کے کام کرتے ہاتھ رک گئے۔ اس نے ایک نظر اپنے ہاتھ میں پکڑے ڈسٹنگ کے کپڑے پر ڈالی اور دوسری نظر فون پر' پھر کپڑا صوفے پر رکھ کر فون کی جانب متوجہ ہوئی۔ اسکرین پر حنا کا نام جگمگا رہا تھا۔ اس نے لیس کا بٹن دباتے ہوئے فون کان سے لگایا۔

"ہیلو حنا!" وہ فون لے کر صوفے پر آ کر بیٹھ گئی۔ دوسری طرف جو کچھ حنا نے اسے کہا اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

فون اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گرا۔ کتنی دیر وہ اپنے آپ پر قابو پانے کی کوشش کرتی رہی۔ پھر جلدی سے زمین سے موبائل اٹھایا اور شاہ میر کو فون ملایا۔ تھوڑی دیر بعد فون اٹھا لیا گیا۔

"ہیلو انیہ!" دوسری طرف سے شاہ میر بولا۔

"شاہ میر..." اس کی آواز سن کر اس کی آنکھوں میں نمی در آئی اور گلا رندھ گیا۔

"انیہ! کیا ہوا۔" وہ گھبرا گیا۔

"شاہ میر! آپ کہاں ہیں۔" وہ اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے بولی۔

"آفس میں۔" وہ الجھے ہوئے انداز میں بولا۔

"شاہ میر! آپ جہاں بھی ہیں پلیز جلدی گھر آئیں۔"

"انیہ مجھے بتاؤ۔ کیا ہوا ہے۔" وہ پریشان لہجے میں بولا۔

"شاہ میر آپ گھر آئیں پھر بات کرتے ہیں۔" اتنا کہہ کر انیہ نے فون بند کر دیا۔

وہ ریش ڈرائیونگ کرتے ہوئے گھر پہنچا۔ گاڑی

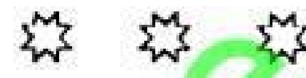
لاک کر کے وہ دروازے تک آیا۔ دروازہ ادھ کھلا تھا۔ وہ اندر داخل ہوا۔ ٹی وی لاؤنج خالی تھا۔ وہ ادھر ادھر نظریں دوڑاتا کمرے میں آیا۔
سامنے ہی انیہ سوٹ کیس میں الماری سے کپڑے نکال کر رکھ رہی تھی۔
"انیہ... یہ کیا ہے۔ ہم کہاں جا رہے ہیں؟"
وہ حیرت سے چیزوں کا جائزہ لیتا اس تک آیا۔
"ہم نہیں صرف آپ جا رہے ہیں۔" وہ کپڑے تہہ کر کے سوٹ کیس میں رکھ رہی تھی۔
"کہاں۔" وہ نا سمجھنے والے انداز میں بولا۔
"پاکستان۔" وہ سکون سے بولی۔
"پاکستان۔" حیرت سے بولا۔
"مگر کیوں۔"
"شاہ میر! ماموں جان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔" وہ بولی۔
"کیوں کیا ہوا۔" وہ پریشانی سے بولا۔
"فالج کا اٹیک ہوا ہے۔" اس کی بات سن کر وہ کتنی دیر خاموش رہا۔
"شاہ میر پلیز، وہ آپ کے پاپا ہیں، ان کی حالت اتنی خراب ہے۔ کیا آپ ان کا حال پوچھنے بھی نہیں جائیں گے؟" وہ سب کچھ چھوڑ کر اس کے سامنے آکر کھڑی ہوئی۔
کتنی دیر وہ خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔ انیہ نے اس کی خاموشی کو رضامندی جان کر بیگ پیک کیا۔
"تو تم اور حیدر... میرا مطلب ہے ہم لوگ بھی چلو۔" وہ تھوڑی دیر بعد بولا۔
"چلے تو جاتے مگر۔ ایمرجنسی میں مجھے شام کی فلائٹ میں صرف ایک سیٹ ملی ہے۔ میں نے سوچا۔ آپ چلے جائیں۔ کیونکہ آپ کا وہاں جانا بہت ضروری ہے۔ اور رہی بات میری اور حیدر کی تو دو تین دن تک ہم بھی آجائیں گے۔" وہ اسے ساری تفصیل بتاتے ہوئے بولی۔
شاہ میر نے اثبات میں سر ہلا دیا۔
ایرپورٹ پر اسے ولید ریسیو کرنے آیا۔ اس سے ملنے کے بعد وہ دونوں گاڑی میں آکر بیٹھ گئے۔
"ہوں۔ اب بتاؤ گھر چلنا ہے یا پہلے ہسپتال۔" ولید نے پوچھا۔
"ہسپتال۔" شاہ میر سنجیدگی سے بولا۔
تقریباً" آدھے گھنٹے میں وہ ہسپتال کے سامنے تھے۔ وہ دونوں گاڑی سے اترے اور قدم بڑھائے۔ ولید نے ایک نظر شاہ میر پر ڈالی وہ کافی پریشان لگ رہا تھا۔
"کیا ہوا؟ کیا سوچ رہے تھے۔"
"کچھ خاص نہیں۔ پاپا کی حالت کے بارے میں اور گھر والوں کے رویے کے بارے میں۔" کہتے ہوئے وہ مڑا تو سامنے تایا ابا کھڑے تھے۔ ان کی نظر بھی اس پر پڑی مگر شاید پہچاننے کی کوشش کر رہے تھے۔ سامنے ہی اماں کھڑی تھیں۔ وہ ان تک آیا۔
"شاہ میر...!" کہتے ہوئے وہ بے اختیار اس کے گلے لگ گئیں۔ زرگل، عائشہ، فاطمہ، عمر، عثمان، تایا، تائی سب حیرت و بے یقینی سے اسے دیکھ رہے تھے۔ جبکہ اماں اس کے گلے لگی بے آواز رو رہی تھیں۔ شاہ میر نے انہیں خود سے الگ کیا اور ان کے آنسو صاف کیے۔
"پاپا... ک... کہاں ہیں۔" وہ اٹک کر بولا۔ اماں نے کمرے کی جانب اشارہ کیا۔ شاہ میر نے سر ہلا دیا۔ اور اپنی آنکھوں میں در آنے والی نمی صاف کر کے آگے بڑھا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی اس کی نظر بیڈ پر پڑے وجود پر پڑی۔
آٹھ سال... آٹھ سال کا عرصہ کم نہیں ہوتا انا اور ضد کی جنگ اب کمزور پڑ چکی تھی۔
آہٹ محسوس کر کے پاپا نے دھیرے سے آنکھیں کھولیں۔ وہ کافی کمزور اور بیمار لگ رہے تھے۔ چہرے پر نقاہت طاری تھی۔
شاہ میر ان کے پاس کھڑا دھندلی آنکھوں سے انہیں دیکھ رہا تھا، وہ بھی حیرت و بے یقینی سے اسے دیکھ رہے تھے۔
"ش... شاہ... میر۔" انہوں نے بمشکل بولنے کی کوشش کی۔

"پاپا۔۔!" وہ دھیرے سے رندھی آواز میں بولا۔

ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ شاہ میر نے ہاتھ آگے بڑھا کر ان کے آنسو صاف کیے اور ان کے پاس اسٹول پر بیٹھ گیا۔

وہ کافی دیر ہاسپٹل میں رہا۔ اماں' عائشہ' فاطمہ کے علاوہ اس نے کسی سے بھی زیادہ بات کرنے کی کوشش نہیں کی۔

ڈاکٹر سے ملنے کے بعد وہ ولید کے ہمراہ اس کے گھر چلا گیا۔ حویلی جانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ حنا نے اس کا پرجوش استقبال کیا۔ کھانے کے بعد وہ آرام کی غرض سے کمرے میں جا کر سو گیا۔



اگلے دن بھی وہ ہسپتال میں رہا۔ بس ماں' بہنوں کے ساتھ رہتا۔ پاپا تو اپنی بیماری کے باعث بات نہیں کرپاتے۔ البتہ جب شاہ میر نے ان کی بیماری کی وجہ پوچھی تو اماں نے بتایا کہ

"انہیں فراز نے سب کچھ سچ سچ بتا دیا تھا کہ جو کچھ بھی ہوا۔ اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں' پھر اس کے بعد وہ اندر ہی اندر گھلنے لگے اور آج وہ اس حال کو پہنچ گئے ہیں۔" ماں سے نظریں ہٹا کر اس نے سامنے سوئے اپنے باپ پر ڈالیں۔

"سب کچھ جاننے کے بعد انہیں بس یہی فکر کھائے جا رہی تھی کہ تمہارا سامنا کیسے کریں گے۔" جواب اب عائشہ نے دیا۔ اس نے مڑ کر عائشہ کو دیکھا۔

فاطمہ' عائشہ ان دونوں کی شادی ہو چکی تھی۔ فاطمہ کے تین' عائشہ کے دو بچے تھے جبکہ گل نین کی منگنی ہوئی تھی۔

"شاہ میر جو کچھ بھی ہوا۔ اس کے ذمہ دار ہم سب ہیں۔ پلیز ہمیں معاف کر دو۔ بہت بڑی غلطی ہو گئی ہے ہم سے۔ ہم نے تمہارے اور انیہ کے ساتھ بالکل اچھا نہیں کیا۔" تایا ابا ہاتھ جوڑے اس کے سامنے کھڑے تھے۔ شاہ میر بے اختیار اٹھ کر ان کے پاس آیا اور ان کے بندھے ہوئے ہاتھ کھول دیے۔

"تایا ابا پلیز! یہ سب کر کے مجھے شرمندہ نہ کریں۔" کہتے ہوئے خود پر قابو پاتا وہ وہاں سے ہٹ گیا۔



انیہ اور حیدر بھی پاکستان پہنچ چکے تھے اور آج پاپا نے ڈسچارج ہو جانا تھا۔ وہ انیہ اور حیدر کو لے کر ہاسپٹل آیا۔ تھا۔

کمرے میں سب لوگ موجود تھے۔ جب وہ انیہ اور حیدر کے ہمراہ کمرے میں داخل ہوا۔ سب حیرت سے انہیں دیکھ رہے تھے۔

"السلام علیکم!" انیہ نے پراعتماد انداز میں سب کو سلام کیا۔ تایا' تائی' عمر بھائی' عثمان' فاطمہ' عائشہ وہ سب سے مل رہی تھی۔

"اماں! یہ حیدر ہے آپ کا پوتا۔" شاہ میر حیدر کو ان سے ملواتے ہوئے بولا۔ فضیلت بیگم نے مسکراتے ہوئے اسے پیار کیا۔ اب انیہ اور شاہ میر پاپا کی جانب متوجہ ہوئے۔

"ماموں۔۔۔ انیہ آگے بڑھ کر ان کے گلے جا لگی۔

"پاپا! یہ کون ہیں۔" حیدر شاہ میر کا بازو ہلا کر پاپا کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

شاہ میر نے ایک نظر اپنے باپ کو اور پھر انیہ کی جانب دیکھا۔

"بتائیں ناں پاپا۔" حیدر ایک دفعہ پھر بولا۔

"بیٹا! یہ آپ کے دادا ابو ہیں۔" شاہ میر نے کہا۔

"واؤ گرینڈ فادر۔" وہ مزے سے بولا۔ پاپا آگے بڑھے اور حیدر کو پیار کیا۔

"کیا آپ اب ہمارے ساتھ رہیں گے۔ جس طرح اسد' سعد کے گرینڈ فادر ان کے ساتھ رہتے ہیں۔" وہ معصومانہ انداز میں بولا۔ انیہ نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور شاہ میر کی طرف دیکھا۔

"ش۔۔۔ ش۔۔۔ شاہ میر۔" پاپا کی آواز سن کر وہ ان کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ اسے اپنے پاس بلا رہے تھے۔ ان

کی آنکھوں میں نمی در آئی۔ شاہ میر نے آگے بڑھ کر ان کے ہاتھوں پر ہاتھ رکھا۔

"نا... ناراض... ہو۔" وہ اٹک اٹک کر بولے۔

"بالکل نہیں۔" وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ان کے سامنے کھڑے ہو کر اس کی ساری ناراضی' گلے شکوے سب اڑنچھو ہو گئے۔

"ت... تو... پھر... گ... گھر چلو۔" انہوں نے بمشکل جملہ مکمل کیا۔ شاہ میر نے نفی میں سر ہلایا۔

"نہیں۔ ابھی نہیں۔" اس کی بات سن کر وہ پریشان ہو گئے۔

"بعد میں آؤں گا۔" انہیں یوں دیکھ کر وہ فوراً بولا۔

"پ... پکا۔" ان کی آنکھوں میں جگنو اُتر گئے۔

"پکا۔" وہ مسکرا کر بولا اور باقی سب سے مل کر انیہ کے ہمراہ وہاں سے واپس آ گیا۔

☼ ☼ ☼

"انیہ! تم سے کوئی ملنے آیا ہے۔" وہ اس وقت ٹی وی لاؤنج میں بیٹھی میگزین الٹ پلٹ کر دیکھ رہی تھی جب حنا نے معنی خیزی سے کہا۔

"مجھ سے ملنے۔" وہ اپنی طرف اشارہ کر کے بولی۔

"ہاں۔" حنا نے اثبات میں سر ہلایا۔

"کون آیا ہے۔" اس نے پوچھا۔

"ڈرائنگ روم میں ہے جاؤ دیکھ لو۔" وہ کندھے اچکا کر کہتی وہاں سے چلی گئی تو انیہ الجھ کر اٹھ کھڑی ہوئی اور قدم ڈرائنگ روم کی جانب بڑھائے۔ جیسے ہی وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی' سامنے کھڑی شخصیت کو دیکھ کر گنگ رہ گئی۔

وہ علیزے تھی اور جس حال میں تھی انیہ نے بے اختیار نظریں چرائیں۔ لینن کے سوٹ میں اس کا جسم ڈھانچہ لگ رہا تھا گندمی رنگت کالی سیاہ ہو گئی تھی۔ اس کے سر پر زخموں کے نشان تھے اور چہرے کی ہڈیاں ابھری ہوئی تھیں۔

"کیسی ہو۔" علیزے نے پہل کی۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں۔" انیہ کافی دیر بعد بولی۔

"تم یہی سوچ رہی ہو گی ناں کہ میں اب یہاں کیا لینے آئی ہوں؟" اس کی بات پر انیہ نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

"بہت بوجھ ہے مجھ پر انیہ! وہ ہلکا کرنے آئی ہوں۔" وہ رندھی آواز میں بولی۔

"میں جانتی ہوں انیہ! میں نے جو کچھ تمہارے ساتھ کیا۔ وہ بالکل بھی اچھا نہیں کیا۔ تمہیں اذیت' تکلیف دی۔ میں نے تمہارا اعتماد توڑا۔ تمہارا دل دکھایا۔ میں نے وہ کیا۔ جو ایک دشمن بھی نہیں کرتا۔"

"پلیز علیزے! اب پرانی باتیں مت دہراؤ ان سب کا کوئی فائدہ نہیں۔ میں نے تمہیں معاف کیا۔" انیہ سنجیدگی سے بولی۔

"اتنی آسانی سے۔" وہ حیرت سے بولی۔

"ہاں اتنی آسانی سے۔" اتنا کہہ کر انیہ چپ ہو گئی۔

"مما کی ڈیتھ ہو گئی ہے انیہ۔" اس کی بات پر انیہ چونک کر مڑی اور کتنی دیر اسے دیکھتی رہی۔ بے اختیار اس کی آنکھوں سے آنسو ٹوٹ کر گرے۔ علیزے نے کچھ کاغذات ٹیبل پر رکھے۔

"یہ پراپرٹی کے کاغذات تمہاری امانت۔" اتنا کہہ کر وہ باہر نکل گئی۔

☼ ☼ ☼

دو' تین دن بعد اماں کا فون آیا۔ وہ انہیں گھر آنے کا کہہ رہی تھیں۔

وہ تینوں حویلی کے گیٹ کے سامنے تھے۔ شاہ میر نے ہارن دیا۔ چوکیدار بھاگتا ہوا آیا اور گیٹ کھولا۔ شاہ میر نے گاڑی پورچ میں روکی وہ انیہ اور حیدر گاڑی سے نکلے۔

اب وہ تینوں داخلی دروازے کے سامنے کھڑے تھے۔ یہ وہی دروازہ تھا۔ جہاں سے کبھی اسے دھکے دے کر نکالا گیا تھا۔ تب کسی نے اس کی بات نہیں سنی

تھی۔
ٹی وی لاؤنج میں سب لوگ موجود تھے اور اسے ہی دیکھ رہے تھے۔
اس دن بھی تو یہ سب ہی مل کر اس کا تماشا دیکھ رہے تھے۔ دل سے ہوک اٹھی۔ ایک پل کے لیے اس کا دل چاہا کہ یہاں سے بھاگ جائے۔ وہ اندر داخل ہوا تو سب کے چہرے خوشی سے کھل اٹھے۔ شاہ میر حیرت سے حویلی کو دیکھ رہا تھا۔ سب کچھ ویسے کا ویسا ہی تھا کچھ بھی نہیں بدلا تھا۔ شاید وہ بدل گیا تھا۔ اس نے سوچا۔ سب نے ان کا بہت اچھے طریقے سے استقبال کیا۔ ان سب میں فراز نہیں تھا اسی نے عائشہ سے پوچھا۔
"عائشہ! وہ فراز۔" اس نے پاس بیٹھی عائشہ کا کندھا ہلایا۔ جو حیدر کو پیار کر رہی تھی۔
"جب شاہ میر نے انیہ کو فراز اور اس کے ساتھیوں کے چنگل سے بچایا تو فراز نے ڈر کے مارے گھر والوں کے سامنے سارا الزام شاہ میر پر لگا دیا۔
اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہونے کی صورت میں علیزے نے سارا غصہ فراز پر نکالا اور سارہ کو اس سے بدگمان کر دیا۔ سارہ نے اس سے قطع تعلق کر لیا۔ کچھ دن بعد رہی سہی کسر گل خان نے نکال دی۔ اس نے سب کچھ تایا ابا اور ابو کو بتا دیا۔
انہوں نے اسے گھر سے نکال دیا اور فراز اس کے دل میں جانے کیا آیا وہ نجانے کہاں چلا گیا اس کے بارے میں کسی کو کچھ خبر نہیں ہے۔"
آج خان ہاؤس کے لیے بہت بڑا دن تھا۔ پوری حویلی دلہن کی طرح سجی تھی۔ دونوں ماموں پرجوش انداز میں ادھر ادھر کھڑے مہمانوں کا استقبال کر رہے تھے۔ عثمان، عمر، رحمان (عائشہ کے شوہر) انتظام سنبھال رہے تھے۔ لان میں مہندی کی رسم تھی۔ گانے اونچی آواز میں بج رہے تھے۔ لڑکیاں ڈھولک بجا رہی تھیں۔ آج گل نین کی شادی تھی۔
"عائشہ گل! انیہ کہاں ہے۔" وہ اس وقت بلیک شلوار قمیص میں ملبوس تھا۔ عائشہ نے ایک نظر اپنے بھائی پر ڈالی اور مسکرا کر بولی۔
"اپنے کمرے میں ہے۔" وہ فوراً کمرے کی جانب بڑھا۔ جیسے ہی وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ ایک دم ٹھٹکا۔
لائٹ پنک کلر کے شرارے، پرپل کلر کی قمیص جس پر خوب صورت کام تھا زیب تن کیے۔ اپنے لمبے سیاہ بال اپنی پشت پر پھیلائے، ہلکے میک اپ میں وہ بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔ وہ اسے اپنی نظروں کے حصار میں لیتا آگے بڑھا۔
"تم یہ کیا کر رہی ہو؟"
"میں۔۔۔ تیار ہو رہی تھی۔" وہ اپنے کانوں میں جھمکے ڈالتے ہوئے بولی۔ شاہ میر نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ سے جھمکا لیا اور اس کے قریب آیا۔ انیہ سٹپٹائی۔
"میں کر لوں گی۔" وہ منمنائی۔ شاہ میر نے جھمکا اس کے کان میں ڈالا۔
"بہت خوب صورت لگ رہی ہو۔" وہ دھیرے سے بولا۔
"شاہ میر۔۔۔" انیہ اپنے آپ کو چھڑاتے ہوئے بولی۔
"ہوں۔۔۔" وہ دھیرے سے بولا۔
"وردہ رو رہی ہے۔" اس کی بات پر اس نے سٹپٹا کر بیڈ پر لیٹی وردہ کو دیکھا۔ انیہ مسکراتی ہوئی۔ وردہ کی جانب لپکی اور اسے اپنی گود میں بھر لیا۔
"پاپا! اگر آپ کو مما سے فرصت مل گئی ہے تو پلیز نیچے آجائیں۔ دادا ابو بلا رہے ہیں۔" حیدر کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولا۔ شاہ میر نے حیرت سے انیہ کو دیکھا۔
"میں آتا ہوں۔" شاہ میر نے کہا۔
"او کے مما! میں وردہ کو لے جاؤں۔" حیدر نے معصومیت سے کہا۔
"ہاں یہ لو۔" اس نے وردہ کو اس کی گود میں دیا تو وہ اسے لے کر باہر نکل گیا۔
"اب آپ بھی جائیں۔ ماموں بلا رہے ہیں۔"

انیہ نے اسے جانے کا اشارہ کیا۔

"تم بہت بری ہو انیہ۔" وہ منہ بنا کر بولا۔

"کیوں؟" وہ حیران ہوئی۔

"جب بھی میں رومانس کرنے لگتا ہوں تو تم ہمیشہ میرا موڈ خراب کر دیتی ہو۔" وہ منہ بنا کر بولا۔

"پلیز شاہ میر آپ جائیں۔ساموں۔"

"خاموش۔بالکل خاموش۔" وہ اس کے ہونٹوں پہ ہاتھ رکھ کر بولا۔ کمرے میں سکوت چھا گیا۔ اسی وقت کمرے کا دروازہ کھلا اور زرگل اندر داخل ہوئی۔ انیہ گڑبڑا کر پیچھے ہٹی۔

"اوہ سوری۔ آئی ایم ریلی سوری۔" وہ شرمندہ ہوئی۔ جبکہ شاہ میر نے غصے سے اسے دیکھا۔

"آؤ زرگل۔" انیہ اسے گھورتی زرگل کی جانب متوجہ ہوئی۔

"وہ... وردہ نیچے رو رہی ہے اور امی کہہ رہی ہیں، پھولوں کے زیور کہاں رکھے ہیں۔" اس نے کہا۔

"ہاں وہ فرج میں رکھے ہیں۔ تم لے لو۔ میں ذرا وردہ کو دیکھ لوں" کہتے ہوئے انیہ باہر نکل گئی۔ جبکہ زرگل **جھجکتے** ہوئے بیڈ روم کی جانب بڑھی۔

وہ پھول لے کر جانے ہی لگی تھی کہ شاہ میر نے اسے روکا۔

"زرگل! تم نے شادی سے انکار کیوں کیا؟"

پچھلے ہفتے زرگل کا رشتہ آیا تھا۔ مگر اس نے صاف انکار کر دیا۔ یہ سب اسے انیہ نے بتایا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ شاہ میر زرگل سے بات کرے اور اسے شادی کے لیے رضامند کرے۔

"میں شادی نہیں کرنا چاہتی۔" وہ رندھی آواز میں بولی۔

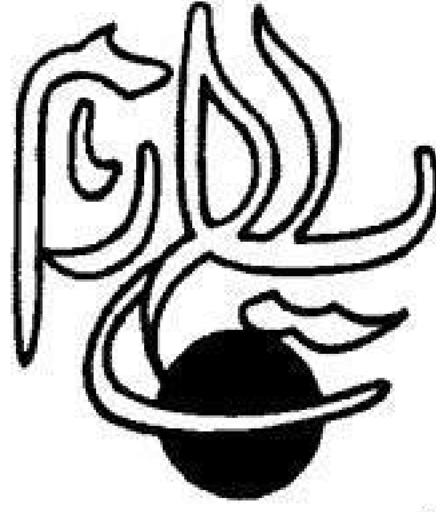
"زرگل! شادی کر لو۔ یہ ایک دوست اپنی دوست سے کہہ رہا ہے۔" زرگل نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ بلیک کلر کی شلوار قمیص میں وہ بہت زیادہ خوب صورت لگ رہا تھا۔

"میری بات سمجھنے کی کوشش کرو زرگل، فراز کی وجہ سے تایا ابو پہلے ہی بہت پریشان ہیں ایسے میں تم۔" شاہ میر وہاں سے چلا گیا۔ زرگل دھندلی نظروں سے اسے جاتے دیکھ رہی تھی۔

سامنے ہی شاہ میر، انیہ سے کچھ کہہ رہا تھا اور وہ مسکرا رہی تھی۔ پاس ہی حیدر وردہ کو پیار کر رہا تھا۔ زرگل نے رشک بھری نظروں سے انہیں دیکھا۔ وہ بہت پیارے لگ رہے تھے۔ **یہ** فیملی وہ واقعی چاہے جانے کے لائق تھا۔



سمیرا حمید



— ۹ —

نویں اور آخری قسط

یوں جیسے امیرِ شہر مچان پر ہی کھڑا رہ گیا ہو اور زہر بجھے نیزوں نے اس کے شہر کی زندہ سانسوں کو مال غنیمت کی طرح لوٹنا شروع کر دیا ہو۔

"نگر حیات۔" پر آگ کے گولے برسائے جانے لگے اور خاتمے کی راکھ آگ کی لپٹوں میں دیک بنی گھس گئی ہو۔

"امیرِ شہر سڑک پر اپنا جہاں لٹتے دیکھ رہا ہے۔"

موت کی سانسیں نہیں ہوا کرتیں، پھر بھی وہ زندگی کی لو پھونک مار کر بجھا دینے کا اختیار بحکم خدا اپنے اختیار میں رکھتی ہے۔

اس کے شہر پر یہ پھونکیں تیز آندھیوں کی طرح چلیں اور افواج یارم (مسمار کرنے والا) کے ہاتھوں اس نے اپنے قلعے کو مچان سمیت منہدم ہوتے دیکھا۔

اور پھر یوں چشماں اندھ پوش ہوئیں۔۔۔ سماعتیں معزول ٹھہریں۔۔۔ اور دہن نے ماتم زدوں کی چوکھٹیں جا تھامیں۔

"امر اور مرن۔۔۔" زندگی دو لفظ ہے۔

سیکیورٹی فورس نے امرحہ کی طرف یک دم یلغار کی اور وہ اس کے گرد اپنی ڈیفنس شیلڈز لیے دائرے میں کھڑے ہو گئے اور دوسرے کچھ کھڑے، کچھ گھٹنوں پر



مکمل ناول



پوزیشن لیے ربڑ کی گولیاں فائر کرنے لگے، جبکہ وہ اس طرف ایسے ایستادہ رہا جیسے اب وقت آخر تک یہ ہی حکم اس پر مُہر تھا۔

شور یک دم دھماکوں کی صورت پھٹا۔۔۔ انسانی بستی کے گولے نے کشش کا تھال الٹ دیا اور برازیلا اسٹیڈیم زمین سے پہلے اٹھا اور پھر ہر چیز اپنی حد بندی سے نکل جانے کے لیے اپنی حدوں کی نافرمان ہوئی اور عمارتیں اور لوگ بے وزن ہونے لگے۔۔۔ پھول اور درخت۔۔۔ جھیلیں اور آبشاریں۔۔۔ سبزے اور خطے کرہ زمین سے اٹھنے لگے۔۔۔ بہاریں اور نغمے۔۔۔ ابابیلیں اور فاختائیں۔۔۔ خوشبوئیں اور میوے بھی پیچھے نہ رہے۔

"اور اے ابن الوقت! ان دو لفظوں کی حقیقت مجھ پر اب کھلی۔"

"امر" یار کا ہونا اور "مرن" اس کا نہ ہونا۔

اپنے ہی جسم کے جلنے کی بو بلا تامل اس کے نتھنوں میں گھسنے لگی۔ حرکت کرنے کے لیے جو طاقت درکار تھی، وہ اس کے دائرہ اختیار میں نہ تھی۔ کارل، ویرا یا سائی اس طرف اس کے پاس کوئی نہیں تھا۔ وہ اس طرف سامنے امرحہ کے پاس تھے، جو شدت تکلیف میں ہوگی یا تکلیف سے مبرا ہو چکی ہوگی۔

الہام اس کے کانوں میں پھونکیں مارنے لگے اور پیش گوئی کی زبانیں نکل آئیں۔

سائرن بجاتی ایمبولینس آئی۔ سیکیورٹی فورس نے اب جیسے دبنگ دھاوا بول دیا اور سڑک سے ہجوم ایسے چھٹنے لگا جیسے وہ سب اسی ایک سانحے کے انتظار میں تھے، جو عالیان پر گزر چکا تھا۔ ہیلی کاپٹر پرواز کر رہے تھے۔ ایمبولینسز اور رضاکار تیزی سے حرکت میں آچکے تھے۔ فورس سڑک پر اور اطراف میں جال کی طرح پھیل گئی۔ دو اہلکار دور سے عالیان پر بھاگتے ہوئے چلائے، پھر ایک چلاتے ہوئے اس کے قریب آیا اور جھک کر اسے بازو سے پکڑ کر اٹھا کر گھسیٹنے لگا۔ ساتھ وہ تیز آواز میں کچھ کہہ رہا تھا اور پھر اتنی افراتفری میں اس نے ذرا کی ذرا رک کر جھک کر اسے دیکھا اور چونک گیا۔

"تم ٹھیک ہو؟" اس نے پوچھا۔

ایمبولینس اب جا رہی تھی۔۔۔ اور وہ اس کے قریب سے گزر گئی۔ نتھنوں سے بو اس کے اندر اترنے لگی۔

امیر شہر نے اپنی ہتھیلیوں کو خالی پایا جیسے ابتدائے وقت سے اٹھا ہجر وصل کی دھرتی پر قیام گاہ بناتا، ابدیت کی مشعلوں سے روشن "شہر" اجڑ گیا۔

"تو امرحہ چلی گئی۔۔۔ یا جا رہی ہے۔۔۔ یا چلی جائے گی۔"

دل نے دھڑکنیں مستعار لیں، سانسوں نے زندگی کو التجائیہ صدا دی اور اس کے مجسمے میں سیکیورٹی اہلکار نے اسے ایک محفوظ حصے کی طرف اچھال سا دیا اور تیز آواز میں ایک سمت چلے جانے کا اشارہ کیا۔ لیکن وہ سیکیورٹی اہلکار کے بتائے اشارے کے مخالف سمت بھاگا اور راستے میں آنے والے سیکیورٹی اہلکاروں کو دھکیلتا اور پھلانگتا ہوا اس مقام تک پہنچ گیا، جہاں سڑک سرخ تھی اور کانچ کی بوتلیں ٹوٹی ہوئی بکھری پڑی تھیں اور خون کے چھینٹے کانچ پر جمع تھے۔

اس بار تین، چار اہلکار اس کی طرف لپکے کہ اسے اٹھا کر کہیں پھینک دیں کہ وہ تیزی سے ان سے ٹکراتا ہوا اس جگہ پر جھک کر بیٹھ گیا اور خون پر اپنے ہاتھ رکھ لیے۔

"اور سن اے شہریاراں کی ملکہ! اس میں ذرا وقت نہ لگا اور میں تم ہو گیا اور تم ہی رہ گیا۔"

اور اس کے آنسو اس خون پر گرے جو امرحہ کا تھا۔۔۔ اہلکاروں نے اسے کوئی ضدی، عجیب و غریب حرکتیں کرنے والا فین سمجھ کر گردن، بازو اور کالر سے پکڑ کر اٹھایا اور اسے دور لے جانے لگے۔



جب اسے ایسے سڑک سے دور لے جایا جا رہا تھا تو سائی نے پیچھے سے چلا کر اس کا نام لیا۔

"کب سے ڈھونڈ رہا ہوں تمہیں، کہاں تھے تم؟"

سائی اس کی طرف بھاگا آیا اور اہلکار کو اپنا یونی ورسٹی کارڈ دکھایا۔ اہلکار نے اس کا بازو چھوڑ دیا اور تیز تیز یہ کہہ کر چلا گیا کہ جلد سے جلد اپنی جائے رہائش کی طرف چلے جائیں۔ اس دوران عالیان سہم کر سائی کو دیکھ رہا تھا اور پھر وہ سائی سے الگ، آگے تیز تیز چلنے لگا۔ سائی کے لیے عالیان کی یہ حرکت غیر متوقع تھی۔

"عالیان!" سائی چلایا اور اس کے پیچھے لپکا۔

"کہاں جا رہے ہو؟" اس کی طرف تیز چال میں بڑھتے ہوئے سائی نے ہانپ کر کہا۔ ان چند منٹوں کی بھاگ دوڑ میں وہ بری طرح سے تھک چکا تھا۔

"یہ اب مجھے بتائے گا کہ امرحہ کے ساتھ کیا ہوا؟" عالیان بھاگنے لگا۔ اس نے سوچا اور چاہا کہ بس اب وہ دنیا میں کہیں جا چھپے کہ اسے معلوم ہو سکے اور نہ کوئی اسے بتا سکے کہ امرحہ چلی گئی۔ وہ کبھی اس خبر کی پذیرائی نہیں کر سکے گا۔۔۔ وہ کبھی اس کی آنکھوں کے بند ہو جانے کو اپنی کھلی آنکھوں سے نہیں دیکھے گا۔ کبھی نہیں۔۔۔

"عالیان تم اسپتال جا رہے ہو؟" اس کے رد عمل سے عاجز سائی چلایا۔ اس کے سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ عالیان کر کیا رہا ہے۔۔۔ یا پھر یہ اپنا دماغی توازن کھو چکا ہے۔

عالیان نے رفتار تیز کر دی۔۔۔ اپنے بگڑے دماغی توازن کی تصدیق کر دی۔ سائی نے جیسے بھانپ لیا۔ اس کا دل بھر آیا اور رندھی ہوئی آواز میں وہ چلایا۔

"اسٹریچر پر لے جاتے ہوئے اس نے تمہارا نام لیا تھا۔"

خود کو آگے لے جاتا، سڑک کو پیچھے چھوڑتا عالیان رک گیا۔ ہجوم، سیکیورٹی فورس، اسٹیڈیم، افراتفری، آنسو گیس، سب پیچھے رہ گئے تھے۔ البتہ شور اپنی موجودگی کی گواہی ابھی بھی دے رہا تھا۔ سیکیورٹی فورس کی گاڑیاں، ایمبولینس، فائر بریگیڈ کی گاڑیاں آجا رہی تھیں۔

اس نے پلٹ کر سائی کو دیکھا، پھر شجر ستاروں سے مزین آسمان کو اور یہ دیکھنا ایسا دیکھنا ہو گیا جیسے خدا تک جانے کا راستہ تلاش کر رہا ہو۔

"وہ زندہ ہے نا سائی؟" فاصلے سے وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے، پھر اس نے کچھ وقت ہمت مجتمع کرنے کے لیے لیا اور پھر پوچھا ایسے جیسے اس نے سر پر وہ تھال اٹھا رکھا ہو جس کے سب ہی چراغ بجھ چکے ہوں اور صرف ایک ایسے جل رہا ہو جو بجھ جانے کے قریب ہی ہو۔

"آؤ اسپتال چلیں عالیان!" سائی اس کے قریب آ چکا تھا اور اپنی انگلیوں سے اس کے بھیگے بھیگے گال صاف کر رہا تھا۔

"خدا کے لیے بتاؤ سائی!"

"اسے کچھ نہیں ہو گا عالیان!" اس نے عالیان کے دونوں ہاتھ پکڑ کر محبت سے ان پر دباؤ ڈال کر وہ کہا جو کہنا ضروری تھا۔۔۔ پر امید رہنے کے لیے بہت ضروری۔۔۔

"اسے کچھ نہیں ہوا۔۔۔ یہ کہہ دو خدا کے لیے۔"

اس نے اپنے ہاتھ چھڑوا کر سائی کو شانوں سے تھام کر جھنجھوڑا۔

"پلیز کہہ دو۔۔۔" کھڑے رہنے کی طاقت پھر سے ختم ہونے لگی اور وہ کھڑے رہنے سے معذور اور گر جانے پر مجبور ہو گیا۔ سائی اس کے پاس نیچے بیٹھ گیا اور اس کے گال کو شفقت سے چھوا۔

"آؤ عالیان! ہم خدا سے دعا کریں۔"

تھوڑی دیر ان کے درمیان خاموشی رہی، جیسے انہونی کی چاپ پر کان دھرنے جا رہے ہوں۔

"آؤ۔۔۔ ہم امرحہ کے پاس چلیں۔" سائی نے کہا جس پر عالیان نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔ دیکھنے کا یہ انداز امید کی کرن کھوجنے جیسا تھا۔

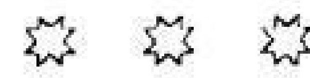
کیا روم کے مصوروں نے "عشق عیاں" کے سائے تلے بنائے اپنے شاہکاروں پر سیاہ دوات انڈیل دیں، جبکہ اس کے وجدان نے سنگ دلی کو آنکھوں پر بٹھائے اور رحم دلی کو بالائے طاق رکھتے اپنے مرتب سوالنامے میں سے پہلا سوال اس پر داغا اور وہ بلبلا اٹھا۔

"کیا الہامی اوراق حکم کی بجا آوری کے لیے رازداری اور پوشیدگی سے پھڑپھڑائے؟" دوسرے نے پہلے وجدان کو مات دی۔

"اور کیا دجلہ و فرات میں جوار بھاٹا اٹھا اور ریت کی چوٹیاں سوگ میں اس لیے جھک آئیں کہ آفاق نے تمہاری دعاؤں کو الٹ دیا، کیونکہ انہوں نے "ہجر یار" کو مرقوم پایا۔ اور کیا سزا کے لیے تمہارا زندہ رہنا قائم ٹھہرا اور مبارک ساعتوں کو ہمیشہ کے لیے رخصت کر دیا گیا۔"

سائی نے دیکھا کہ وہ سکڑتا جا رہا ہے جیسے مٹ جانے کو ہے۔

"کیا "بحر یاراں" پر رواں سفید بادبانی کشتیاں بس ڈوب جانے کو ہوئیں اور "مشک آہو" مشک کافور۔۔۔ "کافور" ہوا۔"



اسپتال کے کوریڈور میں کھڑے اس کی آنکھیں خشک ہونے میں نہیں آ رہی تھیں۔ کارل، ویرا، سائی اور باقی سب اس کے اردگرد، آس پاس کھڑے تھے۔ ویرا اس کا ایک ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر سہلا رہی تھی۔ اس کے اپنے ہاتھ کانپ رہے تھے اور وہ زندگی میں پہلی بار کمزوری اور کم ہمتی کا شکار ہوئی تھی۔ ساری انسانی طاقت ٹھیک اس جگہ بے بس ہو جاتی ہے جہاں "ہو جا" کا حکم لگ جاتا ہے۔

کارل کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ عالیان سے ایسا کیا کہے کہ وہ آرام سے کہیں بیٹھ جائے اور پانی کے دو گھونٹ ہی پی لے۔ دیوار کے ساتھ لگ کر وہ کب تک ایسے ہی کھڑا رہنا چاہتا ہے جیسے "آنے والوں" اور "جانے والوں" کا راستہ روک لے گا۔

رات کے دو بجے کا وقت ہے۔ ان سب کو وہاں کھڑے کئی گھنٹے گزر چکے ہیں۔ آپریشن تھیٹر سے امرحہ کو آئی سی یو میں شفٹ کر دیا گیا ہے۔ ونی بوٹل کی دو ضربیں اس کے سر کے پچھلے حصے اور گردن سے ذرا نیچے لگی تھیں۔ گولی اس کا بایاں شانہ چھو کر گزری تھی۔ وہ گولی اس کے دل، اس کے سر، اس کی آنکھ پر لگتی، اگر بوٹل کی ضرب سے وہ اپنا توازن کھو کر لڑکھڑا نہ جاتی۔۔۔ پھر وہ وہیں مر جاتی۔

کتنی ہی بار لیڈی مہر، سادھنا، شارلٹ، مورگن فون کر چکی تھیں، لیکن عالیان نے کسی سے بھی بات نہیں کی تھی۔ وہ بس خاموش کھڑا تھا۔ بچپن سے لے کر اب تک کی زندگی اس کی آنکھوں کے سامنے گھوم رہی تھی۔ وہ کھڑکی کے پاس کھڑا مارگریٹ کا انتظار کر رہا ہے۔۔۔ مارگریٹ کو سسکتے ہوئے سن رہا ہے۔ کڈز سینٹر کے کسی کونے میں چھپا بیٹھا رو رہا ہے۔۔۔ ماما مہر کے سینے سے لگا خود کو رونے سے روک رہا ہے۔ وہ جتنا کچھ بھی دیکھ رہا تھا ان میں خود کو دکھوں میں گھرا ہی دیکھ رہا تھا۔

پھر ان مناظر میں امرحہ آ گئی اور بار بار پلٹ کر آتی رہی۔۔۔ خود پر اختیار رکھتے اس نے امرحہ کو آنکھوں کے سامنے سے ہٹنے نہیں دیا، کیونکہ اسے یہ خوش فہمی لاحق ہوئی کہ ایسے وہ امرحہ کو زندہ رکھے ہوئے ہے اور

یہ ایک خوش آئند عمل ہے۔۔۔ جبکہ اسی دوران جب جب اسے ماما مارگریٹ تابوت میں آنکھیں بند کیے نظر آئیں تو وہ سہم کر چونک چونک جاتا۔ اسے بدشگون جانتا اور فوراً" نظرانداز کردیتا۔

کارل اور ویرا کتنے ہی طریقوں سے ڈاکٹرز اور اسٹاف کی منت کرچکے تھے کہ انہیں دور سے امرحہ کو دیکھ لینے دیا جائے، لیکن انہیں اجازت نہیں مل رہی تھی۔ رات چار بجے کے قریب کارل دس منٹ کے لیے ایک سینئر ڈاکٹر کے آفس میں گیا اور صرف پانچ منٹ کی اجازت لے کر باہر آیا۔ عالیان کا ہاتھ پکڑ کر اسے آئی سی یو ڈپارٹمنٹ کے اندر کیا اور ایک نرس آگے اسے امرحہ کے کمرے کے سامنے شیشے کے اس طرف لے آئی۔

وہ امرحہ کو دیکھنا بھی چاہتا تھا اور نہیں بھی، وہ یہ ہمت کر بھی رہا تھا اور نہیں بھی۔ اس نے سر جھکا رکھا تھا اور اسے اٹھانے کے لیے تیار بھی تھا اور نہیں بھی۔ کیونکہ کسی چلتے پھرتے انسان کو بے بسی سے زندگی اور موت کے بستر پر پڑے دیکھنا سب سے بدترین منظر ہوتا ہے۔ ایسے مناظر اپنی تاب میں بے مثال ہوتے ہیں۔

اس نے ایک ہاتھ پھیلا کر شیشے پر رکھا اور پھر دوسرا دس انگلیوں کی جھریوں میں سے ایک جھری پر اپنی آنکھ رکھ دی اور دوسری آنکھ کو تین انگلیوں کی اوٹ میں بند ہی رکھا۔ نقشین اخروٹی قد آدم آئینہ ہے جو ارغوانی پوشاک میں ملبوس، گھیردار فرشی دامن کو گھٹنوں سے ذرا سا اوپر اٹھائی امرحہ کو منعکس کررہا ہے۔ شفاف روشنی گندم کی بالیوں کی طرح اس کے ادھ گندھے بالوں میں جھوم رہی ہے۔

ڈریگن پریڈ سے پہلے وہ یہ خواب دیکھتا تھا۔

زخموں میں جکڑی اور مختلف مشینوں اور ٹیوبوں سے منسلک امرحہ کو اس نے دیکھا اور آنکھ بند کرلی۔۔۔ انگلی کی جھری سمیٹ لی، خواب کی کھڑکی کھول دی۔

"اس کے جوتے کا بکل بند ہونے میں نہیں آرہا اور اتنی گھیردار پوشاک اسے الگ سے تنگ کررہی ہے۔"

اس نے آنکھ کو کھولا اور اسے قطعاً" نہیں مسلا کہ وہ ٹھیک سے کام کرے۔ ایسے منظر کو دیکھنے کے لیے شفاف بینائی کی ضرورت بھی کسے تھی بھلا۔

دونوں ہاتھوں سے اس نے گھٹنوں سے ارغوانی ریشم کو پکڑ کر اٹھا رکھا ہے اور وہ نیچے بیٹھ کر اس کے جوتے کا بکل بند کررہا ہے اور پھر سر اٹھا کر مسکرا کر اسے دیکھتا ہے۔

"تم سے اتنا سا کام بھی نہیں ہوتا؟" وہ کہہ رہا ہے۔

"اگر ہوجاتا تو تم یہ شرف کیسے حاصل کرپاتے؟" آنکھیں ترچھی کرکے گردن کو ادا سے ذرا اور اٹھا کر اس نے کہا۔

آنکھیں بند رکھے گردن سیدھی کیے اس نے اب خاموش رہنا پسند کیا۔

اگر اسے اندر جانے کا موقع دیا جائے تو وہ آنکھوں پر پٹی باندھ لے اور صرف ہاتھ سے چھو کر اسے محسوس کرے۔

تم نے یہ پیغامات مجھ سے نہیں لیے تو میں نے یہاں باندھ دیے۔

"رک جاؤ۔"

"روک لو۔"

انگلیوں کی جھریاں اس نے پھر سمیٹ لیں اور اپنے جھکے شانوں اور بند آنکھوں اور اپنے اونچے قد کے ساتھ وہ ایک "دعا" میں ڈھلنے لگا۔

حمزہ توف کے گاؤں میں سفر پر جانے والوں کی بخیریت واپسی کے لیے چراغ دیپ محل میں رکھ دیے گئے اور پھر گاؤں بھر کی چوکھٹیں چراغوں سے سج گئیں۔۔۔ اور اب وہ یہ یقین رکھتے ہیں کہ ان کی لو میں دھیمی ہونے سے پہلے مسافر لوٹ آئیں گے۔ شیشے کی دیوار پر پھیلی ہتھیلیوں پر اس نے اپنا سر ٹکا دیا اور اس کا وجود "لو" میں بدلنے لگا اور دعا کے چراغوں میں جل جانے کو ہوا۔ جانے والوں کی راہ میں ایک ایک کرکے چراغ رکھے جانے لگے اور دور کہکشاؤں کے ہجوم کو چیرتی ان کی لوئیں "عرش معلیٰ" پر سجدہ ریز ہونے کو باوضو ہوئیں۔

دعا میرا کلام ہے۔
اس پر میرا اختیار ہے۔
قبولیت اس کا "جمال" ہے۔
جو میرا خدا ہے... جو میرا خدا ہے۔
اسے اب اس دعا سے ضروری کام کوئی اور نہیں تھا۔ اس کا ارتکاز بیرونی دنیا کی کوئی مداخلت نہیں توڑ سکتی تھی۔
کارل نرس کے ساتھ آیا' شاید نرس اسے شائستگی سے کہہ کر اور اس کا شانہ ہلا ہلا کر تھک چکی تھی۔ کارل نے اسے شانوں سے تھاما اور باہر لے آیا۔ لیکن دراصل وہ وہیں "مقام دعا" پر ہی کھڑا رہ گیا۔ وہ کسی کو یہ نہیں سمجھا سکتا تھا کہ اپنی من پسند جگہ پر موجود ہونے کے لیے وہاں ظاہرا "موجود ہونا ضروری نہیں۔
کارل نے اسے ایک جگہ بٹھا دیا اور خود بھی ساتھ بیٹھ گیا اور کتنی ہی دیر وہ اسے دیکھتا رہا' شاید وہ پوچھنا چاہتا تھا۔
"اتنی زیادہ محبت کرتے ہو تم امرحہ سے... اتنی کہ مر رہے ہو اس کے لیے؟"
ذرا دور بیٹھے ویرا اور سائی نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ویرا اپنی ہتھیلیاں مسلنے لگی' جو وہ نہیں کیا کرتی تھی' لیکن اب وہ سب ہو گا جو پہلے کبھی نہیں ہوا تھا' وہ اٹھ کر عالیان سے دور چلی گئی۔ اس کے لیے مشکل تھا اسے ایسے دیکھنا' کتنا کچھ زندگی میں ایک دم سے مشکل ہو گیا تھا۔ جیسے گن گن کر سانس لینا... کوئی کارل سمیت ان سب سے پوچھتا اب تک کتنی گنتی ہو پائی ہے۔

☆ ☆ ☆

"سادھنا! کمرے کی کھڑکی کھول دو۔" نشست گاہ میں بیٹھے انہوں نے کہا۔
"اتنی ٹھنڈ میں؟"
"ہاں... کھول دو' بلکہ سب کھڑکیاں کھول دو۔"
"آپ کو ٹھنڈ لگ جائے گی۔"
"ٹھنڈ لگ جائے کوئی غم نہ لگے۔" انہوں نے بڑی دل گرفتی سے کہا۔
دونوں کئی گھنٹوں سے خاموش نشست گاہ میں بیٹھی تھیں۔ سادھنا نے اپنی عبادت کی تھی اور لیڈی مہر نے اپنی... اور دونوں نے ایک ہی انسان کے لیے کتنی ہی دیر دعائیں کی تھیں... فون ان کے پاس ہی رکھے تھے اور جب بھی کوئی فون بجتا تھا تو دونوں ہی اسے اٹھانے کے لیے تیار نہیں ہوتی تھیں۔
لیڈی مہر اپنی آنکھیں پونچھ رہی تھیں۔

☆ ☆ ☆

آنکھیں بار بار صاف کرنے پر بھی خود بخود نم کیوں ہو رہی ہیں اور ان کے ہاتھ پیر کیوں کانپ رہے ہیں۔ سمجھ نہیں آ رہی۔ انہوں نے امرحہ کو فون کیا' لیکن اس کا فون بند جا رہا تھا۔ انہوں نے خود ہی سوچ لیا کہ میچ دیکھ رہی ہو گی۔ موبائل کی چارجنگ ختم ہو چکی ہو گی۔ چند گھنٹے انہوں نے مشکل سے گزارے۔ فون پھر بھی بند ہی ملا۔ اٹھ کر نفل پڑھے' دعا مانگی' لیکن دل پر گہری ہوتی افسردگی کم نہیں ہوئی... بس ان کا دل امرحہ میں ہی اٹکا تھا اور بس یہ ہی چاہت تھی کہ اس کی آواز سن لیں۔ انہوں نے سادھنا کو فون کیا۔
"امرحہ فون نہیں اٹھا رہی' تم ویرا یا این کا نمبر دو یا سائی کا۔"
سادھنا چپ ہو کر سوچنے لگی' پھر کچھ دیر بعد بولی۔
"وہاں سگنلز کا مسئلہ ہے شاید... میں این اور ویرا کو خود بھی فون کر رہی ہوں' کسی کا نمبر نہیں مل رہا۔ یہ بچے باہر جا کر لاپروا ہو جاتے ہیں۔ گھوم پھر کر واپس ہوٹل آئیں گے تو خود ہی کر لیں گے۔" سادھنا نے جھوٹ بولا۔
"میچ تو کب کا ختم ہو چکا ہو گا۔"
"ہاں... پر سنا ہے میچ کے بعد وہاں سڑکوں پر بڑا مارچ ہوتا ہے... میچ انگلینڈ جیت گیا ہے... تو شاید..." سادھنا کی زبان لڑکھڑا سی گئی۔
دادا نے فون بند کر دیا۔ ٹی وی پر چلنے والی برازیلا اسٹیڈیم میں ہونے والے تصادم کی چھوٹی سی خبر انہوں

نے دیکھی نہیں تھی اور ان کے علاوہ گھر میں کسی کو معلوم ہی نہیں تھا کہ امرحہ اس وقت برازیل میں ہے۔ دونوں کے درمیان کے معاملات زیادہ تر دونوں کے درمیان ہی رہتے تھے۔ دادا کو امرحہ کے علاوہ کسی کی پروا نہیں ہوتی تھی اور امرحہ کو دادا کے علاوہ کسی اور سے بات نہیں کرنی ہوتی تھی۔



مقام بے نام و نشان اور مکڑی کے سے جالوں میں گھرنے کی کیفیت۔

خاردار باریک تار سے جالوں کو کاٹ کاٹ کر وہ عاجز آچکی تھی۔ اندھیارے روشنائی پر حملہ آور تھے اور روشنی اندھیاروں سے پسپا.... کبھی اس کے پیر سخت زمین کو چھوتے اور کبھی وہ ڈگمگا جاتی اور کبھی وہ بے وزن شے کی طرح بے سمت تیرتی۔

لامکاں کی حالت تھی اور سفر گماں۔

اس کے دونوں بازو بالخصوص بایاں بازو ایسے جل رہا تھا جیسے وہاں دہکتے انگارے دبا دیے گئے تھے۔ وہ تھک چکی تھی۔ اوب چکی تھی، لیکن جال جیسے کاٹتے رہنا تھا۔ جتنی تیزی سے وہ کاٹتی اتنی ہی تیزی سے وہ اور بنتے چلے جاتے، جیسے لاکھوں کروڑوں مکڑیوں کو وہاں تاک لگا کر بٹھا دیا گیا ہو۔ انہیں اس کی سزا کے لیے یہ حکم دیا گیا ہو۔ اجالے سے منحرف اور تاریکی کے وفادار گولے اس پر داغے گئے اور اس کے سر کے پچھلے حصے میں تکلیف اٹھی۔ نامعلوم اتھاہ گہرائیوں کے دوسرے گولے بھی اس پر حاوی ہونے لگے۔ وقت کا سلطان "ابہام" روپوشی سے نکل آیا۔

سب گڈمڈ ہونے لگا اور جالوں نے یک دم اس کے پورے وجود کو اپنی لپیٹ میں لیا اور اسے ایک سمت گھسیٹنے لگے۔ اس کی ساری قوت ختم ہو گئی۔ اور خیال عقل و ذہن سے ماورا ہو گیا۔ شبیہات ابھرنے لگیں.... اشکال بننے لگیں اور اس کے راستے میں آنے لگیں۔

"اگر میں جوان ہوتا تو تمہارے ساتھ کرکٹ کھیل لیتا، لیکن میں تو بے چارا سا، بوڑھا سا انسان ہوں نا.... جلدی تھک جاتا ہوں۔"

آواز راستہ بنا کر آئی اور اسے چھو کر گزر گئی۔ دوبارہ پھر اس کے قریب سے گزری اور مٹ گئی۔ سڑکیں، عمارتیں، زمینی ٹکڑے، اجسام اور چیزیں اس کے اطراف سے آرپار ہونے لگیں۔

"مجھے ویرا کہتے ہیں، سپر پاور روس کو تو تم جانتی ہی ہو گی۔ میں اسی ملک کی سپر گرل ہوں.... لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم مجھے دی ویرا کہو۔"

ویرا کی اشکال مختلف زاویوں میں بن کر بکھر گئیں۔

وہ سائیکل سے گر گئی ہے۔ "تمہیں ہر حال میں ریس جیتنی ہے، میری ایک ٹانگ ٹوٹ جائے یا تمہاری دونوں۔"

زاویوں میں بٹی اشکال نے اسے بھگا لیے جاتے جال پر ہاتھ مارے، پر ہاتھ معلق ہی رہ گئے۔ سمت نامعلوم کی طرف سفر جاری رہا۔ ویرا کہیں پیچھے رہ گئی۔ نئی اشکال بننے مٹنے لگیں۔ اس نے سائی کو دیکھا اور کارل کے پاس سے گزری اور اسے ٹھنڈے برف سے پانی میں ڈوبنے کا جان لیوا احساس ہوا، اس کا خون جم گیا اور خاردار جال اس کے یخ گوشت میں گھسنے لگا۔ ٹھنڈ کا احساس ہر طرف پھیل گیا.... تکلیف حد سے سوا ہو گئی.... تیز روشنی اور گھپ تاریکی ہاتھ ملاتے اور چھڑاتے رہے۔

وہ یونی میں کھڑی ایڑی کے بل گھوم رہی ہے۔

اس کے کانوں میں شور بڑھ گیا، جیسے دھرتی پر موجود سارے حشرات کرلا رہے ہوں۔ اس کا سفر اور تیز ہو گیا۔ دھڑا دھڑ کئی اور گولے اس کی طرف اچھالے گئے۔ مکڑیوں نے اور پھرتیاں دکھائیں اور اسی دوران فرش سے اٹھتی عرش کی بلندیوں کو چھوتی ایک آواز اس کی یخ حساسیت سے ٹکرائی اور خدا کی پناہ میں اسے جا سمیٹنے کو ہوئی۔

وہ اندھا دھند بھاگ رہی ہے.... ٹکرا رہی ہے.... گر گئی ہے۔ خواب در خیال در خواب ہو گیا۔

آواز نے اس بار بلندیوں پر اور بلندیاں جمائیں اور

وہ عرش میں جابسنے کو ہوئی اور خط تقدیر سے کند تحریر انمٹ سے گزرتی صدائے "اے خدا" بلند سے بلند کرتی چلی گئی۔ بدنما دھاریوں سے آراستہ اور دلکشی سے انجان "راہ بے سمت" پر ایک شبیہ ابھری اور گزر گئی...... وہ پھر ابھری اور مٹ گئی اور ایسا لاتعداد بار ہوا۔

یہ کون ہے؟ خواب درخیال کی پہیلی وہ بوجھ نہ سکی۔

شکل پھر بنی' آواز پھر گونجی اور بدنما رنگوں کی دھاریوں میں شفاف روشنی بصورت "رضائے الٰہی" آشیانہ فلک پر مثل آفتاب طلوع ہونے کو ہوئی اور آخر کار وقت کی ملکہ "رمز حقیقی" نے آنکھیں کھول دیں۔

"امرحہ......!" شور بڑھ گیا' آواز دب گئی' لیکن خواب درخیال کی پہیلی اس نے بوجھ لی۔

"عالیان!" وہ بے بسی سے کراہنے لگی اور شدت سے دونوں ہاتھ چلا کر جالوں کا چھتا چاک کر ڈالا۔ بدنما دھاریاں دائرے میں سمٹنے لگیں اور دائرہ "آب الحیات" کی صورت اختیار کرتا چلا گیا۔

تاریکی نے نقاب الٹ دیا۔

چشم سیاہ نے چشم یار کو جالیا۔

جفت کا فرق مٹتا چلا گیا۔

اے ابن الوقت! ہاں میں نے بوجھ لیا۔

"عرش معلی" پر کس دعا نے جا سجدہ کیا۔

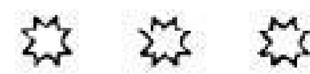
آنکھ کھول کر وہ کھولے ہی رکھنے کی متحمل نہ ہوسکی۔ بہت دیر بعد جب اس کی دوبارہ آنکھ کھلی تو وہاں سامنے کوئی نہیں تھا۔ ایک نرس اور دو ڈاکٹرز اس کا چیک اپ کر رہے تھے۔ اس کی رپورٹس پڑھ رہے تھے۔ ڈسکس کر رہے تھے۔ اس کا بی پی چیک کرتے نرس نے اسے مسکرا کر دیکھا اور اس کا گال تھپکا۔

"وقت تمہیں زندہ رکھے۔" مجھ سے کہا گیا تھا کہ میں تم سے یہ کہہ دوں۔ وہ ماحول کو پہنچاننے کی کوشش کر رہی تھی' لیکن صرف اس جملے کو ہی پہچان سکی اور اسے صرف یہ یاد رہ گیا کہ کس نے اسے یہ کہنے کے لیے کہا ہوگا۔ وہ پھر سے گہری نیند میں چلی گئی اور اگلی بار جب پلکوں کے غلاف پتلیوں سے اٹھائے تو بیڈ کے سامنے شیشے کی دیوار کے پار اسے کوئی کھڑا نظر آیا۔

"یہ کون ہے' جو ایسے کھڑا ہے جیسے اس کا کوئی پیارا مر چکا ہے۔"

اسے یہ پہچاننے میں تھوڑا وقت لگا' کیونکہ وہ عالیان تو تھا' لیکن عالیان جیسا نہیں تھا' تو یہ عالیان ہے...... اور اس کا کون عزیز مر چکا ہے؟

کیا بس...... اگر وہ عزیز میں ہوں تو میں مر چکی ہوں یا دراصل اب ہی زندہ ہوئی ہوں۔ اس نے بہت کوشش کی کہ وہ جاگتی رہے' لیکن اس کا دماغ پھر سے سونے لگا۔



اپنے دونوں ہاتھ اس نے شیشے پر رکھے ہوئے تھے۔ جیسے اسے چھو رہا تھا۔ اسپتال کا اسٹاف اب اس سے عاجز آچکا تھا۔ وہ اسے آئی سی یو کے اس کمرے کی گلاس وال کے سامنے کھڑے رکھنے کے لیے مجبور ہو چکے تھے۔ وہ لڑکا تھک رہا تھا نہ ہٹ رہا تھا اور اس کے دوستوں نے بھی ان پر غیر معمولی دباؤ ڈال رکھا تھا کہ ان میں سے ایک لڑکے کا دل کا کہنا تھا کہ آخر وہ ہوش میں کیوں نہیں آرہی...... اٹھ کر بیٹھ کیوں نہیں رہی۔ باتیں شاتیں کیوں نہیں کر رہی اور اس کا یہ سوال بھی خاصا اہم تھا کہ اتنا بڑا اسپتال جو ڈاکٹروں کی فوج سے بھرا پڑا ہے ایک ننھی سی لڑکی کو جلدی ٹھیک نہیں کر پا رہا۔

ننھی سی لڑکی بیڈ پر ان سب سے الگ اکیلی لیٹی ہے۔ اس سب سے انجان کہ باہر کی دنیا میں اب کیا کیا ہو رہا ہے اور اس سے بھی انجان کہ اب وہ اس کی دنیا مٹھی میں سمیٹے اسے کھڑا رکھے ہوئے ہے۔ یہ سزا اس نے اسے دی ہے یا اس نے خود اپنے لیے تجویز کی ہے۔

جس رات وہ ماما مارگریٹ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے بیٹھا رہا تھا تو دراصل وہ اس خوش فہمی میں مبتلا تھا کہ ایسے اس کی ماما اسے چھوڑ کر کہیں نہیں جائیں گی۔ پر

وہ چلی گئیں۔ اتنا بڑا ہونے پر وہ اس کے سامنے اسی لیے کھڑا ہے کہ وہ کہیں جا نہیں سکے گی۔ مسئلہ پہلے بھی وہی تھا، مسئلہ اب بھی وہی ہے۔ خوش فہمی کی کل سب معجزے رونما کروانے کا دم بھر لیتی ہے۔ اسے اس سے سروکار نہیں ہوتا کہ کیا ہو سکتا ہے اور کیا نہیں، اسے اس سے مطلب ہوتا ہے کیا ہونا چاہیے اور ضرور ہی ہو جانا چاہیے۔

جب ڈاکٹرز اس کا تفصیلی چیک اپ کر چکے تو وہ اندر صرف دو منٹ کے لیے جا سکا اور اس کے قریب جا کر اس کے دائیں ہاتھ کو آہستگی سے اٹھا کر اپنی ہتھیلی پر رکھا۔

"خدا مجھ پر بہت مہربان ہے امرحہ۔۔۔ اور مجھے اس پر شک نہیں۔"

دو منٹ تک وہ اس کا ہاتھ ہاتھ میں لیے کھڑا رہا۔

وہ آنکھ کھول نہیں پائی، لیکن ہمیشہ اس کی چاپ کی منتظر اس کی سماعت بازی لے گئی۔

"خدا مجھ پر بہت مہربان ہے امرحہ۔"

اس کے ہاتھ میں جو گرمی سرایت کر رہی تھی اور اس کے الفاظ میں جو ملائمت تھی، وہ لطیف رنگوں کی دھنک میں ڈھلتیں اس کی ہتھیلی پر پھوٹیں اور اس کے پورے وجود پر بصد شوق پنکھ پنکھ پھیل جانے کے سفر میں مبتلا ہوئیں۔

"یارم۔۔ یارم۔" کلام فارسی رباعیوں کے ہجوم سے اٹھا۔

"اب دنیا میں کون سی نعمت اس کے بعد ہے جو مجھے عطا کی جائے گی۔" اس نے سوچا۔

"یہ خواب ہے تو اس خواب کے نہ ٹوٹنے کی دعا ضرور کرنی چاہیے۔۔۔ اور اگر یہ حقیقت ہے تو اس حقیقت کے خواب نہ ہونے کی دعائیں بھی مجھ پر لازم ہیں۔"

کچھ اور وقت گزرا اور اس نے محسوس کیا کہ ایک نرم و نازک ہاتھ نے اس کے ہاتھ کو تھام لیا اور اس کی پیشانی کا بوسہ لیا۔

"میں زندگی میں کبھی نہیں روئی اور تم نے مجھے رلا دیا۔ سب خراب کاموں کی ذمہ دار تم ہو امرحہ!"

جب سائی آیا تو وہ سوئی جاگی سی تھی، وہ اسے خاموشی سے دیکھتا رہا اور چلا گیا۔ این کے بعد پھر کارل آیا۔

"خدا تم سے پوچھے امرحہ۔۔۔ خود تو تم مزے سے بیڈ پر لیٹی ہوئی ہو اور ہمیں تم نے باہر کھڑا کر رکھا ہے۔ باہر بیٹھنے کی جگہ تو بہت ہے، لیکن سونے کی نہیں اور میرے آس پاس کتنے ہی لوگ اپنی کھانے پینے کی چیزیں لیے گھومتے رہے اور میں نے کسی ایک پر بھی ہاتھ صاف نہیں کیا، بلکہ شرافت سے اپنے پیسوں سے لے کر کھاتا رہا، اگر تم چند اور گھنٹے اسی حالت میں رہیں تو مجھے خوف ہے کہ میں ایک فرشتہ صفت انسان بن جاؤں گا۔ مجھے فرشتہ بننے سے بچالو امرحہ!"

اور کھلتی بند ہوتی آنکھوں سے پریشان امرحہ پہلی بار مسکرائی۔

"اگر تم فرشتے بن بھی گئے تو بھی فرشتوں کے شیطان ہی کہلائے جاؤ گے۔" امرحہ نے سوچا۔

بہت زیادہ سوچنے کی اب ضرورت نہ رہی اور اس نے پاپا کو فون کیا۔

"پاپا آپ ٹھیک کہتے تھے۔" اس نے آواز میں ٹھہراؤ پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"کیا؟" وہ اس کے انداز سے چونک گئے۔ "امرحہ ٹھیک ہے نا؟"

"وہ ٹھیک ہو رہی ہے۔"

"تو تم کس بارے میں مجھے ٹھیک کہہ رہی ہو ویرا؟"

"کہ جو زیادہ عقل مند بنتے ہیں وہ کوئی ایک ایسی بے وقوفی ضرور کر گزرتے ہیں جو ان کی ساری عقل و ذہانت پر قہقہے لگاتی ہے۔"

"تو تم نے یہ بے وقوفی کی؟" انہیں بات سمجھنے میں ذرا سی بھی دیر نہ لگی کہ وہ کس بے وقوفی کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔

"ہاں۔۔۔" آواز کا ٹھہراؤ جاتا رہا اور اس کی آواز بھیگ گئی اور صرف اپنے باپ کے سامنے وہ رونے

لگی۔

"تمہیں خود کو مضبوط کرنا چاہیے۔" جب وہ کافی دیر تک رو چکی تو انہوں نے کہا۔

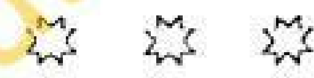
"مجھے تکلیف اس بات سے ہے کہ میں انجان رہی اور مجھے انجان رکھا گیا۔"

"کیا تم اس سب پر تلخی سے آنسو بہاتے رہنا چاہتی ہو؟ اگر میں تمہیں جانتا ہوں تو شاید نہیں۔۔۔ ویرا اس وقت تمہارا ردعمل ایک ایسے انسان کا سا ہونا چاہیے جو خود کو ایک طرف رکھ کر معاملات کو خوش اسلوبی سے تکمیل کی طرف لے جاتا ہے۔ کیا تم چاہتی ہو کہ تمہارے بارے میں یہ سوچا جائے کہ تم برف سی ٹھنڈی اور بے معنی ہو۔۔۔ تم میں جذبات کی وہ گرمی ہے ہی نہیں جس کی توقع ہم انسان ایک دوسرے سے کرتے ہیں۔"

ویرا خاموشی سے سنتی رہی۔

"تم نے ایک بار مذاق میں مجھ سے کہا کہ تم تجربات میں مجھ سے کہیں آگے نکل چکی ہو اور میں نے تم سے صرف اتنا کہا کہ انسان تجربات میں کیسا بھی "آدم کل" کیوں نہ ہو جائے، وہ کسی دوسرے انسان کے اندر کا بھید نہیں پا سکتا۔۔۔ مشکل سے چند ایک کا۔۔۔ ورنہ کسی کا بھی نہیں۔" ان کی اس دوران عالیان سے ایک بار بات ہو چکی تھی اور یہ جاننے میں انہیں زیادہ وقت نہیں لگا کہ امرحہ جو ویرا کی دوست ہے اور بقول ویرا' عالیان کی بھی دوست رہی ہے۔ وہ صرف دوست نہیں ہے۔

"ٹھیک کہہ رہے ہیں۔۔۔ اور عالیان کا بھید امرحہ ہے۔" اس بار وہ آواز سے رونے لگی۔ اس لیے نہیں کہ اس پر بھید کھل گیا تھا صرف اس لیے کہ دیر سے کھلا تھا۔



وہم یقین میں لپٹے ان کے دل پر کھل رہے تھے اور دادا کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ سادھنا کا ایک ہی جواب تھا کہ برازیلا میں چند وجوہات کی بنا پر حکومت نے مواصلاتی نظام بلاک کر دیا ہے۔ دادا کو برازیل کا معلوم تھا نہ ہی برازیلا کا' نہ ان کے حکومتی معاملات کا۔ انہیں اپنے دل کا پتا تھا جس پر گھبراہٹ اور خوف طاری ہو' ہو جاتا تھا۔ وہ سادھنا سے کئی بار کہہ چکے تھے کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے۔ اور جس وقت سادھنا کو یہ معلوم ہوا کہ امرحہ خطرے سے باہر ہے تو اس نے کہا۔

"اسٹیڈیم میں چھوٹا سا ہنگامہ ہوا تھا فینز کے درمیان۔۔۔ امرحہ تھوڑی سی زخمی ہو گئی ہے۔ خوف سے بے ہوش ہے۔" اور اتنے جھوٹ کی آمیزش ہوا سچ سن کر بھی دادا کو کھڑے رہنے کے لیے دیوار کا سہارا لینا پڑا۔

"اور۔۔۔"

"امرحہ ٹھیک ہے دوائیوں کے زیر اثر سو رہی ہے۔"

"تم جھوٹ بول رہی ہو۔۔۔ تم اب بھی جھوٹ بول رہی ہو۔"

سادھنا چپ کر گئی۔ یہ سب جھوٹ وہ ان ہی کے لیے بول رہی تھی کہ وہ اتنی دور ہیں امرحہ سے' زیادہ سچ ان کی جان پر برا صدمہ ثابت ہو گا۔

دوسری طرف اسپتال میں موجود شاہ ویز مانچسٹر واپس جا چکا تھا۔ ویرا کی روسی تلفظ کی تیز انگلش دادا کو بالکل سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ سائی کے چھوٹے چھوٹے سادہ جملوں سے بھی دادا کی تسلی نہ ہوئی۔ وہ تیز تیز اور مسلسل اردو بولتے جا رہے تھے' جو سائی اور ویرا کو سمجھ نہیں آ سکتی تھی۔ ویرا اور سائی کی جتنی بھی بار دادا سے کبھی بات ہوئی تھی تو درمیان میں امرحہ نے مترجم کے فرائض انجام دیے تھے۔ وہ دونوں اشاروں سے انہیں پرسکون رہنے کے لیے کہہ رہے تھے۔ لیکن سب بے کار جا رہا تھا۔ وہ بار بار اپنی گیلی آنکھیں صاف کر رہے تھے اور ان سے ایک ہی بات کہہ رہے تھے۔ کہ انہیں فوراً" امرحہ سے ملوایا جائے۔ سائی ٹیبلٹ عالیان کے پاس لایا۔

"تم امرحہ کے دادا سے بات کر لو' تمہیں اردو آتی

ہے۔ انہیں ہماری کوئی بات سمجھ میں نہیں آرہی۔"
آنکھیں مسل کر وہ ٹیب لے کر ایک پرسکون گوشے میں بیٹھ گیا۔ گلے کو کھنکار کر آواز کو کچھ صاف کیا اور پھر دادا کو سلام کیا اور کہا۔

"امرحہ ٹھیک ہے۔ دوائیوں کے زیر اثر سو رہی ہے۔ جلد ہی جاگ جائے گی۔ اسپتال کے رولز سخت ہیں، ہم ابھی اس کے پاس نہیں جاسکتے۔" سائی اسے یہ ہی سب کہہ گیا تھا، کہنے کے لیے اور اس نے یہ ہی کہہ دیا۔

دادا خاموش سے ہوگئے اور انہیں یہ معلوم کرنے میں وقت نہ لگا کہ امرحہ دراصل کتنی زخمی ہے۔ جو شخص اپنے انداز کو عام بنا کر یہ جھوٹ بول رہا ہے کہ وہ دوائیوں کے زیر اثر سو رہی ہے، وہ کس خاص غم پر سوگ منا تا، کئی وقتوں کا جاگا لگ رہا ہے۔

ایک ہی دکھ کو جھیلتے دو لوگ آمنے سامنے آگئے۔ دادا کے خدشات کی تصدیق صرف عالیان کی طرف دیکھ لینے سے ہی ہوگئی کہ امرحہ کتنی زخمی ہوگئی ہوگی، لیکن اب یہ جان کر بھی وہ ویسے زخمی نہیں ہوئے جیسے کچھ دیر پہلے مختلف وسوسوں کے ہاتھوں ہو رہے تھے۔

"وہ زخمی کیسے ہوئی؟ ایک دوسرے کو جب دو لوگ خاموشی سے تکریم دے چکے تو دادا نے پوچھا۔"

"وہ... زخمی..." اس کی زبان لڑکھڑا گئی اور دادا سے اس کے اس تاثر میں چھپے غم کی تاب لانا محال ہوگیا۔

"مجھے یاد نہیں۔" خود کو بے تاثر رکھتے اس نے کہا۔

وہی پرانا المیہ کہ کون ہے جو ان لفظوں کی ادائیگی کرنا چاہتا ہے جو اپنے کسی پیارے کی تکلیف سے لبالب ہوں۔ داستان حیات کے ان پنوں کو تو کورا رکھنے کو ہی جی چاہتا ہے۔

"یاد نہیں؟" دادا نے خود کلامی کی اور اب تک کی زندگی کے تجربات ان کی مٹھی میں سمٹ آئے۔ نقطوں نے تصویر بنا ڈالی اور اس تصویر کو پوشیدہ رکھنے پر انہوں نے خود اپنا ہی مباحثہ کیا۔

"امرحہ نے نیند کی گولیاں کھالی تھیں اور ان کے دوست نے ان سے پوچھا تو انہوں نے کہا۔" پتا نہیں۔ انہیں سب پتا تھا، لیکن ایسی تفصیلات کو دہرانا ان کے لیے تکلیف دہ تھا۔

دنیا کے ایک حصے ادھر لاہور میں ایک شخص اپنے کمرے میں موجود ہے۔ ادھر دنیا کے دوسرے حصے کے اسپتال میں ایک دوسرا شخص موجود ہے۔ اور ان دونوں اشخاص پر ایک نظر ڈال کر دادا نے جان لیا کہ اسپتال میں بیٹھا وہ شخص ان سے کہیں آگے کی بازی لے گیا ہے۔ امرحہ پر گزری تکلیف کو بھلاتے وہ اپنی یادداشت کھو بیٹھنا چاہتا ہے۔

ٹھیک اسی وقت سب سوال، ساری تشویش، سب کا سب کچھ غیر ضروری ہوگیا۔ وہ جان گئے کہ اب اس میں کیسا شک کیا جائے کہ وہ ایک ایسے انسان سے ہم کلام ہیں جس کی آنکھوں میں احترام ہے اور الفاظ میں رحم دلی... جو ان سے ہم کلام ہے تو ان کے زخموں پر مرہم رکھ رہا ہے اور جس کی خاموشی سراپا مناجات ہے اور مزید انہوں نے سوچا کہ اب بھی اس وہم کو کیونکر تحلیل نہ کر دیا جائے کہ وہ آدمیوں کے ہجوم میں ایک انسان نہیں ہے... بلکہ اس یقین کو کسی معتبر ہستی کی طرح گلے سے کیوں نہ لگا لیا جائے کہ اس ہجوم آدمیت میں وہی تو ایک انسان ہے۔

"تم عالیان ہو؟" جان تو چکے تھے، بس یہ سوال اسے احترام دینے کے لیے پوچھا۔ عالیان نے سر ہلایا۔

"امرحہ ٹھیک ہے عالیان؟ اس بار انہوں نے یہ پوچھا۔

"جی... اور وہ ٹھیک ہی رہے گی۔" اس نے عجلت پسندی سے کہا اور یہ جواب آسمانی فرشتوں کو سنانے جیسا ہوگیا کہ دیکھو اگر کوئی اور ارادہ باندھ رہے ہو تو سن لو میں نے دعا کی ہے۔ میں نے تکرار نہیں کی، لیکن ہاں میں نے خدا کی ہاں کی علامتیں دیکھی ہیں۔ وہ انکار نہیں کرتا اور صبر کی تلقین کرتا ہے اور میں نے صبر کا یہ پیغام ہاں کے ساتھ اترتے پایا ہے۔ اس کے اس آخری رد عمل سے دادا کے اندر شفافیت بھر گئی اور اس پیمانے کو جو ہر انسان کی طرح ان کے ہاتھ میں بھی تھا کو

انہوں نے ایک طرف رکھ دیا۔

یہ ایک انسان کی دوسرے انسان پر وارد ہونے کی واردات تھی' اسے کسی پیمانے سے جانچنا اس عمل کی تذلیل ہوتی۔ دادا نے زندگی میں پہلی بار اس جذبے کو قریب سے محسوس کیا کہ کیسا پیارا لگتا ہے کہ جو ہمیں پیارا ہو وہ کسی اور کو بھی اتنا ہی پیارا ہو۔ وہ اس احساس سے حاسد نہیں ہوئے اور اپنے اندر اترنے والی جانکاری کی روشنی کو انہوں نے بے دخل نہیں کیا۔



مانچسٹر یونیورسٹی کے ڈین اور انتظامیہ ان لوگوں سے مسلسل رابطے میں تھے اور یونی ورسٹی انتظامیہ سے دو لوگ برازیل ان سب کے پاس آچکے تھے' تاکہ ہر طرح کی سہولت کو ان کے لیے ممکن بنا سکیں۔ ڈین وقفے وقفے سے ان سے اپ ڈیٹس لے رہے تھے۔

یونی ورسٹی نے اپنے اٹھائیس طلبا کے زخمی ہونے کا آفیشلی اعلان کر دیا تھا۔ جن میں بیس معمولی سے زخمی ہوئے تھے اور آٹھ معمولی سے ذرا زیادہ اور ان آٹھ میں صرف امرحہ تھی جسے گولی لگی تھی۔ امرحہ کے علاوہ باقی کے پانچ بھی اسپتال میں ہی ایڈمٹ تھے اور باقی کے بائیس مانچسٹر واپس جا چکے تھے۔

حکومتی سطح پر ان سب کو وی آئی پی سہولتیں دی جا رہی تھیں۔ حادثے کے نقصانات کیا کیا رہے اور فوائد کس کے حصے میں آئے۔ یہ پیچیدہ بحث ٹی وی' اخبارات' سوشل میڈیا میں ہر طرف جاری تھی۔ حادثے کے چھ گھنٹے کے اندر اندر تفصیلات سامنے آ گئی تھیں۔ ساتھ فائر اسٹیڈیم کے باہر سڑک پر کیے گئے۔ اسٹیڈیم کے اندر اور باہر جو کچھ ہوا وہ سب پلان تھا۔ نشانہ غیر ملکیوں کو بنایا گیا کہ برسر اقتدار سیاسی پارٹی کے خلاف طوفان کھڑا کیا جا سکے اور بالخصوص ڈیفنس منسٹر کو استعفیٰ کے قریب کیا جا سکے۔

حکومتی نمائندے بار بار ان اسپتالوں کے چکر لگا رہے تھے۔ اسی دوران ویرا اور کارل نے ایک پریس کانفرنس میں حصہ لیا اور پریس کانفرنس میں کارل نے صحافیوں کو ایسے اپ ڈیٹ کیا کہ ایک صحافی نے دوسرے کے کان میں پوچھا۔

"یہ کسی بڑی سیاسی شخصیت کا "ڈیرسن" تو نہیں' کسی اور کو بولنے ہی نہیں دے رہا۔"

"اس کے بولتے کسی اور کے بولنے کی ضرورت رہ گئی ہے کیا؟" وہ ہنسا۔

پریس کانفرنس کے بعد کارل نے چند ٹی وی چینلز کو انٹرویو بھی دیے اور جب امرحہ خطرے سے نکل آئی تو وہ ایک لائیو شو میں شریک ہوا اور تصادم کا ایسا منظر کھینچا کہ سب نے جان لیا کہ کارل سے زیادہ اس تصادم کا کوئی عینی شاہد ہو ہی نہیں سکتا۔ باقی سب بھاگ دوڑ رہے تھے۔ ایک صرف وہ ذہین و حاضر دماغ انسان تھا جو اطراف کا باریک بینی سے جائزہ لے رہا تھا۔ اس بے چارے نے اپنے سر اور جسم کے باقی حصے پر لاتعداد بوتلیں کھائیں' لیکن کتنے ہی کمزور دل افراد کو بحفاظت تصادم سے دور محفوظ کیا اور کتنے ہی گرے ہوؤں کو اٹھایا اور ایک ماسک پہنے فائر کرنے والے کے سر پر گھونسا مارا۔ آنسو گیس اچھالنے والوں کو لاتیں ماریں اور کتنے ہی فتنہ سازوں کو اس نے گھسیٹ گھسیٹ کر سیکیورٹی فورس کے حوالے کیا۔

اس کی کمر پر زخم آئے۔ اس کی کہنیاں چھل گئیں۔ اس کے سر سے خون نکلا' لیکن اس نے کسی زخم کی پرواہ تک نہیں کی۔ ساتھ ہی اس نے چند ایسی باتوں کا اضافہ کر دیا جو اس پورے تصادم میں کہیں بھی نہیں ہوئی تھیں۔

ان سب کو اتنا کچھ بتاتے وہ انہیں یہ بتانا بھول گیا شاید کہ میچ شروع ہونے سے پہلے وہ خود ایسا ہنگامہ کروانے کا سوچ رہا تھا' اور اس کی کتنی خواہش رہی تھی ایسے منظر کو براہ راست دیکھنے کی' میچ تو اس نے کئی بار دیکھا تھا' یہ سب تو نہیں دیکھا تھا نا۔

اگر برازیلین یہ جان لیتے کہ جس پورے تصادم کا وہ اکیلا ہیرو ہونے کا دعویٰ کر رہا ہے تو در اصل اس کی کالی زبان سے نکلے لفظ سچ ہو گئے اور برازیل اسٹیڈیم پر آفت ٹوٹ پڑی تو آفیشلی اسے "کارل دی منحوس

مارا" کا خطاب دے دیتے اور اس کے پاسپورٹ پر Banned tilla fter Death کا ٹھپہ لگا دیتے۔

اس لائیو شو میں اس کی دھواں دھار پرفارمنس دیکھ کر کئی دوسرے چینلز اسے کال پر کال کرنے لگے اور اس نے تھوڑا تھوڑا وقت سب کو دے دیا اور ساتھ یہ بھی بتا دیا کہ وہ مانچسٹر یونی کا اسٹوڈنٹ ہے اور اسٹوڈنٹ لون جلد سے جلد اتارنا چاہتا ہے۔ (ان کی مدد سے) تو یوں اخبارات' ٹی وی اور سوشل میڈیا میں وہ اتنی بار اور ایسے آیا کہ اگر کارل چاہتا تو آرام سے مانچسٹر میں الیکشن جیت سکتا تھا۔

گولی امرحہ کو چھو کر گئی اور مشہور وہ ہو گیا۔

مزید یہ کہ ایک چینل نے اس تصادم کا دباؤ کم کرنے کے لیے ایک نیم مزاحیہ لائیو پروگرام ترتیب دیا۔ جس میں ہلکے پھلکے انداز سے یہ بتایا جانے والا تھا کہ اگر ایسی صورت حال کا کوئی شکار ہو جائے تو اسے کس رد عمل اور حاضر دماغی کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔ تو کارل نے بچہ' بچی' لڑکا' لڑکی' انکل' آنٹی' ہپی شپی' ہر ایک کی جگہ خود کو رکھ رکھ کر بتایا کہ کیا کیا ہو جانے پر کس رد عمل کا اظہار کرنا ہے۔ پہلے وہ ایک نک چڑی فیشن کی دلدادہ لڑکی بنا اور اس کے سر پر بوتل ماری گئی اور نک چڑی نخریلی لڑکی جس طرح منہ بناتی پلٹی اور مارنے والے کی طرف ناخن تیز کرتی لپکی۔ اس نے شو میں بیٹھے ناظرین کو ہنسا ہنسا کر مرنے کے قریب کر دیا۔

فلور پر کھڑا کارل رکا اور انگلی اٹھا کر نا کا اشارہ کیمرے میں دیکھ کر کرنے لگا۔ اور بولا۔

"ایسے تو وہ آپ کے سر پر دو' تین بوتلیں اور مار دے گا۔۔۔ تو یہ رد عمل ٹھیک نہیں ہے۔۔۔ شکر ادا کریں کہ آپ کو صرف ایک بوتل پڑی ہے اپنے سر پر دونوں ہاتھ رکھ کر اسٹیڈیم سے نکلنے کی کوشش کریں اور اپنے ناخنوں کو ہتھیار سمجھنا چھوڑ دیں' اگر یہ ہتھیار ہوتے تو فوج میں سپاہیوں کی جگہ بلیاں بھرتی ہوتیں۔"

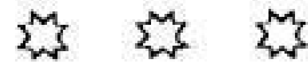
قہقہوں کا طوفان تھمنے میں نہ آیا اور سائی کے پھیپھڑے پھٹنے کے قریب ہو گئے۔ وہ سب اس دباؤ سے نکل آئے تھے جو امرحہ کو لے کر ان پر رہا تھا۔ یہ اس رات کی بات ہے جس دن امرحہ کو روم میں شفٹ کر دیا گیا تھا۔

شو کے بعد اسے مانچسٹر سے اپنے پروفیسر کا فون آیا۔

"میں نے اور میری بیوی نے زندگی میں پہلی بار تمہاری حرکتوں کا مزا لیا ہے۔ میں ہنستے ہنستے صوفے سے گر گیا اور میری بیوی سینڈوچ کھاتے کھاتے ٹامی (کتا) کا کان منہ میں لے بیٹھی۔۔۔ تم اتنے ہی کیوٹ تھے ہمیشہ سے یا میری نظر کمزور رہی ہے؟"

جواب میں کارل نے لمبا قہقہہ لگایا۔ "افسوس ہے پر یہ ہی سچ ہے۔ آپ کی نظر ضرورت سے زیادہ کمزور رہی ہے۔۔۔ ویسے مانچسٹر واپسی پر میں ٹامی کی خیریت پوچھنے گھر آسکتا ہوں کیا۔۔۔ ساتھ ڈنر بھی کر لیں گے۔"

پروفیسر دیر تک ہنستے رہے۔ "آجانا ڈنر کے لیے۔۔۔ ویسے ٹامی بالکل ٹھیک ٹھاک ہے۔ امید ہے تمہاری آمد کے بعد بھی ٹھیک ہی رہے گا۔"



اسے روم میں شفٹ کر دیا گیا تھا۔ ویرا اور سائی اس کے ساتھ رہے۔ این' ڈیرک' دائم' نوال اور باقی یونی فیلوز آتے جاتے رہے۔ ان سب کی رات کی فلائٹ تھی جو واپس جا چکے تھے۔ وہ ویڈیو کال سے اس کا احوال پوچھتے رہے۔ ڈین اور انتظامیہ نے بھی اس سے بات کی۔

کارل صبح سے اس کے پاس ہی تھا' پھر وہ ہوٹل تیار ہونے چلا گیا' اسے اسٹوڈیو جانا تھا۔ جانے سے پہلے وہ وقفے سے امرحہ کو پھول دیتا رہا جو بقول سائی وہ ادھر ادھر سے گول کر کے لاتا رہا تھا۔

اس دوران عالیان کونے میں رکھی کرسی پر خاموشی سے بیٹھا رہا اور جب ویرا اور سائی بھی چلے گئے تو وہ اپنی کرسی اس کے بیڈ کے قریب لے آیا۔ اس وقت تک امرحہ سو چکی تھی۔ اس کے سر میں درد سے ٹیسیں اٹھتیں اور اس کی آنکھیں بار بار بند ہو' ہو جاتی

تھیں۔ انجکشن لگنے اور دوا کھانے کے ایک گھنٹے کے اندر اندر سے نیند آجاتی۔۔۔ نیند گہری نہیں ہوتی تھی۔ وہ درد سے سوتی جاگتی رہتی تھی۔ اسے الٹے سیدھے خواب آتے اور وہ ڈر کر یا چونک کر جاگ جاتی۔

ساری دنیا سو جائے اور ہم کچھ چرالے جائیں۔ عالیان اس کیفیت میں تھا اور وہ امرحہ کو دیکھتے اس کی تصویریں چرا رہا تھا۔

دن نے شام کو آواز دی اور شام رات کے انتظار پر ختم ہوئی۔

وہ خاموشی سے اس کی تصویریں چراتا رہا۔ انہیں من پسند وقت تک تکتا رہا اور پھر ان پر اپنا نام ثبت کرتا رہا۔ کون یہ اعتراض کرسکے گا' اب کہ وہ اس کی ملکیت نہیں ہیں۔ اس نے ذرا دیر کو آنکھیں بند کیں اور پھر کھولیں کہ اسے عین سامنے پانے کے احساس کو پھر سے چھو سکے۔ پھر اس نے اس کی دائیں ہتھیلی کھولی اور اپنی انگلی سے اس کی ہتھیلی پر "تحریر حُب" لکھنے لگا۔ پھر اس کی انگلی موقلم (برش) بن گئی اور وہ ایک تمثال گر (مصور) بنتا چلا گیا۔

زمانہ حال کے امرحہ عالیان زمانہ قدیم کے اونچی فصیلوں کے شہر میں آمنے سامنے آکھڑے ہوئے۔ سنگ ہجراں منہدم ہونے لگے اور شہر نے عروس البلاد (خوب صورت شہر) کا بھیس بدلنا شروع کردیا۔۔۔ چاندی کے گلاب پاشوں کے منہ کھول دیے گئے اور انہیں ان کے پیروں کے اطراف لڑکھڑا دیا گیا۔ عطر بیز گروہوں میں باادب ہوگئے اور گلاب کی پتیاں سنہرے چمکیلے تھالوں سے چھنتے ان کے سروں سے فضا میں اچھالنے لگے۔

میں ایک تمثال گر۔۔۔

تحریر ناتمام کو اپنے موقلم سے تصویر کامل میں رنگتا چلا گیا۔

"عشق۔۔۔" جس سنگھاسن پر بسرام ہے۔

میں اس سنگھاسن پر قابض ہوتا چلا گیا۔

فصیلوں پر مشعلیں روشن کردی گئیں اور دہلیزوں اور چوکھٹوں' چھتوں اور شہ نشینوں میں نفیس اور پاکیزہ پوشاکوں میں لوگ سمٹ سمٹ آنے لگے۔ ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹیں غالب ہیں اور آنکھوں میں شوق دید کی چاہ۔ ان کے گھروں کے اندر نقشین تھالوں کے تھال "شیرنی" سے سجائے رکھے گئے ہیں۔

کیونکہ۔۔۔ اس نے ایک دم سے رنگ بکھیرتے موقلم کو مٹھی میں جکڑ لیا۔ اور اپنی آنکھیں کھول دیں۔

"میں ایک امرحہ۔۔۔

اپنی ہستی تمثال گر کے رنگ دار موقلم سے سجاتی چلی گئی۔

"عشق۔۔۔" جس سنگھاسن پر بسرام ہے۔

"میں اس سنگھاسن پر اس کے سنگ قابض ہوتی چلی گئی۔"

لفظوں کی فی الحال ضرورت باقی نہ رہی۔ وہ اسے دیکھ رہی تھی اور وہ سر جھکائے اب اس کی ہتھیلی کی پشت پر وہ رنگ بکھیر رہا تھا جو دنیا کی کسی دکان سے نہیں خریدے جاسکتے۔ پھر اس نے سر اٹھایا اور اس کی اس مسکراہٹ کو جالیا جو اس کے کینوس کے محراب پر بکھری تھی اور ساتھ وہ بھی ایسے مسکرانے لگا جیسے زندگی میں کبھی اسے ایک کانٹا بھی نہ چبھا' ہو دکھ کی تعریف اس نے صرف لغت میں پڑھی ہو۔

"حمزہ توف کے گاؤں سے جانے والے سب ہی مسافر چراغوں کی لوئیں دھیمی ہونے سے پہلے لوٹ آئے ہیں۔ انتظار کو انہوں نے انتظار ہی رہنے دیا' فراق میں نہیں بدلا۔"

"تم نے میرے ہاتھ پر کیا بنایا ہے؟" کتنے لمبے عرصے بعد گفتگو کا آغاز ہوا۔ امرحہ نے پہلا سوال پوچھا۔

"خود کو۔۔۔" اس نے وہ جواب دیا جس کے بعد کسی اور سوال کی ضرورت ہی باقی نہ رہی۔

"خود کو۔۔۔" اس نے انجانی خوشی سے کئی بار زیر لب اس جواب کو دہرایا' اور جانا کہ اس کے سوال کا اس سے خوب صورت جواب کوئی اور ہوتا تو کتنا بد صورت ہوتا۔ اس نے خود کو اس کی دسترس میں دے دیا۔۔۔ خود کو اس میں رقم کردیا۔

جھالروں کو کناروں میں پیوست رکھے چمکتے دمکتے سرخ و سبز باریک تھال پوشوں کو اتار لیا گیا اور تھالیوں کو چھتوں اور شہ نشینوں، دہلیزوں اور چوکھٹوں میں تقسیم ہو جانے دیا۔

امرحہ نے محسوس کیا کہ مسرت نقرئی قہقہے لگاتی اس کے وجود میں اہتمام سے سرایت کر رہی ہے اور اس بار اس کا قیام عارضی نہیں ہو گا' یقیناً" نہیں ہو گا۔

اس نے چاہا کہ وہ چھلانگ لگا کر بیڈ سے کود جائے اور کھڑکی سے باہر خود کو نکال کر پوری قوت سے چلا کر پوچھے۔ "کیا اس وقت دنیا میں مجھ سے زیادہ خوش قسمت انسان کوئی ہے؟"

"ہے... اچھا پھر یہ بتاؤ کیا تمہارے پاس عالیان ہے۔"

لیکن اس نے یہ سب نہیں کیا' کیونکہ اسے کچھ اور کرنا اور کہنا تھا۔

"تم نے تو کہا تھا میں تمہارے لیے مرچکوں جیسی ہوں۔ میں مر بھی جاؤں گی تو بھی تمہیں فرق نہیں پڑے گا۔" امرحہ اپنی ساری تکلیف بھول چکی تھی لیکن حیرت انگیز طور پر اسے یہ سب اپنے نام کی طرح یاد تھا۔ وہ آگے بڑھنے سے پہلے پچھلے حساب چکانا چاہتی تھی۔

لفظ گر چکے جیسے عالیان پھر سے نیم مردہ سا ہو گیا اور اداسی سے بولا۔ "ہاں مجھے صرف فرق ہی نہیں پڑا۔"

"تم ایک برے انسان ہو۔" امرحہ ذرا سا اٹھ کر ٹیک لگا کر بیٹھ گئی اور یہ کرتے اس نے جان بوجھ کر عالیان کی مدد نہیں لی۔

"بلاشبہ... میں ایک برا انسان ہوں۔" عالیان نے بہت آرام سے مان لیا۔

"تم انتہائی بددماغ اور غصیلے انسان ہو۔" پہلے جملے سے امرحہ کی تسلی نہیں ہوئی۔

"ہاں... اور میں دیوانہ سا بھی ہوں۔" عالیان نے اس کی تسلی کرنی چاہی۔

"تم ضدی اور ہٹ دھرم ہو۔"

"بالکل! اور میں بہت بدتمیز بھی ہوں۔"

"ہاں! تم نے ابھی تک بات کرنے کی تمیز نہیں سیکھی۔ تم اتنے... کتنے سارے بڑے ہو گئے ہو' لیکن ابھی تک اتنا برا سا منہ بسور لیتے ہو' تمہاری آنکھوں کی سختی بارود کی طرح محسوسات کے پرخچے اڑا دیتی ہے۔"

"ہاں... بلاشبہ تم سچ کہہ رہی ہو۔" اس نے کہا جبکہ امرحہ کے ذخیرہ الفاظ پر وہ ہنسنا چاہتا تھا۔

"تمہارا دل پتھر کا ہے۔"

"نہیں... میں سارے کا سارا ہی پتھر کا انسان ہوں۔"

آگے امرحہ کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اور اسے کیا کیا کہے۔ جو یونی ورسٹی کی محراب میں اسے سمیٹے کھڑی تھی۔ وہ اب اسے اس کی برائیاں گنوا رہی ہے اور اسے بتا رہی ہے کہ وہ کس قدر برا ہے... کہا جاتا ہے کہ عورت شکوے کا دوسرا نام ہے اور میں یہ کہتی ہوں کہ محبوبہ 'شکوے کا پہلا نام ہے۔"

"میں نے سنا کہ تم مجھے آوازیں دے رہے ہو اور تمہاری آواز فرش سے عرش تک اٹھتی جاتی ہے۔"

عالیان کی برائیاں ختم ہو گئیں یا اس کی یادداشت جاتی رہی۔ اگلی بات اس نے یہ کہی اور بے آواز رونے لگی اور اسی رونے کے دوران اس نے فیصلہ کیا کہ اسے عالیان کے ساتھ انتہائی سخت رویہ اپنانا چاہیے۔ کم سے کم اتنے وقت تک کے لیے جتنے وقت عالیان نے اپنائے رکھا۔

"تم میرا ہاتھ چھوڑ دو اور سن لو میں کئی سالوں تک تم سے بات نہیں کروں گی۔"

اور عالیان جو بہت دل گرفتی سے اسے روتے ہوئے دیکھ رہا تھا اور سوچنے لگا تھا کہ شاید وہ اسے ناپسند کرنے لگی ہے' اس کی اس بات پر ہنس دیا۔

"ٹھیک ہے مت کرنا بات' لیکن صرف اتنا بتا دو امرحہ! میرے ساتھ تو رہو گی نا؟"

"نہیں۔" امرحہ نے فوراً" انکار کر دیا۔

"یہ بھی ٹھیک ہے... پھر میں تمہارے ساتھ رہ لوں گا۔" امرحہ کی گیلی پلکوں کو اس نے انگلی کی پور سے

خشک کرتے ہوئے کہا۔
"نہیں۔۔۔" اس نے پہلے سے زیادہ سختی سے کہا۔
اور عالیان نے اسے اس کی ادا جانا اور اسے بتانا چاہا کہ اب دنیا میں کوئی ایسی جگہ نہیں رہی، جہاں امرحہ اسے چھوڑ کر رہ سکے اور وہ اسے وہاں رہنے بھی دے۔
"میں اس بات پر قائم رہوں گی۔" عالیان جواب میں خاموش ہی رہا تو اس نے اسے یاد دلایا کہ "نہیں" کا مطلب کیا ہوتا ہے۔ "نہیں ہی۔۔۔"
"عالیان پھر ہنس دیا۔" اس بار نہیں کا مطلب نہیں، نہیں ہے امرحہ، ہوا بھی تو میں اس نہیں کو قبول نہیں کروں گا۔" اس نے اس کے ہاتھ کو اپنی دونوں ہتھیلیوں کے درمیان نرمی سے رکھا۔
"سنو امرحہ! میں نے ایک اچھی دعا مانگنا سیکھ لیا ہے۔ میں نے جان لیا ہے کہ ہمیں کس ساعت میں دیر تک قیام کرنا ہے کہ ہم اس ساعت کو جالیں جو خدا کی رضامندی سے لبریز ہوئی ہوتی ہے کہ ہمیں ہماری پسندیدہ نعمت عطا کر دی جاتی ہے۔ میں نے ان نعمتوں کا شمار کرنا چاہا جو مجھے عطا کی گئیں۔ اور میں نے ماما کے بعد تمہارا نام لیا۔ میں نے خدا کو یہ بتایا کہ اس کی مہربانی مجھ پر کیسے ظاہر ہوئی۔ (تمہاری صورت) یہ بھی سنو امرحہ کہ میں نے جان لیا ہے بہاروں کا ہمیشگی قیام کسے کہتے ہیں۔ یہ ایک امرحہ کا ایک عالیان کے پاس ہونے کو کہتے ہیں۔ مجھے معلوم ہوا کہ خوشنما تخلیقات کی خوشنمائی کا راز کیا ہے۔ یہ ایک امرحہ اور ایک عالیان کا ساتھ ہے۔
میں نے اس حقیقت کی تفصیلات پالیں کہ کوئی چال، کوئی پینترا کارگر نہیں کہ جو دل پر آزمایا جائے اور یہ ہمارے اختیار میں رہے، اور دنیا میں کوئی حکمت ایسی نہیں، جو اس میں داخل ہو جانے والے کو نکال باہر کرے اور یہ ممکن کر دکھائے کہ میرا جو حصہ تم میں ہے وہ تم واپس کر سکو اور میرے پاس جتنی ادھوری، مکمل تم ہو وہ میں تمہیں لوٹا سکوں، اور ہم الگ الگ زندگی گزار سکیں۔۔۔ ایسی حکمت ناپید ہیں امرحہ! اور ایسی حکمتیں ناپید ہی رہیں گی۔" کہہ کر وہ رکا۔

"شیرینی تقسیم کر دی گئی اور چاندی کے سکے زمانہ حال کے مہمانوں کے سروں کے اوپر سے اچھال دیے گئے اور اب وہ اپنے سازندوں کی طرف لپک رہے ہیں۔۔۔ ان سب کو ایک دعائیہ گیت گانا ہے، اس متوقع دلہن کے لیے جس کے گل انار گالوں کو سرخی کے لیے غازے کی ضرورت نہیں رہی۔
میری بے اعتنائی پر تمہارا شکوہ جائز ہے اور تمہاری کم عقلی پر میرا، لیکن اب اگر ہم اس سب کو خوب صورت پروں والا سرخاب بنا کر اڑا دیں گے تو ہمیں ان تتلیوں کے پیچھے بھاگنے کا موقع مل جائے گا جو بے اعتنا اور کم عقل نہیں اور جو خوش رنگ پھولوں پر قیام کرتی ہیں اور معصوم لوگوں کو چھو کر گزرنا پسند کرتی ہیں۔"
کیا کھڑکی کھلی رہ گئی ہے۔۔۔ یقیناً "ہاں۔۔۔ کیونکہ آسمان سے اترتی کہکشاں قافلوں کی صورت کھڑکی سے کمرے میں اترنے لگی ہے اور ان کے سروں سے گھوم کر دیواروں پر اسی تصویر میں ڈھل کر نقش ہو چکی ہے، جو تمثال گر نے اس کی ہستی پر سجادی ہے۔
"میں ہزاروں الفاظ جانتا ہوں۔ معنی بے معنی کئی جملے بول سکتا ہوں، لیکن مجھے افسوس ہے امرحہ! اپنا مدعا بیان کرنے کے لیے میرے پاس اچھے الفاظ ہیں نہ پُراثر جملے۔"
اب ابو علی ابن مقلاء کے شاگرد خطاط درس گاہ کے سفید سنگی احاطے میں حوض کے اطراف قطار میں بیٹھنے لگے ہیں۔ وہی جملہ جو مجھ پر وارد ہوا اور جس کے متعلق میں نے اب جانا۔
درس گاہ کی اونچی سفید محرابوں نے شفیق استادوں کی طرح خطاطوں کی نگرانی کی اور پھر اسے تعویذ حب، صورت لکھ کر محراب حب کی چوکھٹ سے باندھ دیا۔ وہ بولتا گیا۔ سنگ بصری کی تختیاں خطاطوں نے تھام لیں اور مبتلائے تعریف خدا ہوئے۔
"ایک پہلی اور آخری بات صرف اتنی ہے کہ پہلے میں عالیان تھا۔۔۔ پھر میں تم ہو گیا اور اب میں تم ہی رہ گیا امرحہ!" اس کی ہتھیلی کو وہ آنکھیں تک لے گیا اور۔۔۔

"استاد محترم کے اشارے پر صندلی قلمیں بلوری دواتوں میں ڈبو کر عروس الخطوط اپنائے انہوں نے خطاطی کی ابتدا کی۔

"محبت آسمانی فرمان ہے' نافرمانی کی اجازت نہیں۔"

سنگ بصری کی پیشانی پر انہوں نے لکھ دیا۔ آنکھوں سے وہ انہیں ہونٹوں تک لے آیا۔

"محبت پرندہ پربت ہے پاتال اس کا نشیمن نہیں۔"

سنگ بصری کی دوسری سطر نقش کردی گئی۔

پھر اس کے ہاتھ پر وہ احترام بجالایا۔

"محبت مشک ہو ہے بھید میں قید نہیں۔"

تو تحریر مکمل ہوئی۔۔۔ "لوح حُب" لکھ دی گئی۔

شنگرفی، ارغوانی، سبز و لاہی سیاہی سے ایک خطاط گل کاری کرتے جاتے ہیں اور خدائے واحد کی تعریف بیان کرتے جاتے ہیں اور پھر دعا کی ابتدا کچھ یوں کرتے ہیں۔

"لوح حُب۔" کو خدا وقت کے ہاتھوں زندہ رکھے زندہ رکھے۔۔۔ پر شباب رکھے۔۔۔ وقت کے زوال سے خدا اسے بچائے رکھے۔۔۔ بچائے رکھے اور "محراب حُب" کی پیشانی پر روشن رکھے۔۔۔ یوں رکھے کہ "روز ازل" "روز ابد" سے جا ملے۔



گہرائی ہے۔۔۔ اونچائی ہے۔۔۔ لوگ ہیں۔۔۔ پس منظر میں بجھتے شہر کی جلتی روشنیاں ہیں۔۔۔ اور اس کے سر کے عین اوپر کئی سو کرسٹل لڑیوں کا چھتا ہے، جو برقی ارتعاش سے ایسے حرکت میں ہے جیسے مشرقی حسینہ بے خودی میں اپنا آنچل دھیمی ہوا کے سپرد کر رہی ہو۔

"مشرقی حسینہ۔۔۔ امرحہ۔۔۔"

مقام اونچائی پر ہے اور وہ مائیک کے سامنے ہے۔

"دھ۔۔۔ ویرا۔"

اس نے بجھتے شہر کی جلتی روشنیوں کو دیکھا اور اس کی آنکھیں اداسیوں کے پانیوں سے چمکنے لگیں اور گلے کو کھنکھارے بنا بولنا شروع کیا۔

"پہلے میں نے بات شروع کی اور میں ختم کرنا بھول گئی تھی اور اب میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ میں بات کہاں سے شروع کروں۔۔۔ امرحہ سے۔۔۔ خود سے یا عالیان سے؟"

"امرحہ۔۔۔" اس نے گہرا سانس لیا۔ "آپ اسے نہیں جانتے، میں بھی نہیں جانتی تھی، مجھے صرف یہ معلوم تھا کہ وہ میری دوست ہے۔ لیکن کچھ وقت گزرا۔ مجھے معلوم ہوا کہ میں اس کی دوست نہیں تھی۔ اگر میں اس کی دوست ہوتی تو وہ مجھ سے وہ سب کہہ دیتی جو وہ کسی اور سے نہیں کہہ سکتی تھی۔ وہ بات جو اس نے آپریشن تھیٹر میں جانے سے پہلے کہی یا اس وقت جب وہ گر گئی تھی۔ جب میں اس کی طرف لپکی تو میں نے دیکھا کہ وہ پوری شدت سے آنکھیں کھولے رکھنے کی کوشش کر رہی ہے۔ میں نے گردن موڑ کر دیکھا تو وہ اتنی تکلیف میں بھی اس سمت دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی، جس سمت عالیان گر چکا تھا۔ ایسی تکلیف وہ بے ہوشی میں وہ اسپتال آنے تک کئی بار چونک کر اٹھی اور اس نے صرف عالیان کا نام لیا۔ جتنی بار وہ چونک کر اٹھی، اتنی ہی بار۔۔۔ وہ اپنے زخموں سے زیادہ کسی اور ہی تکلیف میں تھی۔"

ویرا رکی اور اس نے ایک نظر سب کو دیکھا۔ وہ دیکھ سکتی تھی کہ جن لوگوں کو وہ اپنے اور عالیان کے بارے میں بتا گئی تھی۔ انہیں امرحہ کے بارے میں جاننا کیسا لگ رہا تھا۔ "شاک" ویرا نے سر اٹھا کر گرنے کے قریب آنسوؤں کو آنکھوں کے اندر کرنا چاہا اور وہ آنکھوں کے اندر ٹھہرے دوسرے آنسوؤں کو بھی باہر لے آئے۔

"عالیان۔۔۔ خوب صورت دلوں میں سے ایک کا مالک۔۔۔ وہ سڑک پر ایسے گر گیا جیسے گولی اسے لگی ہو۔ سیدھی دل پر۔۔۔"

وہ رکی اور کافی دیر تک رکی رہی۔ "ایک ہی وقت میں دونوں مجھ پر آشکار ہوگئے۔ جب امرحہ آپریشن تھیٹر میں تھی اور عالیان سر جھکائے خاموش کھڑا تھا تو میں اس کے پاس گئی اور اس سے کہا۔

"وہ ٹھیک ہو جائے گی۔ وہ اتنی جلدی بے ہوش نہ ہوتی اگر اس کے سر پر ضرب نہ لگتی۔

اور اس کی آنکھوں سے آنسو نکل کر گرنے لگے۔

ایک جوان مرد رو رہا تھا۔ ٹھیک کر رہا تھا' ایک مرد اگر اپنی ماں' بیوی' بیٹی کی تکلیف پر رو دیتا ہے' تو وہ بلند بانگ ان سے اپنی محبت کا اقرار کرتا ہے۔" کہہ کر وہ ہر افسردگی کی انتہا پر نظر آنے لگی۔

جب عالیان ایک بار امرحہ کو دیکھ آیا تو میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور کہا۔ "تم ایک اچھے اداکار ہو عالیان اور امرحہ بھی... تم امرحہ کے علاوہ دنیا کے ہر انسان کے ساتھ خوش رہنے کی اداکاری کرتے رہے اور دنیا کے ہر انسان کے ہوتے امرحہ کو جاتے دیکھ تم ساری اداکاری بھول گئے۔ تم دنیا کے ہر انسان کے ساتھ خوش رہ سکتے ہو لیکن زندہ تم امرحہ کے ساتھ ہی رہ سکتے ہو۔ میرے ساتھ تعلق نبھانے کی تمہاری کوشش اچھی تھی۔"

"تمہارے دل میں' میں نے اپنا احترام کھو دیا ویرا۔" اس نے ایسی شرمندگی سے کہا کہ میرے دل میں اس کا احترام اور بڑھ گیا اور میں نے کہا۔

"ہاں! ایسا ضرور ہو جاتا اگر تم نے کبھی مجھ سے کہا ہوتا کہ تم مجھ سے محبت کرتے ہو... تم نے ہمیشہ کہا کہ میں ایک اچھی لڑکی ہوں اور اس پر تم ابھی بھی قائم ہو گے۔ اب تم پہلی فرصت میں امرحہ کو بتا دینا کہ اگر تم دونوں میں تیسرے کی گنجائش نکل سکتی تو عالیان برازیلا اسٹیڈیم میں دیوانہ وار اس کے لیے بھاگ نہ رہا ہوتا۔ اس بار تم اسے زیادہ یقین سے بتانا' زیادہ وقت لینا اور اس کا ہاتھ پکڑ لینا کہ وہ انکار کر کے کہیں جا نہ سکے اور وہ انکار نہیں کرے گی۔ میں نے بے ہوشی میں اسے تمہارا نام بڑبڑاتے سنا ہے۔" پس منظر کی ساری روشنیاں بجھ گئیں۔

"میں بے وقوف ہی تھی۔ یہ سب نہیں جان سکی اور اب مجھے یہ سمجھ میں نہیں آرہا کہ جب میں یہ کہانی اپنے پوتے' پوتیوں کو سناؤں گی تو وہ میرے بارے میں کیا سوچیں گے۔ کیا وہ اپنی گرینڈ مام کو برا کہیں گے؟"

اس نے گیلے گال صاف کیے۔

"وہ سمجھ دار بچے ہوں گے' وہ اپنی گرینڈ مام کی اعلا ظرفی پر فخر کریں گے۔" سائی نے پیچھے سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ویرا چونک کر پلٹی۔

لوگ گم کر دیے گئے... روشنیاں بجھا دی گئیں... کہانی سنا دی گئی۔

وہ ہوٹل کے باغ کے اندھیرے گوشے میں اکیلی کھڑی تھی۔

سائی ان ہی کے ہوٹل شفٹ ہو چکا تھا اور ایک گھنٹے کی نیند بھی لے چکا تھا۔ پھر جیسے وہ بہت بے چین سا ہو کر اٹھا۔ اسے یاد آیا جب وہ سویا تھا تو بہت خوش تھا' کیونکہ "المیہ داستان" "طربیہ" ہو چکی تھی۔

تو پھر وہ ایسے ہڑبڑا کر کیوں اٹھا۔ وہ بیڈ پر بیٹھ گیا۔ اتنے سال ہو گئے تھے اسے سائی بنے' اب لوگ اس کے پاس نہیں آیا کرتے تھے تو وہ کمپاس بنا ان کی سمت مڑ جاتا تھا اور کہتا تھا۔ "سنو شاید تمہیں میری ضرورت ہے۔"

وہ اٹھا اور دوسری منزل پر آیا دروازے پر دستک دی' کوئی جواب نہیں ملا۔ پھر یہ سوچ کر کہ وہ اسپتال امرحہ کے پاس نہ چلی گئی ہو اسے فون کیا' لیکن اس کا فون بند تھا۔ کاؤنٹر پر آکر پوچھا انہوں نے ایک بار کی طرف اشارہ کر دیا۔ وہ بار گیا' وہ وہاں بھی نہیں تھی۔ وہ خود ہی اسے ڈھونڈتا رہا اور پھر اسے اندھیرے گوشے میں کھڑے باتیں کرتے دیکھا۔ وہ خود میں اتنی مگن تھی کہ وہ عین اس کے پیچھے کھڑا ہو کر سب سننے لگا اور اسے خبر نہیں ہوئی۔

اس نے ویرا کا ہاتھ پکڑا اور کمرے میں لے آیا دونوں نیچے کارپٹ پر دیوار سے ٹیک لگا کر ساتھ ساتھ بیٹھ گئے۔

"میں جانتا ہوں تم دکھی ہو؟" بات سائی نے شروع کی۔

"ہاں بہت دکھی ہوں سائی۔ اس لیے کہ میں سمجھ نہیں پائی کہ کیا ہو رہا ہے... مجھے حقیقتاً" یہ ہی لگا کہ امرحہ عالیان کو دوست کی حیثیت کے علاوہ پسند نہیں

کرتی اور عالیان.... سائی ایسا ہی تو ہوتا ہے ایک بریک اپ کے بعد کچھ وقت لگا اور سب ٹھیک.... میں امریکہ سے واپس آئی تو امرحہ مجھے بدلی ہوئی ملی، میں نے پوچھا تو اس نے بتایا کہ دادا ایسے لڑکے سے اس کی شادی کرنا چاہتے ہیں جسے وہ پسند نہیں کرتی۔ میں نے پوچھا تو کیا تم کسی اور کو پسند کرتی ہو؟ تو اس نے کہا۔ مجھے اس سب سے دلچسپی نہیں ہے۔" یہ کہتے ویرا نے تاسف بھرا انداز اپنالیا۔

"کیا میں ایک بری لڑکی ہوں سائی؟" دل برداشتی اپنے عروج پر نظر آنے لگی۔

"تم نے یہ کیوں سوچا؟" سائی کو جیسے دلی صدمہ ملا۔

"پتا نہیں۔" اس نے خود کلامی کے انداز سے کہا۔

"کچھ باتوں کے ہو جانے میں ہمارا اختیار نہیں ہوتا ویرا۔ ان کے ہونے اور نہ ہونے پر۔ ایک اچھا ڈرائیور اگر حادثہ کردے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ برا ہے، اس کا مطلب ہے کہ سڑک، گاڑی اور کچھ دوسرے عوامل نے مل کر حادثے کے اسباب پیدا کر دیے۔ اچھے اور برے واقعات کے اسباب بنتے ہیں ویرا۔"

"عالیان کو خود کو پاگل بنانے کی کیا ضرورت تھی سائی! تم نے دیکھا وہ کیسے اس کا نام لے لے کر بھاگتا پھر رہا تھا۔"

"اس نے خود کو پاگل نہیں بنایا ویرا۔ بس شاید اس پر دیر سے ادراک ہوا۔"

دونوں تھوڑی خاموشی سے اپنی اپنی جگہ اپنی اپنی سوچ کو سوچتے رہے۔

"تو گرینڈ ماما نے اعلا ظرفی کا مظاہرہ کیا۔" سائی نے ہنس کر ایک نئی بات شروع کی۔

ویرا ذرا سا ہنس دی۔ "اگر نہ کرتی تو امرحہ روسیوں کے بارے میں اپنے پوتے پوتیوں کو کیا بتاتی کہ وہ خود غرض ہوتے ہیں اور ہماری جگہوں پر قابض ہو جاتے ہیں۔ وہ خود روس آتی نہ اپنی پوتی کو کبھی آنے دیتی، بلکہ روس کے بارے میں ٹی وی پر کوئی خبر چل رہی ہوتی تو وہ چینل بدل دیتی اور سوچتی روس دنیا کے نقشے پر ہوتا ہی نہ تو کتنا اچھا ہوتا۔"

سائی پوری جان سے ہنسنے لگا۔ "تم مذاق میں ایسا کہہ سکتی ہو، لیکن حقیقت میں ایسا کبھی نہ ہوتا۔"

"اگر میری اور عالیان کی شادی ہو جاتی تو ایسا ہی ہوتا۔" وہ اپنی ہتھیلیاں مسلنے لگی اور ایسا کرتے وہ ایسی بچی لگنے لگی، جس کی ساری گڑیاں چرالی گئی ہوں اور ان کے کپڑے جلا دیے گئے ہوں۔

سائی نے محبت سے اس کی طرف دیکھا۔ "عالیان اس مشرقی لڑکی کا پرنس تھا۔ تمہارا پرنس چارمنگ تو کہیں اور تمہارے انتظار میں ہوگا نا۔"

"ہاں بس اب یہ ہی کام رہ گیا ہے۔ سب کام چھوڑ کر اس پرنس چارمنگ کو ڈھونڈتے پھرنا یا اس کے انتظار میں بیٹھ جانا.... میں ایک بالغ، اتنی بڑی سی لڑکی ہوں۔ دی لیڈی ویرا، مجھے تم ان فیری ٹیلز سے نہیں بہلا سکتے۔" وہ چڑ گئی۔

"فیری ٹیلز ہماری حقیقی زندگیوں سے زیادہ خوب صورت نہیں ہو سکتیں ویرا۔ جہاں ایک ویرا ہے، ایک سائی، ایک کارل، دو امرحہ عالیان۔ کیا کسی فیری ٹیل میں یہ سب ہوں گے؟ ہمارے پاس دکھ ہیں۔ ملنا، بچھڑنا، رونا، مسکرانا، گر جانا، اٹھ کھڑے ہونا۔ یہ سب ہے، کہیں کم، کہیں زیادہ.... شان دار محل، قیمتی ملبوسات، آرائش زندگی، کھیل کود، مسکراہٹیں، خوب صورتی اور نغمے ہی زندگی کو فیری ٹیل نہیں بناتے۔ زندگی کو فیری ٹیل ہماری سوچ بناتی ہے۔ پرنس چارمنگ وہ نہیں جو ایک بڑی سلطنت کا شہزادہ ہے یا جو بہت خوب صورت ہے۔ پرنس چارمنگ ہر وہ انسان ہے جو ایک شفاف دل کا مالک ہے۔ جو بلا امتیاز انسانوں سے محبت کرتا ہے۔ میں، تم، عالیان، امرحہ، کارل، ہم سب۔

یہ زندگی تب بھی فیری ٹیل سے زیادہ خوب صورت ہے جب ہر ساعت ہمیں فضا میں بسی خوشبو محسوس ہوتی ہے۔ آسمان شان دار محل کی چھت لگتا ہے اور زمین مخملیں قالین جو ہر نئے قدم پر ایک نئے رنگ میں ڈھلتا ہے۔"

ویرا نے سائی کے کندھے پر سر رکھ دیا اور اسے

خاموشی سے سنتی رہی اور سنتے سنتے سو گئی۔ سائی نے اسے ایسے سوتے دیکھا تو چاہا کہ آج کی پوری رات اسے اس انسان کے لیے دعائیں کرتے گزار دینی چاہیے اور وہ زیر لب دعائیہ نظموں کو ایسے دہرانے لگا کہ وہ نیند سے جاگ نہ جائے، لیکن نیند میں ہی سن بھی لے۔

"ویرا..." موت سی برف میں کھلتے اکلوتے پھول کی طرح وہ اس احساس کو خاطر میں نہ لائی کہ خزاں میں وہ "کیلی بہار" ہے۔

میری کہانی کے یہ دو کردار۔
طلوع آفتاب سے۔
دوستی میں حرف خاص سے۔
مثالوں میں "بے مثال" سے۔



برازیل سے وہ وی آئی پی سیٹ سے مانچسٹر میں آئی جہاں اسے علاج کے لیے ڈاکٹروں کی اگلی ہدایات تک رہنا تھا۔ سارے اخراجات برازیلین حکومت اٹھا رہی تھی۔ وہ اسے مکمل صحت یاب کرکے بھیجنا چاہتے تھے۔ لیکن اسے مانچسٹر آنے کی جلدی تھی۔ اس کی وجہ سے اس کے ساتھ رہنے والوں کی تعلیم کا نقصان ہو رہا تھا۔ وہ سب لوگ ویک اینڈ کا سوچ کر میچ دیکھنے گئے تھے۔ این، ڈیرک وغیرہ پہلے ہی واپس آ چکے تھے۔ کارل، ویرا، سائی، عالیان اس کے ساتھ تھے۔ کارل کا تو ویسے بھی برازیلا میں ٹی وی پر مستقبل کافی روشن ہو گیا تھا۔ اسے تو چند اور دن وہاں رکنے پر اعتراض نہیں تھا۔

سادھنا اور لیڈی مہر ایئرپورٹ سے اس کے ساتھ اسپتال گئے اور اسپتال میں اس کے پروفیسرز، کلاس فیلوز، یونی فیلوز آ آ کر ملتے رہے۔ شزا بھی اس کے لیے پھول لے کر آئی۔ ڈیرک تو برازیلا میں بھی کئی بار اس سے مل چکا تھا اور دائم وغیرہ کا گروپ اور رابتا، شرلی، للی سب وہاں بھی اس سے مل گئے تھے اور یہاں بھی آتے رہے۔ اسٹور کا مینیجر، اس کے کولیگز اور اس کا پہلا باس تو کئی بار آئے۔

"یہ کیسا حادثہ تھا مس اخروٹ! جو تمہیں برازیلا میں پیش آیا اور تمہیں ٹھیک کر گیا؟" انہوں نے سنجیدگی سے اس کا جائزہ لینے کے بعد کہا۔

مس اخروٹ جواب میں صرف مسکرا دی۔

"تو برازیلا نے تمہیں بدل دیا؟"

"شاید..." وہ اور مسکرا دی۔

اس دوران کارل نے اس کے لیے لائی جانے والی چاکلیٹس اور کوکیز کو سعادت مندی سے اپنے پاس محفوظ کرنا شروع کر دیا۔ سائی نے امرحہ کو بتایا کہ اس نے سب سے کہا ہے کہ پھول لے جانے کے بجائے وہ چاکلیٹ لے جائیں، کیونکہ امرحہ کو چاکلیٹ بہت پسند ہے نا... اور ایک ایسا انسان، جس کے شانے پر گولی لگی ہو، اسے ایسی چھوٹی چھوٹی خوشیاں تو ضرور ہی مہیا کر دینی چاہئیں نا۔

ان چھوٹی چھوٹی خوشیوں میں سے ایک بھی امرحہ کے منہ میں نہ گئی، البتہ ہال میں کارل نے اپنے کمرے کی حفاظت چوری پروف کر دی۔

جب وہ گھر آئی تو اس کے کمرے کو ویرا، سادھنا اور این نے مل کر مختلف پوسٹرز، کارٹونز اور دعاؤں سے سجا رکھا تھا۔ دیواروں پر ان سب کی مختلف موقعوں پر لی جانے والی تصویریں لگی تھیں اور یونی فیلوز کے پیغامات کارڈز کی صورت دیواروں سے جھول رہے تھے۔

یونی ورسٹی نے اسے آفیشل لیو دے دی تھی۔ اس کے لیکچر ریکارڈ کیے جا رہے تھے اور اسے گھر ملتے تھے۔ سائی ایک بار ضرور اس کے پاس آتا۔ کافی پی کر چلا جاتا۔ عالیان یونی سے پہلے، یونی اور جاب کے بعد اتنی بار اس سے مل جاتا کہ لگتا وہ واقعی اسپائیڈر مین ہے۔ عمارتیں پھلانگتا آتا جاتا ہے۔

کارل اپنی الٹی سیدھی تصویریں کھینچ کھینچ کر اسے بھیجتا رہتا کہ "خوب صورت انسان کو دیکھنے سے انسان جلد صحت یاب ہو جاتا ہے۔"

وہ اب تک فون پر ہی دادا سے بات کرتی رہی تھی اور اسے حیرت یہ ہوئی تھی کہ دادا نے ایک بار بھی

نہیں کہا تاکہ وہ اسے دیکھنا چاہتے ہیں۔ جب وہ شٹل کاک آچکی اور اٹھ کر بیٹھنے لگی، جبکہ اب بھی اٹھنے سے اس کے سر میں ٹیسیں اٹھتی تھیں اور اس کا بایاں شانہ درد کرتا تھا اور اکثر وہ کئی کئی گھنٹے متلی کا شکار رہتی تھی اور اچانک ہی اسے تیز بخار ہوجاتا تھا تو دادا پہلی بار اسے دیکھ کر بات کرنے لگے کیونکہ اس نے خود ہی کہا تھا کہ وہ انہیں دیکھنا چاہتی ہے۔

''اب مجھے بتاؤ کہ تمہارے ساتھ کیا ہوا تھا؟''

''ایسے ہی فینز بھڑک اٹھے اور لڑتے لڑتے مجھ پر گر گئے۔'' وہ ٹیک لگا کر بیٹھی تھی اور اس کے چہرے پر زخم کے نشانات اب کچھ مندمل اور قابل برداشت ہوگئے تھے۔ سر کو اس نے دوپٹے سے ڈھانپ رکھا تھا۔ کیونکہ پچھلے حصے میں لگی بینڈیج سامنے سے ذرا سی نظر آتی اور گردن کی بھی۔

''بس...'' دادا نے بہت آرام سے پوچھا۔

''جی...'' جو جھوٹ سادھنا نے بولا تھا' وہ اب تک اسے ہی آگے لے کر چلتی رہی تھی۔

''تمہارے بس اتنے معمولی سے زخمی ہونے پر ویرا' کارل' سائی اور عالیان اتنے پریشان ہوگئے تھے؟''

''وہ مجھے ہوش نہیں آرہا تھا نا اس لیے۔ میرے سر پر چوٹ آئی تھی۔ بس خوف زدہ ہوگئی تھی' بہت' بہت زیادہ۔''

مانچسٹر کے اسپتال میں جب وہ آئی تو اس نے یہ بتایا کہ وہ گھر آچکی ہے' جب وہ گھر آچکی تو وہ یہ بتانے لگی کہ وہ یونی جانے لگی ہے اور دادا نے ایک بھی بار اس سے کوئی سوال یا تکرار نہیں کی' جو وہ کہتی وہ سن لیتے اور اسے صحت مندی اور زندگی کی سلامتی کی دعائیں دیتے رہتے۔

''جب میں نے باری باری ویرا' سائی اور پھر عالیان کو دیکھا تو مجھے جیسے کچھ بھی پوچھنے کی ضرورت نہیں رہی اور مجھے لگا کہ وہ مجھ بے چارے بوڑھے پر ترس کھا رہے ہیں۔ مجھے صدمے سے بچانا چاہتے ہیں۔ میں نے شہریار کی مدد لی۔ وہ ایک پڑھا لکھا سمجھ دار انسان ہے۔ اس نے کچھ وقت لگایا انٹرنیٹ پر اور اسے معلوم ہوا کہ تصادم میں کل تین لوگوں کو گولیاں لگی ہیں اور ان تین میں سے ایک مانچسٹر یونی ورسٹیوں کی اسٹوڈنٹ ہے۔ پھر اس نے یونی ورسٹی انتظامیہ سے رابطہ کیا اور اسے بتایا گیا کہ وہ ایک اسٹوڈنٹ امرحہ واجد ہے۔ تم نے مجھ سے جھوٹ اس لیے بولا کہ میں ایک بوڑھا انسان ہوں۔ ایسی خبر سن کر مجھے کچھ ہو نہ جائے۔ سادھنا سے لے کر سائی تک سب مجھ سے چھپاتے رہے۔ یہ ایک اچھی حکمت عملی تھی مجھ بوڑھی جان کے لیے امرحہ... لیکن میں انجانتا کے درد کا شکار ان ہی دنوں ہوا۔ جانتی ہو کس لیے؟ صرف اس لیے کہ تم نے خود کو خود مر جانے دیا۔ تم نے اپنی جان کی پروا نہیں کی۔ تم نے خود کو اہم نہیں جانا۔ تمہیں بہانہ مل گیا مرنے کا... تم نے چاہا کہ تم مر جاؤ' تم نے خود کو محفوظ کرنے کی کوشش نہیں کی... تم نے اپنی کمزوری ظاہر کی ہمت اور طاقت نہیں۔''

''یہ غلط ہے۔''

''یہ غلط تب ہوتا اگر تم ٹھیک رہتیں' تم موت کی باتیں کرتی تھیں۔ میں نے اپنا پاسپورٹ ایمرجنسی ویزے کے لیے بھیجا' لیکن مجھے ویزا نہیں ملا۔ میں وہاں آتا اور تم سے پوچھتا امرحہ کہ کیا زندگی ایسی بے کار شے ہے کہ اسے موت کے حوالے کردیا جائے۔''

''نہیں... وہ ایک حادثہ تھا دادا اور بس...''

''تم ساری دنیا سے جھوٹ بول سکتی ہو' مجھ سے نہیں۔''

وہ خاموش ہوگئی۔

''تم مرنا چاہتی تھیں؟''

''ہاں!'' اس نے اعتراف کرلیا۔ ''میں نے خود کو مارنا نہیں چاہا تھا' لیکن وہ سب جب وہاں ہوا تو میں نے دعا کی تھی کہ کاش میں مر جاؤں۔ کیونکہ میں خودکشی نہیں کرسکتی تھی اور طبعی عمر تک خود کو گھسیٹ نہیں سکتی تھی۔ میں بظاہر بھاگتی رہی خود کو بچانے کے لیے لیکن اندر ہی اندر میں یہ خواہش کرتی گئی کہ میں زندہ نہ رہوں۔''

''مجھے سزا دینے کے لیے... یہ بتانے کے لیے کہ

اگر ہم زندہ لوگوں کی قدر نہیں کرتے تو وہ مر کر اپنی قدر بڑھوا لیتے ہیں۔"

وہ خاموش رہی، کیونکہ یہ ہی سچ تھا۔ وہ عالیان اور دادا دونوں کو مر کر دکھانا چاہتی تھی اور اس لیے بھی کہ اسے زندہ رہنے میں دلچسپی نہیں رہی تھی۔

"پاکستان آجاؤ۔"

"ایسا نہیں ہو سکتا۔" وہ رو دینے کو ہو گئی۔

"پھر چلی جانا، میں تمہاری دیکھ بھال کرنا چاہتا ہوں، تم سے ملنا چاہتا ہوں۔"

وہ دادا کی طرف دیکھنے لگی۔ "آپ مجھے واپس نہیں آنے دیں گے؟"

"ایک نمازی سے وعدہ لے لو۔" دادا نے بہت پریقین انداز سے کہا۔

"ٹھیک ہے، پھر مجھے وعدہ دے دیں۔" اس نے بہت دیر تک سوچنے کے بعد کہا۔

اس کے پاس دس چھٹیاں تھیں، وہ ان چھٹیوں میں جا کر واپس آسکتی تھی۔ اس نے اپنا ٹکٹ بک کروالیا اور ویرا کو ساتھ چلنے کے لیے کہا۔

"تم لیو پر ہو، میں نہیں۔" ویرا نے اس کے گال پر چٹکی لی۔

"چند دنوں کی بات ہے، تمہیں یونی سے نکال نہیں دیا جائے گا۔"

ویرا اور زیادہ ہنسنے لگی، لیکن شرارت سے۔ "میں تمہارا یہاں انتظار کروں گی، بلکہ ہم سب کریں گے۔"

"میں ایک خود غرض لڑکی ہوں نا ویرا؟" عالیان کے ساتھ وہ آگے ایسے بڑھی، جیسے اس پر صرف اسی کا حق تھا۔ اور خود غرضی سے بھی اس نے ویرا کے بارے میں نہیں سوچا اور اب وہ اتنے دنوں سے ویرا سے بات کرنا چاہ رہی تھی، لیکن ہمت نہیں ہو رہی تھی۔

"تمہارے کمرے میں رکھا وہ البم میں نے دیکھ لیا ہے، جس میں میری تصویر پر تم نے لکھا ہے۔ دوستی کی تعریف کے لیے ویرا کا نام کافی ہے۔ اگر تم خود غرض ہوتیں تو اپنے البم میں جگہ جگہ مجھے محفوظ نہ کرتیں۔"

"میں تم سے حسد کرتی رہی اور تمہیں اپنا دشمن بھی سمجھتی رہی، لیکن یہ سب بہت پرانی باتیں ہیں۔ پھر میں نے عالیان کے لیے تم سے بہتر کسی کو نہیں پایا۔"

ویرا ہنس دی۔ "عالیان کے لیے تم ساری دنیا کو اپنا دشمن بنا لیتیں۔ یہ صرف تم ہی کر سکتی ہو اور میں ان جذبات کی قدر کرنے پر مجبور ہوں۔"

"تم دکھ اور تکلیف سے گزریں؟" بہت مشکل سے امرحہ یہ پوچھ پائی۔

"ہاں میں گزری امرحہ! لیکن اس سے بہت کم جس سے تم گزریں، میں تم دونوں سے محبت کرنے پر مجبور ہوں۔ تم صرف عالیان کی ہی نہیں ہو اور عالیان صرف تمہارا ہی نہیں ہے اور یہ حسد و رشک سے کہیں آگے کے جذبات ہیں۔" اپنے گال سے اس کے گال رگڑ کر ویرا چلی گئی۔ یہ صبح کا وقت ہے اور وہ یونی جانے سے پہلے اس سے مل کر جاتی ہے۔

"ٹھیک ہے۔ وہ عالیان کے ساتھ آگے نکل آئی ہے، لیکن اب اگر وہ گردن موڑ کر پیچھے دیکھتی ہے تو جانتی ہے کہ پیچھے کتنی توڑ پھوڑ کرتی آئی ہے۔ اور اس توڑ پھوڑ میں سب سے زیادہ نقصان میں ویرا ہی ہے۔"

انسان اپنے عمل میں کتنا ہی کھرا کیوں نہ ہو، کہیں نہ کہیں وہ اتنا پست ضرور ہو جاتا ہے کہ خود سے بھی نظریں نہیں ملا پاتا۔ ویرا کی صورت یہ پستی اسے یاد رکھنی ہو گی۔



اگلے دن جب اس کی فلائٹ تھی پاکستان کی تو رات کو سوتے میں غیر معمولی آوازوں کے ارتعاش سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ دن بھر اس کی عالیان سے بات نہیں ہو سکی تھی اور وہ بڑی دل گرفتگی سے سوئی تھی کہ وہ اسے بھول گیا، آخر بھول گیا۔

وہ چند دنوں سے کافی مصروف نظر آ رہا تھا۔ اس سے کھڑے کھڑے مل جاتا اور ماما مہر کے ساتھ باتوں میں مصروف رہتا۔ اس کے سامان کو اس نے معنی خیزی سے دیکھا اور کوئی تبصرہ نہیں کیا اور اسے یہ سب برا

لگا۔ وہ جا رہی ہے اور اسے کوئی فرق ہی نہیں پڑ رہا۔ یعنی محبت پھر سے کم ہونے لگی۔ دونوں کے درمیان متوقع ضروری باتیں ایک طرف ہی رہ گئیں اور کیوں رہ گئیں وہ سوچتی ہی رہ گئی۔

تو رات کے پہلے پہر اس کی آنکھ کھلی اور اسے سمجھ نہیں آئی کہ اتنی ٹھنڈ میں سادھنا نے اس کے کمرے کی کھڑکی آخر کس لیے کھول دی کہ وہ جو برازیلا میں گولی سے نہیں مری' وہ یہاں ٹھنڈ سے مر جائے۔ جب وہ سوئی تھی تو کھڑکی بند تھی۔ اب کھلی تھی اور ٹھنڈی ہوا فرصت سے اندر آ رہی تھی اور ساتھ اپنے سنگ کچھ اور بھی لا رہی تھی۔

ننھی منی چھوٹی بڑی گھنٹیوں کے ہوا کے دوش پر بجنے کی آوازیں تھیں۔ وہ زیر لب ہنسی۔۔۔۔ یہ میرا خواب ہے۔ نہیں تو پھر آگے بڑھنا چاہیے۔ وہ کھڑکی تک آئی۔

دھند میں لپٹے درخت پر شٹل کاک کی بیرونی دیوار پر لگی لائٹ ایسے پڑ رہی تھی کہ وہ آدھا اندھیرے میں تھا اور آدھا نیم روشنی میں اور جو نیم روشنی میں تھا۔ وہ رنگ برنگی اشکال میں جھولتے کارڈوں سے سجا تھا اور وہ اس دوشیزہ کی طرح مسکرائی جسے اس کا گم شدہ جوتا مل چکا تھا۔

حال ماضی کے درخت کی شاخوں پر فاتح ہونے پہ متبسم ہے۔ تو شہزادے نے جان لیا کہ اسے کیا کرنا ہے اور ادھوری کہانی مکمل کرلی گئی ہے۔ اس نے گرم کوٹ پہنا۔ دائیں ہاتھ سے مفلر کو گردن پر بل دیے۔ اسے بائیں ہاتھ سے کام کرنے میں مشکل ہوتی تھی' لیکن اب یہ مشکل رفع ہوگئی تھی۔ دراصل سارے ہی درد برازیلا کے اسپتال میں ہی رفع ہوگئے تھے۔

اس نے ہر رات درخت پر جھولتے پیغامات کو پڑھنے کے خواب دیکھے تھے۔ وہ دعا کیا کرتی تھی کہ حقیقت میں نہ سہی خواب میں سہی اس کا یہ خواب پورا ہو جائے۔ خواب پورا نہیں ہوا۔ خواب نکل کر حقیقت میں بدل گیا۔

وہ بیرونی دروازے سے باہر آئی اور گھوم کر اپنے کمرے کے سامنے لگے درخت کی طرف آئی اور ذرا دور کھڑی ہو کر درخت کو دیکھتی رہی' دیکھتی ہی رہی۔

"یہ میرا خواب ہی ہے' ہاں بس۔۔۔ ضرور میرا خواب ہی ہے۔" وہ بڑبڑائی۔ پیغامات مختلف دلکش رنگوں کے ربنوں سے بندھے جھول رہے تھے۔ آس پاس کی دوسری شاخوں پر مختلف آرائشی فیتے اپنی اہمیت اپنی خوب صورتی سے بڑھا رہے تھے اور زمین پر موجود درخت الوہی خطے کا "شاہ" بنا تاج پوشی کے لیے قائم کھڑا تھا۔

بہت دیر تک کھڑے رہنے کے بعد وہ درخت کے پاس آئی اور ہاتھ بڑھا کر کئی شاخوں کو ایک ساتھ لہرا ڈالا اور گھنٹیوں نے رانجھے کی بنیں۔ ساری دھنیں اپنے اندر سمو کر ان پر سے اپنا اختیار اٹھا ڈالا۔

"ماضی مٹ چکا ہے۔"

وقت نے پرانے سکوں سے آراستہ اپنا تھال الٹ ڈالا اور صرف ایک "تاج" سکے سے خود کو سجا ڈالا۔

"عالیان!" سکے پر کندہ نام اس نے امرحہ کی طرف اچھال دیا۔ جو پیشانی سے اوپر سج گیا۔

"امرحہ!" اسی سکے پر کندہ دوسرا نام اس نے عالیان کی طرف اچھال دیا جو پیشانی کے نیچے اس کی آنکھوں میں دمک اٹھا۔ وہ اندھیرے حصے کی طرف کھڑا تھا۔

امرحہ اس کی موجودگی سے انجان تھی۔ اس کا خیال تھا اسے امرحہ کو درخت تک لانے کے لیے بہت تردد کرنا پڑے گا' لیکن ایسا نہیں ہوا' تو وہ اب صرف گزر چکے وقت کا حصہ ہی بنے رہنا چاہتا تھا۔ گھنٹیاں فانوسی راگوں پر اجارہ داری رکھتی سرمستی میں جھومنے لگیں۔

"جو خواب حقیقت ہو جاتے ہیں۔ وہ خواب ہر ساعت آیا کریں۔" وہ دم بخود کھڑا سوچنے لگا۔ وہ جو دو گھنٹے اس درخت کے ساتھ مصروف رہا تھا۔ اسے بھی یہ یقین ہونے لگا کہ اس بار پھر سے یہ خواب ہی ہے۔ اندھیرے سے روشنی کی طرف اس نے قدم بڑھائے۔

اب گھنٹیاں مہوز کے حکم کی بجا آوری کرتیں

"محرم" کے کانوں میں سرگوشیاں عیاں کرنے کو لپکیں اور پس منظر میں جگتیں اللہ رکھا رحمان کی رازونیاز کرتی دھنیں پریم پریت کے سرگم پر دل دھنتے "محو اظہار" ہو گئیں۔

رات کے ذروں نے قطاریں باندھ لیں اور روشنی کی لکیریں پھلجھڑیاں بن گئیں۔ ہلکی ہوا ان دونوں کے بال اڑا رہی تھی اور وہ دونوں اپنی اپنی جگہ پر اپنی منزلیں طے کر رہے تھے۔ امرحہ کا خیال تھا اس میسج لڑی کو کارل، سائی اور اس نے مل کر سجایا اور چلے گئے۔ اس نے ہاتھ بڑھایا اور ہوا کے سنگ جھولتے ایک پیغام کو پکڑ کر پڑھنے لگی۔

"میں نے تمہیں بہت یاد کیا۔"

دلفریب خوشی کے احساسات امرحہ کے دل پر نازل ہونے لگے۔ وہ دوسرا پیغام پڑھنے لگی۔

"تم ایک جادوگر ہو امرحہ!" امرحہ یوں مسکرادی جیسے اس کی بات چرالی گئی۔

"جب تم نے رونا شروع کیا تو میرا دل چاہا میں بھی تمہارے ساتھ مل کر روؤں، کیونکہ دو ایک جیسے لوگوں کو ایک ہی جگہ بیٹھ کر رونے کا اس سے اچھا موقع اور کب ملتا۔ اسٹوڈنٹ پارٹی پرانک۔"

امرحہ نے قہقہہ لگایا اور ذرا سا ڈر گئی، کیونکہ درخت کے اندھیرے حصے میں چھپا کھڑا عالیان نکل کر سامنے آگیا تھا۔

"اوہ۔ تم یہاں ہو؟"

"تو مجھے کہاں ہونا چاہیے تھا؟" اس نے ہاتھ بلند کیا اور اس کے سر پر جھولتے پیغامات سے بندھی گھنٹیاں لہرا ڈالیں اور معتبر آسمان اور زرخیز زمین نے بڑی محبت سے اپنی سماعتوں کے پٹ ان مترنم آوازوں پر وا کیے۔

"جہاں غائب رہنے کے لیے تم موجود رہتے ہو۔"

اسے یاد آیا وہ اس سے ناراض تھی۔

وہ محبت کے نکھرے احساس سے اسے دیکھتا رہا۔

"تو یہ ناراض ہونا صرف اپنا حق سمجھتی ہے۔"

"میں نے ان پیغامات کو جلا ڈالا تھا، میری یادداشت اچھی ہے میں نے انہیں چند راتیں اور چند دن لگا کر پھر سے لکھا۔" وہ اپنے غائب رہنے کی وجہ بتارہا تھا، لیکن نامکمل وہ امرحہ سے چھپا رہا تھا کہ وہ دراصل بصد شوق کن مصروفیات میں غلطاں رہا تھا۔

"تمہارے بالوں کی نوکیں تمہاری آنکھوں کو پریشان کررہی ہیں۔ کیا میں تمہاری آنکھوں کو اس پریشانی سے بچالوں؟" اس نے مہذب انداز سے پوچھا اور جواب کا انتظار بھی نہیں کیا اور اس کی آنکھوں کو پریشانی سے بچالیا۔

اپنی پیشانی پر اس کی انگلیوں کا لمس محسوس کرتے وہ ذرا سا پیچھے ہوئی اور سر اٹھا کر پیغام پڑھنے لگی۔

اس نے ایک چالاکی کی تھی، دوسری زبانوں میں کافی پیغامات لکھے تھے، تاکہ امرحہ اس سے ان کے مطلب پوچھے۔ دو دن تک ہال میں وہ مختلف ہال میٹس کے کمروں کی طرف بھاگتا رہا تھا اور وہ زیر لب ہنس کر اسے لکھ لکھ کر دیتے رہے تھے۔ جبکہ کارل اور سائی اس کے کندھوں پر چڑھے لکھنے والوں کو آنکھ مارتے رہے تھے تو اگر چند پیغامات کو امرحہ گوگل کرتی تو اسے معلوم ہوتا کہ جس کا مطلب عالیان مجھے اجازت دو، میں آخ آخ کی تکرار پر لہراتی تمہاری ناک کو پکڑلوں۔ بتارہا تھا تو اس کا اصل مطلب کارل کی آنکھ اور ہاتھوں کے اشاروں پر کچھ یہ نکلتا۔

"کیا تم نے ٹھیک سے ناک پونچھنا سیکھ لیا۔ نہیں۔ لیکن ابھی بھی تم آئس کریم، چاکلیٹ کے ساتھ بہتی ناک۔ آخ۔ اف۔ گندی۔"

اور چینی جملہ جس کا مطلب عالیان تم ایک اچھی لڑکی ہو بلکہ تم میں کئی اچھی لڑکیاں چھپی ہیں بتارہا تھا تو اصل میں وہ۔

"تم ایک پٹاخہ لڑکی ہو بلکہ تم میں کئی بڑے بڑے پٹاخے پھوٹ پڑنے کو ہیں۔" تھا۔

اور جاپانی جملے کا اصل ترجمہ "خدا کے لیے اپنے ایشین فلیگ کو سنبھالنا سیکھ لو، آدھی یونی اس سے الجھ کر زخمی ہوچکی ہے اور جو آدھی بچی ہے، وہ زخمی ہونے کے لیے قطار میں کھڑی ہے۔" تھا اور مصری جملے کا۔

"خدا کا شکر ہے ہمارا مانچسٹر ڈوبنے سے بچ گیا۔"

اور کورین جملہ جو عالیان نے مجھ پر شکر لازم ہے۔ لکھنے کے لیے کہا تھا تو دراصل وہ کچھ یوں لکھا گیا تھا۔

''ہم بھی مانچسٹر کی پیداوار اپنی ایک امرحہ لاہور پر اتاریں گے' انہیں بھی معلوم ہو دن میں ستارے اور رات میں سورج کیسے دکھتے ہیں' پھر کیا وہ شکر ادا کریں گے؟''

اگلا جملہ اطالوی میں لکھا تھا اور آخر کار وہ اس پیغام تک پہنچ ہی گئی تھی۔

''یہ کیا لکھا ہے؟'' اس نے لکھنے والے سے رابطہ کیا۔

وہ مسکرایا' اسے دیکھا جھکا اور ایک گھٹنے کو ٹیک کر زمین پر بیٹھ گیا اور اس کا دایاں ہاتھ پکڑ لیا۔

''اس کا مطلب ہے میرے سامنے جھک کر میرا ہاتھ تھام لو۔''

''گل سرخ'' کی گزر گاہوں کی راہی بنی وہ لہرا سی گئی۔

''اتنے چھوٹے سے جملے کا اتنا بڑا مطلب؟''

''ہاں۔ جیسے ایک امرحہ کا مطلب سارا عالیان۔''

اس نے کاملیت لیے کہا۔

اب اس کے آگے دوسرا پیغام تھا جو فرنچ میں تھا اس نے کن اکھیوں سے عالیان کو دیکھا اور مطلب پوچھنے کی غلطی نہیں کی' لیکن اس نے مطلب بتانے کی جلدی ضرور کی۔

''اس کا مطلب ہے میرا دوسرا ہاتھ بھی تھام لو۔'' بیٹھے بیٹھے ہی اس نے اس کا دوسرا ہاتھ بھی پکڑ لیا۔

اس بار اس کی ہنسی اتنی دیر تک گونجتی رہی کہ وہ سیف الملوک پر اترتی پریوں کی آنکھوں کی چمک بن گئی۔ ''اور ایک پیغام جو میں نے لکھا ہی نہیں وہ میں تمہیں سناتا ہوں'' اس کا انداز بانسری ہو گیا اور الفاظ ''راہ گل ارغون'' کی طرف پیش قدمی کرنے لگے۔

''مجھ سے شادی کرو گی امرحہ؟'' سوال پھر سے دہرا دیا گیا اس بار دونوں ہاتھ تھام کر اور سب کچھ جان کر۔

امرحہ کا پورا وجود ہی ایک خوف میں سمٹ آیا اور اسے یاد آیا کہ زندگی بھی کن کن مراحل کو ہتھیلی پر سجائے کھڑی ہے۔ جو پیچھے رہ گیا تھا فی الحال وہ اب آگے آنے والا تھا۔ لیکن اس نے پہلے والی غلطی دوبارہ نہیں کی۔ اس نے ہاتھ بلند کیا اور گھنٹیوں کو لہرا ڈالا اور وہ دیر تک قبولیت کے زیر اثر خوشی سے بجتی رہیں۔

وہ کھڑی مسکرا کر اسے دیکھ رہی تھی وہ بیٹھا اس کی مسکراہٹ پر نثار ہو رہا تھا۔

''محبت پر فرمان غالب آ گیا اور فراق کو رخصت کی اجازت دے دی گئی۔ کیونکہ تمثال گر نے ''محبت'' کو ''من'' کر کے ''محرم'' بنا دیا۔''

اب تکرار کی ضرورت رہی نہ انکار کی حاجت۔



وہ لاہور آ گئی اور یہ دیکھ کر بہت خوش ہوئی کہ گھر ایسے سجا تھا جیسے کوئی اہم شخصیت آ رہی ہو۔ اس کا نیا کمرہ بے انتہا خوب صورت سجایا گیا تھا لیکن وہ کمرہ اس نے حماد کو ہی دے دیا اور خود اپنے اور دادا کے کمرے میں ہی رہی۔

دانیہ کی منگنی ٹوٹنے کی خبر تو اسے مانچسٹر میں ہی معلوم ہو چکی تھی' واپس آ کر اندازہ ہوا کہ خاندان سے تعلقات بھی برائے نام ہی رہ گئے ہیں۔

سب گھر والوں کو اس کے زخمی ہونے کے بارے میں دادا نے بتا دیا تھا گولی لگنے کا نہیں۔ دادا اکیلے ہی اسے ایئرپورٹ لینے آئے تھے اور وہ سمجھی نہیں کیوں کیوں کہ انہیں اسے گلے لگا کر بہت رونا تھا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ کیوں اتنا رو رہے ہیں اب ہی تو وہ ٹھیک ہوئی تھی۔ اسے دادا کی ہر حرکت مشکوک لگ رہی تھی بلکہ اسے دادا سے ہی ڈر لگ رہا تھا۔

یہ اتنا وقت اس کے دور رہنے کا اثر تھا یا زخمی ہونے کا۔ دادی اور اماں اس کے ساتھ گھر کا ''اکلوتا لاڈلا'' والا سلوک کر رہی تھیں۔ اس کے آنے کے تین گھنٹے کے اندر اندر ہی ایک جنگ چھڑی حماد' علی اور دانیہ کے درمیان اور دانیہ سب چیزیں لے کر اپنے کمرے میں قلعہ بند ہو گئی' ان تینوں نے اس کا سامان کھول کر خود

ہی سب کچھ نکال لیا تھا تین گھنٹے بھی پتا نہیں وہ کیسے رکے رہے۔

اب حماد دانیہ کو دروازہ توڑ دینے کی دھمکی دے رہا تھا اور دانیہ یہ ثابت کر رہی تھی کہ وہ تو پیدائشی بہری ہے اور گونگی بھی۔ خیر مزید چند گھنٹے لڑنے کے بعد آخر کار وہ طے کر پائے کہ کیا کس کا ہے۔

اسے آئے ایک دن بھی نہیں ہوا تھا کہ اس نے سنا دادی اور اماں کسی فیملی کو گھر بلانے کی باتیں کر رہی تھیں۔ اس نے بہت آرام سے خود کو واش روم میں گرا لیا (ڈرامہ) اور یہ ثابت کر دکھایا کہ اس سے تو چلا بھی نہیں جا رہا آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا جاتا ہے اور وہ بات کرنا ہی بھول جاتی ہے۔

دادا البتہ زیر لب ہنسے جسے دیکھ کر اس نے سوچا۔

"یہ اپنا شہریار تیار کر کے بیٹھے ہیں' ایک دو شہریار دادی اور اماں کے پاس بھی ہیں۔"

اس نے اور عالیان نے ان سب معاملات پر ابھی بات نہیں کی تھی۔ امرحہ نے اس لیے کہ فی الحال وہ کچھ بگاڑنا نہیں چاہتی تھی۔ اسے تھوڑا وقت چاہیے تھا اور عقل مندانہ حکمت عملی اپنانی تھی۔ وہ یہ سب واپس جا کر کرنا چاہتی تھی۔ معاملات ظاہر ہے ویسے ہی پیچیدہ تھے جیسے پہلے تھے فرق صرف یہ تھا کہ اب عالیان اس کے ساتھ تھا پہلے تو اسے دادا کو منانا تھا۔

عالیان نے اسے بتایا تھا کہ دادا کی اور اس کی بات ہوتی رہی ہے اور امرحہ نے یہی سوچا کہ جیسی صورت حال چل رہی تھی۔ دادا کسی سے بھی بات تو کر ہی سکتے تھے... عالیان سے بھی... اور یہ اسے کوئی ایسی بڑی بات نہیں لگتی تھی۔

"تم سے ملنے کچھ لوگ آ رہے ہیں۔" جس بستر پر وہ معذور ہونے کا ڈرامہ کیے دراز تھی وہاں اس کے پاس اس کا ہاتھ پکڑ کر دادا نے کہا۔

"لیکن میں تو چل بھی نہیں سکتی۔ کیسے ملوں گی؟ آپ بھول رہے ہیں' برازیلا میں مجھے گولی لگی تھی۔ گولی سمجھتے ہیں آپ؟" وہ بڑی گولی زدہ سی نظر آنے لگی۔

"ہاں! گولی مطلب گولی ہی۔" دادا ہنسے۔

"تو گولی کھانا کوئی آسان ہے۔ اتنی تکلیف رہتی ہے میرے شانے میں اور چلتی ہوں تو بری طرح سے چکر آتے ہیں۔ مانچسٹر سے لاہور میں صرف آپ کے لیے آئی ہوں' لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں ٹھیک ہو گئی ہوں مجھے بیمار ہی سمجھا جائے دادا۔"

"وہ بیمار کے کمرے میں آ جائیں گے۔" دادا اس کے انداز سے محظوظ ہوئے۔

"ہو سکتا ہے اس وقت میں سو رہی ہوں۔" وہ نیم دراز ہو گئی۔

"جب تم جاگ رہی ہو گی وہ تب آئیں گے۔"

"میرے کمرے سے دوائیوں کی بو آتی ہے' مجھ میں سے بھی... ایسے موقعے پر سادھنا کہتی ہے "چھی چھی..." برا منہ بنانے میں اس نے سب بڑوں کو مات دے دی۔"

"ہی ہی... ایسے موقعے پر دادا یہ کرتے ہیں۔" دادا کتنی ہی دیر ہنستے ہی رہے۔

"تو میں ان مہمانوں کو انکار کر دوں کہ تم نہیں ملنا چاہتیں؟"

"بالکل! پھر کبھی سہی (وہ کبھی جو کبھی نہیں آئے گی)۔"

"پھر کب؟ تم مانچسٹر چلی جاؤ گی' شٹل کاک میں لیڈی مہر کے پاس وہاں وہ تم سے تمہارا ہاتھ تو نہیں مانگیں گی نا؟"

اس نے چونکنے میں وقت لیا کیوں کہ بات دیر سے سمجھی۔ "آپ مذاق کر رہے ہیں۔"

"نہیں امرحہ! اب مذاق نہیں۔" انہوں نے افسردگی ملی سنجیدگی سے کہا۔

"سنو میری پیاری مانچسٹر سے دو خوب صورت لوگ لیڈی مہر اور ان کا بیٹا عالیان آج صبح لاہور آ چکے ہیں اور اس وقت ہوٹل میں ہیں اور ابھی میں ان کے ساتھ چائے پی کر آ رہا ہوں اور کچھ ہی دیر میں مجھے ان کے پاس واپس جانا ہے' کل دن میں عالیان ہمارے گھر آئے گا۔"

امرحہ کے دیکھنے اور سننے کے انداز میں بے یقینی تھی۔

"آپ کیا کر رہے ہیں دادا؟" اس نے سہم کر پوچھا اس کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ اور اس کے شانے میں تکلیف اٹھی اور بڑھنے لگی

"وہ سب جواب میں تمہارے لیے کر سکتا ہوں۔ مجھے تمہیں کچھ باتیں بتانی ہیں امرحہ! تم جانتی ہی ہو کہ میری ماں اس لیے مر گئی تھیں کہ انہیں سانپ نے کاٹ لیا تھا اور ان کا بروقت علاج نہیں ہو سکا تھا۔ ہم سب بہن بھائی ان کے گرد جمع ہو کر رو رہے تھے اور میں دیکھ رہا تھا کہ کیسے موت ان کی سفیدی کو سیاہی میں بدل رہی ہے۔ وہ میری زندگی کا سب سے دردناک وقت تھا اور دوسرا دردناک وقت وہ تھا جب تم میرے سامنے بیٹھی رو رہی تھیں۔ امرحہ! تمہیں بھی سانپ نے کاٹ لیا تھا اور زہر تمہاری آنکھوں سے پھوٹ رہا تھا وہ سنگ چور تھا اور اس کا زہر تمہاری رگوں میں دوڑتا مجھے دکھائی دینے لگا تھا۔ تمہاری صورت کی سیاہی نے میری آنکھوں کا نور جذب کرنا شروع کر دیا اور میں جان گیا کہ بروقت علاج نہ ہوا تو کون تمہیں مرنے سے بچا سکے گا۔ میں نے عالیان کے لیے لیڈی مہر سے بات کرنا چاہی، لیکن مجھے سادھنا نے بتایا کہ عالیان اور ویرا شادی کر رہے ہیں۔ میری غیرت نے گوارا نہ کیا کہ میں عالیان سے بات کروں، لیکن میں نے خدا کے حضور اپنی بات رکھ دی۔۔۔ تمہارا تریاق عالیان ہی ہے حقیقتاً" یہ مجھے اس وقت معلوم ہوا جب میں نے برازیلا میں اس سے بات کی۔"



پہلی گفتگو کے بعد دوسری گفتگو ڈیڑھ گھنٹے کے بعد ان کے درمیان ہوئی۔ دادا نے عالیان کو فون کیا تھا۔

"تمہیں بہت حیرت ہوگی میری بات سن کر، لیکن اگر تم یہ یقین رکھو کہ میں جھوٹ نہیں بول رہا تو میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میں نے ایک دم سے تمہیں اپنے دل کے بہت قریب پایا ہے اتنا ہی قریب جتنی امرحہ ہے۔ میں ان احساسات کی قدر کرتا ہوں جن کے زیر اثر تم اس حالت میں نظر آ رہے ہو۔ میں ایک بوڑھا انسان ہوں، میری سوچیں بھٹک جاتی ہیں، لیکن میری ایک سوچ تم پر آ کر ٹھہر گئی ہے کہ میں نے تم جیسے انسان کے بارے میں امرحہ کی باتیں لاپروائی اور تنفر سے کیوں سنیں۔۔۔ میں نے اس بات کو معمولی کیوں جانا جب اس نے کہا کہ تم ایک اچھے انسان ہو۔"

عالیان خاموشی سے سب سنتا رہا اور حقیقت یہ تھی کہ اسے اس بات کی پروا نہیں تھی کہ دنیا میں وہ اپنی عظمت کی دھاک کس کس پر بٹھا چکا ہے۔ اسے صرف ایک ہی دکھ تھا کہ جو پیغامات اس کے لیے لکھے گئے اس نے وہ نہیں لیے اور جو ہاتھ اس سے چھوٹ گیا اس نے وہ مضبوطی سے پکڑ کیوں نہ لیا۔ اس وقت اس پر اپنی ذات کی ساری پستیاں اور خرابیاں عیاں ہو گئیں اور اس نے اپنی ساری بدصورتی دیکھ لی۔

"کبھی کبھی ہم بوڑھے کچھ باتیں دیر سے سمجھتے ہیں۔" دادا نے یہ آخری بات کی جو ایک پچھتاوے کا احساس لیے ہوئے تھی۔



"تم نے مجھ سے کہا کہ انسانوں کے ہجوم میں تمہیں ایک ایسا انسان ملا جس کی آنکھ میں رحم دلی اور اخلاق میں نرمی ہے۔ میں یہ کیسے بھول گیا کہ ساری زندگی تم نے بے رحمی اور بداخلاقی ہی دیکھی تھی تو اب اس کی اصل قدر دان تم ہی تو تھیں۔ تم نے کہا امرحہ تمہیں ہمیشہ اپنی قسمت پر رشک رہا جو عالیان کے ملنے سے رشک میں بدل گیا اور تم نے کہا امرحہ کہ مشرق ایک گنجان خطہ ہے، فلسفیوں کے ان فلسفوں سے بھرا ہوا جن کے پیندے میں تعصب ہوتا ہے اور کنارے پر منافقت۔

تم نے اتنی بڑی بات کہہ دی میں کئی راتیں اس سوچ کو لے کر جاگتا رہا کہ تم نے اتنی بڑی بات کیسے سیکھ لی۔ تم معاشرے کی جڑوں میں کب گھس گئیں اور کھری کھوٹی حقیقت کیسے اکھاڑ لائیں؟

تو تم واقعی میں بدل چکی تھیں' مجھے پہلے اس سوچ نے پریشان رکھا پھر جب میرے دل سے خود ساختہ تعصب چھٹا تو مجھے تم پر فخر ہوا۔

ہاں امرحہ قیمتی انسان سے میرا مطلب حسب نسب والا قیمتی انسان ہی تھا اور میں یہی چاہتا تھا کہ تم ہم دو میں سے ایک کا انتخاب کرلو۔ "میرا"۔۔۔ یہ بھی میری کنارے کی منافقت۔ امرحہ ہمیں کچھ وقت لگتا ہے' لیکن ہم اپنا آپ پا ہی لیتے ہیں اور میں نے بھی اپنا کھرا کھوٹا پا ہی لیا۔ تمہارے پاس تو کوئی انسانوں کو ناپنے کا آلہ نہیں تھا پھر بھی تم نے جان لیا کہ "انسان" ہوتا کسے کہتے ہیں اور میں جس نے معاشرتی جنگل میں کئی عشرے اپنے پیمانوں سمیت گزارے میں کیسے چوک گیا۔۔۔ یہ بھی میرے پیندے کی منافقت۔ جس سے لگاؤ ہو جائے اس کے لیے ہم کائنات میں بھاگ دوڑ کر کے بہت سے فلسفے اکٹھے کراتے ہیں کہ دیکھو یہ بے مثال ہے۔ ہم اسے اس آنکھ سے دیکھتے ہیں جو آنکھ دنیا کے پاس نہیں ہوتی جو ہمیں روشنی نظر آتی ہے وہ معاشرے کو اندھیرا دکھتا ہے۔

اگر تم بے قصور ہوتے ہو تو قصور ہمارا بھی نہیں ہوتا۔۔۔ ہاں امرحہ ہمیں یہ مان رہتا ہے کہ ہماری اولاد ہمارا سر نیچا نہیں ہونے دے گی اور یہ بھی سچ ہے کہ میرے جیسے یہ غرور حاصل نہیں کرپاتے کہ ہم نے اولاد کی خوشیوں کو نیچا نہیں ہونے دیا۔

ایک دن میں پارک میں بیٹھا تھا اور دیکھ رہا تھا کہ ایک بچہ پرندوں کے پیچھے بھاگ رہا ہے پھر اس نے اپنے باپ سے کہا کہ اسے بھی اڑنا ہے تو اس کے باپ نے اسے اپنی پشت پر پھیلا لیا اور اپنے بازو پھیلا کر اڑنے کے انداز میں بھاگنے لگا۔ وہ ایک اچھا انسان تھا۔ اس نے مجھے ایک بات بروقت سکھائی کہ میں تمہارے دو پر کیوں نہیں بن گیا کہ تم اڑ سکو' میں نے تمہیں موت کی طرف کیوں دھکیل دیا' میں نے تمہارے پر کاٹ کر تمہیں روایات میں کیوں جکڑ دیا۔ تمہارا سارا جوش و خروش ختم ہو گیا' تمہارے مقاصد فوت ہو گئے' تم بجھ گئیں۔ تو اب میں اپنا آپ تمہیں دیتا ہوں' میں تمہاری وہ ماں اور تمہارا وہ باپ جو انسان کے دو پر ہوتے ہیں کہ اگر اسے یہ دو پر نہ ملیں تو وہ کبھی زندگی کے آفاق پر نہیں اڑ سکتا بنتا ہوں۔

تم نے اپنی حدیں نہیں پھلانگیں اور میرے لیے یہی بہت ہے۔ اب میں تمہیں یہ نصیحت پھر کرتا ہوں "چیزوں سے لاپروائی برتو اور انہیں گم کردو' قیمتی انسانوں کی پروا کرو اور انہیں گم نہ ہونے دو۔"

لیڈی مہر نے خود فون کیا تھا مجھے تمہارے لیے' میں نے بہت سے حساب کتاب لگا کر انہیں اور تمہیں یہاں بلایا ہے اور میں نے ہی انہیں کہا تھا کہ وہ اپنے آنے کے بارے میں تمہیں نہ بتائیں کیوں کہ میں جانتا تھا کہ تم انہیں منع کردو گی' تم واجد سے انہیں ڈراؤ گی اور پھر تم خود بھی نہ آتیں۔ کیوں کہ تم یہاں کی متوقع صورت حال کو سمجھتی ہو۔"

"بابا نہیں مانیں گے۔" امرحہ ڈر ہی گئی۔

"وہ بعد کی باتیں ہیں' اگر تمہارے شانے میں گولی کے اثرات کچھ کم ہو گئے ہیں تو لیڈی مہر کے لیے کمرہ تیار کرو۔ وہ آج رات ہمارے گھر رہیں گی۔ ان کے آنے کی اطلاع میں نے تمہاری اماں اور دادی کو دے دی ہے۔"

شانے کی ساری تکلیف ختم ہو چکی تھی' لیکن نئی تکلیف اس کے دماغ میں اٹھی تھی۔ "بابا اور عالیان۔۔۔" بس یہی سوچ کر۔۔۔



پاک سرزمین کا چاند ہے
تاریخ میں روشن باب ہے
قرارداد کی یادگار ہے
"لاہور" جو شہر بے مثال ہے

اس نے پیروں کی تالی ایسے بجائی جیسے جھروکوں میں چھپی کھڑی لڑکیوں کو ہنسانا چاہتا ہو اور وہ چقوں کی اوٹ میں کھڑیں واقعی ہنس بھی رہی ہوں۔

اس نے ہوٹل کی شاپ سے شلوار قمیص سوٹ خرید کر پہن لیا تھا۔

"شلوار قمیص مجھ پر سوٹ کر رہی ہے نا؟" اس نے ماما مہر سے پوچھا۔

"یہ بنی ہی تمہارے لیے ہے۔" اس کی پیشانی چوم کر انہوں نے کہا۔

لیکن اس کو اطمینان یوں نہیں ہوا کہ وہ تو ماں ہیں ایسے ہی کہیں گی تو اس نے کمرے سے ہوٹل کے باہر تک ملنے والے ہوٹل کے اسٹاف سے پوچھا اور انہوں نے مسکراہٹیں دبا دبا کر کہا "ہاں۔"

پھر اس نے سوچا کہ وہ تو ہوٹل کا اسٹاف ہے اخلاق نبھا رہا ہے۔ لاہور والوں سے پوچھنا چاہیے' سچ وہی بولیں گے۔

تو اس نے سڑک پر ملنے والے دو چار نہیں' آٹھ دس لوگوں سے پوچھ لیا اور جواب میں اسے جو مسکراہٹیں ملیں وہ اسے بہت بھلی لگیں۔ اگر کوئی اسے دیوانہ شیوانہ سمجھ رہا تھا تو وہ اس میں بھی خوش تھا... کیوں؟

کیوں کہ "شہر یاراں"... "شہر جاناں" ہو گیا ہے۔

پھر امتیاز یوں مٹ جاتا ہے کہ ہر ایک کو گلے لگانے کو دل چاہتا ہے کہ یارو' ہیلو! آج سے میں بھی لاہوری ہوا۔ مجھے مبارک باد دیں میں بھی لاہوری ہو گیا ہوں... یہ پہناوا شلوار قمیص اب میرا بھی ہے۔ کلاہ کسی کڑیل پنجابی کی طرح مجھ پر بھی جچے گا اور گھنی مونچھوں کو تاؤ دینا میں بھی جان جاؤں گا۔ آپ جو کھیر کو انگلی سے چاٹتے ہو تو آج سے یہ انداز میرا بھی ہے اور ابھی میں نیا ہوں' لیکن جلد ہی میں پتنگ کو "بو" کرنا سیکھ جاؤں گا اور مجھے دیر نہیں لگے گی نان کو نہاری میں ڈبو ڈبو کر کھانے میں اور اس کا عادی ہونے میں کہ پھیری والے کیسی مزے مزے کی صدائیں لگایا کرتے ہیں اور ڈھول والے کیسی کیسی تھاپ پر ڈھول بجایا کرتے ہیں اور گول گپے والا کیسے بھر بھر کر کھٹے کی پیالیاں دیتا جاتا ہے اور آپ ہی بتائیں کیا میں بھی یہ نہیں کہوں گا کہ او بھائی جی' ویرے' او میاں صاحب' وے تیرا بیڑا ترے... راہ دے سانوں جان دے...

وہ ایویں مسکرا مسکرا کر سب کو دیکھتا جاتا پھر اس نے فون نکال کر امرحہ کو کہا' جس کی ابھی دادا سے گفتگو ختم ہی ہوئی تھی اور اس کے لیے یہ یقین کرنا مشکل ہو رہا تھا کہ عالیان لاہور آ چکا ہے۔

"امرحہ! لاہور میں یہ گیارہواں انسان ہے جس سے میں نے برف باری کا پوچھا اور اس کا کہنا ہے کہ اتنی زیادہ برف باری ہوتی ہے کہ ہمیں کئی مہینوں تک گھروں میں بند رہنا پڑتا ہے۔"

امرحہ ہنس دی۔ "اور...؟"

"اور میں نے ایک خاتون سے پوچھا کہ امرحہ کہاں ملے گی تو وہ سہم گئیں اور الٹا مجھ سے پوچھا گیا... امرحہ واپس آ گئی' اتنی مشکلوں سے تو اسے نکالا تھا لاہور سے۔ تم نے سب کو کتنا تنگ کر رکھا تھا یہاں امرحہ؟"

"جھوٹ... سارا لاہور مجھے نہیں جانتا۔"

"لیکن سارا لاہور اب مجھے ضرور جان جائے گا۔"

خوشی اس کے انداز سے ایسے آشکار ہو رہی تھی جیسے اسے شہر لاہور کی چابی پیش کر دی گئی ہو۔

"ضرور جان جائے گا تم اتنا چلا کر جو بول رہے ہو۔"

امرحہ نے اس کی خوشی محسوس کر لی۔

"میں چلا نہیں رہا' میں خوش ہوں' میں نے خوابوں میں لاہور کی سیر کی ہے' ان سڑکوں پر تمہیں ڈھونڈتا رہا ہوں میں..."

"مجھے ڈھونڈتے تم خود نہ گم ہو جانا لاہور میں اور یہ تمہارے پیچھے شور بہت ہے۔"

"ہاں میں سفر کر رہا ہوں نا۔" وہ اور چلا کر بولا۔

"تم کس طرف سفر کر رہے ہو جو اتنا شور ہے؟"

"ڈرائیور آگے ہے۔ میں کیسے پوچھوں کہ یہ کون سی سڑک ہے' ٹھہرو' میں اس بچے سے پوچھتا ہوں۔"

"بچے سے؟ تمہارے ساتھ بچے کیا کر رہے ہیں؟"

"اسکول کے بچے ہیں میرے ساتھ بیٹھے ہیں یار...!"

"تم بس میں بیٹھے ہو؟"

"نہیں... رکشے میں..."

"کون سے رکشے میں؟"

"جس کے آگے پیچھے پانچ چھ لوگ بیٹھتے ہیں۔"

"اف عالیان... !تم چاند گاڑی میں بیٹھ گئے؟"

"اسے چاند گاڑی کہتے ہیں... کیوٹ... میں اس چاند گاڑی کو مانچسٹر کی سڑکوں پر دوڑتے ہوئے دیکھ رہا ہوں،'تم ہیں' ویرا' سائی اور کارل ڈرائیور'ایک ساتھ کتنے ہی لوگ اور جہاں مرضی لے جاؤ۔"

"تم نے کہا پانچ چھ... اس میں تین آگے اور تین پیچھے بیٹھتے ہیں' مطلب تم کافی تنگ بیٹھے ہو!" امرحہ کو اس کی طرف سے نئی فکر لگی۔

"ہم تنگ نہیں ہیں... ہم پانچ لوگ پیچھے آرام سے بیٹھے ہیں۔"

"پانچ لوگ...؟" امرحہ چلا اٹھی۔

"ہاں امرحہ... سیٹ پر ہم تین ہی ہیں دو بچے میرے دو گھٹنوں پر بیٹھے ہیں۔"

کہتے ایک دم اس کی آہ سی نکلی۔ رکشہ اچھلا تھا اور اس کا سر چھت سے لگا تھا' جو پہلے بھی چھت سے ہی لگا ہوا تھا اور وہ جھک کر بیٹھا ہوا تھا۔ بچے ہنسنے لگے۔ موبائل اس کے ہاتھ سے سڑک پر جا گرا۔ بچوں نے شور ڈال کر رکشہ رکوایا اور بھاگ کر سڑک سے اس کا فون اٹھا کر لائے۔ اس نے آن کیا تو امرحہ کی کال آ رہی تھی۔

"فون گر گیا تھا۔" وہ اپنا سر مسل رہا تھا جو ذرا زور سے لگ گیا تھا۔

"تم تو نہیں گرے نا؟ تم کوئی ٹیکسی نہیں لے سکتے تھے؟"

"میں ٹیکسی میں ہی بیٹھ رہا تھا پھر مجھے یہ چاند گاڑی پسند آ گئی۔ ہوٹل والوں نے مجھے سائیکل دے دی تھی' پر مجھے تو راستے ہی نہیں آتے تو میں نے واپس کر دی۔ اگر تم سائیکل کے پیچھے بیٹھو اور مجھے راستے بتاتی جاؤ تو میں لاہور گھوم لوں۔"

"مجھے خود راستے نہیں آتے۔ میں تمہیں اپنے ہی شہر میں ایسے گم کر دیتی کہ کوئی ہمیں ڈھونڈ نہ سکتا۔"

"اچھا... چلو آؤ پھر گم ہو جائیں امرحہ' اور ہم ہمارے علاوہ کسی کو نہ ملیں۔"

"ہم نہیں' لیکن اب تم ضرور گم ہو جاؤ گے۔"

"میں نقشہ لے کر نکلا ہوں جی..."

"یہ تمہاری یونیورسٹی نہیں ہے کہ تم نقشہ لے کر ہر جگہ چلے جاؤ۔"

"تم غلط ہو... میں امرحہ نہیں ہوں جو نقشہ ہاتھ میں لے کر بھی گم ہی ہوتا جاؤں۔"

"تم جا کہاں رہے ہو؟"

"تاریخی شہر کی تاریخی مسجد کی طرف اور سنو امرحہ! دادا کے رویے سے ایسا لگ رہا ہے کہ وہ تم سے ملنے نہیں دیں گے۔ تم اپنے گھر کا ایڈریس مجھے دو' میں تمہارے گھر کی کھڑکی تک تو آ ہی جاؤں گا۔"

"یہ مانچسٹر نہیں ہے اسپائڈر مین کہ تم عمارتیں کودتے پھلانگتے یہاں وہاں آتے جاتے رہو' یہاں ہم عمارتوں پر خاردار تاریں لگواتے ہیں اور ان میں کرنٹ چھوڑ دیتے ہیں۔"

"کیوں؟"

"تم جیسے اسپائڈر مینوں کے لیے..."

"کیوں لاہور میں رومیو نہیں ہوتے؟"

"ہوتے ہیں' پر ساتھ جولیٹ کے ابا جی بھی ہوتے ہیں۔"

"ہاہا... تم مجھے اپنے بابا سے ڈرا رہی ہو۔ میں ڈرنے والا نہیں۔"

"تم ڈرو نہ ڈرو' وہ تمہیں ڈرا دیں گے۔"

مینار پاکستان کے ایک طرف چاند گاڑی رکی تو اس نے سیلفی لی اور اپ ڈیٹ کر دی۔

"می ان مون کار!"

"گڈ' چاند پر جا کر ہم پر پتھر نہ پھینکنا۔" شاہ ویز کا فوری کمنٹ آیا۔

"آتے ہوئے ایک لیتے آنا۔" سائی نے کہا۔

"یہ تمہارے ساتھ بیٹھے بچے کیا کھا رہے ہیں؟" کارل کا بھوکا کمنٹ آیا۔

"یہ بھنے ہوئے چنے کھا رہے ہیں اور یک زبان خدا کا شکر ادا کر رہے ہیں کہ لاہور میں کوئی کارل نہیں اور عالیان کا دل جیسا بھوکا نہیں۔"

عالیان نے لکھا اور اس کے کمنٹ کو ہر اس ہال

میٹ نے لائک کیا جو بڑے سانحات' ہاتھ سے پکائے کھانوں' **مفن**' پزا' سینڈوچز اور چھوٹے سانحات کینڈی' بسکٹ' چاکلیٹ کی گمشدگی سے گزر چکا تھا۔

"یعنی لاہور ایک نعمت سے محروم رہ گیا۔" کارل نے کمنٹ کیا۔

"نہیں' ایک آفت سے محفوظ ہو گیا۔" عالیان نے جواب دیا۔



شاہی مسجد میں نماز عصر کے بعد وہ باہر نکلا اور اطراف میں گھومتا رہا اور کاغذ کی کون سے بھنے چنے نکال نکال کر کھاتا رہا پھر دادا اسے آملے اور اپنے ساتھ گھمانے لگے۔ لیڈی مہر وہ گھر چھوڑ آئے تھے۔

رات کا کھانا کھلانے وہ اسے فوڈ اسٹریٹ لے آئے تھے۔ دادا نے کھیر پہلے ہی منگوا کر رکھ لی تھی تاکہ اگر اسے زیادہ مرچیں لگیں تو وہ کھیر کھا لے اور اتفاق سے وہ کھانے سے زیادہ کھیر کھا گیا اور اس کے کان اور ناک سرخ ہو گئی اور آنکھوں میں پانی تیرتا رہا۔

دادا اسے دیکھ کر ہنسنے لگے اور وہ خود بھی ہنسنے لگا اور اس دوران اگر کوئی کمزور بینائی والا بھی اسے دیکھتا تو رک کر ضرور کہتا "بہت خوش ہو۔۔۔ خدا تمہاری خوشی کو نظر بد سے بچائے۔"

"ہو سکتا ہے تم یہ محسوس کر رہے ہو کہ تمہیں اچھے انداز سے خوش آمدید نہیں کہا گیا اور امرحہ کے خاندان کے نام پر صرف میں ہی تم سے مل رہا ہوں۔"

"میں نے ایسا کچھ محسوس نہیں کیا۔ میں نے یہاں آکر اجنبیت محسوس نہیں کی' خوش آمدید کہنے کا اس سے بہتر انداز اور کیا ہو گا۔" اسے وہ بچے یاد آئے جو اس کے گھٹنوں پر بیٹھے تھے اور اپنے منہ کے ساتھ ساتھ اس کے منہ میں بھی چنے ڈال رہے تھے' جیسے وہ جان گئے تھے کہ کوئی پہلی بار ان کے دیس آیا ہے اور مہمان نوازی میں انہیں بھی اپنا حصہ ڈالنا ہے۔

دادا کو عالیان کی بات اچھی لگی۔ انہوں نے سوچا کہ آگے جو وہ کہنے جا رہے ہیں اسے کہنے کے لیے ان کے پاس مناسب الفاظ ہیں نا۔۔۔ اور کیا وہ ترش اور تلخ تو نہیں کہ سامنے موجود انسان کی مسکراہٹ پر بھاری پڑیں۔

"کیا اب ہم کچھ غور طلب باتیں کر لیں؟" وہ کھانا کھا چکا تو دادا نے پوچھا۔

اس نے سر ہلا دیا۔

"میں نے تم سے یہاں آنے سے پہلے کہا کہ صرف ایک بار اگر تم اپنے والد کو اپنے ساتھ لا سکو تو میرے لیے آسانی رہے گی' بے شک پھر تم ان سے کبھی نہ ملنا' لیکن تم نے انکار کر دیا۔ اب میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ کیا تم یہ کہہ سکتے ہو کہ لیڈی مہر ہی تمہاری والدہ ہیں۔"

دادا اچھی طرح سے جانتے تھے کہ وہ بہت بڑی بات کر رہے ہیں اور واقعی وہ ایک بڑی بات ہی تھی' عالیان کے چہرے کے رنگ ایک دم سے بدلے۔

"ماما مہر میری ماما ہیں' لیکن ماما مارگریٹ کی موجودگی کو چھپا دینا ان پر ظلم ہو گا' پھر میں دوسرا انسان ہوں گا جو ان کی تذلیل کرے گا۔ میں یہ نہیں کر سکتا۔ میں چاہتا ہوں بلکہ آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ معاملات کتنے بھی پیچیدہ کیوں نہ ہوں' آپ ماما مارگریٹ کا تعارف مجھ سے پہلے امرحہ کے خاندان سے کروائیں۔" اس نے ٹھہر ٹھہر کر تحمل سے کہا۔

"تم یہاں کے مسائل کو نہیں جانتے۔"

"شاید' لیکن اپنی خوشی کے لیے میں ماما کی عزت و تکریم کو کیسے کمتر کر دوں۔"

"عالیان! امرحہ کا باپ نہیں مانے گا۔"

عالیان خاموش ہو گیا۔ جتنا میٹھا وہ کھا چکا تھا' وہ کڑوا ہو گیا۔

دادا کو بھی خاموش ہو جانا پڑا شاید انہوں نے اس کا دل دکھا دیا تھا۔ فون پر انہوں نے اس سے کئی باتیں کی تھیں' لیکن یہ بات وہ اسے سامنے بٹھا کر کرنا چاہتے تھے۔

"شاید تم یہ سوچتے ہو کہ واجد ایک جاہل انسان ہے' لیکن وہ جاہل نہیں ہے اس جیسے سب باپ جاہل

نہیں ہیں۔ بہت سے سمجھ دار لوگ اسے دقیانوسیت کہتے ہیں' لیکن دراصل یہ ہمارے حساب کتاب ہیں۔ سیدھے سیدھے حساب۔۔۔ کہ کھجور رہی ہے، جو کھجور کے درخت پر لگے جو جھاڑی پر لگی ملے گی وہ کھجور نہیں ہوگی' ہم بنیاد کو دیکھتے ہیں عالیان! سب دیکھتے ہیں۔ تم دنیا بھر کی ان بڑی درسگاہوں کی مثال ہی لے لو جو صرف قابل' ذہین و فطین طلبا کو ہی داخلے دیتی ہیں جبکہ علم کے دروازے سب پر ہمہ وقت کھلے رہنے چاہئیں تو معیار کے پیمانے ہر جگہ ہیں۔ صرف ہم پر ہی یہ الزام نہیں لگنا چاہیے کہ ہم قدامت پسند اور جاہل ہیں۔ ہم ایسے ہی ہیں۔ رہی معیار کی بات تو ہم انہیں بدل سکتے ہیں' انہیں متوازن کرسکتے ہیں اور بدلتے وقت کے تقاضوں کو دیکھتے انہیں چکردار بنا سکتے ہیں۔

ہمارے یہاں شادی دو لوگ نہیں دو خاندان کرتے ہیں اور اس شادی کو کامیاب بھی دونوں خاندان مل کر کرتے ہیں۔ ٹھیک ہے کچھ رسومات اور اصول کھوکھلے اور بے بنیاد ہوچکے ہیں' اور کچھ سرے سے ہی بے کار اور فضول ہیں' لیکن ہماری معاشرتی پرکھ ہمارے بڑوں کے تجربات پر ترتیب دی گئی ہے اور ان تجربات کو جھٹلایا نہیں جاسکتا۔ ان تجربات کی روشنی میں کچھ فیصلے غلط بھی ہوئے ہوں گے' لیکن وہ سب ٹھیک کردینے کی نیت سے کیے گئے ہوں گے۔

تم دنیا میں گھوم پھر کر دیکھ لو' تمہیں کوئی باپ ایسا نہیں ملے گا جو اولاد کا برا چاہے' اور کوئی ماں ایسی تمہیں ملے گی جس نے اپنی اولاد کی خوشیوں کے لیے کوشش نہ کی ہو۔ تو امرحہ کا باپ اس کا برا نہیں چاہے گا اور اس کی ماں اس کی خوشی سے حاسد نہیں ہوگی' لیکن کچھ خانے تو پر کرنے ہی ہوتے ہیں۔ صدیوں کے چاک پر ڈھلا یہ ڈھانچہ اگر کہیں سے بوسیدہ اور بھربھرا ہو بھی رہا ہے تو ہم پورے ڈھانچے کو منہدم کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں' لیکن مرمت ہم ساتھ ساتھ کرتے جاتے ہیں۔" دادا کہہ کر اسے دیکھنے لگے۔

اور عالیان کو ایک بات اب سمجھ میں آئی کہ اس نے کس آسانی سے کہہ دیا تھا کہ اسے اس خطے کا سفر نہیں کرنا جہاں انسانوں سے زیادہ روایات کا احترام کیا جاتا ہے' اس نے اب جانا کہ ان روایات کا احترام ہی دراصل ان سے جڑے انسانوں کا احترام ہے۔۔۔ اگر ہم "بڑوں کی عزت" کی روایت کا احترام نہیں کریں گے تو "چھوٹوں سے عزت" کی وصولی ہمیں بھولنی پڑے گی۔ اور پھر ایسے انسانی معاشرے کا پھلنا پھولنا ایسا ہی ہوجائے گا جیسے درخت کا زمین کے بغیر نمو پانا یعنی "نمو ہی نہ پانا"

"مجھے تمہاری یہ بات اچھی لگی کہ تم نے امرحہ کو اکسایا نہیں' زمانہ جس تیزی سے ترقی کرچکا ہے ایسے وقت میں یہ کوئی انوکھی بات نہ ہوتی۔"

"میں کبھی ایسا نہ کرپاتا اور کرتا بھی تو امرحہ نہ مانتی۔"

"میں جانتا ہوں۔۔۔ تم کل گھر آرہے ہو' تم ابھی صرف سب سے ملوگے' پھر دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے۔" دادا کچھ زیادہ پرامید نہیں تھے۔

عالیان سمجھ سکتا تھا کہ ان کے لیے سب کتنا مشکل ہورہا ہے کہ کھانے کے نام پر انہوں نے صرف چند نوالے ہی کھائے تھے۔



"تمہارا گھر بہت خوب صورت ہے امرحہ۔"

"شکریہ۔" ان کے سونے سے پہلے وہ ان کے پاس بیٹھی تھی۔ اماں اور دادی نے اچھی میزبان ہونے کا ثبوت دیا تھا اور لیڈی مہر اور ان دو خواتین میں اچھی خاصی باتیں ہوچکی تھیں۔

"مجھے بہت اچھا لگ رہا ہے آپ کو اپنے گھر میں دیکھ کر۔"

وہ ہنسیں۔ "مجھے بھی اپنے گھر میں تمہیں چلتے پھرتے دیکھنا بہت اچھا لگتا ہے' شارلٹ کا ہمیشہ سے یہ کہنا تھا کہ عالیان میرا لاڈلا ہے اور اب اس نے مجھے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ خبردار جو امرحہ کو آپ نے اپنی لاڈلی بنایا۔ اگر ایسا ہوا تو وہ مجھے اپنی کہانیاں سنانا بند کردے گی۔"

امرحہ ہنسنے لگی۔ "پھر ایسا غضب نہ کیجئے گا۔"

"اس نے جب تمہیں مور گن کی شادی میں دیکھا تھا تو میرے کان میں کہا تھا۔" آپ کی بہو خود چل کر آپ کے گھر آگئی ہے۔"

امرحہ ہنس تو دی' لیکن خوف سے وہ ٹھیک سے خوش بھی نہیں ہو پا رہی تھی۔ دانیہ بھی ان کے ساتھ آکر بیٹھ گئی تو لیڈی مہر نے اس سے کہانی کی فرمائش کر دی۔ امرحہ اٹھ کر اپنے کمرے میں آگئی اور دادا کا انتظار کرنے لگی۔

دانیہ کو گوسپ میں خاصی دلچسپی رہا کرتی تھی۔ اسی کا سہارا لے کر اس نے اپنی کالج کی لڑکیوں کی الٹی سیدھی کہانی بنا کر سنانی شروع کی۔ اور کہانی اتنی دلچسپ ثابت ہوئی کہ دس منٹ کے اندر اندر لیڈی مہر سو گئیں۔

"دیکھا میری کہانی کا کمال؟" دانیہ نے فخریہ کہا۔

"ہاں دیکھا' بور کہانیوں پر انہیں ایسے ہی نیند آجاتی ہے۔"

"تم جل رہی ہو۔"

"تمہاری خوش فہمی کو جلا رہی ہوں۔"

اگلے دن لنچ سے پہلے عالیان دادا کے ساتھ گھر آگیا اور کافی دیر تک حماد' علی' بابا اور دادا کے نرغے میں بیٹھا رہا۔ اماں اور دادی سے بھی بات چیت ہو گئی اس کی کچھ دیر جو وہ ذرا اکیلا ہوا تو اس نے اپنی ایک سیلفی لی اور فخریہ اپ ڈیٹ کر دی۔

"امرحہ کے گھر لنچ کے لیے۔"

"کنجوس امرحہ نے کیا کیا بنایا ہے تمہارے لیے؟" کارل کا فوری فون آیا۔

"مانچسٹر کے بھیسنے کارل کا بھیجا پرائم ڈش ہے۔"

"پھر تو مانچسٹر کے دوسرے بھیسنے عالیان کے کان سیکنڈ پرائم ڈش ہوں گے۔"

"ہاہاہا!" وہ دل کھول کر ہنسا کیونکہ آخر کار وہ امرحہ کے گھر آچکا تھا' لیکن امرحہ کہیں نظر نہیں آرہی تھی اور پھر ڈرائنگ روم سے ملحق ڈائننگ روم میں اس نے اسے دیکھا۔ وہ میز پر کوئی کھانے کی ڈش رکھ رہی تھی اور اس کا انداز کچھ ایسا تھا کہ وہ تو اسے جانتی ہی نہیں۔۔۔ تم کون ہو اجنبی۔۔۔ کیا نام ہے بھلا تمہارا۔۔۔ پردیسی ہو۔۔۔ ہمارے دیس کیا لینے آئے ہو؟

عالیان اسے حیران دیکھتا رہ گیا۔ "یہ امرحہ کو کیا ہوا؟"

لنچ جو امرحہ اور دانیہ کے علاوہ سب نے ساتھ بیٹھ کر کیا' کے بعد دادا نے عالیان کو چلنے کا اشارہ کیا۔

یعنی یہ کیا؟ عالیان نے منہ بسور لیا۔ اس نے تو امرحہ کا کمرا بھی نہیں دیکھا تھا' نہ ٹیرس نہ کھڑکی۔۔۔ نہ پورا گھر کہ وہ لاؤنج کے کس صوفے پر بیٹھ کر لیٹ کر ٹی وی دیکھتی تھی اور کس پر سے سوتے میں لڑھک کر گر جاتی تھی۔ کس دیوار کی کس تصویر کو ٹانگتے اسٹول پھسل گیا تھا اور لان کے کس حصے میں وہ کرکٹ کھیلتی رہی ہے اور اس کے گھر کے آس پاس کے وہ کون سے گھر ہیں جن کی ڈور بیل بجا بجا کر وہ بھاگتی رہی ہے اور وہ کون سا گھر ہے جس کی بیل بجاتے اسے الیکٹرک شاک لگا اور گھر میں وہ کون سی اونچائی ہے جس پر سے وہ سپرمین بنی کودنے والی تھی اور وہ کون سی دیوار ہے جس پر اس نے اسکول کا ہوم ورک لکھ دیا تھا اور بدلے میں اس کے کان لمبے اور پونیاں ڈھیلی کی گئی تھیں۔ اور وہ لکڑی کی الماری کہاں ہے جہاں وہ چھپ کر بیٹھ جایا کرتی تھی کہ گھر کے باہر ایک شیر آگیا ہے اور وہ ہم سب کو کھا جائے گا' بڑا سا منہ کھول کر بس غڑپ کر جائے گا ہمیں۔۔۔ ہاں جی۔۔۔

عالیان کو ہوٹل واپس آنا پڑا اور رات کو دادا لیڈی مہر کو بھی ہوٹل چھوڑ گئے۔ انہوں نے امرحہ کے رشتے کی بات کر دی تھی اور عالیان کے لیے امرحہ کا ہاتھ مانگ لیا تھا۔

واجد صاحب نے دادا کے اشارے پر ان سے کہا کہ وہ سوچ کر جواب دیں گے۔ دادا کے علاوہ امرحہ اور امرحہ سے متعلق معلومات سب کو بہت کم تھیں۔ وہ بہت اوپر اوپر کی باتیں جانتے تھے جیسے انہیں یہ معلوم تھا کہ امرحہ کی لینڈ لیڈی ایک بیوہ خاتون ہیں۔ انہوں

نے دس بچے لے کر پالے ہیں' اس کا انہیں علم نہیں تھا۔ انہیں پہلے اس بات پر حیرت تھی کہ امرحہ کے آتے ہی فوراً" وہ کیوں آ رہی ہیں۔ دادا نے کہہ دیا کہ میں نے ہی بلایا ہے' ان کا بیٹا ہے اس کے لیے وہ امرحہ کا ہاتھ مانگنا چاہتی ہیں۔

"امرحہ اسی گھر میں رہتی ہے' جس میں یہ لڑکا رہتا ہے؟" واجد صاحب کا پہلا سوال یہ تھا۔

"نہیں' لڑکا ہاسٹل میں رہتا ہے۔"

"اپنے گھر کے ہوتے ہاسٹل میں کیوں رہتا ہے؟"

"یہ خاتون مہر جسمانی نقص کا شکار ہو گئی تھیں۔ ان کے ساتھ ایک ہندوستانی لڑکی ان کی دیکھ بھال کے لیے رہتی ہے اور امرحہ کی طرح کی چند دوسری لڑکیاں' تو لڑکے کا گھر میں قیام انہیں مناسب نہیں لگا۔"

یہ عالیان کے گھر آنے سے پہلے کی باتیں تھیں' جو دادا نے دادی اماں اور واجد صاحب کو بتائیں۔ وہ چاہتے تھے کہ عالیان سے مل لیں تو باقی باتیں بعد میں ہی ہوں۔ اور سب نے عالیان سے مل لیا اور الفاظ کے استعمال کے بغیر یہ بتا بھی دیا کہ انہیں عالیان سے مل کر کتنا اچھا لگا ہے تو دادا نے باقی باتیں کرنے کا فیصلہ کیا۔

"آپ کہہ رہے تھے کہ امرحہ کے کانووکیشن کے لیے آپ مانچسٹر جائیں گے تو اب میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گا' پھر دیکھیں گے کیا کرنا ہے۔"

دادا نے خود کو تیار کیا' وہ اپنے بیٹے سے خوف زدہ نہیں تھے لیکن وہ چاہتے تھے جو باتیں اب آگے وہ کرنے والے ہیں ان پر بھڑکنے کے بجائے تحمل سے تبادلہ خیال کیا جائے۔

"کیا تمہیں عالیان پسند نہیں آیا؟"

"آیا ہے اسی لیے تو کہہ رہا ہوں' وہاں چلیں گے۔ کچھ دیکھ بھال لیں گے۔"

"میں نے دیکھ بھال لیا ہے۔ میں چاہتا ہوں ہم دونوں کا نکاح کر دیں' منگنی کے حق میں میں نہیں ہوں۔" دادا نے اپنی طرف سے بڑی سمجھ داری کا مظاہرہ کیا۔

"آپ نے کہاں دیکھا بھالا ہے اسے۔ آپ تو خود پہلی بار مل رہے ہیں' اور اتنی جلدی لیا ہے منگنی یا نکاح کی۔ کچھ ہی مہینے ہیں نا' ہم چلیں گے وہاں۔ پھر دیکھیں گے۔"

"ٹھیک ہے' ہم مانچسٹر چلیں گے لیکن تم صبر و تحمل سے میری چند باتیں سن لو۔"

واجد صاحب کی پیشانی پر پہلی بار شکن نمودار ہوئی۔ "کیسی باتیں؟"

"عالیان مسلمان ہے اور بہت اچھا لڑکا ہے۔"

"وہی تو آپ کو کیسے پتا بابا کہ وہ اچھا ہے؟" وہ ہنسے۔

"پتا چل جاتا ہے۔" اس دلیل کو وہ کسی بھی دلیل سے پائیدار نہیں بنا سکتے تھے۔

"ایسے ایک بار ملنے سے نہیں پتا چلتا۔"

"میرا تجربہ اتنا ہو چکا ہے کہ۔"

"میرا تجربہ آپ جتنا نہیں ہوا۔ اور مجھے تجربہ نہیں تسلی کرنی ہے۔"

دادا نے ایسے گہرا سانس بھرا جیسے خود کو تسلی دیتے ہوں۔ "دراصل خاتون مہر ایک بے اولاد بیوہ خاتون ہیں' ان کے شوہر ڈاکٹر تھے۔ ان خاتون نے بچوں کی پرورش کے ایک پرائیویٹ ادارے سے دس بچے لے کر پالے' عالیان کے والد کا نام ولید البشر ہے اور وہ اس وقت ناروے میں ہے' ولید البشر اور عالیان کی والدہ کے درمیان علیحدگی ہو گئی تھی۔" دادا کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کس بات کو پہلے کریں اور کسے بعد میں۔ وہ ذرا گھبرا سے گئے۔

"تو یہ خاتون عالیان کی خالہ ہیں؟ یا کوئی اور رشتے دار؟" شکن گہری ہونے لگی۔

"یہ اس کی ماں ہیں' پالا ہے اسے۔" دادا شکن کی گہرائی ناپ سکتے تھے۔

واجد صاحب بہت دیر تک اپنے باپ کی شکل دیکھتے رہے ان کی ساری خوشی کافور ہو گئی جو عالیان سے مل کر ہوئی تھی۔

"یعنی عالیان بھی ان ہی دس بچوں میں سے ایک ہے جنہیں یتیم خانے سے لے کر پالا ہے؟" ان کا

انداز پھٹ سا گیا' غیر مہذب ہو گیا۔
"یتیم خانہ نہیں' بچوں کے۔"
"ایک ہی بات ہوئی نا بابا' باپ نے کیوں نہیں رکھا اسے؟" وہ عالیان سے "اسے" پر آ گئے فوراً "کہ اب نام لینا گوارا نہیں۔
دادا نے جان لیا کہ کیسے وہ لڑکا جس سے واجد خوش اخلاقی سے باتیں کرتا رہا تھا اب تلخی اور بد اخلاقی سے زیر بحث لایا جانے والا ہے۔
"عالیان کی والدہ اس کے بچپن میں فوت ہو گئی تھیں۔" دادا نے تحمل سے کہا۔
"میں باپ کا پوچھ رہا ہوں بابا!" وہ تلخی سے تیز آواز سے بولے۔
"باپ ایک لاپروا انسان ہے' اسے اپنے بیٹے کی کوئی پروا نہیں رہی۔"
"اور باقی کے رشتہ دار' نانا' نانی' خالہ' ماموں؟"
باپ کی بات کو انہوں نے فی الحال ایک طرف رکھا۔
"عالیان کی والدہ اپنے والدین کی اکلوتی بیٹی تھیں اور ان کے والدین ان کی شادی سے پہلے ہی وفات پا گئے تھے۔"
"تو اس کی شادی کسی نے تو کی ہو گی نا ولید البشر کے ساتھ۔ کوئی رشتے دار۔ کوئی چچا کوئی ماموں' دادا' دادی' ماں باپ مرنے سے باقی خاندان تو نہیں مرجاتا نا؟"
"ہمارے اور ان کے ماحول میں فرق ہے واجد۔!"
"رشتوں میں تو فرق نہیں ہے نا۔ خونی رشتے تو ہر جگہ ہوتے ہیں نا؟"
دادا کا حلق خشک ہو گیا تو ان کا فیصلہ ٹھیک تھا کہ ان سب سوالوں کے لیے انہوں نے عالیان اور لیڈی مہر کو آگے نہیں کیا تھا۔
"بولیں نا؟ اور باپ نے کیوں نہیں رکھا اسے؟ آپ نے ہی منع کیا تھا مجھے کہ میں ان سے کچھ نہ پوچھوں' میں یہی سمجھا کہ یہ امرحہ کی لینڈلیڈی کا بیٹا ہے' چلیں یہاں تک میں نے قبول کر لیا۔ اب آگے؟ کیا کیا کہہ رہے ہیں آپ؟"
"کہا تو ہے کچھ باپ ہوتے ہیں خدا رسول کو بھولنے والے' اس نے اپنی اولاد کی پروا نہیں کی' اور ہمیں اس سب سے کیا' لڑکا اچھا ہے' اس کا مستقبل روشن ہے۔"
"کوئی تو وجہ ہو گی جو اس نے اپنی اولاد وہ بھی لڑکے کو نہیں اپنایا' بابا آپ کچھ چھپا رہے ہیں مجھ سے' میں ایک کاروباری انسان ہوں مجھے پاگل مت بنائیں' امرحہ آپ کی لاڈلی ہے' اس کا مطلب یہ نہیں کہ آپ اسے اتنی آزادی دے دیں کہ وہ یہ سب کرے' یہ لڑکا اس کی یونیورسٹی میں پڑھتا ہے نا' اور یہ آپ کا اور امرحہ کا رچایا کھیل ہے' امرحہ اپنی لینڈلیڈی کو اس کی ماں بنا کر لے آئی' ورنہ وہ یتیم خانے میں پلنے والا اس کا کوئی آگے نہ پیچھے' آزاد معاشرے کی پیداوار کسی کا گناہ۔"
"ایسا کچھ نہیں ہے۔" دادا نے بڑے غصے سے کہا۔
"تو پھر کیا ہے؟" وہ بھی چلائے۔ "کیا چل رہا ہے آپ کے اور امرحہ کے درمیان۔ بابا آپ نے اسے لاڈ میں رکھا' ٹھیک ہے لیکن میں اس کا باپ ہوں' اس کے لیے فیصلہ مجھے ہی کرنا ہے' آپ نے اسے مانچسٹر بھیج دیا میں نے کچھ نہیں کہا لیکن اب۔"
"بعد میں تم نے ہی کہا تھا کہ میرا فیصلہ ٹھیک تھا۔ یاد ہے؟ چند ماہ پہلے تم نے مجھ سے کہا کہ امرحہ کے دیے پیسوں سے تمہارے کاروبار میں ایسے برکت پڑی ہے کہ تم نے سارے قرض اتار دیے ہیں' ہر اچھے فیصلے کے نتائج کچھ وقت گزارنے کے بعد ظاہر ہوتے ہیں۔"
"یعنی آپ نے مجھے اندھا ہی سمجھ لیا تھا۔ جس کا نا نہ پتا اسے آپ اور آپ کی لاڈلی گھر لے آئے۔ اچھی ملی بھگت کی آپ دونوں نے۔"
"عالیان بہت اچھا لڑکا ہے واجد۔!"
"اس کی پیشانی پر لکھا ہے؟"
"کیا سب اچھے لوگوں کی پیشانیوں پر لکھا ہوتا ہے؟"

"ہاں لکھا ہوتا ہے' خاندان' باپ' دادا' شرافت رکھ رکھاؤ' حسب نسب' یہ ہوتی ہیں پیشانیوں کی لکھائی۔ ایک عورت کو اٹھالائے اس کی ماں بنا کر۔"

"ماں بنا کر نہیں وہ اس کی ماں ہیں واجد۔"

"سگی ماں تو نہیں ہیں نا پھر۔ اور باقی کے بچے۔ وہ سب کون ہیں' یہ کیسا خاندان ہے' خاندان کا سربراہ' نہ آگے نہ پیچھے' ایک عورت اور اس کے دس بچے۔"

"تم ایک عظیم خاتون کی بے عزتی کررہے ہو واجد!" دادا نے دلی دکھ سے کہا۔

"آپ نے میری بے عزتی کی ہے ایسے لوگوں کو گھر بلا کر۔ کوئی ضرورت نہیں امرحہ کو واپس وہاں بھیجنے کی' بہت کرلی پڑھائی' میں نے غلطی کی جو اسے آپ کے حوالے کردیا۔"

دادا استہزائیہ ہنس دیے' "میرے حوالے اسے تم نے نہیں کیا تھا' میں نے خود اسے سنبھالا تھا' تمہاری اور تمہارے خاندان کی جاہلانہ سوچ اور حرکتوں سے اسے بچائے رکھا۔ بیٹی بیٹی لگا رکھا ہے تم نے' تمہاری بیٹی تب ہوتی جب تم کبھی اس کے دکھ میں شریک ہوئے ہوتے' کبھی پونچھے اس کے آنسو تم نے۔"

"اسے کھلایا' پلایا' جوان کیا۔ کیا کم کیا؟"

"کھلانا' پلانا ہی سب نہیں ہوتا۔ بڑا احسان جتاتے ہو کھلا پلا کر اولاد کو' اولاد کے پہلے حق 'محبت' کی ادائیگی کب کی تم نے۔ تمہیں تو یہ تک نہیں معلوم کہ چھپ کر رونے کے لیے وہ گھر کے کس کونے کی طرف بھاگتی تھی۔"

"ہاں میں ایک برا باپ ہوں۔ اب چپ کرجائیں' بس ساری بات ختم۔"

"میں فیصلہ کرچکا ہوں۔ تم سے رائے لی تھی آخری فیصلہ میرا ہی ہوگا۔"

دادا نے ایسی سنجیدگی اور مضبوطی سے کہا کہ واجد صاحب رک کر انہیں دیکھنے لگے۔ دونوں دادا کے کمرے میں بیٹھے تھے' جبکہ باہر سب ان کی آوازیں آسانی سے سن سکتے تھے۔ امرحہ دانیہ کے کمرے میں تھی اور وہاں سے با آسانی سب سن سکتی تھی۔

"پھر آپ مجھے سب سچ سچ بتائیں۔ کیا ہے یہ سب؟"

دادا نے سوچا کہ تو پھر انہیں وہی کرنا پڑے گا جو انہوں نے پیش بندی کے طور پر سب سے آخر میں رکھا تھا۔ اور اب سب بتا دینا ہی ہوگا کیونکہ نہ بتانے سے بھی کچھ فرق نہیں پڑے گا' واجد کا رویہ معجزہ ہی ہوگا جو بدلے گا۔

"عالیان کی والدہ ایک غیر مسلم عورت تھیں۔ انہوں نے ایک مسلمان سے شادی کی۔ ولید البشر نے عالیان کی والدہ کو دھوکا دیا اور چھوڑ کر چلا گیا۔ اور دوسری شادی کرلی۔ عالیان کی حقیقی ماں اور خاتون مہر ایک دوسرے کو جانتی تھیں۔"

واجد کئی لمحے اپنے والد کی طرف دیکھتے رہے' انہیں یقین نہیں آیا کہ انہیں جو ابھی بتایا گیا ہے وہ ان کے باپ نے اتنی آسانی سے کہہ بھی دیا ہے۔

"آپ ایک غیر مسلم عورت کے بیٹے کے لیے امرحہ کے رشتے کے حق میں بحث کررہے ہیں' مجھ سے لڑ رہے ہیں' مجھے اتنا کچھ سنا رہے ہیں' آپ نے انہیں گھر ہی کیوں آنے دیا؟" اس بار وہ پوری قوت سے دھاڑے۔

تجربے کی آنکھ سے دادا یہ سب پہلے ہی دیکھ چکے تھے۔ ایسا ہی رویہ اور ایسے ہی سوال۔ یہی رد عمل۔ سب ٹھیک ویسا ہی ہو رہا تھا۔

دادا اٹھ کر کھڑے ہوگئے۔ کمرے میں اماں اور دادی آئیں کہ بات بڑھ نہ جائے۔ دادا نے تینوں کی طرف دیکھا اور کہا۔

"امرحہ میری ہے اور اس کے لیے فیصلہ بھی صرف مجھے ہی کرنے کا حق ہے' عالیان ایک اچھا لڑکا ہے۔ مجھے اس کے ماضی یا خاندان سے کوئی سروکار نہیں' مجھے وہ پسند ہے اور میں امرحہ کی شادی اسی سے کروں گا۔"

"آپ کو لڑکا پسند ہے یا آپ کی لاڈلی اسے پسند کرلائی ہے؟" واجد تیزی سے کہتے کمرے سے نکلے اور امرحہ کی طرف بڑھے۔

''امرحہ!'' انہوں نے چلا کر اسے بلایا۔
''واجد!'' دادا ان کی طرف لپکے۔
''تمہیں پڑھنے کے لیے بھیجا تھا یا یہ سب کرنے؟'' وہ دانیہ کے کمرے میں اس کے سر پر پہنچ گئے اور اسے بازو سے پکڑ کر جھنجوڑا۔
دادا نے لپک کر انہیں امرحہ سے دور کیا۔ حماد' علی' دانیہ 'سب اسی کمرے میں آن موجود ہوئے تھے۔
''یہ جاہلوں والے طریقے نہ اپناؤ' تحمل سے میری بات سنو۔''
''آپ کا طریقہ ٹھیک ہے؟'' ان کی تیز آواز تیز ہی رہی۔
''کون ہے یہ امرحہ جسے تم یہاں لائی ہو؟''
دادا نے ان کا بازو پکڑ کر کمرے سے باہر گھسیٹا اور بڑے جتنوں سے انہیں واپس اپنے کمرے میں لائے۔
امرحہ کمرے میں رونے لگی۔ یہ اس کی خوش گمانی تھی کہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔

''بیٹھ جاؤ واجد! خدا کے لیے۔ تم وہی انسان ہو جس نے ساری عمر کبھی اپنی اولاد کے پاس بیٹھ کر اسے نہیں سنا۔ تمہیں تو یہ تک نہیں معلوم کہ امرحہ یونیورسٹی میں کس مضمون کی طالبہ ہے' اور تم اس کی زندگی کے فیصلے کے لیے ایسے بھڑک رہے ہو جیسے تمہارے ساتھ بہت زیادتی ہونے جا رہی ہے۔ تم جیسے ہی باپ ہوتے ہیں جن کی اولادیں گھٹ گھٹ کر روتی اور مرتی ہیں۔ تم اپنی اولادوں کی بے سکونی کے مسکن ہو' جاؤ ذرا دیر کو اپنی بیٹی کے پاس بیٹھو' اسے سنو' اس کی جگہ خود کو رکھ کر دیکھو' وقت بدل رہا ہے' میں بے مہار آزادی کا قائل نہیں' لیکن ایسی پابندی کا قائل بھی نہیں کہ ایک انسان زندہ ہوتے ہوئے بھی مر جائے۔''
''مجھے یہ رشتہ پسند نہیں' بات ختم۔'' انداز اٹل تھا۔
دادا نے اپنی اتنی باتوں کو صاف بے کار ہوتے دیکھا' جیسے چکنائی لگی پرت پر سے پانی کا بغیر گیلا کیے گزر جانا۔
''کیوں۔؟'' سوال بے کار تھا پر انہوں نے پوچھ لیا۔
''بس نہیں' آپ نے شہریار کی بات کی تھی' اس کے خاندان کو بلا لیں۔''
''تو تم نہیں مانو گے؟''
''کبھی نہیں' میں نے اپنی ناک نہیں کٹوانی' خاندان' لوگ' سب کیا کہیں گے' ایک یتیم بے سہارا ایسے ویسے کو لڑکی پکڑا دی۔ جس کے خاندان کی خبر نہ دین کی۔'' تنفر تھا کہ انداز سے چھلک چھلک جاتا تھا۔
''اس کے مسلمان ہونے پر شک نہ کرو واجد! گناہ گار ہو گے۔''
''آپ اس کا دین تصدیق کروا کر آئے ہیں نا؟'' طنز سے اس کی آنکھیں سکڑ گئیں۔
''میرے تمہارے دین تصدیق ہوئے ہیں؟ جو شخص سال میں چند بار نماز پڑھتا ہے اور سالوں بعد بھی کلام پاک کو کھول کر اس سے ہدایت نہیں لیتا' وہ دوسروں کے ایمان پر سوال اٹھا رہا ہے' اسے دوسروں کے دین کی فکر لاحق ہے۔''
''بابا! بس کر دیں یہ فلسفے' بات ختم بس۔''
''ٹھیک ہے واجد بات ختم۔'' دادا نے کمرے کے دروازے میں کھڑے ہو کر اماں اور دادی کو اندر آنے کے لیے کہا اور جب وہ آ گئیں تو بہت تحمل سے کہا۔
''اس جمعہ کو امرحہ کا عالیان کے ساتھ نکاح ہے' میں نے امام صاحب سے بات کر لی ہے۔''
تھوڑی دیر کو سب کے درمیان سکوت رہا۔
''یہ بچکانہ حرکتیں چھوڑ دیں بابا!'' سکوت ایسے ٹوٹا۔
''بچکانہ ہوتیں تو چھوڑ دیتا واجد! خاندان کے کچھ سمجھ دار لوگوں سے بھی میں نے بات کر لی ہے۔''
''آپ نے ڈھنڈورا پیٹ دیا' کیوں؟''
دادی اور اماں' واجد کی آواز سے سہم گئیں۔ جب سے امرحہ مانچسٹر گئی تھی' اور دادا کی مدد سے گئی تھی تو سب پر اور اچھی طرح سے یہ بات واضح ہو گئی تھی کہ

اس کی زندگی کے باقی فیصلے بھی انہیں ہی کرنے ہیں۔ جو چند رشتے، دادی اور اماں تیار رکھ کر بیٹھی تھیں، اس بات کو ذہن میں رکھے ہوئے تھیں کہ امرحہ کے دادا کی تسلی ہو گی تو ہی بات آگے بڑھے گی۔ اور اب یہ دو خواتین یہ بات بہت آرام سے سمجھ گئی تھیں کہ وہ عالیان میں کچھ دیکھ رہے ہیں تو ہی ایسے اس کے حق میں بول رہے ہیں۔ کیونکہ وہ دنیا میں آخری انسان بھی نہیں ہوں گے جو امرحہ کا برا چاہیں گے۔

"سنو واجد! زندگی میں صرف ایک بار اس کے دل کی بات اس کی خوشی کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ تمہاری بیٹی صرف اسی ایک لڑکے کے ساتھ خوش رہے گی، تمہاری اجازت اہم ہے اس کے لیے۔"

"تو آپ مان رہے ہیں کہ امرحہ ہی لائی ہے اس لڑکے کو؟"

"واجد! میں تم سے نہیں جیت سکتا سوالوں اور جوابوں میں۔ تم ایک کھونٹے سے بندھے ہو، حرکت کرنے کے لیے تیار ہی نہیں۔ آگے پیچھے کسی بھی طرف پیش قدمی کرنے کے لیے راضی ہی نہیں۔ ضد، انا، ادھر ادھر کی بے کار باتیں 'یہ' 'وہ'۔ میں جانتا تھا تم کبھی نہیں مانو گے، کبھی نہیں۔ پھر بھی میں نے کوشش کی۔ اب بھی تمہیں سمجھا رہا ہوں۔ لیکن بہت سی باتیں بہت سارا وقت گزرنے کے بعد ہی سمجھ میں آتی ہیں اور تمہاری سمجھ کے لیے میں بہت سارے وقت کا انتظار کر سکتا۔ میں نے اپنا وقت وفات نہیں پڑھ رکھا کہ اس وقت سے پہلے تک تمہیں راضی کرتا رہوں۔ امرحہ عاقل و بالغ ہے۔ اس کی پسند اور فیصلے کی اپنی جگہ اہمیت ہے۔ تم اس کے باپ ہو لیکن اسے بڑا میں نے کیا۔ جو حق اس پر میرا ہے، وہ تمہارا صرف اس لیے نہیں ہو سکتا کہ تم باپ ہو اس کے، تم امرحہ کو نافرمان ہونے کی بددعا دے سکتے ہو لیکن یاد رکھنا نافرمانی کی بددعائیں تب ہی لگا کرتی ہیں جب فرماں برداری سے فرائض ادا کیے گئے ہوں۔ اور فرائض میں پہلا فرض "محبت" کا ہے۔"

☆ ☆ ☆

گھر میں تناؤ بڑھتا گیا۔ دادا لیڈی مہر کے پاس گئے اور انہیں صورت حال سے آگاہ کر دیا، لیکن عالیان کو کچھ نہیں بتایا۔

ایک بار بابا پھر امرحہ کے پاس آئے۔

"تمہارے دادا تمہارا نکاح کرنا چاہتے ہیں اس سے۔ ان سے کہہ دو تمہیں منظور نہیں، اچھے خاندان اور لڑکوں کی پاکستان میں کمی نہیں ہے۔"

امرحہ خاموش سر جھکائے بیٹھی رہی۔

"امرحہ!" وہ چلائے۔

آنسو ٹپ ٹپ اس کی آنکھوں سے گرنے لگے۔

دادا ان دونوں کے پیچھے آکر کھڑے ہو گئے۔

"میرے لیے کچھ تو آسانیاں پیدا کریں۔" بہت دھیمی آواز میں اس نے کہا۔

"جانتی ہو لوگ کتنی باتیں کریں گے؟"

"لوگ باتیں ہی کرنے کے لیے پیدا ہوتے ہیں، میں اور تم بھی تو لوگ ہی ہیں ہم دونوں کبھی باز آئے باتیں کرنے سے۔ آج میں اور تم شروعات کرتے ہیں کل کو دنیا بھی چپ ہو جائے گی۔" دادا نے بڑی آس سے کہا کہ شاید کچھ بہتری ہو جائے۔

"دنیا آپ کے اشاروں پر نہیں چلے گی۔" وہ ہونہہ کے انداز سے بولے۔

"اگر دنیا میرے اشاروں پر نہیں چلے گی تو میں بھی دنیا کے اشاروں پر نہیں چلوں گا، امرحہ کی خوشیاں تو میں ہرگز اس دنیا کی سیاہی سے نہیں لکھوں گا۔"

"مجھے معلوم تھا یہی سب ہو گا۔" بابا غصے سے چلے گئے تو دادا اس کے پاس بیٹھ کر اسے چپ کروانے لگے۔

"اسی لیے میں نے تمہیں اور عالیان کو یہاں بلایا تھا۔ میں چاہتا تو مانچسٹر آکر بھی تمہاری شادی کر سکتا تھا لیکن صرف یہی ایک بات میں نہیں چاہتا تھا، کہ تمہارا باپ، ہی کہہ دیتا کہ تم نے خود وہاں شادی کر لی تھی اور میں تم پر پردہ ڈالنے گیا تھا۔ خاندان کی کتنی ہی لڑکیوں کو ان کے گھر والے پڑھنے کے لیے باہر نہ بھیجتے شاید۔ میں نے بہت سوچا ہے اس بارے میں، اب

ایک آخری حل یہی ہے کہ تم خود جاؤ واجد کے پاس اور کوشش کر کے دیکھو، شاید وہ مان جائے۔"

"مجھے ان سے ڈر لگ رہا ہے۔"

"آؤ میرے ساتھ۔" اسے ساتھ لے کر وہ ان کے کمرے میں لائے۔ دو دن سے وہ اسٹور نہیں جا رہے تھے، گھر میں یہی سب چل رہا تھا۔ وہ بیڈ کے کراؤن سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے، وہ ان کے قریب بیٹھ گئی اور ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

"مجھ پر وہ بوجھ نہ ڈالیں جو میں اٹھا نہ سکوں، بہت مشکل ہو جائے گا سب پھر۔"

"میں تمہارا باپ ہوں کچھ تو میرا لحاظ کرو، تمہارا بھلا ہی سوچ رہا ہوں۔"

"میرے بھلے پر ہاں کہہ دیں۔" اس نے بڑی ہمت کر کے کہا۔

"یہ کبھی نہیں ہو گا امرحہ!" ان کا انکار، انکار ہی رہا۔

ایسا سنجیدہ انکار سن کر وہ کتنی ہی دیر ان کے پاس بیٹھی روتی رہی اور سوچتی رہی، وہ کم تھا جو اس نے پہلے سوچا تھا جو ہو رہا تھا وہ اس سے کہیں زیادہ تھا اگر دادا بھی نہ مانتے تو یہ سب ناممکنات میں سے ہوتا۔

"جمعے کو تمہاری بیٹی کا نکاح ہے واجد! اب ہم ہمیشہ کے لیے اسے گھر سے رخصت کر دیں گے۔" دادا نے کہا اور امرحہ کو لے کر کمرے میں آ گئے۔

"یہ نکاح کبھی نہیں ہو گا دادا!" امرحہ اور رونے لگی۔

"اگر یہ خدا کی طرف سے ہونا طے ہے تو ضرور ہو گا۔ واجد نے مجھ سے کہا کہ اس رشتے کی صورت میں نتائج بھگتنے کے لیے تیار ہو جاؤں، کسی بے دین اور بغیر باپ کے لڑکے کو لڑکی سونپ رہا ہوں۔ میں نے بہت کچھ سنا ہے۔ میں خود بھی ڈگمگا جاتا ہوں پھر میری تسلی یوں ہو جاتی ہے کہ اس کی سرپرست خاتون مہر ہیں، ہمارے بڑے کہتے ہیں جس کی بیٹی لینی ہو اس کی ماں دیکھو اور جس کو بیٹی دینی ہو اس کے باپ کو اور عالیان کا باپ ہے نہیں اور جو ماں ہے، وہ اتنی عظیم ہے کہ انہیں صرف ماں ہی نہیں سمجھا جا سکتا۔ تو میں جو کبھی اپنے ہی فیصلے سے خوف زدہ ہو جاتا ہوں اور شکوک میں گھر جاتا ہوں تو خاتون مہر کے بارے میں سوچ لیتا ہوں۔"

دادا نے بات یہیں ختم کی۔ وہ ایسے سنجیدہ اور چپ چپ سے ہو گئے تھے، جیسے نئے سرے سے حساب کتاب کرتے ہوں۔

امرحہ نے جانا کہ یہ سب کیسا گنجال ہے۔

لیڈی مہر ایک بار پھر گھر آئیں سہولت سے بابا سے بات کرنے، لیکن وہ خاموشی سے اٹھ گئے اور سب بے بس سے ایک دوسرے کو دیکھ کر رہ گئے۔

دادا عالیان کو اسٹور لے گئے۔ وہ وہاں ان سے بات یا کسی اور ردعمل کا منتظر ہی رہا، لیکن کوئی بات ہوئی نہ بدمزگی اور نہ ان کے رویے میں تبدیلی آئی۔

دادا نے ایک ایک کر کے سب کوششیں کر ڈالیں اور سب ناکام رہیں اور آخر میں دونوں میں خاموشی تن گئی اور اس خاموشی نے گھر میں سب کو بے چین رکھا۔

ساری صورت حال کی عالیان کو خبر ہو چکی تھی اور وہ جان گیا تھا کہ امرحہ یہی چاہتی تھی کہ وہ اس سب کا سامنا کرے، وہ افسردہ ہو گیا۔ پہاڑ سا پہاڑ تھا جو سر ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔

"تمہیں رویوں اور روایتوں کے بارے میں ناپسندیدگی سے نہیں سوچنا چاہیے۔" لیڈی مہر نے اسے سوچوں میں گم دیکھا تو اسے اپنے سامنے بیٹھا لیا۔

"میں نے ایسا نہیں کیا۔"

"امرحہ کے دادا نے ہمیں ہر چیز کے بارے میں پہلے سے ہی خبردار کر دیا تھا۔ یہ سب ایسے ہی ہونا تھا ہم سب اپنی اپنی جگہ پر ٹھیک ہیں عالیان اور ہم اپنی اپنی جگہ سے دوسرے کو غلط کہہ رہے ہیں۔ تمہارے لیے امرحہ کے والد غلط ہیں، ان کے لیے تم۔ اور یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں۔"

"ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ، لیکن خبردار رہنا اور حقیقتاً اس سب کا سامنا کرنا دو الگ باتیں ہیں ماما۔"

میں ان کے اسٹور پر گیا تو سارا وقت خوف زدہ ہی رہا۔ میں نے خود کو معمولی اور کمتر محسوس کیا اور مجھے خوف بہت شدت سے لاحق رہا کہ وہ ماما کے بارے میں کچھ کہہ دیں گے۔ میں انہیں اپنا سمجھتا ہوں' کیونکہ وہ سب امرحہ کے اپنے ہیں۔ لیکن وہ مجھے کبھی اپنا نہیں بنائیں گے۔"

"وقت لگے گا اور سب ٹھیک ہونا شروع ہو جائے گا۔"

"سب غلط بھی تو ہو سکتا ہے۔"

"غلط ہو جائے تو بھی یہی سوچو کہ ٹھیک ہو جائے گا۔ مایوسی سے ہارنا نہیں چاہیے بلکہ مایوسی کو ہرا دینا چاہیے۔ امید بڑے کام کی چیز ہے اسے سنبھال کر رکھنا چاہیے۔"

"سب پرامید ہونے سے ہی تو نہیں ہوتا ماما!"

"ایک اچھی چیز امید اور ایک بری چیز ناامیدی میں سے اچھی والی کا انتخاب کر لینا چاہیے' بے شک یہ اپنے عمل میں کتنی ہی سست کیوں نہ ہو۔ یا یہ کتنا ہی انتظار کیوں نہ کروائے۔"

ساری اچھی باتیں ایک طرف لیکن عالیان اس تکلیف کو بری طرح سے جھیل رہا تھا کہ اسے پسند نہیں کیا گیا۔ وہ بار بار خود کو دیکھتا اور اپنے بارے میں سوچتا۔ اس کا اعتماد اتنی سی دیر میں ہی مٹی کے ڈھیر کی طرح بیٹھ سا گیا اور اسے لگنے لگا کہ دنیا میں وہ اکیلا انسان ہے جو سب سے پیچھے اور سب سے زیادہ بے کار ہے۔ اسے یہ بھی لگتا جیسے ولید البشر اس پر بلند بانگ قہقہے لگا رہا ہو۔ اور اس کی طرف اشارے کر کر کے کہتا ہو "دیکھی اپنی حیثیت۔ دیکھ لی۔"

وہ خود کو تلخی سے بچاتا رہا لیکن کچھ تلخی اس میں چھلکنے ہی لگی' دادا نے اسے دیکھا تو ان کا دل جیسے مٹھی میں آگیا۔

"تم دو عظیم عورتوں کے بیٹے ہو عالیان۔ میرے دل میں تمہاری بہت قدر ہے۔"

"یہ دونوں عورتیں سب کے لیے عظیم کیوں نہیں ہیں؟" اس نے امرحہ کے والد کا نام نہیں لیا۔

"تو تمہارے لیے اس سوچ کی کوئی اہمیت نہیں جو میں اور امرحہ ان کے بارے میں رکھتے ہیں۔"

عالیان شرمندہ سا ہوا۔ "ایسا نہیں ہے۔"

"جمعے کو تمہارا نکاح ہے۔" دادا نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہا۔

"آپ نے کہا تھا آپ نے نکاح والی بات امرحہ کے بابا کو منانے کے لیے کی تھی۔"

"مجھے صرف اس کا ردعمل دیکھنا تھا۔ اور اس نکاح کو میں پہلے ہی طے کر چکا تھا' کیونکہ میں جانتا تھا یہی سب ہوگا اگر واجد مان جاتا تو اور بات تھی۔"

"آپ یہ سب امرحہ کے لیے کر رہے ہیں؟"

"نہیں' صرف اس لیے ہی نہیں' میں وہ کر رہا ہوں جو ٹھیک ہے اور جس میں کچھ غلط نہیں' نہ تم نہ میں۔ اور نہ ہی اس فیصلے میں۔"

"مجھے نہیں لگتا یہ نکاح ہوگا' میں خوف زدہ ہوں۔" اس نے اپنے دل کی بات کہہ دی۔ اور دادا کے جانے کے بعد دیر تک سائی سے باتیں کرتا رہا' پھر کارل سے کی۔ اور امرحہ ویرا اور سادھنا سے ساری صورت حال پر رائے لیتی دراصل تسلیاں لیتی رہی۔

دادا نے گھر میں قمقمے لگوا دیے اور یہ کام انہوں نے اس لیے کیا کہ واجد کا اگلا ردعمل سامنے آجائے' ان کا ردعمل یوں سامنے آیا کہ وہ نیند کی گولیاں کھا کر سو گئے اور سونے سے پہلے دادا اور ان کے درمیان چند باتیں ہوئیں جن میں سے ایک بات پر وہ خاموش سے ہو گئے۔ جب دادا نے کہا کہ۔

"تمہاری بیٹی نے ایک بار خودکشی کی کوشش کی تھی اور مری نہیں تھی۔ اس بار وہ خودکشی نہیں کرے گی پھر بھی مر جائے گی۔ پھر تم اپنی ضد کی قبر پر بیٹھ کر آنسو بہاتے رہنا۔"

بات ایسی جان لیوا گونج کے ساتھ کی گئی کہ دل رو دینے کو ہو گیا۔

دادا امرحہ کے پاس آئے وہ سر گھٹنوں میں دیے بیٹھی تھی۔

"میں نے ویزے کے لیے کاغذات جمع کروا دیے

ہیں۔ جلد ہی میں بھی مانچسٹر آجاؤں گا اور مجھے یقین ہے واجد' دانیہ اور باقی سب کو بھی آنے کی اجازت دے دے گا۔"

"آپ کیا بات کررہے ہیں دادا' وہ مجھے یہاں سے جانے دیں گے تب نا۔"

"امرحہ! اب اپنے باپ کی خاموشی کا احترام کرو۔ انسان قسمت کا کتنا بھی دھنی کیوں نہ ہو' زندگی کی راہوں میں اسے چند کانٹے مل ہی جاتے ہیں۔ یہ نکاح جمعہ کو ہوگا ورنہ کبھی نہیں ہوگا۔"

"آپ نے نکاح کا فیصلہ ہی کیوں کیا دادا' سال دو سال ٹھہر جائیں اب' بابا مان جائیں گے۔"

"میری عمر دیکھو امرحہ' اتنا بوڑھا انسان جب سونے کے لیے آنکھ بند کرتا ہے تو وہ یہی سوچ کر کرتا ہے کہ اب یہ آنکھ قبر میں کھلے گی۔ میرے بعد تمہارا کیا ہوگا۔ میں تمہارے سامنے کھڑا ہوں اور واجد نہیں مان رہا' میں نہ ہوا تو کیا کرلوگی۔ اس نے اپنے ایک دوست کو گھر آنے کے لیے کہہ دیا تھا' اپنے بیٹے کے لیے۔ میں نے کس جتن سے انہیں گھر آنے سے روکا' میں ہی جانتا ہوں۔ یہ سب میری موجودگی میں ہورہا ہے۔ اور کیا چاہتی ہو کیا ہو جائے۔؟"

"آپ اپنے مرنے کی باتیں ایسے بے رحمی سے کیوں کررہے ہیں؟" امرحہ ان سے لپٹ گئی۔

"ہر انسان' خود اگلے ہی پل زندگی سے ہار جانے والا بھی یہی سوچتا ہے کہ موت کی بات کیا کرنی اور موت اسے آلیتی ہے۔ کیا موت آنے سے پہلے پوچھتی ہے کہ تم نے اپنی ساری ذمہ داریاں ادا کرلیں تو آؤ پھر میں تمہیں آلوں۔ اگر موت اسے پوچھتی تو دنیا کا کوئی کام ادھورا نہ رہ جایا کرتا۔ اپنی ماں کے بعد میں نے تم سے محبت کی اور میں کبھی اس کی وجہ نہیں جان سکا۔ تمہارے معاملے میں میں بے اختیار ہوں۔ جو تکلیفیں میں نے تمہیں دیں' میں انہیں بھلانے کے جتن کرتا رہتا ہوں۔"

"آپ نے مجھے کوئی تکلیف نہیں دی۔"

"دی ہے۔ میں نے بھی دی ہے۔ اب دعا ہے کہ خدا ہمیشہ تمہیں خوش رکھے۔"

امرحہ اور دادا ساری رات بیٹھے باتیں کرتے رہے۔

اس رات کی صبح کا امرحہ کو انتظار تھا۔ شدت سے۔ وہ چاہتی تھی کہ صبح اتنی روشن ہو کہ روشنیاں اگلے وقتوں کے لیے محفوظ کرلیں جائیں۔



"کیا تمہاری یونیورسٹی میں سب عالیان جیسے ہیں؟" دانیہ پوچھ رہی تھی۔ وہ' عالیان اور دادا مل کر کچھ خریداری کرنے گئے تھے اور اسے زیادہ وقت عالیان کے ساتھ گزارنے کا موقع مل گیا تھا۔

"سب اپنے اپنے جیسے ہیں عالیان جیسے نہیں۔ تمہیں عالیان اچھا لگا ؟"

"لفظ اچھا کافی چھوٹا ہے' دادا اکثر کہا کرتے تھے کہ دیکھنا امرحہ کی قسمت تم سب سے بازی لے جائے گی' اور تم بازی لے گئیں۔ دادا کی ساری دعائیں تمہیں ہی جا لگیں امرحہ' ویسے دادا مجھے بھی کہتے رہتے ہیں کہ میں بھی انہیں بہت پیاری ہوں' اب دیکھتی ہوں کتنی دعائیں لگتی ہیں دادا کی مجھے۔"

امرحہ ہنسنے لگی۔

بابا ناراض تھے' حقیقت تھی' نکاح کے لیے ماحول سازگار نہیں تھا یہ بھی حقیقت تھی لیکن ایک اور حقیقت یہ تھی کہ وہ گھڑیاں گن رہی تھی۔ دوسری بڑی حقیقت یہ تھی کہ وہ خوش ہونا چاہتی تھی' بہت زیادہ خوش' لیکن بابا کا خیال ذہن میں آتے ہی اس کی خوشی آنے سے پہلے ہی رخصت ہوجاتی۔ ایک منظر بار بار اس کی نظروں کے سامنے گھومتا کہ بابا نے پسٹل کنپٹی سے لگا رکھی ہے اور وہ اسے یہ کہہ رہے ہیں کہ "عالیان کو انکار کردو امرحہ۔ یہ شادی کبھی نہیں ہوگی۔"

ان دنوں میں اس نے کچھ کھایا نہیں' وہ سو نہیں سکی' اس کے سر میں کیسے درد ہورہا ہے اس نے اس کی بھی پروا نہیں کی۔ زندگی ایک دم سے پھر سے ایسی

پیچیدہ لگنے لگی جو بھی حل نہ ہوسکے جسے کوئی حل کر ہی نہ سکے۔

"دادا کی ساری حکمت عملی دھری کی دھری رہ جائے گی۔" وہ سوچتی اماں اور دادی روتی بھی جاتیں اور اسے دیکھ کر مسکرانے بھی لگتیں۔

"یہ سب کیا ہو رہا ہے اگر سب معمول پر ہے تو مجھے کیوں غیر معمولی لگ رہا ہے؟" وہ یہ بھی سوچتی۔

دوسری طرف کارل کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اسکرین سے نکل کر عالیان کا گلا دبوچ لے۔

"تم شادی کر رہے ہو میرے بغیر؟"

"تم سے کرنی تھی کیا؟"

"بکواس نہ کرو' اگر زیادہ ہی کوئی ایمرجنسی ہے تو دو دن انتظار کر لو' مجھے وہاں آلینے دو۔"

"حالات کچھ ایسے ہیں کہ یہ ضروری ہے اور یہ شادی نہیں ہے۔"

"شاہ ویز کا کہنا ہے نکاح شادی ہی ہوتا ہے۔"

"ارے شادی ہوتی ہے پر رخصتی کے بعد۔ شادی کا بنیادی عمل "نکاح" ہو رہا ہے رخصتی نہیں۔"

"تو شادی ہی ہوئی نا میں کتنا خوار ہوا امرحہ کے لیے اسپتال میں' اڑتالیس گھنٹے میں سویا نہیں اس کے لیے ہم کھڑے رہے بیٹھے تک نہیں' میرا گلا خشک ہو گیا چینلز کو اس کے بارے میں اپ ڈیٹ کر کر کے اور وہ ایسے شادی کر رہی ہے' بلایا تک نہیں۔" کارل بڑا عظیم دکھی لگنے لگا۔

"امرحہ نے تو مجھے بھی نہیں بلایا' میں تو خود اپنی شادی میں جا رہا ہوں' اب ایک ہی صورت ہے کہ تم سپر سونک لو اور آجاؤ یہاں۔"

"یونیورسٹی کے باہر پارکنگ میں کھڑی رہے نا سپر سونک۔"

"تم خواہ مخواہ ناراض ہو رہے ہو۔ میرے شہہ بالے تم ہی بنو گے۔"

"یہ بہت بڑا اعزاز ہو گا جو مجھے ملے گا۔"

"تمہاری ٹکر پر شہہ بالی ویرا ہو گی میرا خیال ہے ابھی سے تیاری شروع کر دو۔"

"تم نے تو کہا تھا تم امرحہ کے گھر والوں سے مل کر جا رہے ہو۔"

"ماما نے مجھے یہی کہا تھا کارل۔! تم نے مجھ سے کہا جا رہے ہو تو امرحہ کو جیت کر لانا۔ یہاں جیت لانے والا ماحول نہیں ہے۔ یہاں احترام سے طلب گار بننے کا ماحول ہے۔ میں طلب گار بنا کھڑا ہو جاؤں گا اور میرے ساتھ امرحہ کو کھڑا کر دیا جائے گا۔ اور اس سب میں میں' وقت کو آگے لے جانے کی بات نہیں کر سکتا' اگر ایسا کہا تو مجھے نظر آ رہا ہے کہ میں نقصان میں رہوں گا۔ یہ امرحہ کے دادا کا فیصلہ ہے' میں انکار نہیں کر سکتا۔"

کافی دیر وہ کارل سے باتیں کرتا رہا۔ پھر اس نے امرحہ اور عالیان کی کہانی ماما کو سنائی' وہ سو گئیں تو بھی اسے سونے کا بہانہ نہیں مل سکا۔ اسے ڈر تھا کہ کچھ ہو جائے گا۔ ابھی دادا آئیں گے اور اسے کچھ کہہ دیں گے یا امرحہ روتے ہوئے فون کرے گی اور کہے گی "عالیان واپس چلے جاؤ' یہ شادی کبھی نہیں ہو سکے گی۔"

"یہ شادی کبھی نہیں ہو سکے گی کیا؟ صرف اس لیے کہ وہ خاندان میں شمولیت کے رائج اصولوں پر پورا نہیں اترتا۔ اور اس لیے بھی کہ ہر خاندان میں داخلے کے لیے اپنے راستے ہوتے ہیں اور امرحہ کے خاندان میں داخلے کے راستے اس پر بند ہیں' سوائے ایک دادا کے اور امرحہ صرف دادا کی ہی بیٹی نہیں ہے۔"

صبح ہو گئی اور اسے تب بھی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس صبح کو کیسے خوش آمدید کہے۔ اس نے وہ انگوٹھی نکال کر ہاتھ میں لے رکھی تھی جو ماما مارگریٹ کی تھی اور ماما مہر اس لیے ساتھ لے آئی تھیں کہ ہاں ہو جانے پر وہ امرحہ کو پہنا دیں گی۔ اسے یقین ہونے لگا کہ وہ کبھی اس انگوٹھی کو امرحہ کے ہاتھ میں نہیں دیکھ سکے گا۔

ہر خیال بے سکونی کے لبادے میں لپٹ گیا اور اس نے خالی پن کا احساس ہر طرف محسوس کیا اور تصور میں بھی مشرقی دلہن اس کے پہلو میں آکر کھڑی نہ ہوئی۔ "انکار" کا احساس اس پر غالب رہا اور اس نے خود کو زندگی کے صحراؤں میں بھٹکتے پایا اور اس نے

معجزوں کی دعائیں کرنی چاہیں اور تصورات میں وہ خود کو اکیلا اور اداس دیکھتا رہا۔ سوچیں بے رحمی سے اس کا تاریک مستقبل اس پر روشن کرتی رہیں۔

ماما کے ساتھ ناشتا کرتے وہ ناشتا نہ کرنے کا بہانہ کرتا رہا۔

"عالیان! تم کب بڑے ہوگے؟" وہ ہنس دیں۔

"شادی کے بعد۔" وہ ہنس نہ سکا۔

"تم ایسے بجھے بجھے کیوں ہو میرے بیٹے؟"

"کچھ برا نہیں ہوگا۔ سب باتوں کا تمہیں معلوم ہونا ضروری نہیں، لیکن امرحہ کے دادا نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ مجھے واپس نہیں لوٹائیں گے اور بھی بہت ساری باتیں ہوئی تھیں ہمارے درمیان۔ تم بس اتنا جان لو کہ وہ یہ نکاح جلد سے جلد کر دینا چاہتے ہیں۔ اگر امرحہ کے بابا مان جاتے تو بھی وہ منگنی نہ کرتے۔ عالیان وہ ضرور ہوگا جو تمہارے لیے اللہ نے طے کیا ہے۔ تم نے مجھ سے کہا کہ تم ایک اچھی دعا مانگنا سیکھ چکے ہو۔ اس اچھی دعا کو پھر سے دہراؤ۔"

سوچوں کی بے رحمی چھٹنے لگی۔ "یقیناً" اچھی دعا کو دہرانے کا اس سے بہترین وقت اور کون سا ہوگا۔"

اسے مسکرانا یاد آگیا آخر کار۔

وہ امرحہ، اپنی اور اس کے خاندان کی تکون کیوں بنا رہا ہے؟

وہ امرحہ، عالیان، اور اللہ کی رضا کی تکون کیوں نہیں بنا رہا؟



ان کی کلاس ختم ہو چکی ہے اور پروفیسر کے کلاس سے نکلتے ہی وہ فوراً اٹھ کر سب کے سامنے آکر کھڑی ہوگئی جیسے وہ ایسا خطاب کرنے والی ہو جو انسان صرف اپنی ذات سے کرتا ہے وہ بھی مختلف بہانوں سے خود کو بہلا کر۔

سب شرارت سے اسے دیکھ رہے ہیں، وہ عالیان کی غیر موجودگی کے بارے میں اس سے پوچھتے رہے ہیں۔ سب سمجھ لینے کے انداز میں آنکھ مارتے، اور کئی طریقوں سے اسے چڑانے سے خود کو روک نہیں پاتے۔

"میں عالیان سے محبت کرتی ہوں اور امرحہ سے بھی، اور اس محبت کے خالص پن میں کوئی کھوٹ نہیں۔" اس نے ایسی شان کو اپنا کر یہ کہا کہ اسے تعظیم دینا ضروری سا ہوگیا۔ دبی دبی ہنسی خاموشی میں ڈھل گئی اور زندگی کی انگلی نے بولنے پر آمادہ لوگوں کے ہونٹوں پر ٹھہر کر "شش" کہہ کر انہیں چپ کروایا۔

"براز یلا میں امرحہ زندہ نہ رہتی تو وہاں صرف وہی نہ مرتی۔ ایک کے مرنے سے دو موتیں کیسے ہو سکتی ہیں میں نے وہاں جان لیا۔ اور جب میں نے یہ جان لیا تو میں نے خود کو وہیں روک لیا۔ کیونکہ مجھے ایسی منزل کی طرف نہیں بڑھنا تھا جس تک میں پہنچ تو جاتی لیکن جسے پا نہ سکتی، جو ہماری مٹھی میں ہوتا ہے وہ ہمارا نہیں ہوتا، جو ہماری گرفت میں نہ ہو کر بھی ہمارا ہو وہ ہمارا ہوتا ہے۔ عالیان پر میری گرفت تھی جو کہ امرحہ کی نہیں تھی۔"

وہ کہہ کر رکی کہ جانچ سکے وہ تین لوگوں کے احساسات کو کمزور تو نہیں کر رہی۔

"سادی کہتا ہے، بہت کم چند ہی لوگ ہوتے جنہیں ملانے کے اسباب بنتے ہیں اور جن کے بچھڑ جانے پر وقت آنسو بہاتا ہے، وقت نے یہ آنسو براز یلا میں بہائے۔ میرا خیال ہے کہ عالیان کو امرحہ پسند آئی تھی نا، وہ اس سے پہلی نظر کی محبت کا شکار ہوا تھا، شاید اس نے جان لیا تھا کہ انسانوں سے بھری اس دنیا میں صرف وہی اس کی ہے۔ اس میں خوبی کا کمال ہے نا کسی کا قصور۔ یہ ایسے ہی ہونا تھا۔ خونی جنگیں ہوں، بغاوت اٹھتی یا عذر مچتا یہ سب ایسے ہی ہونا۔"

اس کے انداز نے مورخ کی ہیبت اپنالی جو ایمانداری سے تاریخ کو ساری سیاہی و سفیدی سمیت کھنگالتا ہے۔

"آپ میں سے کچھ کا کہنا ہے کہ میں اکیلی ہوگئی ہوں، جبکہ میرا ماننا ہے کہ میری زندگی شاید ہی اب امرحہ کے بغیر مکمل ہو، جب میں مانچسٹر آرہی تھی تو پاپا

نے طنزاً" کہا تھا۔ میں دیکھتا ہوں تم مانچسٹر سے ایسا کیا لے کر آتی ہو جو روس سے نہیں ملتا۔ تو اب میرے پاس پیش کرنے کے لیے امرحہ ہے۔"

ساری کلاس ہنس دی۔

"امرحہ کے پاس عالیان ہے۔"

"عالیان کے پاس کارل اور کارل کے پاس شیطان۔" کسی ایک نے بلند آواز سے کہا اور سب کے قہقہوں نے زلزلے کی سی صورت اختیار کرلی کارل بھی ہنسنے لگا۔

"تو کیا ایسے بیش قیمت تحائف کو دیکھ کر پاپا خوش نہیں ہوں گے۔ عالیان اس وقت پاکستان میں ہے امرحہ کے ساتھ اور چند ہی گھنٹوں بعد ان کی شادی ہوجائے گی۔ اور مجھے اس شادی میں شرکت کرنی ہے۔" بہت من موہنی سی آواز میں اس نے کہا' وہ ان کی ہنسی میں شامل نہیں ہوسکی تھی۔

"کتنے ہی اسٹوڈنٹس نے مجھ سے کہا کہ آخر کار میری اور امرحہ کی دوستی اب ختم' ایک لڑکی نے مجھ سے کہا کہ میں نے امرحہ سے ہار کیوں مان لی۔ نہ امرحہ سے دوستی ختم ہوئی ہے' نہ ہم حالت جنگ میں تھے کہ ہار جیت کا خطاب حاصل کرتے۔ میں نے حقیقت کو کھلے دل سے قبول کیا اور شدت پسندی کو اپنے اندر سے رخصت کردیا۔ میری اور عالیان کی کہانی پر نظر ثانی کی ضرورت نہیں تھی' لیکن امرحہ اور عالیان کی کہانی کو نیک تمناؤں کی ضرورت ہے اور آج ان کے خاص دن میں ساری نیک تمنائیں ان کے نام کردوں گی میں ان کے لیے وہ دعا کروں گی۔ جو صرف میں ہی کرسکتی ہوں۔"

اس کی من موہنی آواز نم سی ہونے لگی اور انہوں نے محسوس کیا کہ وہ بہادر نظر آنے کی کوشش کررہی ہے اور زیادہ کوششیں بھی تو ناکام کردیتی ہیں نا کبھی کبھی۔۔۔۔

"آپ کا ماننا ہے کہ میں ظاہر نہیں کررہی' لیکن مجھے فرق پڑا ہے' میں اداس نظر آتی ہوں' میں کھوکھلی ہنسی ہنستی ہوں' میں کسی گمشدہ چیز کو تلاش کرتی لگتی ہوں' میں عالیان کو بہت یاد کرتی ہوں اور میرے لیے مشکل ہے اس حقیقت کو تسلیم کرنا کہ اس کا ہاتھ پکڑنے کا حق میں نے اب ہمیشہ کے لیے کھودیا۔"

ٹھہر ٹھہر کر اس نے غیر مرئی نقطے پر نظریں ٹکا کر کہا پھر ایک دم سے نظریں ان سب کی نظروں کے مقابل کردیں۔

"ہاں آپ کو ٹھیک لگتا ہے۔" مورخ نے یہاں بھی بے ایمانی نہیں کی۔

سائی جو ان دونوں کو ساتھ لے جانے کے لیے آیا تھا اور کلاس کے دروازے میں کھڑا تھا اس نے اپنا دل سکڑتے ہوئے محسوس کیا۔ کلاس میں چھایا سکوت ٹوٹنے میں نہ آیا اور ویرا کلاس سے ایسے نکل آئی جیسے وہ عالیان کی زندگی سے نکلی ہو۔



وہ سرخ سنگی سیڑھیاں چڑھ رہا ہے۔ مسرت و اطمینان سے۔

اورنگزیب عالمگیر کی بنائی "بادشاہی مسجد" کا دروازہ کھول دیا گیا ہے' میناکاری اور گل کاری کی آرائشی محراب سے گزرتے اس نے ذرا دیر رک کر وسیع احاطے کے پار اونچے میناروں کے قیام تلے واقع میناروں کو شکر گزاری سے دیکھا' جیسے مقدس مقامات کے دوست فرشتوں کو سلام کیا۔

وہ چلتا حوض تک آیا اور اس کے پانی میں ہاتھ ڈبو دیا اور پھر پانی کو بچکانہ انداز میں چلو میں لے کر اچھال دیا اور مسکرا دیا۔ ایسی مسکراہٹ جو انسان کے لیے بنادی جاتی ہے اور "روز عقد" اسے پیش کی جاتی ہے' سے ابھی وہ دور ہی رہا۔

وہ نماز جمعہ سے دو گھنٹے پہلے ہی آچکا ہے اور اب سر جھکا کر گنبد کی چھت تلے ستون سے ٹیک لگائے بیٹھا ہے۔ وہ بہت شدت سے مارگریٹ کو یاد کررہا ہے' اس کی آنکھیں بھیگ رہی ہیں اور وہ محسوس کررہا ہے کہ مرنے والے ہمارے ساتھ ساتھ زندہ رہتے ہیں۔

بہت دیر تک اسے سر جھکائے ایسے ہی بیٹھے رہنا ہے۔

دن کی روشنی محرابوں اور دیواروں سے ہوتی ستونوں کو چھوتی سجدہ گاہ میں "رحمت" بنی اترنے لگی۔

روشنی اس آئینے پر مرتکز رہنے پر بضد ہے جس کے عکس میں وہ جھلملا رہی ہے۔ دودھ میں سنہری کرنیں جا ملی ہوں، سے رنگ کی فرشی پوشاک میں جس کا دامن پیچھے سے زمین پر بچھا ہے اور آگے آتے آتے ذرا سا اوپر اٹھتا جاتا ہے کو پہنے وہ نظر اتار لیے جانے کے لیے کھڑی ہے، طرح دار، حسین و جمیل ملکہ کے پرشکوہ تاج کے نقش سے نقش فرشی دامن سے طلوع ہوتے سنہری کھیرے رنگ کے نقوش بناتے کمر تک قیام کرتے جارہے ہیں اور موتی آسمان پر بکھرے ستاروں کی طرح گردن سے نیچے بکھرے ہیں۔ اگر اس لباس پر اتنا کچھ نہ ہوتا تو اس کے جگمگ کرنے کے لیے اتنا ہی کافی ہوتا کہ اسے امرحہ نے پہن رکھا ہے۔

اس نے اپنے سر کو ذرا سا اوپر اٹھایا اور ہاتھ میں پکڑے جھومر کو سر پر بائیں رخ رکھ کر دیکھنے لگی اور پھر سرخ کامدار دوپٹے کو دوسرے ہاتھ سے کھینچ کر ناک تک گھونگھٹ کی صورت لے آئی۔

دادا نے ایک دم عجلت کے انداز سے دروازہ کھولا اور وہ گھبرا گئی اور جھومر والا ہاتھ سمیٹ کر آہستگی سے نیچے لے آئی۔ گھونگھٹ ناک تک ہی رہا۔ اس نے رخ نہیں موڑا۔ دادا نے پیچھے سے قد آدم آئینے میں اس کے عکس کو دیکھا اور یہ کہا "دلہن دلہن کھیلنے والی اب خود دلہن بنی کھڑی ہے.... وقت کا کام تیزی سے گزرنا ہے.... ٹھیک ہے وہ گزر جائے، لیکن اس سے اتنی سی التماس ہے وہ ایسے وقتوں میں اپنی رفتار ٹھہرے ایسی پیاری صورتوں کو دیکھنے کے لیے زیادہ نہیں صرف چند صدیوں پر محیط چند پل اس کے لیے جس نے آج اپنا روپ بدل لیا ہے جس کے سیاہ بال صرف سیاہ نہیں رہے اور جس کی صاف گوری رنگت دھنک رنگوں سے تال میل میں مصروف ہے۔

دادا نے سوچا اس نے یہ نیا روپ کہاں سے چرایا، پرانی امرحہ کہاں گئی؟

جھومر والے ہاتھ میں پسینہ آگیا۔ پھر اس نے گھونگھٹ کا کونا اٹھا کر گردن موڑ کر دادا کو دیکھا اور مسکرا دی۔ اس نے کوئی میک اپ کیا تھا نہ کوئی زیور پہنا تھا۔ دائرے میں گھٹی مہندی اس کی ہتھیلیوں پر آگے پیچھے براجمان تھی۔ اور دل پسند عہد بنیں انگلیوں کی پوروں میں مقید تھیں۔ اس نے ابھی جوتے نہیں پہنے تھے پھر بھی آج وہ قد میں بہت اونچی ہے۔ آج اس کی مسکراہٹ ہر رنگ سے مشابہ ہے اور ہر خوشی کی انگلی تھامے "محو رقص" ہے۔ آج اس سے زیادہ خوب صورت دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ آج مسرت پر اس کی بادشاہی ہے۔

دادا اس کے قریب آگئے اور اس کی پیشانی چوم کر اس کا ہاتھ تھام لیا اور اسے لے کر باہر آگئے، واجد صاحب کے کمرے میں اور اسے ان کے سامنے کھڑا کردیا۔

کچھ وقت گزرا، وہ خوف سے کچھ بول نہ سکی۔ دادا نے بابا کا ہاتھ اٹھا کر اس کے سر پر رکھ دیا اور اسے ساتھ لے کر باہر آگئے۔ اماں اور دادی نے اس کے آگے وہ سب کیا جو بعد ازاں انہیں خیرات کرنا تھا۔

تو "سفر عقد" کی سجاوٹ ہونے لگی اور شاہی گاؤں کے لوگ گھروں سے باہر گاؤں کی گلیوں میں استقبال کے لیے نکل آئے۔



مقام خدا ہے....
ادائیگی فرض ہے....
رتبہ بندگی ہے....

کئی سو نمازی اپنی صفوں میں حالت قیام میں کھڑے ہیں۔

وہ راکع.... وہ ساجد.... وہ عاجز.... وہ طالب.... وہ مومن....

نماز جمعہ کی ادائیگی ہوگئی اور دعا مانگی جانے لگی۔

نماز سے پہلے دادا، حماد، علی اور چند بزرگ عالیان کے پاس آچکے تھے۔ خواتین والے حصے میں لیڈی مہر بھی آچکی تھیں اور نماز سے پہلے وہ ان سے دعا میں

لے آیا تھا اور ان کا ہاتھ چوم آیا تھا۔

دعا ہو گئی تو عالیان اٹھا اور امام صاحب اور سب نمازیوں کے سامنے جا کر بیٹھ گیا۔ امام صاحب نے سب نمازیوں کو بیٹھے رہنے کے لیے کہا اور عالیان کا تعارف کروانا شروع کیا۔

یہ عالیان مارگریٹ ہیں۔ یہ برطانیہ سے آئے ہیں یونیورسٹی میں زیر تعلیم ہیں۔ ان کی حقیقی والدہ وفات پا چکی ہیں اور یہ اپنی سرپرست والدہ کے ساتھ یہاں موجود ہیں۔ جناب عالیان بفضل خدا مسلمان ہیں اور بنت عبدالواحد اور جناب عبدالکریم کی پوتی سے نکاح کرنے والے ہیں۔ یہ چاہتے ہیں کہ آپ سب انہیں دعائیں دیں اور ان کے نکاح میں شریک ہوں۔"

غیر محسوس مسکراہٹیں ایسے گونجیں، مانو جیسے سب نے با آواز بلند کہا "ہاں ہم ضرور شریک ہوں گے.... ہم یہ خوشی کیوں کر حاصل نہیں کرنا چاہیں گے، جو معتبر اور درجات میں بلند تر ہے۔"

صفوں کی ترتیب قائم ہے اور دعائیہ ہاتھ اٹھنے کے لیے تیار ہیں۔ ان کے اجلے لباس عطر آگیں ہیں اور سوچیں پاکیزہ، ان کی مسکراتی نظریں متوقع دولہے کو دیکھ رہی ہیں، کئی بچوں کو ان کے باپوں نے گودوں میں بٹھا لیا ہے۔ اور وہ ان کے کانوں میں بتانے لگے ہیں کہ اب کیا ہونے جا رہا ہے۔

"عالیان امرحہ کا.... امرحہ عالیان کی۔"

عالیان نے خود پر سب کی نظروں کو پایا اور وہ اپنی مسکراہٹ کو چھپانے میں ناکام رہا اور اس نے جانا کہ سب اس کے دل کی تیز تیز دھڑکن سن رہے ہیں اور شرارت لیے محظوظ ہو رہے ہیں تو اس کے باقاعدہ لاہوری بننے کی تقریب میں سب شریک ہیں۔

کارل، سائی اور باقی کے ہال میٹس دم سادھے سب دیکھ رہے ہیں۔ شاہ ویز ساتھ ساتھ ترجمہ کر رہا ہے۔

"سحر انگیز...." کارل بڑبڑایا۔

عالیان نے اپنے قریب بیٹھے دادا کی طرف دیکھا اور دھیمی آواز سے پوچھا۔ "اجازت ہے دادا؟"

جواب میں دادا نرمی سے مسکرا دیے۔

عالیان امام صاحب کو حق مہر اور باقی کی تفصیلات پہلے ہی بتا چکا تھا۔ پھر دادا نے گواہوں کے نام لیے اور ان کا تعارف کروایا، امام صاحب انہیں اپنے ساتھ لے کر خواتین کے حصے کی طرف آنے لگے۔

ندیاں دریاؤں میں گرنے لگیں اور دریا بحر بحر ہوئے۔

سجدہ گاہ میں پھیلی نورانیت زندگی کی سرپرستی سنبھالنے لگی۔

"قافلہ صورت یہ مختصر سا سفر کیسا دلنشیں ہے، لیکن پھر بھی اس کے جلد ختم ہو جانے کی دعا پر دل مائل ہے۔" "ایک سے دوسرے گنبد کی نقشیں چھتوں تلے کئی سو نمازیوں کے سامنے سے، امام مسجد کے ساتھ "عروس مشرق" کی طرف جاتے اس نے اقرار کیا۔

زر افشاں میں غوطہ زن ہو کر نکلے پروانے گنبدوں کی چھتوں سے جھولتے فانوسوں کے گرد بے ساختگی سے لپکے اور افشاں کی لہریں بناتے نمازیوں کے سروں پر برس گئے۔

کلام اقبال کے اسرار محویت سے چکا چوند ہوئے۔ اور ساری شاعری ایک ساعت میں سمٹ آنے کے لیے ایک ساعت میں لکھی جانے لگی۔

اس بار اب عہد قدیم، عہد جدید کا مہمان بننے آ رہا ہے۔

دریائے راوی واپس اپنی جگہ قلعے اور بادشاہی مسجد کی دیواروں کو چھو ما گرنے لگا ہے۔ پانی اورنگزیب عالمگیر کے عہد میں بنائے حوضوں میں بہہ آیا اور حوضوں نے فوارے جاری کر دیے۔ شاہی قلعے کا پھاٹک کھول دیا گیا۔ اور گھوڑے اور ہاتھی، بگھیاں اور پالکیاں، اپنی اپنی سواریاں قلعے کے دروازے سے اندر لے جانے لگے۔

نقارہ بجایا جا رہا ہے۔ با ادب با ملاحظہ۔ ساعت نکاح۔

دن نے اپنی روشنی کم نہ کی اور ادھر لاہور میں چار میناروں اور تین گنبدوں پر ابر کرم سی نظر کی سرخ

گھونگھٹ سے ہوتی اس کی نظر سیاہ لکڑی کی جعفری کی جھری میں جڑی جھک جانے کے تیار نہیں تھی وہ دیکھ سکتی تھی کون اس کی طرف آرہا ہے اور کسے ساتھ لارہا ہے اور وہ دونوں کتنے لوگوں کی موجودگی میں کہاں موجود ہیں۔ اس کے لب وا نہ ہوئے' لیکن اس کے محسوسات ترنم میں آواز بلند کرتے چلے گئے۔

پیش قدمت کوچہ راگل می کنم۔ (میں تیرے قدموں سے پہلے رستے میں پھول بچھاؤں)

گل می کنشم گل گلاب می کنم۔ (پھول بچھاؤں' گلاب کے پھول بچھاؤں)

خاک قدمت بپری دم وار راستم۔ (تیرے قدموں کی خاک پر اپنا آپ وار دوں)

یارم۔یارم۔یارم۔ (میرے دوست' میرے یار' میرے محبوب)

خوشی نے اپنے سارے پرانے معنی کھو دیے اور وہ صرف ایک معنی پر براجمان ہوگئی "عالیان" پر اس کے سفید لباس شلوار قمیص پر سلوٹیں تھیں۔ اس کے آگے پیچھے' دائیں' بائیں فانوسی قندیلیں شانوں پر اٹھانے والوں کی فوج تھی' باجے تاشے والوں کی۔ وہ بگھی سے اترا تھا۔ کسی تخت سے' پھر بھی کوئی اس کی برابری کا نہیں تھا۔ اس کی خوب صورتی کی چکا چوند لحظہ بہ لحظہ بڑھتی جارہی تھی اور اسے نظر بھر کر دیکھتے رہنا مشکل ہورہا تھا۔

وہ جو دولہا ہے۔۔۔۔

عنبر بیز آب سا۔۔۔۔

عشق میں قیام سا۔۔۔۔

زبان فیض میں کلام سا۔۔۔۔

طرب کے سازوں نے ملن کے گیتوں کو دعوت کلام دی۔

اور نگینہ جڑے طاؤسی پر ان گیتوں پر رقص کناں ہوئے۔

وہ سنجیدہ اور خاموش تھا' لیکن اس کے اندر برپا جشن کے سماں کا راز اس کی آنکھیں اگل رہی تھیں۔

گھونگھٹ کے پار امرحہ مسکرادی۔ اسے صبح عالیان کا میسج آیا تھا "ماما کہتی ہیں اگر ہمارا نکاح بحکم خدا طے ہے تو بس یہ طے ہے اور اس سے آگے ہمیں کچھ نہیں سوچنا چاہیے۔ یہ سوچ شک ہوگی اور شک یقین کا دشمن ہوتا ہے۔"

"ہاں یہ نکاح طے تھا۔" اس کی نظروں کے سامنے وہ سب گھومنے لگا' جس میں سب ہونا ممکن تھا' لیکن اس کا اور عالیان کا ایک ہونا نہیں۔ وہ دعائیں کرتی تھی اور خود ہی ان دعاؤں پر یقین کھو دیتی تھی' کیسا مشکل اور یقین سے خالی سفر کاٹا اس نے' پانی پر چلنے جیسا' بس ناممکن ہی۔

لیڈی مہر اس کے ساتھ ہی بیٹھی تھیں اور وہ دیکھ سکتی تھیں کہ کیسے وہ اپنے ہونٹوں کے کنارے دانتوں میں دبا رہی ہے کہ اس کی مسکراہٹ نمایاں نہ ہو۔ اماں' دادی' دانیہ اسے کچھ ایسے دیکھ رہے تھے جیسے وہ ان کی کبھی تھی ہی نہیں' ہر لڑکی کی شادی پر اس کے گھر والے شاید ایسا ہی محسوس کرتے ہیں۔

نماز کی ادائیگی کے بعد اس نے آنکھوں میں کاجل لگالیا تھا اور ہونٹوں پر لپ گلوس اور گھونگھٹ نکال کر بیٹھ گئی تھی۔ این' سادھنا اور ویرا اسے شٹل کاک کی نشست گاہ میں بیٹھی دیکھ رہی تھیں۔

جب اس نے گھونگھٹ نکال لیا تو ویرا نے سوچا وہ آج سے پہلے کبھی اتنی خوب صورت نہیں لگی۔ اگر یہ سرخ رنگ کا کمال ہے تو اسے ہمیشہ یہی رنگ پہننا چاہیے اور اگر یہ متوقع رسم کے اثرات ہیں تو وہ کبھی ان اثرات سے نہ نکلے۔۔۔۔ وہ۔ تو۔

ایک عروس مشرق ہے۔۔۔۔

حسن میں طمطراق سی۔۔۔۔

طلسم میں طلسم کشا سی۔۔۔۔

گل پیراہن' گل روسی۔۔۔۔

ویرا مبہوت اسے دیکھ رہی تھی' این اور سادھنا اسے کچھ کہہ رہی تھیں کہ امرحہ نے اشارے سے انہیں خاموش کروایا اور بتایا کہ امام صاحب آرہے ہیں۔ اس نے عالیان کا نام نہیں لیا۔

امام صاحب جعفری کے پاس نیچے قالین پر بیٹھ

گئے' عالیان بھی انہی کے ساتھ بیٹھ گیا اور باقی سب بھی۔ عالیان اور امرحہ جعفری کے اس اور اس پار آمنے سامنے آگئے۔ پل کے پل عالیان نے نظر اٹھا کر جعفری کے سوراخوں سے جھانکا اور اسے سرخ رنگ کی جھلک نظر آگئی۔ اس وقت اسے امرحہ کو دیکھنے کی جلدی نہیں تھی۔ اسے امرحہ کو سننے کی بے چینی تھی۔ اس مقام تک وہ اس کی رضامندی سے ہی پہنچا تھا' لیکن اسے وہ خاص جملہ سننا تھا۔

مجھے یہ کہہ لینے دیں کہ وہ لمحہ آن پہنچا جس کی آمد کا صدیوں نے انتظار کیا اور سوال کی طلوع ہوئی نکھری نکھری ساعتوں نے "جواب" کو خوش آمدید کہا۔

امام صاحب نے نکاح پڑھانا شروع کیا۔

جیسے سلامی کے لیے قطاریں باندھ لی گئیں۔

اور شہزادیاں اور رانیاں' کنیزیں اور باندیاں اپنی اپنی سواریوں سے اتریں' اپنے لہنگے' پشوازیں' شرارے اور چولیاں اور لمبے' الجھتے' زرتار رنگ برنگ دوپٹوں کو سنبھالتیں' شیش محل کو جاتی سیڑھیوں سے قہقہے لگاتی' اٹھکھیلیاں کرتی گزرتیں اور محل کے جھروکوں میں جا کھڑی ہوئیں اور سر اٹھا کر ادھر بادشاہی مسجد کی طرف دیکھنے لگیں۔ ان کے ہاتھوں میں فاختائیں ہیں اور ان کے پیروں کی پازیبیں سریلی شہنائیوں کی طرح بجتی ہی جاتی ہیں اور ان کے زیورات ان شہنائیوں پر جھومتے ہی جاتے ہیں۔

امام صاحب نے بنیادی نکات کی ادائیگی کے بعد امرحہ سے پوچھا۔

"قبول ہے؟"

من پسند سوال۔۔۔ دل پسند تکرار۔۔۔ گل گلزار۔۔۔ گل گلزار۔۔۔

قبولیت درویشانہ پاکیزگی لیے دو دلوں میں گل رنگ ہو جانے کو ہے۔

اور جائز ہونے کی بڑی اہمیت ہے اور اجازت نامے کا بلند رتبہ ہے۔۔۔ بلند۔۔۔ بلند تر۔ مشک بید سے سجی اپنی پوشاک میں ملبوس مشکبار پری طویل مسافت طے کرتی اس مشک بندھن میں بندھنے والوں پر مشک بید برسانے کے لیے اپنی سکھی سہیلیوں کو لیے آچکی ہے اور انہوں نے مقام خدا پر احترام سے پرواز شروع کردی اور اپنی مشک بید سے بھری ٹوکریاں خالی کرنی شروع کردی ہیں۔ شروعات انہوں نے عالیان امرحہ سے کی ہے۔

عالیان نے پھر نظر اٹھا کر دیکھا اور جھری سے گھونگھٹ کے پار چشم سیاہ کو جا لیا' جو ابھی بھی سیاہ تھیں' لیکن روشنی کے خزانوں سے لبریز تھیں وہ چشماں جنہوں نے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا اور اسے ان داستانوں کی اور لیے جاتی تھیں' جنہیں نسل در نسل بُنا گیا اور صدیوں بصد شوق سنا گیا اس کے دل پر ایسی کیفیت طاری ہونے لگی جس کے بیان کے لیے مترجم بننا اس کے بس میں نہ تھا۔

امرحہ نے چاہا کہہ دے "عالیان مارگریٹ قبول ہے۔ بھوری آنکھوں والا لارڈ میئر' ہنسا دینے والا' رلا دینے والا' دور کردینے والا' پاس رہ جانے والا' جس سے بچھڑنا قسمت تھا اور جس کا "ملنا" طے تھا۔

عالیان مسکرا دیا اور امرحہ بھی کیوں کہ اس نے صاف آواز سے کہہ دیا تھا اور اس نے صاف سماعت سے سن لیا۔

"قبول ہے۔"

یوں کہا کہ سب سن لیں۔

ان فاختاؤں کو ہاتھوں سے چھوڑ دیا گیا جن کے پروں پر لاہی چھینٹے تھے۔

"قبول ہے۔" امرحہ کے بعد عالیان نے کہا۔

قلعے کی بلند دیواروں اور مچانوں سے رنگ بھرے تھالوں کو اچھال دیا گیا۔ اور رنگ ہر رنگ میں فضا میں بکھرتے چلے گئے۔

"قبول ہے" اس نے پھر کہا۔

"عروس البلاد" میں دف بجائے جانے لگے۔

نٹ کھٹ کنیزیں اپنی جھلملاتی اوڑھنیاں لہراتے تیزی سے قلعے میں بھاگتے جھروکے بدلنے لگیں اور اپنی شوخ آوازوں میں گانے لگیں۔

پیمانہ بدھ۔۔۔ پیمانہ بدھ۔۔۔

پیمانہ بدہ کہ خمار استم.....
پیمانہ بدہ کہ خمار استم.....
"قبول ہے۔" وہ کہتے ہی رہنا چاہتا تھا کہ کوئی سماعت ایسی نہ رہ جائے جو اسے سن نہ سکی ہو سب سن لیں..... سب جان لیں۔

اپنے دل پر اس نے ہاتھ رکھ لینا چاہا' تاکہ وہ اس آواز کو کچھ دبا سکے جو بلند بانگ حال دل بیان کر رہی تھی اور ساری دنیا اس پر جھک آئی تھی کہ اچھا تو جناب کا یہ حال ہے؟

اور دو مسکراہٹیں دونوں کو پیش کردی گئیں جو "روز عقد" ہی ہونٹوں پر کھل سکتی ہیں۔ دونوں اس مسکراہٹ کے حق دار ٹھہرے اور انہوں نے جانا کہ خوشیوں کے اب تک جتنے مطلب انہوں نے جانے تھے' وہ کتنے چھوٹے اور معمولی تھے۔ مسرت اپنے سبھی معنوں اور رازوں کو لیے اب ان پر آشکار ہو رہی ہے اور وہ ایسی مسرت کے شکر گزار ہیں۔

نکاح محبت کی معراج ہے..... ورنہ سب دھواں ہے جس کا کہیں قیام نہیں۔

"نکاح" سب سے پاک اور پسندیدہ روایت۔

"نکاح" دو دلوں کی فضیلت۔

امام صاحب نے خطبہ نکاح دیا اور پھر دعا کرنے لگے۔ وہ سب واپس منبر امام کے پاس آکر بیٹھ گئے تھے۔ سب نمازی دعا میں شریک تھے اور بلند آواز سے آمین کہتے جاتے تھے اور فرشتے بھی ابدی محبت کی دعاؤں کے تحائف دیتے "آمین" کہنے میں شریک ہیں۔

پھر امام صاحب نے اٹھ کر عالیان کو گلے سے لگایا اور مبارک باد دی۔

اور اپنے لاہی پروں کو راوی کے شفاف پانی میں منعکس کرتی ان گنت فاختائیں چھما چھم اڑانیں بھرتی قلعے سے مسجد کے صحن سے اڑا جانے لگیں۔

پھر دادا نے اور باقی سب نے اسے گلے سے لگا کر مبارک باد دی پھر ایک ایک کر کے نمازی بھی اٹھ اٹھ کر آنے لگے اور اس کے لیے اسے کتنے اپنے اپنے الفاظ میں مبارک باد دینے لگے۔

عالیان کو لگا ساری دنیا نے اس کے نکاح میں شرکت کی ہے اور اب ساری دنیا ہی جشن مناتی ہے۔ نکاح اس الوہی پن نے اس کا دل موہ لیا۔

حماد اور علی وہ مٹھائی سب میں تقسیم کرنے لگے جو ڈھیروں ڈھیر لیڈی مہر نے منگوائی تھی اور پھر عالیان خود بھی وہ مٹھائی تقسیم کرنے لگا اس نے ڈھیروں مبارکیں وصول کیں اور بچوں کے گالوں پر جھک جھک کر پیار کیا۔

"آپ دولہا ہو؟" ایک بچے نے اس سے مٹھائی لیتے ہوئے کہا۔

"ہاں میں دولہا ہوں۔"

اس نے بڑی خوش دلی سے کہا بلکہ اس نے چاہا کہ اس سے بار بار پوچھا جائے کہ "کیا تم دولہا ہو؟" اور وہ بار بار کہے ہاں..... "میں دولہا ہوں"

دادا نے امرحہ کو کتنی ہی دیر سینے سے لگائے رکھا' "میں نے اپنا فرض ادا کر دیا۔ مجھ سے زیادہ خوش آج اس دنیا میں کوئی نہیں۔"

"میں کبھی آپ کا شکریہ ادا نہیں کر سکوں گی دادا!" بہت مشکل سے وہ بس یہی کہہ پائی' جذبات کی شدت سے اس سے کلام مشکل تھا۔

مسجد خالی ہونے لگی۔

عالیان نے Anselm ہال میں مشترکہ مبارک باد دی' شور بہرہ ہوئے بغیر سن لیا اور کارل اور سائی سے کتنی ہی دیر بات کرتا رہا۔

"دیکھ لو' دولہا نہیں بھاگا؟" وہ مور گن سے کہہ رہا تھا۔

مور گن دل کھول کر ہنسی "تم لاہور میں ہو نا اس لیے..... روس میں ہوتے تو بھاگتے۔"

ایک سایہ سا عالیان کے چہرے پر لہرایا۔ ابھی کچھ دیر پہلے اس کی دیرا سے بھی کافی لمبی بات ہوئی تھی اور وہ اس کے ساتھ کافی لمبا چوڑا مذاق کرتی رہی تھی۔

عالیان نے گہرا سانس لیا..... یہ پھانس شاید ہمیشہ اس کے دل میں رہنے والی تھی کہ اس نے پیارے دلوں

میں سے ایک پیارے دل کی مالکہ لڑکی کو ہاں کہہ کر کیسے اسے واپس موڑ دیا تھا۔ امرحہ کی صورت وہ فائدے میں رہا تھا' لیکن اس پیاری لڑکی کا نقصان کرکے اعلا ظرفی میں وہ کبھی ویرا سے آگے بازی نہیں لے جاسکے گا۔

مورگن اور شارلٹ سے لمبی بات کرنے اور انہیں مسجد دکھانے کے بعد وہ لیڈی مہر کے پاس آیا ان کا ہاتھ پکڑ کر چوما اور ان کی گیلی آنکھوں کو صاف کیا۔

"آپ شارلٹ' مورگن کی شادیوں پر بھی رو رہی تھیں اور میری پر بھی۔ میں تو رخصت ہو کر کہیں نہیں جارہا۔"

لیڈی مہر ہنس دیں۔ "اللہ نے میری دعائیں قبول کیں۔"

"میری بھی ماما!" وہ بھی مسکرا دیا۔

ان سب نے مشترکہ تصویریں بنوائیں' پھر عالیان ماما مہر کو گاڑی تک چھوڑ آیا اور وہ سب چلے گئے۔ اس نے دادا سے اجازت لے لی تھی امرحہ کے ساتھ کچھ دیر وہیں رہنے کی۔



تو امریم کا جولاڈ کا نام ہے وہ "امرحہ عالیان" ہے۔

عالیان نے اس کا وہ ہاتھ تھام لیا جس میں ماما کی انگوٹھی تھی۔ امرحہ نے دوپٹا پلیٹ رکھا تھا اور سر سے وہ ذرا پیشانی سے نیچے تک جھکا تھا اور جھومر اور کانوں کے بندے کناروں سے جھانک رہے تھے جیسے چوری چھپے عالیان کو دیکھ رہے ہوں۔

اس کا ہاتھ پکڑ کر وہ اسے اس محرابی لمبے برآمدے میں لے آیا جس کے اس طرف سے کبھی راوی بہتا نظر آتا تھا اور جس کی ٹھنڈی ہوا سجدوں اور دعاؤں کی گواہ بنی تھی۔ دونوں ساتھ ساتھ کھڑے ہو گئے۔

امرحہ نے خود پر وہ جاپانی ریشمی پارچہ لپیٹے پایا جو این کے مطابق جاپانی دلہن کے لباس کے ساتھ لپیٹ دیا جاتا ہے جس میں ہر رنگ کا ٹکڑا ہوتا ہے۔

اور جس پر " Anata No iro Ni " لکھا ہوتا ہے۔

عالیان نے ذرا سا غور کیا کہ سرخ عکس تلے اس کی آنکھیں عجیب افراتفری کا شکار سی ہیں۔ وہ دنگ سارہ گیا کہ جنہوں نے افراتفری مچادی' اب وہ خود اس میں مبتلا ہیں۔ خود فراموشی کی حالت میں وہ وقت کو پیچھے چھوڑتا چلا گیا اور نیل کے پانیوں جنہیں آبی پرندے سلام کرتے جاتے ہیں کو اس کی آنکھوں میں ہلکورے کھاتے دیکھا۔

"من عاشق چشم مست یارا ستم۔" (میں یار کی مست آنکھوں کا عاشق ہوں)

واپسی میں اسے کچھ وقت لگا۔

"امرحہ..... مجھے عالیان کہتے ہیں۔" اس کے بعد اسے اپنا آپ یاد آیا۔

"عالیان۔ مجھے زوجہ عالیان کہتے ہیں" اس کا بھی وہی حال تھا۔

دونوں چاندی کے آب خوروں میں موجود زعفران ملے دودھ میں عکس مہتاب ہو گئے اور جس ذرہ اندھیرے کی لپیٹ میں لپٹا مقفل دروازہ نیل کے روشن کناروں کی طرف کھلتا چلا گیا جہاں روپہلی کرنیں سفید روشنائی سے سرخ گلاب بنانے میں مگن تھیں۔

سرخ گلابوں سے سجے کناروں پر انہوں نے اپنے قدم رکھے اور اپنے سفر کا آغاز کر دیا۔

"کیسی حیرت انگیز بات ہے امرحہ! کہ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ ایک لڑکی جو اس شہر کی ہو گی وہ میری جان اپنی مٹھی میں لیے ہو گی۔"

"مجھے اس میں شک ہے۔"

"کس میں؟"

"کہ تمہاری جان میں اپنی مٹھی میں رکھتی ہوں' یہ اختیار تو تم رکھتے ہو۔"

وہ ہنس دیا۔ "یہ کیا ہے؟" اس نے انگلی سے جھومر کو چھو کر پوچھا۔

"یہ تم پر بہت اچھا لگ رہا ہے۔"

"کتنا اچھا؟"

"اتنا اچھا کہ میں چاہتا ہوں تم اسے ہر وقت ایسے

ہی لگایا کرو۔"
امرحہ من چاہی ہنسی ہنس دی۔ "یہ ہر وقت نہیں لگایا جا سکتا۔"
"پھر بھی میں یہی کہوں گا کہ اسے ہر وقت لگایا جائے۔"
امرحہ کے جسم میں ہلکا سا ارتعاش تھا اور عالیان یہ محسوس کر سکتا تھا وہ زیر لب ہنس دیا اور امرحہ نے اس کی مسکراہٹ کو بڑا محبوب پایا۔ جس محبت نے اس کے دل پر قبضہ کر لیا تھا وہ اب اس کے نام کر دی گئی تھی۔ ملکیت کا یہ احساس ہر بلند احساس پر حاوی تھا۔
عالیان نے سوچا جیسے چھپ کر دیکھتے رہنا تھا وہ مقابل آ گیا ہے اور کون ہے جو اسے اس سے دور لے جا سکے۔
"میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں امرحہ!"
"میں تم سے وہ سننا چاہتی ہوں!"
"میں تم پر مر مٹا تھا اور مجھے اپنا یہ مر مٹنا بہت عزیز ہے۔" اپنے دل پسند وقفے کے بعد دل پسند انداز کو اپنا کر اس نے کہا۔
امرحہ دیر تک ہنستی رہی۔
"اور میں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ میں ناراض ہو جایا کروں گا، لیکن ایسا کبھی نہیں ہو گا کہ میں تمہیں ناپسند کرنے لگوں۔ میں تم سے لڑوں گا، لیکن تمہیں دور نہیں کروں گا۔ میں فاصلہ رکھ لوں گا، لیکن تمہیں چھوڑ کر نہیں جا سکوں گا۔ اگر میں معاملات کو بگاڑ دوں گا تو انہیں ٹھیک کرنے کی کوشش بھی کروں گا۔ میری کچھ باتیں تمہیں تکلیف دے سکتی ہیں، لیکن ایسا نہیں ہو گا کہ میں ارادتاً تمہیں تکلیف دوں۔ "میں عالیان صرف تمہارا" ہونے کا حق کبھی تم سے نہیں چھین سکوں گا۔ دنیا میں شاید ہی کوئی مکمل زندگی گزار تا ہو اور ہم بھی انہی میں شامل ہوں گے، لیکن ایسا بھی نہیں ہو گا کہ میں ہماری زندگی کو مکمل کرنے کی کوشش نہ کروں۔"
وہ رکا کہ اب وہ بولنا نہیں سننا چاہتا ہے۔
"پیغامات جو تم نے میرے لیے لکھے تھے کیا تم ان میں سے کوئی ایک مجھے اس وقت سنا سکتی ہو؟"
امرحہ نے اسے دیکھا۔ "یعنی یہ اب چاہتا ہے اسے بھی کچھ سنایا جائے، لیکن ایسا بھی کیا ضروری ہے۔۔۔ ہے نا؟"
"مجھے کچھ یاد نہیں۔" وہ ایسے ہو گئی جیسے اسے تو اپنا نام بھی یاد نہیں۔
سچ سچ سندری امرحہ۔۔۔
"اپنی یادداشت کھنگالو۔" وہ یک دم ہی دلگرفتہ سا ہو گیا۔
"کیسے۔۔۔ میرے سر پر زخم آئے ہیں۔"
"تمہارے زخم تقریباً ٹھیک ہو چکے ہیں۔"
"پھر بھی ان زخموں نے میری یادداشت پر گہرے اثرات مرتب کیے اور میں تمہارے علاوہ سب بھول گئی۔۔۔ یہ بھی کہ یہ زخم مجھے کیسے آئے۔۔۔ مجھے یہ نظر نہ آیا کہ میں مرنے جا رہی ہوں، مجھے صرف یہ نظر آیا کہ میں تم سے دور جا رہی ہوں۔ مجھے یہ خوف نہیں ہوا کہ میں کس تکلیف سے گزرنے والی ہوں، مجھے یہ فکر لاحق رہی کہ تم کسی تکلیف سے نہ گزرو۔۔۔ ایک عرصہ ہوا میں نے دنیا کو دیکھنا چھوڑ دیا، کیوں کہ ایک عرصہ ہوا میں نے تمہارے علاوہ کسی کو نہیں دیکھا۔۔۔ بہت پرانی بات ہوئی اب یہ کہ میں کیا کیا بھول سکتی ہوں، لیکن صرف ایک "تمہیں" نہیں، تم میرے ہر معنی کی لغت ہو۔۔۔ میں ہر معنی تم سے کھوجتی ہوں۔۔۔ مجھے اس سے سروکار نہیں کہ دنیا کن شاہکاروں سے بھری پڑی ہے، میں صرف اس پر شکر گزار ہوں کہ مجھے کس سے نوازا گیا "تم سے"۔" "میرے پیغامات اب تمہیں تا عمر پڑھتے رہنا ہے اور انہیں یاد بھی رکھنا ہو گا۔ ان میں سے ایک پر لکھا ہے۔
" Anata No iro Ni "
"یہ جاپانی ہے نا؟" یہ کوئی قدیم مصری زبان ہی کیوں نہ ہوتی اسے فرق نہیں پڑتا تھا ترجمہ کرنے والا اس کے ساتھ موجود تھا۔
"ہاں۔۔۔" وہ ترجمہ کرنے کے موڈ میں نظر نہیں آئی تھی۔

"اس کا مطلب کیا ہے؟"
"تم بتاؤ؟" امرحہ کے لیے تالیاں۔
"تم نے لکھا ہے تم بتاؤ۔۔۔" عالیان کے لیے تسلیاں۔
"تم بوجھ کے دکھاؤ۔۔۔"
"عالیان! دنیا میں سب سے پیارا ہے۔"
"ہاہا۔۔۔ نہیں۔۔۔"
"کیا میں پیارا نہیں ہوں؟" اسے لگا اسے کوئی صدمہ ملنے والا ہے۔ اتنی جلدی' ابھی تو اس کی شادی ہوئی ہے۔
"نہیں۔۔۔ مطلب اس کا مطلب یہ نہیں ہے۔"
"یعنی میں بہت پیارا ہوں؟" اسے اسی کی فکر لگی تھی۔
"اس بارے میں سوچنا پڑے گا۔" اس نے قہقہہ لگایا۔
"اچھا پھر اس کا مطلب ہوگا۔۔۔ بہاریں عالیان کے دم سے ہیں۔"
"تم کتنے خوش فہم ہو عالیان۔۔۔ چچ چچ۔"
"میں ایسی خوش فہمیاں پالتا رہوں گا۔ مجھے ایسی خوش فہمی عزیز ہے۔"
آفتاب کی تابناکی نیل کے پانیوں میں اٹھکھیلیاں کرنے میں محو ہے اور آبی پرندے پھڑپھڑاتے پروں کے ساتھ ہر فکر سے آزاد ہیں' آگے ہی آگے بڑھتے وہ دونوں نئی منزل طے کر رہے ہیں اور ان کی آوازیں اپنی موجودگی کا احساس دور وادیوں میں بجتے باب کی بے خود لے کی طرح دلا رہی ہیں۔ "عالیان کے ساتھ پر میں شکر گزار ہوں۔" عالیان تھکنے کے لیے تیار نہیں تھا' پھر اس نے اس کے سر پر ہلکی سی ہاتھ سے ضرب لگائی۔
"آئی یادداشت واپس؟"
امرحہ ایسے کھلکھلائی جیسے واقعی یادداشت آ ہی گئی۔
"میں خود کو تمہارے رنگوں سے سجاتی ہوں۔"
رباب کی لے دیر تک وادیوں میں گونجتی رہی اور اس گونج پر وہ پھر سے مر مٹتا۔
مشک آہو نے نیل کی وسعتوں کو پاٹا اور زقند بھرتا ہرنی کے سامنے آکھڑا ہوا اور پھر دونوں ان دونوں کے گرد چوکڑیاں بھرنے لگے اور پھر آمنے سامنے کھڑے ہوگئے اور اصفہان کے قالین باف نے زر احمر کے تاروں سے انہیں شاہکار میں بدل دیا اور ان میں ایک گہرے گپت راز کو نقش کر دیا۔ جو ان کی رونمائی تک راز ہی رہنے والا ہے۔



ایرپورٹ صرف سادھنا ہی آئی تھی۔ عالیان کو حیرت ہوئی' کوئی بھی نہیں آیا۔ جاب پر جانا اتنا ہی ضروری تھا سب کا۔
جب وہ گھر آئے تو عالیان مسکرا دیا۔۔۔ شٹل کاک کی فرنٹ وال پر چھوٹی بڑی رنگ برنگی پرچیاں جگہ جگہ چپکی تھیں اور ان پر نوٹ لکھے تھے۔ دونوں مل کر نوٹ پڑھنے لگے اور ذرا غور نہ کیا کہ سادھنا لیڈی مہر کو لے کر کچن ڈور سے اندر چلی گئی ہے۔
کچھ پر جو کس لکھے تھے' کچھ پر دونوں پر مزاحیہ فقرے چست کیے گئے تھے' کچھ میں صرف امرحہ کو مخاطب کیا گیا تھا' کچھ میں صرف عالیان کو۔ جیسے کہ عالیان کے لیے چند نوٹس پر یہ لکھا تھا۔
"بے چاروں کے گروپ میں شمولیت مبارک ہو عالیان۔"
"دنیا میں ہر کام ممکن ہے شوہر بن کر واپس "انسان" بن جانا ممکن نہیں۔ دنیا میں ایک ہی مظلوم قوم ہے جو خود پر ہوئے ظلم کے خلاف آواز بلند نہیں کر سکتی شوہروں کی قوم' آواز کی اس فوتگی کے لیے نیک تمنائیں۔"
امرحہ کے لیے ایک نوٹ پر لکھا تھا۔ "تمہارے پاس اب دو آپشن ہیں مانچسٹر سے نکل جائیں یا مانچسٹر میں رہ کر امرحہ کو بھگت لیں۔ ہم سب کا مشترکہ خیال ہے پہلا آپشن ہی قابل قبول ہے صرف۔"
کافی دیر تک ہنستے رہنے کے بعد دونوں اندر کی طرف

لیکے۔ دروازے پر ہاتھ رکھا ہی تھا کہ وہ ایسے کھل گیا جیسے اندر سے کسی نے دھکا دیا۔ اور دھکا دیا گیا تھا۔

گولف بالز۔ پاپ کارن ببلز' کلر بالز کے تینوں ڈھیر نے دونوں کو کسی سونامی طوفان کی وزنی اور طاقتور لہر کی طرح آلیا اور وہ اس میں دب گئے اور اسی میں دبے رہے۔ اور ان کے ہاتھوں پیروں' منہ' سر اور نجانے کہاں کہاں کلر بالز مختلف رنگوں میں اپنے نقش چھوڑ گئیں۔ مطلب انہیں جوکر بنا گئیں۔ دونوں نے اس ڈھیر میں سے سر نکالا۔

اور ایک دم سے شٹل کاک کے اوپر نیچے کے کونے کھدروں سے ایک فوج نکل کر نمودار ہوئی اور ایک زبان چلائی۔ "سرپرائز"

"کیسا اچھا سرپرائز تھا نا؟"

کارل' ویرا' سائی سب آگے کھڑے تھے۔

"اٹس شو ٹائم" کارل نے انگلی اٹھا کر کہا اور ون' ٹو' تھری کے بعد گلے میں جھولتے گٹار پر اس شدت سے ہاتھ مارا کہ امرحہ نے اپنا سر دوبارہ ڈھیر میں دے لیا کہ مبادا وہ بہری ہی نہ ہو جائے۔

عالیان نے خود کو اور امرحہ کو اٹھانے کی کوشش کی لیکن گردن تک دھنسے ہونے کی وجہ سے وہ ایسا کرتے بار بار گولف بالز سے پھسل کر گر جاتا۔ تھک کر وہ وہیں بیٹھا رہا اور کارل' ویرا' اور سائی کا شور دیکھنے لگا جو کسی راک اسٹار کی بھدی اور خوفناک نقل اتار رہے تھے اور شادی کے سائیڈ ایفیکٹ سے لبالب ہوئے گانے کو ہل جل کر اور اچھل اچھل کر گا رہے تھے۔ اور پیچھے شاید پوری یونی جو آموجود ہوئی تھی ہل ہل کر ان کا ساتھ دے رہی تھی۔

ان سب کے دانت نیلے' پیلے رنگوں سے رنگے ہوئے تھے اور جب وہ گانے کے لیے منہ کھولتے تو بہت دلکش منظر پیش کرتے۔

سائی نے آگے بڑھ کر عالیان کے سر پر کاغذ کی ٹوپی رکھ دی۔ جس پر لکھا تھا۔

"MrRight"

اور پھر امرحہ کے سر پر رکھی جس پر لکھا تھا۔

"MrsAlwaysRight"

گانا گاتے وہ آگے ہی آگے ان کی طرف بڑھتے آئے۔ اور غول کی صورت ان کے اوپر جھک گئے جیسے زمین سے نکلے ڈائنا سور کے جوڑے کو ملاحظہ کر رہے ہوں۔ اور پھر نیلے' پیلے دانتوں والے منہ کو کھول کر یک زبان چلائے۔

"Congrates"

امرحہ نے سوچا' کیسے شریف لوگ ہیں کیسے پیار سے مبارکباد دے رہے ہیں۔

شریف لوگوں میں سے ایک نے اسے ایک گفٹ دیا' جو بعد ازاں امرحہ نے اپنے کمرے میں بہت شوق سے کھولا اور ایک پنچ نکل کر اس کی ناک پر بڑے زور سے لگا۔ اس نے کتنی بار تو اس گفٹ کو فلموں اور ٹی وی میں دیکھا تھا۔ اتنا عام ہونے کے باوجود وہ پنچ (Punch) بہت خاص انداز سے اس کی ناک سوجا گیا۔ دنیا بھر میں اس گفٹ کے کھولنے والے اس سے برآمد ہونے والے "گھونسے" سے انجان ہی ہوتے ہیں۔

اندر ایک نوٹ لکھا رکھا تھا۔ "میری طرف سے پہلا تحفہ' یہ یاد دلانے کے لیے کہ میں بدلنے والا نہیں ہوں۔"

ہاں وہ کیسے بھول سکتی ہے کہ وہ بدلنے والا نہیں ہے۔

ایک تحفہ عالیان بھی کارل کے لیے لایا تھا' لاہور کی سیر کرتے وہ اتفاق سے ایک ایسی دکان کے سامنے سے گزرا جہاں خالص دیسی اور روایتی سامان رکھا تھا۔ اس خالص سامان میں سے عالیان نے کارل کے لیے کیا لیا۔ حقہ۔ جی اس نے دکان دار سے حقے کو استعمال کرنے کا طریقہ معلوم کیا اور پیک کروا کر لے آیا۔

"تم سگریٹ بہت پیتے ہو نا۔ یہ ڈیڈ ہے سگریٹ کا۔"

"صرف ڈیڈ ہی اٹھا لائے۔ مام۔ گرینڈ ما' گرینڈ پا نہیں لائے۔"

"نہیں وہ اگلی بار جاؤں گا تو لاؤں گا۔"

"میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہاری زبان نے کافی رفتار پکڑلی ہے۔"

"اچھا۔ سنا ہے کہ تم ایما کے گھر کوئی کارروائی کرنے گئے تھے اور اس کے کتے سے جا ملے۔ جس رفتار سے تم بھاگے' دیکھنے والوں نے اس رفتار کی داد دی۔"

سائی جو ان دونوں کے قریب ہی بیٹھا تھا اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"میرا خیال ہے تم یہ سمجھ ہی چکے ہو اب کے جانور تمہارے دھوکے میں آنے والے نہیں' اور وہ تم سے ڈرنے والے بھی نہیں۔"

کارل نے اچھل کر سائی کی گردن دبوچ لی "سائی پوری یونی میں ایک تمہیں میں نے بچہ سمجھ کر چھوڑا ہوا تھا۔ تم نے ثابت کر دیا تم بڑے ہو گئے ہو اب۔"

سائی ہنسنے لگا "خدا کے لیے" مجھے تنگ کرو۔ میں تم سب کا باپ بنے رہنے سے تنگ آچکا ہوں۔"

"فکر نہ کرو' میں مستقل تمہارا باپ بنا رہ سکتا ہوں۔" باپ کارل نے بچے سائی کو دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر سر سے بلند کر دیا۔

سائی چیخنے مارنے لگا۔ عالیان سائی کی مدد کو لپکا۔ عالیان کو انہیں ڈنر کروانے لے جانا تھا اور عالیان جانتا تھا خاص طور پر کارل اس کی جیب پر کس قدر بھاری پڑنے والا ہے۔

دوسری طرف امرحہ' ویرا' سادھنا' این کو ڈنر کے لیے لے جا چکی تھی۔

زندگی اس معمول پر آنے لگی جس سے وہ ہٹی ہوئی تھی۔

عالیان صبح اسے شٹل کاک سے اپنی سائیکل پر بٹھا لیتا' کبھی وہ ویرا کے ساتھ سائیکل پر ہوتی' کبھی وہ تین یا چار اپنی اپنی سائیکلوں پر ہوتے۔ جب وہ عالیان کی سائیکل کے پیچھے ہوتی تو وہ اسے ایک لمبے چکر کے بعد یونی اتارتا۔

رات کو جاب سے واپسی کے بعد' اور اپنے ہال جانے سے پہلے وہ اس کے کمرے کی کھڑکی تک آتا اور کچھ دیر ٹھہر کر چلا جاتا۔ وہ وسل پر نئی نئی دھنیں بجانے لگا تھا اور کھلتی چمک نے مستقل اس کی آنکھوں میں بسیرا کر لیا تھا۔

اب وہ سائیکل کو گول دائروں میں گھماتا تھا۔ اور اس دائرے کے اندر امرحہ کو کھڑا کر لیتا تھا۔ اب اس کی ضرورت نہیں رہی تھی کہ وہ یونی میں اس کے پیچھے پیچھے رہے کیونکہ اب وہ اس کے ساتھ رہتا تھا۔ اور اب یہ سوال کہ کلاس کے بعد وہ کہاں مل سکتا ہے کا جواب "امرحہ کے ساتھ" بھی پرانا سا ہو چکا تھا۔

عالیان نے اپنے سارے گمشدہ احساسات پا لیے اور اس نے بڑے جامع انداز سے خود کو اکٹھا کر لیا۔

ولید البشر نے ایک اور بار پھر کوشش کی تھی' اسے اپنے کام لانے کی اور اس بار اس نے بھڑکے بنا بہت آرام سے اس کے ذہن میں یہ تسکین کر دیا کہ ایسا ہونا ممکن نہیں۔

ماما مارگریٹ کی ساری ڈائریاں اس نے امرحہ کو دے دیں کہ وہ انہیں پڑھ لے اور جان لے کہ اس کی ماں کیسی خاتون تھیں۔

وہ کیسی خاتون تھیں یہ جاننے کے لیے امرحہ کو ڈائری پڑھنے کی ضرورت بلاشبہ نہیں تھی' عالیان کی ذات میں ان کی شخصیت بہت اچھی طرح نمایاں ہو جاتی تھی' لیکن اس نے یہ ڈائریاں اس نظر سے ضرور پڑھیں جس نظر سے عالیان پڑھتا رہا ہو گا۔

مانچسٹر کی سڑکوں پر چہل قدمی کرتے' بارش کی پھوار سے خود کو بھگوتے اور کسی گمنام ریسٹورنٹ کے اکیلے' پرسکون گوشے میں بیٹھ کر کافی یا سوپ پیتے وہ اسے اپنے بچپن کی باتیں سناتا۔ وہ اسے بتاتا کہ اس کی ماں دیکھنے میں کیسی تھی اور جب بھی وہ مسکراتی تھیں تو اپنے حسن کو کیسے مکمل کرتی تھیں۔ وہ ان رنگوں اور ملبوسات کے بارے میں بات کرتا جو مارگریٹ پہنا کرتی تھیں اور اسے وہ سب جملے ٹھیک یاد تھے جو ماما مارگریٹ اسے گود میں بٹھائے اس کے کانوں میں کہا کرتی تھیں۔

ان سب باتوں کو کرتے وہ کم ہی افسردہ ہوا کرتا تھا۔

کیونکہ وہ محسوس کرتا تھا کہ وہ پرسکون ہوتا جارہا ہے۔ جس بے چینی نے اس کے اندر اپنے پنجے گاڑدیے تھے وہ نشان اب مٹنے لگے ہیں۔ ٹھیک ہے کہ آج بھی وہ کافی بنا کر اسے کچن میں ہی بھول آتا ہے' یہ سوچتے سوچتے کہ امرحہ اس وقت کیا کررہی ہوگی۔ وہ اسے فون کرتا ہے۔ اس سے بات کرتا ہے۔ فون بند ہوتے ہی وہ پھر سوچنے لگتا ہے کہ "اب امرحہ کیا کررہی ہوگی۔"

اور کبھی کبھی وہ ہال میں اپنے کمرے میں سوتے ہوئے گھبرا کر اٹھ بیٹھتا ہے۔ اس پر وہی کیفیت طاری ہوجاتی ہے جو برازیلا اسٹیڈیم کے باہر ہوئی تھی۔ وہ صرف فون ہی نہیں کرنا چاہتا وہ سائیکل بھگاتا شٹل کاک آتا ہے اور امرحہ کے کمرے کے دروازے میں کھڑے ہوکر اسے سکون سے سوتا دیکھ کر چلا جاتا ہے۔

وہ اس کے ساتھ نئے نئے کھیل کھیلتا ہے۔

"تمہارے پاس ایک منٹ ہے تم کہیں بھی جاکر چھپ جاؤ۔ پھر ایک منٹ بعد تم ٹائم نوٹ کرنا کہ میں نے تمہیں کتنی دیر میں ڈھونڈ نکالا۔"

وہ دونوں ہفتے کی شام ایک پل پر کھڑے تھے' ہلکی ہلکی بوندا باندی ہورہی تھی' آس پاس کافی رش تھا اور وہ اسے چھپ جانے کے لیے کہہ رہا تھا۔

"ٹھیک ہے۔" اس نے سر ہلایا۔

عالیان نے اپنا رخ اس سے موڑ لیا' ایک منٹ گزرا تو وہ اسے ڈھونڈنے کے لیے نکلا اور جیسے کہ اس میں امرحہ نامی ریڈار فکس تھا' اس نے ٹھیک ڈیڑھ منٹ کے اندر اندر آئس کریم کھاتے انکل آنٹی کی آڑ میں چھپ کر چلتی امرحہ کو جالیا اور انگلی اٹھا کر کہا "فریز۔"

"اب تمہاری باری۔" امرحہ نے مسکرا کر کہا اور رخ موڑ لیا' ایک منٹ گزرا' وہ ذرا سا آگے ہوئی اور ٹھوکر کھا کر گر گئی۔ پندرہ سیکنڈز کے اندر اندر اس نے عالیان کو ڈھونڈ نکالا تھا کیونکہ عالیان خود بھاگتا اس کے پاس آگیا۔ وہ سڑک پر بیٹھی قہقہے لگا رہی تھی۔

"کتنی بڑی ڈرامے باز ہو تم۔ چلو پھر سے کرو۔" وہ ساری بات سمجھ گیا۔

"میں پھر گر جاؤں گی تم پھر سے آؤ گے۔ اگر یہ ڈرامہ سو بار ہوگا تو تم سو بار اس جال میں آؤ گے۔ تمہیں ہر بار یہی لگے گا۔ اوہ اس بار یہ سچ میں گر گئی۔ ہر بار تم اس جھوٹ میں آؤ گے۔ تم رہ ہی نہیں سکتے۔"

امرحہ کے قہقہے بلند سے بلند ہوتے جارہے تھے۔

عالیان نے غور سے امرحہ کو دیکھا۔ "تو تم نے کارل سے کلاسز لینی شروع کردیں؟"

"میں گئی تھی اس کے پاس اس نے کہا ایڈمیشن کلوزڈ۔" وہ اٹھ کر کھڑی ہوئی۔

"اس نے ایڈمیشن کلوزڈ کا کہا تھا یا تم انٹری ٹیسٹ میں فیل ہوگئیں۔ عالیان نے جاندار قہقہہ لگایا امرحہ بھی ہنسنے لگی۔ جب کبھی وہ عالیان کی سائیکل کے پیچھے بیٹھی ہوتی تو ان کی سائیکل سے اپنی سائیکل ٹکراتا' انہیں گراتا' ہاتھ ہلاتا کارل آگے نکل جاتا۔ اس کا ماننا تھا کہ امرحہ نے برازیلا میں ایسی بہادری کا مظاہرہ کیا اور ایسے زخم کھائے کہ اب یہ چھوٹے موٹے زخم اس کے لیے کوئی معنی ہی نہیں رکھتے۔ اور ایسے چھوٹے موٹے زخم اسے اگر لگ بھی جائیں تو کیا فرق پڑتا ہے۔"

عالیان نے چھپ جانے اور ڈھونڈ نکالنے کے اس کھیل کو کسی اور دن کے لیے اٹھا رکھا' اب وہ اسے اس خواب کے بارے بتانے لگا تھا جس میں پھولوں سے سجی کشتی ان دونوں کو بٹھائے پانی پر رواں تھی۔ اور اس نے سوچ لیا ہے وہ اس خواب کو حقیقت میں بدلنے کا وعدہ بھی اس سے کرلے گا۔



لیڈی مہر چند دن مور گن کے پاس جاکر رہ آئی تھیں وہ نانی بن گئی تھیں۔ اور ان کو یہ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ وہ خدا کی کس کس نعمت اور کس کس رحمت کا شکریہ ادا کریں۔

"خدا نے مجھے کیسے اور کتنا نواز دیا ہے۔" وہ تشکر سے کہتی جاتیں۔

انسان دوست انسانوں کو خدا نوازتا ہی رہتا ہے اور وہ کبھی دکھی نہیں ہوتے کیونکہ وہ دوسروں کے دکھوں کو سکھوں میں بدلنے میں لگے رہتے ہیں۔ وہ جو دل میں کوئی نقب رکھتے ہیں نہ نظر میں حسد۔ یہ لوگ جو دنیا میں کم ہی ہوتے ہیں اگر نہ ہوں تو زمین بے آباد اور بنجر ہونے میں وقت نہ لے۔

ویرا کا بھائی ایلکسی چند دنوں کے لیے مانچسٹر آیا اور ایک کار میں ٹھنس کر انہوں نے اسے مانچسٹر اور لندن گھمایا۔ بے چارا' سائی' کارل' عالیان کے ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھے پچک پچک کر چنا منا سا ہو کر واپس گیا۔ ویرا کار چلاتی' لہراتی رہی اور امرحہ پوری قوت سے چلاتی رہی۔

جاتے وقت وہ ویرا کے گوش گزر ایک بیان جاری کر گیا۔

"اگر تم ان سب کو روس لانے کا ارادہ رکھتی ہو تو میں پہلے ہی بتا دوں' روس کے ٹکڑے ہونے کے بعد یہ دوسرا سانحہ ہو گا جو روس پر گزرے گا۔"

روس پر کیسا ہی بڑا سانحہ گزرتا' ان سب کو وہاں جانے سے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔ ڈگری کے بعد اور عالیان امرحہ کی باقاعدہ شادی کے بعد انہیں وہیں جانا تھا۔

اس دوران ایک بار امرحہ نے بھی پہاڑ پر رسے سے چڑھنے کی کوشش کی۔ اور ویرا اسے اسکیٹنگ بھی سکھا رہی تھی یعنی وہ دن بھی دور نہیں تھا۔ جب مانچسٹر کی سڑکوں پر ایک کالے اور ایک بھورے بالوں والی لڑکی ریس لگاتی نظر آئیں گی۔ اور اس بار بھی رشین لڑکی خود کو ہرا دے گی تاکہ پہلی بار ریس لگانے والی لڑکی مقابلے سے بددل نہ ہو جائے اور وہ ہمت نہ ہار دے اور روس کی خبر چلتے وہ ٹی وی چینل نہ بدل دے۔

چند ایک بار اس نے کارل کی بھی مدد کی۔ ایک بار اسے ایما کا جوتا لا کر دیا اور ایما کو بھی ننگے پیروں سے گھر جانا پڑا۔

جوتے والی حرکت پر شرمندہ ہوتی امرحہ ایما کے گھر معذرت کرنے اور یہ ثابت کرنے گئی کہ اسے بھی معلوم نہیں تھا کہ کارل اس کے پاس سے جوتا چھین کر لے جائے گا۔ ایما اس کے لیے کافی بنانے کچن میں گئی اور ایما کے پیچھے کچن تک جاتے' راستے میں آتے' لاؤنج' بیڈ روم' چند ریکس کے قریب سے گزرتے امرحہ نے اپنی کتابوں میں دبی ایک فائل کھول کھول کر خالی کرنی شروع کر دی۔ کچھ زیادہ نہیں' فائل میں کاکروچ کی ننھی منی سی فوج آباد تھی جو اب ایما کی گھر پر پرورش پانے والی تھی۔

ایما امیر باپ کی نازک اندام "کاکروچ کو خونی بلا سمجھنے والی پیاری سی بچی تھی۔ کچھ زیادہ نہیں ہوا' ایما کا نروس بریک ڈاؤن ہوتے ہوتے رہا۔ کاکروچ تھے کہ ہر طرف سے نکلتے ہی آ رہے تھے۔ اتنے کاکروچ تو اس کے پورے خاندان نے اپنی پوری پیدائشی اور وفاتی تاریخ میں نہیں دیکھے تھے۔

خیر امرحہ کا اور کاکروچ کا کیا تعلق' وہ تو کافی پی کر آ گئی تھی واپس۔ اور پھر ایما کو سائیکل ریس چیلنج بھی دے دیا ایما کی سائیکلنگ اچھی تھی۔ جسٹ فار فن اس نے چیلنج قبول کر لیا اور جب وہ وننگ لائن کراس کرنے جا ہی رہی تھی کہ ایک چھرا اس کے سر پر آ کر لگا اور وہ بے چاری ایسے گری کہ دو دن یونی نہیں آ سکی۔

"کہتے ہیں محبت اور جنگ میں سب جائز ہوتا ہے۔"
شاید ایما نے نہیں سنا تھا البتہ کارل نے سنا بھی تھا اور یاد بھی کر لیا تھا۔

کارل کو برا بھلا کہتے بلکہ برا بھلا ثابت کرتے امرحہ نے ایما کے متوقع شو کے پاس بھی حاصل کر لیے تھے۔ آرٹ اسٹوڈنٹ کی حیثیت سے اپنے ڈیزائن کیے گئے ملبوسات کو پہن کر وہ خود بھی ریمپ پر واک کر رہی تھی' اچھا خاصا گلیمرس ایونٹ تھا کہ کارل ریمپ پر چڑھ گیا اور یہ لمبے سارے ریمپ پر جم کے انداز میں زومبی بنا ایما کے ساتھ ساتھ چلتے اسے گھورتا رہا۔ نہ پلک جھپکی نہ گردن کا زاویہ بدلا۔ جو لوگ وہاں بیٹھے تھے وہ یہ سمجھے کہ یہ آرگنائزر کا ہی کوئی "ایونٹ ڈیزائن" ہے اور جو ریمپ پر چل رہی تھی وہ اپنی واک خراب نہیں کرنا چاہتی تھی۔ البتہ بیک اسٹیج جا کر وہ رو پڑی۔

"تمہارے مرنے پر میں ایک گرینڈ پارٹی دوں گی کارل۔" روتے روتے وہ چلائی۔

وہ پارٹی وہ تب دیتی تا جب پارٹی دینے لائق رہتی اور کارل واقعی مر بھی جاتا۔ اس کی صرف ایک غلطی تھی کہ اس نے کارل کو پرپوز کیا اور پھر چھوڑ دیا۔ لیکن اب کارل تو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھا نا۔ کچھ غلطیاں ایسے ہی جان کا عذاب بن جاتی ہیں۔ احتیاط کرنی چاہیے۔

احتیاط سے وہ سب ایک ایک چیز کا انتخاب کر رہے تھے تاکہ رات کی پارٹی میں وہ کسی صورت کسی فلمی ہیرو سے کم نہ لگیں۔ شارلٹ سے کارل نے ایک فلمی پارٹی کے پاس حاصل کر لیے تھے۔ عالیان کو تو ذرا دلچسپی نہیں تھی جانے میں۔ کارل، سائی، شاہ ویز جا رہے تھے۔ کیونکہ۔

دنیا بھر کے تعلیمی اداروں میں پڑھنے والی نسل دنیا کی سب سے بھوکی عوام ہوتی ہے۔ یہ جتنا کھاتی ہے اتنی ہی اور بھوک رہتی ہے۔ جتنا اور کھاتی ہے اتنی اور بھوکی رہ جاتی ہے۔ تو اس بھوک کو مٹانے وہ سب ایک کوشش کرنے جا رہے تھے۔ وہ کھانے کھانے جو بقول ان کے انہوں نے صرف تصویروں میں ہی دیکھے تھے اور خوابوں میں ہی چکھے ہیں۔

ان تینوں کا جوش و خروش دیکھ کر عالیان قہقہے لگا رہا تھا۔ پھر شارلٹ آ گئی اور وہ اس کے ساتھ چہل قدمی کرنے لگا۔

مورگن اور وہ چند دنوں کے لیے ماما مہر کے پاس رہنے آئی تھیں۔ مورگن تو خیر معمول کے مطابق آیا کرتی تھی، لیکن شارلٹ کو اس وقت آنے کی جلدی رہا کرتی تھی، جب اس نے کوئی مزے دار سی نئی کہانی بنائی ہوتی تھی اور اس کہانی کو اسے مکمل پرفارمنس کے ساتھ ماما کو سنانا ہوتا تھا۔ ظاہر ہے نئی کہانی اس کے پاس عالیان اور امرحہ کی تھی۔

"تو تم نے برازیلا میں ہزاروں لوگوں کو پچھاڑا اور کئی لوگوں کو گھونسے مارے اور کتنے ہی لوگوں کو اٹھا اٹھا کر پھینکا۔ ہاں یہ کہانی مجھے اچھی لگی۔ تمہاری شادی کے دن میں سب کو سناؤں گی، ویسے ماما کو سنا چکی ہوں میں۔"

"ایسا کچھ نہیں ہوا۔" وہ ہنس دیا۔

"تو مورگن نے ٹھیک کہا تھا اس بار دولہا بھاگے گا۔" شارلٹ اس کے نکاح سے اب تک پچاس بار یہ کہہ چکی تھی دراصل اس سے بات کرتے اس نے بائے کی جگہ یہ جملہ کہنا شروع کر دیا تھا۔

"لیکن کتنا ہی اچھا ہوتا اگر تم عین شادی کے وقت بھاگتے۔ کتنی حسرت ہے مجھے ایسی مناظر کو براہ راست دیکھنے کی۔ آخر حسرتیں جلدی پوری کیوں نہیں ہوتیں، اگر ایسی چھوٹی چھوٹی خواہش بھی پوری نہ ہوں تو کیا فائدہ زندگی کا؟"

"مجھے یقین ہے، جورڈن نے ایک نفسیاتی معالج سے رابطہ کر لیا ہو گا۔"

"میرے لیے؟"

"نہیں خود اپنے لیے۔"

" ویسے تم نے ایک اچھا ہیرو ہونے کا ثبوت دیا۔ تم پارٹی میں جا رہے ہو؟"

"نہیں۔ مجھے کوئی دلچسپی نہیں جانے میں۔"

"میں پہلے سے ہی جانتی تھی۔ اچھی بات ہے جانا بھی نہیں چاہیے، ویسے امرحہ اور ویرا میرے ساتھ جا رہی ہیں۔ اور این بھی اور اتفاق سے سادھنا بھی۔" شارلٹ نے آنکھیں پٹ پٹائیں۔

عالیان چونکا۔ "اچھا؟ کیا فلم اسٹار بھی آ رہے ہیں؟"

"آئیں یا نہ آئیں تمہیں تو اس سب سے دلچسپی ہی نہیں۔"

"نہیں، مجھے فلم اسٹارز سے ملنا ہے۔"

"کس فلمی ستارے سے؟ پیراماؤنٹ پکچرز کی ہیروئن "امرحہ سے"؟ ویسے امرحہ اور ویرا خاص تیاری کر رہی ہیں جانے کے لیے۔"

"اچھا" وہ سوچنے لگا کہ اسے کیوں نہیں بتایا گیا۔

"اسے اس لیے نہیں بتایا کہ وہ سب آپس میں ہی انجوائے کرنا چاہتی تھیں۔ انہیں معلوم تھا کہ کارل

جارہا ہے لیکن اسے لفٹ کس نے کروائی تھی۔"

ہال واپس آکر وہ بھی جانے کے لیے تیار ہونے لگا تو ان سب کو اس پر ہنسنے کا موقع مل گیا۔ وہ چپ چاپ ان کی ہنسی سنتا رہا اور تیار ہوتا رہا اور پھر وہ سب پارٹی میں آگئے۔ کارل تو پارٹی میں ایسے شامل ہوا جیسے گیسٹ آف آنر وہی تھا۔ عالیان البتہ ادھر ادھر دیکھتا اور گھومتا رہا۔ ایک دوسرے کے ساتھ منسلک تین بڑے بڑے ہالز تھے' شارلٹ فون اٹھا رہی تھی نہ امرحہ اور ویرا' این اور نہ ہی شریف سی سادھنا۔ حد ہے۔ کتنی تیزی ہو جاتی ہیں یہ لڑکیاں جب ایک ساتھ ہوتی ہیں تو۔

ہالز اور ان ہالز سے نکلتی سیڑھیاں چڑھ چڑھ کر' اتر اتر کر وہ تھک چکا تھا۔ ہر طرف چمکتے دمکتے لوگ پھیلے ہوئے تھے اور ان لوگوں میں ایک امرحہ ہی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ اسے سادھنا اور این ایک جگہ نظر آگئیں۔

"امرحہ کہاں ہے؟" اس نے سادھنا سے پوچھا اور اس نے کندھے اچکا دیے۔

"اف یہ خواتین۔"

اسے ویرا بھی نظر آگئی چند لوگوں سے بات کرتے ہوئے قریب ہی شارلٹ کھڑی تھی' لیکن امرحہ نہیں تھی۔ اس نے ان کے قریب جا کر ان سے پوچھا اور جواب میں انہوں نے ایسے دیکھا جیسے جانتی ہی نہیں کہ وہ ہے کون۔ اور پوچھ کیا رہا ہے۔

وہ خود ہی سر اٹھا اٹھا کر دیکھنے لگا۔ پھر اسے دور امرحہ کی جھلک نظر آئی۔ جو مسکرا کر کسی کی آڑ میں چھپ رہی تھی۔ وہ اس کی طرف لپکا' لیکن وہ وہاں نہیں تھی۔ کتنی ہی بار وہ اسے ایسے ہی نظر آتی رہی۔ کسی کی آڑ میں چھپی ہوئی اور غائب ہوتی ہوئی۔ عالیان کو بہت شوق تھا نا اسے ڈھونڈ نکالنے کا تو وہ اس کا یہ شوق پورا کر رہی تھی۔

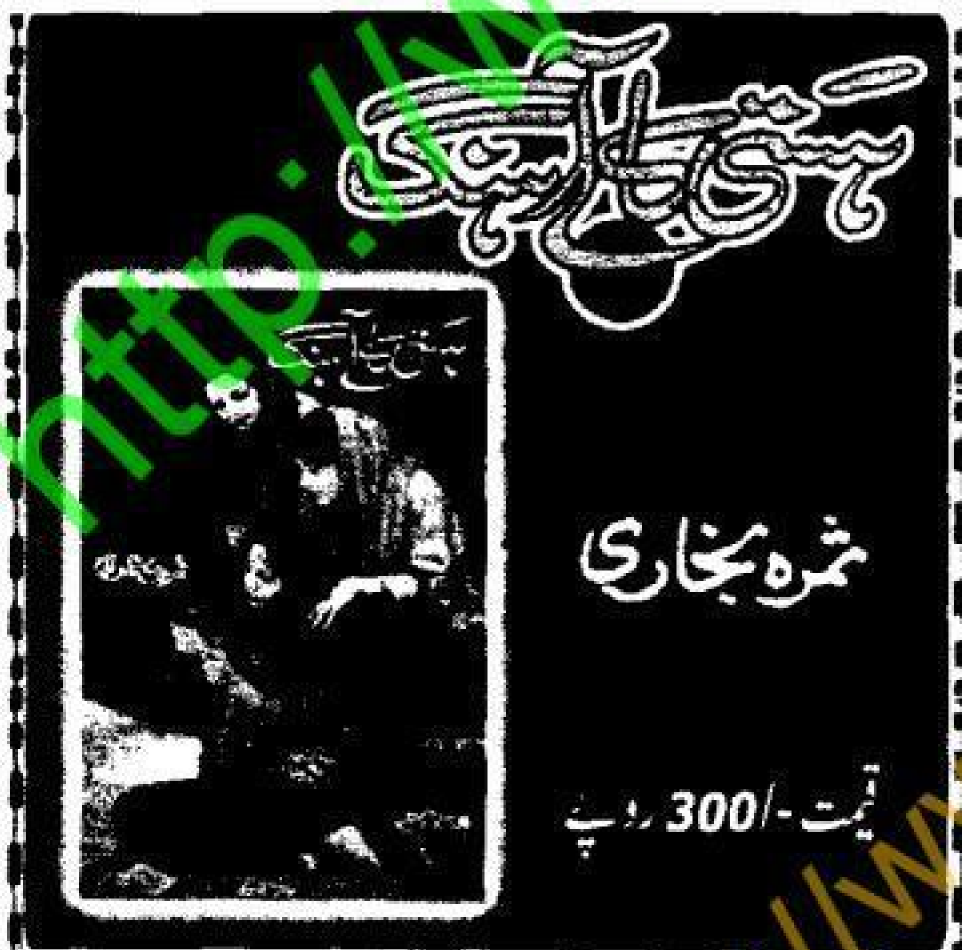
کئی سو لوگوں کی آڑ میں چھپ چھپ جانے کا کھیل اچھا ہے۔ اپنے ریشمی آسمانی رنگ کے فراک کے دامن کو لہراتے' خوب صورت لوگوں کے ہجوم کے پیچھے چھپ چھپ جاتے' اس کے لیے اپنی ہنسی پر قابو رکھنا مشکل ہو رہا تھا۔ چند ایک نے گردن موڑ کر اسے دیکھا اور جیسے کچھ جان کر اور سب سمجھ کر وہ مسکرا دیے۔

ہال کی وسعت میں اور لوگ داخل ہوتے جا رہے تھے۔ رش بڑھ رہا تھا۔ عالیان کا کام اور مشکل ہو رہا تھا۔ وہ اسے پوری شدت سے ڈھونڈ رہا تھا۔ وہ پوری شدت سے چھپ رہی تھی اور پھر افرا تفری میں سیڑھیاں چڑھتے عالیان کا پیر پھسلا اور دو اسٹیپ لڑھک کر گر گیا۔

اور یوں دس سیکنڈز کے اندر اندر امرحہ اس کے سامنے تھی۔

"جاؤ پھر چھپ جاؤ' میں پھر ڈھونڈ نکالوں گا تمہیں۔ میں سو بار گروں گا تم سو بار آؤ گی' اگر یہ جھوٹ ہو گا تو تم ہر بار اس جھوٹ میں آؤ گی۔"

عالیان نے ایک آنکھ دبا کر کہا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اس کا ہاتھ پکڑ لیا کہ وہ پھر سے چھپ نہ جائے۔ آج وہ اسے اس خواب کے بارے میں بتانے والا تھا جس میں اس کے بالوں میں لہریں تھیں اور اس کی پوشاک سرخ تھی۔ اب اسے امرحہ سے وعدہ لینا ہے۔ کیا وہ اس خواب کو حقیقت میں بدل دے گی؟ یقیناً" وہ انکار نہیں کر سکے گی۔



☆ ☆ ☆

"میں ایک خوش قسمت انسان ہوں۔ میں ایک دوست رکھتا ہوں اور میری خوشیوں کے سارے راستے میرے دوست کے دل سے ہو کر آتے ہیں.... کیونکہ میری دعاؤں پر آمین میرا پیارا دوست ہے۔"

"تمہارے ساتھ مل کر بزنس کرنے کا ارادہ میں نے بدل دیا ہے۔"

"وہ کس لیے؟"

"میں بزنس کروں گا' لیکن ابھی نہیں' میرا خیال ہے پہلے مجھے زندگی کو تھوڑا انجوائے کرلینا چاہیے۔"

"اور میرا خیال ہے اب تک تم زندگی انجوائے کرتے رہے ہو۔"

"ایک بزنس اسٹڈیز کا اسٹوڈنٹ کیا زندگی انجوائے کرتا رہا ہوگا فرش! ہر وقت پڑھنا' لائبریری' کتابیں' اسائنمنٹس' لیکچرز' یہ وہ سب ہے مجھے تو یہ معلوم نہیں کہ یونی میں کوئی کینٹین بھی ہے۔"

"کینٹین کا تمہیں معلوم بھی کیسے ہوگا' تمہیں کچھ خرید کر تھوڑی کھانا ہوتا ہے۔"

"مجھے تو پروفیسرز کے آفس کا معلوم ہے یا بزنس ڈیپارٹمنٹ کا۔ یونی آنا' جاب پر جانا' ہال جا کر رات گئے تک پڑھتے رہنا اور پڑھ کر شرافت سے سو جانا' زندگی ایسی ہوتی ہے کیا؟"

"کتنے معصوم لگ رہے ہو تم یہ سب کہتے کارل!"

"پتا نہیں عالیان' کون بددعا دے گیا مجھے ایسی معصومیت کی' میرا بھی دل چاہتا ہے' شرارتیں کروں' اچھلوں' مستی کروں' تمہارے ساتھ ادھر ادھر کی سرگرمیوں میں حصہ لوں اور نہیں تو ایک آدھ بار کسی کو چھوٹی سی چٹکی ہی بھرلوں' دیکھوں کہ وہ کیسے اچھلتا ہے۔"

عالیان سر ہلانے لگا۔ "صرف ایک چٹکی بھرنے کا خواب ہی ادھورا رہ گیا ہوگا نا تمہارا؟"

"ابھی تو میں نے کوئی خواب دیکھا ہی نہیں' چند دن پہلے گوگل کرتے میری نظروں سے ایک رائل پرنسز گزری۔"

"خدا کے لیے آگے کچھ نہ کہنا' میں شاہی خاندان کی بربادی برداشت نہیں کرسکوں گا۔ میں ایک سچا برٹش شہری اور میری سب ہمدردیاں شاہی خاندان کے ساتھ ہیں۔"

کارل نے منہ بنالیا۔ "تم اپنی وفاداری قائم رکھو' ویسے وہ برطانوی شہزادی نہیں ہے۔"

"او اچھا.... پھر بھی.... پھر بھی کارل.... ویسے ایما ایک اچھی لڑکی ہے۔ اس کی مسکراہٹ بہت پیاری ہے۔ میں جب جب اسے اکیلا دیکھتا ہوں' مسکرا دیتا ہوں کہ کیسی خوش قسمت لڑکی ہے ایما۔ تمہارے بغیر کیسی خوش خوش اور پیاری پیاری سی لگتی ہے۔"

"وہ کتنی پیاری ہے یہ امرحہ تمہیں بتائے گی' کیونکہ اس کی مسکراہٹ پر تمہارے خیالات میں امرحہ کو تفصیل سے بتاؤں گا۔ پھر گھڑی کی بند ملے گی اور جولیٹ کی پھٹکار کھلی' جسے سنتے تم بڑے خوش خوش اور پیارے پیارے لگوگے۔"

"ہاہا.... پھر تم ایما کو منالو۔"

"میں عالیان نہیں جو اس کے پیچھے پاگل ہو جاؤں اور وہ امرحہ نہیں کہ مجھے پاگل کر بھی دے۔ دنیا میں ایک "مخلوق" لڑکی کی بھی کمی نہیں رہتی۔ یہ ہر طرف سے حشرات کی طرح نکلتی آتی ہیں۔ کتنے ہی اسپرے کرلو.... کیسی بھی زہریلی دوا چھیلا دو.... یہ تباہی دنیا میں پھیلتی ہی جاتی ہے۔"

"جب تک تم لڑکیوں کو حشرات سمجھتے رہوگے' وہ تمہارے ساتھ انسان بن کر سنجیدہ کیسے ہوں گی؟"

"میں خود کو انسان سمجھتا ہوں کافی ہے۔"

"جبکہ دوسروں کو اس سے اختلاف ہے۔" عالیان نے بلند قہقہہ لگایا۔

کلاس لینے کے بعد وہ دونوں یونی میں ٹہل رہے تھے اور پھر قریب سے گزرتی ایک فریشر لڑکی ذرا سا اچھلی اور ہلکی سی چیخ ماردی۔ کچھ زیادہ نہیں کارل نے تو بس چٹکی بھرنے کا اپنا ننھا منا سا خواب پورا کرلیا تھا۔ آخر ہر انسان کا حق ہے کہ وہ اپنے خواب پورے کرے اور ان کی تعبیر پر خوش ہو۔ آخر کوئی کب تک اپنی خواہش دل میں دبائے رکھے۔

"یہ اس کا کام ہے۔" کارل نے غصے میں بس لال ہی ہوجاتی لڑکی سے عالیان کی طرف اشارہ کرکے کہا اور بھاگ گیا۔ عالیان کو بھی ظاہر ہے بھاگنا پڑا' کیونکہ لڑکی اپنے دائیں ہاتھ کو تھپڑ کے لیے زحمت دیتی نظر آرہی تھی۔

اسی شام کو امرحہ ویرا کی سائیکل کے پیچھے بیٹھی آئس کریم کھا رہی تھی۔ امرحہ نے تو ویسے بھی جاب چھوڑ دی تھی اور ویرا کے پاس بھی کچھ وقت نکل آیا تو وہ دونوں ساتھ

نکل پڑیں اور ادھر ادھر کھاتے پیتے وہ مانچسٹر میں آوارہ گردی کرتی رہیں۔

''میں اب بھی رات کو اکثر ڈر کر اٹھ جاتی ہوں۔ مجھے لگتا ہے میں خواب میں وہی سب دیکھتی رہی تھی جو تمہارے ساتھ برازیلا میں ہوا تھا۔ وہ زندگی کا بدترین احساس تھا امرحہ.... میں نے محسوس کیا کہ میرا جسم بے جان ہو رہا ہے اور مجھے کچھ سنائی اور دکھائی نہیں دے رہا۔'' ویرا پہلی بار اس واقعے کے بارے میں بات کر رہی تھی۔

سائیکل پر پیچھے بیٹھی امرحہ کی آنکھیں نم ہوگئیں اور اس نے ویرا کی کمر میں محبت کے گہرے اور شدید احساس کے تحت ہاتھ حمائل کیا۔

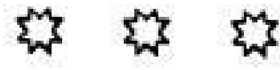
''میں نے اس وقت محسوس کیا امرحہ! کہ وہ زندگی کیا ہوگی جو تمہارے بغیر ہوگی بغیر آواز کے میں نے خود کو روتے پایا.... اور اس وقت مجھے لگا کہ اگر تمہیں کچھ ہوگیا تو میں ساری دنیا کو آگ لگا دوں گی۔ میں اب تک نہیں سمجھ سکی 'امرحہ کو آخر وہ کیا ہے جو میرا تم سے جڑ گیا ہے اور جو جدا ہونے کے لیے تیار ہی نہیں.... مجھے تم سے ایسا جان لیوا لگاؤ کیوں ہے.... آخر اتنی دور روس میں رہنے والی لڑکی ویرا اور اتنی ہی دور پاکستان میں پیدا ہونے والی امرحہ کے اندر ایسا کیا بیج دیا گیا ہے جو تناور ہوتا جا رہا ہے اور جس نے ہمیں اپنی چھاؤں میں لے لیا ہے.... ایسے فاصلوں پر پیدا ہونے والے لوگوں میں اتنی قربت کہاں سے آگئی؟''

اب امرحہ سائیکل چلانے لگی تھی اور ویرا اس کے پیچھے بیٹھ گئی تھی۔

''اسے خدا کی رحمت کہتے ہیں جو اچھے انسانوں کی صورت میں کہیں بھی آ لیتی ہے' پھر فاصلوں کی اہمیت رہتی ہے' نہ رنگ و نسل کی۔'' امرحہ نے کہا۔ اس امرحہ نے جس نے خدا سے ہزاروں' لاکھوں بار شکوے کیے تھے کہ اس نے اسے اچھے لوگوں کے ہجوم میں پیدا نہیں کیا۔

''شاید....'' ویرا نے سر ہلایا اور وہ روسی گانا گانے لگی 'جسے امرحہ بھی ساتھ ساتھ گانے کی کوشش کرنے لگی اور....

اور مانچسٹر کی سڑکوں پر سرمئی اور سفید فراکوں میں ملبوس دو لڑکیاں گنگناتی ہوئی اس راستے کی طرف بڑھنے لگیں' جن پر دو سچے دوست ہی گامزن ہوسکتے ہیں اور جنہیں زندگی کی صبح کے سب ہی اجالے کیے خوش آمدید کہتی ہے اور خوش قسمت بھی۔



''میں تمہیں اس لیے خوش قسمت نہیں کہوں گی کہ تمہیں عالیان ملا۔ میں تمہیں صرف اس لیے خوش قسمت کہوں گی کہ تم دیدی کی بیٹی بن گئی ہو۔'' وہ دونوں نشست گاہ میں بیٹھی ہیں۔ ابھی ابھی امرحہ ماما مہر کو ان کے کمرے میں سلا کر آئی تھی۔ اس سے پہلے وہ سب سادھنا کی کہانی سنتے رہے تھے۔ این بھی سو چکی تھی۔

''جب میں یہاں آرہی تھی تو میرا دل چاہتا تھا میں مر جاؤں' لیکن کسی دوسری جگہ' انجانے لوگوں' انجانے ماحول میں نہ جاؤں۔ مجھے یہ عذاب لگ رہا تھا' لیکن جب میں یہاں آگئی تو مجھے لگا' میں جس گھر سے رمیش کے لیے نکل گئی تھی' اسی گھر میں واپس آگئی ہوں۔ آریان بہت بیمار تھا اور مجھے بہت سارے پیسوں کی ضرورت تھی اور اس گھر کے سارے پیسے میرے حوالے تھے۔ آج تک مجھ سے ایک پیسے کا حساب نہیں لیا گیا۔ روز صبح آریان کو ایک فون کال جاتی ہے یہاں سے اور دیدی اسے روز ایک نظم سناتی ہیں۔ یوں آریان بلند حوصلہ اور باہمت ہوتا جا رہا ہے۔ آریان ٹھیک ہو جائے گا' کیونکہ اس کے لیے دیدی نے دعا کی.... آریان کی ماں کی دعا میں رد کی جا سکتی ہیں۔ دیدی جیسے انسان کی نہیں۔ آریان کی بیماری کی صورت میں جو مجھے لگتا تھا کہ بھگوان نے مجھے سزا دی' وہ دیدی کے ملنے سے وہم ہوگئی۔ مجھے پہلی بار لگا کہ ہاں میں بھی بھگوان کو پیاری ہوں.... اس نے مجھے پیارے لوگوں میں بھیجا.... امرحہ اگر ہمیں درد ملتا ہے تو دوا اس سے بڑھ کر ملتی ہے۔''

امرحہ نے سادھنا کی گیلی آنکھیں صاف کیں۔ آج کل سادھنا بہت خوش تھی اور خوشی سے بار بار رو پڑتی تھی۔ لیڈی مہر نے آریان اور آریان کے بابا کو مانچسٹر بلوایا تھا۔ عالیان کی شادی کے لیے' اور سادھنا سے گزارے بھی وقت نہیں گزر رہا تھا۔

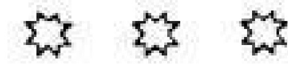
''تم بہت خوش قسمت لڑکی ہو امرحہ!'' مزید آنکھیں گیلی کرتے ہوئے سادھنا نے کہا۔

''ہاں.... بہت زیادہ.... اب دنیا میں کون ہے' جو مجھے سیاہ بخت کہہ سکے.... میں ماما مہر کے زیر سایہ رہنے والی ہوں' جو عظمت کی بلندیوں پر ہیں.... جو فرش پر عرش والے کی رحمت ہیں۔''

اور رحمت جیسے ہی دادا بھی.... روز فون کرتے روز رو پڑتے۔ پہلے یہ احساس تھا کہ وہ پڑھنے گئی ہے واپس آجائے گی۔ اب یہ یقین کہ بس اب وہ پرائی ہوگئی.... رخصت ہوگئی۔ وہ روز بابا کو بھی فون کرتی سلام کرتی' حال چال پوچھتی' پھر خاموشی چھا جاتی اور فون بند ہو جاتا.... دادا کہہ چکے تھے کہ اپنے باپ کی خاموشی کا احترام کرو' تو وہ یہی کر رہی تھی۔ محبت ادھر بھی قائم تھی اور ادھر بھی' اور پھر رات کتنی ہی چھوٹی کیوں نہ ہو۔ سورج طلوع ہونے میں وقت لیتا ہے اور اس مطلوبہ وقت کا احترام کرنا چاہیے۔

موسم بدل رہا ہے.... وقت گزر رہا ہے.... اور اس بار دونوں کے پیراہن دلکش ہیں.... صبحوں کا انتظار رہتا ہے۔ شاموں میں ٹھہرا جاتا ہے اور راتوں کی نیند میں دل پسند خواب دیکھے جارہے ہیں۔

مانچسٹر نکھر نکھر کر سامنے آجاتا ہے۔ یونی ورسٹی میں گھڑیاں بند کردینے کو جی چاہتا ہے' اور کبھی کبھی یہ دل بھی چاہتا ہے کہ یونی کے سارے دروازے بند کردیے جائیں.... کسی کو کہیں جانے نہ دیا جائے اور سب دائرے بنا کر بیٹھ جائیں اور اپنے اپنے دیس کی کہانیاں سنائیں.... اور سب سنتے جائیں.... سنتے ہی جائیں.... وقت کبھی نہ گزرنے کے لیے ٹھہر جائے یا پوری یونی کو ریشمی لحاف میں لپیٹ دیا جائے اور اس کے سرہانے بیٹھ کر اسے محبت سے گھنٹوں دیکھا جائے.... پھر اسی کے سرہانے خود بھی میٹھی نیند سو لیا جائے۔



سمسٹر ختم ہوجانے کو تھا بس.... ان کی پیاری دلاری یونی ورسٹی میں گزارے دن اب ڈائریوں اور البمز میں ہی مقید ہوئے رہ جانے والے تھے۔ وہ سب اسٹوڈنٹس جنہیں وہ نام سے اور وہ سب جنہیں شکلوں سے جانتے تھے وہ سب زندگی کی راہوں میں بکھر جانے والے تھے۔

سائی روبا سے اظہار محبت نہیں کرسکا۔ کیونکہ اسے لگا کہ ایسے وہ اس کے لیے مشکلات کا باعث بنے گا۔ لیکن روبا نے خود ہی اسے انتظار کرنے کے لیے کہہ دیا اور سائی کے لیے یہ ہی بہت تھا۔ ویسے بھی وہ پہلے ہی کہہ چکا تھا کہ میں اس کے فراق میں رونے کے بجائے اسے خوشی سے یاد کرنا اور دعاؤں میں اس کا نام لینا پسند کروں گا۔ یہ بات صرف سائی ہی کہہ سکتا تھا' اور وہ کر بھی سکتا تھا۔

نوال اور دائم کی شادی ہوگئی۔ یہ شادی انہوں نے خاص سمسٹر ختم ہونے سے پہلے کی' تاکہ ان کے سب دوست شرکت کرلیں اور ویسے بھی امتحانات کے بعد عالیان' امرحہ کی متوقع شادی کا ایسا شور تھا کہ انہوں نے امتحانات سے پہلے اپنی شادی کو ترجیح دی۔

پرانک ویک آنے سے پہلے ہی کارل نے اعلان کردیا کہ وہ یہ ویک' دو ویک پہلے سے ہی منائے گا اور اس نے ایسا کیا بھی۔ پہلے مرحلے میں وہ جم کی کاپی بن گیا اور بغیر پیسوں کے کام شروع کردیا۔ وہ ایک گھنٹہ یا کچھ زیادہ وقت ایک ایک کو دیتا اور اتنے سے وقت میں ہی وہ شکار کو عاجز کردیتا۔ جم تو پھر بھی ایک ہاتھ کا فاصلہ رکھتا تھا۔ اس نے یہ فاصلہ بھی ختم کردیا۔ عین منہ کے پاس.... عجیب غریب سیرپ پی کر منہ سے گندی سے بھی گندی بو نکالتے ہوئے کہ ناک پر ہاتھ رکھنے پر بھی بو ناک میں گھس آئے۔ ایک ہی ہفتے میں اس نے کئی شکار نپٹا لیے اور اسی ایک ہفتے میں وہ یونی وہ خاص جوتے پہن کر آیا' جو خدا جانے اس نے کسی سائنس دان سے بنوائے تھے کہ خود آئن اسٹائن بنا تھا۔ ان کے لیے.... ان کے تلوے میں وہ ریکارڈنگ تھی جو چلنے پر چل پڑتی.... اور خدا معاف کرے سنسان قلعے میں چمگادڑوں اور بلاؤں کے چلانے کی خوف ناک آوازیں اور درمیان میں جادوگرنی کے بلند بانگ شیطانی قہقہے' جنہیں سنتے ہی ماؤں کی گودوں میں پناہ لینے کو دل چاہتا۔

وہ جہاں جہاں سے گزرتا کانوں میں انگلیاں ٹھونسنے پر مجبور کردیتا اور ظاہر ہے وہ جم بنا جس شکار کے پیچھے ہوتا وہ ان جوتوں کی وجہ سے بھی اپنا سر پیٹ لیتا۔ اس کے یہ جوتے یونی میں کچھ ایسے مشہور ہوئے اور منہ سے اٹھتی بو نے فضا کچھ ایسے مہکائی کہ اس ویک کو اس کے نام سے منسوب کردیا گیا۔ یعنی ''عذاب ویک''

اس عذاب ویک سے اگلے ویک اس نے ایک مخصوص ''چیپ'' کا استعمال شروع کردیا۔ یہ چیپ جس جگہ لگاتے وہی رنگ اور صورت اختیار کرلیتی' انسانی کھال سے زیادہ بہترین جگہ کون سی ہوتی اسے لگانے کے لیے تو اسے انسانی کھال پر چپکا دیا جاتا۔ انسانی درجہ حرارت پر تیس سیکنڈ کے اندر اندر یہ تیز آواز سے پھٹ جاتی اور کھال پر خون نما دھبے اور جلی ہوئی کھال کی طرح پھیل جاتی۔ جس کی کھال پر یہ یوں پھٹتی وہ یہ سمجھتا کہ اس کی کھال پھٹ

گئی۔

یہ کھال، گالوں پر، کانوں، گردن، ہاتھوں، بازو، انگلیوں پر بہت پھٹی، خاص کر لڑکیوں کی اور اس.... اس قسم کی چیخیں اور شکلیں دیکھنے کو ملیں کہ عینی شاہدین ایسے غضب ناک واقعات پہلے کہاں کسی کو دیکھنے نصیب ہوئے ہوں گے۔

اس پرانک پر کارل کے کافی پیسے لگ گئے تھے، لیکن خیر جب وہ وزیر اعظم بن جائے گا تو ٹیکس کی صورت سب وصول کرلے گا۔ کارل نے اپنے کمرے میں باقاعدہ ایک ایک کا نام لکھ کر فہرست بنا کر لگا رکھی تھی، جسے وہ شکار کرلیتا اس پر ٹک لگا دیتا، وہ نہیں چاہتا تھا کہ بعد میں اسے پچھتانا پڑے، خاص کر جب وہ بوڑھا ہو جائے تو یہ سوچ سوچ کر آہیں بھرے کہ اس نے ان چند ایک کو بھی کیوں چھوڑ دیا، جنہیں وہ ذرا سی محنت سے الو بنا سکتا تھا، تو وہ یہ ذرا سی محنت اب کر رہا تھا۔ اس نے کیا کچھ نہیں کیا جو کیا کم کیا۔

حتیٰ کہ وہ بڑا بوائے بن کر گرلز ہاسٹل میں بھی جاتا رہا اور ان کے کمروں میں مختلف چیزیں چھوڑ چھوڑ کر آتا رہا۔

ایما کے گھر کے آگے اس نے بورڈز کا ڈھیر لگا دیا اور وہ بورڈز کچھ ایسے تھے کہ ایما نے فوراً انہیں آگ لگا دی بعد میں وہ اپنی دوست کے آگے بیٹھ کر روتی رہی اور پوچھتی رہی۔ کیا میں ایسی ہوں.... ایسی؟

پتا نہیں وہ کس "ایسی" کے بارے پوچھ رہی تھی، کیا ہاتھ سے بنائی اس چھپکلی کے بارے میں جس کے براؤن بال تھے اور جس نے نیلا گاؤن پہن رکھا تھا اور جو مسکرا کر کیک کاٹتے دنیا سے خوب صورتی ہمیشہ کے لیے ناپید ہو چکی ہے کا واضح اعلان کر رہی تھی اور جس پر لکھا تھا۔

"Reloaded Ayma is Back Horror" بہرحال باقاعدہ پرانک ویک کا آغاز انہوں نے ماسک پہنے، ہاتھوں میں ہتھیار پکڑے، رات گئے اکیلے اکیلے جونیئرز پر ہلا بول کر ان کے منہ پر ٹیپ چپکا کر.... ان کے ہاتھ باندھ کر۔

"تم اغوا کرلیے گئے ہو۔" کا ثبوت دے کر کیا۔ سائی اور امرحہ کا کام ٹیپ چپکانے کا تھا۔ عالیان اور کارل کے ہاتھ میں ہتھیار تھے اور ویرا یونی کی سپر گرل، میں تمہاری مدد کروں گی بنی وہاں سے گزرتی ہے اور اغوا کاروں کو للکارتی ہے کہ وہ پولیس کو بلا رہی ہے اور فون نکال کر کان سے لگاتی ہے اور اغوا کار ان بے چاروں کی کنپٹی پر گن رکھ دیتے ہیں کہ اگر فون کیا تو یہ گیا۔

"جو گیا...." ہاتھ ہلا ہلا کر ویرا کو منع کرتا ہے، فون نہیں کرنا.... جبکہ ویرا کو ہر حال میں فون کرنا ہے.... ایک.... دو.... تین.... اور وہ بے چارا گیا۔

یہ ہی کام عالیان اور کارل نے دوسرے ہالز میں بھی کیا۔ ان کا دوست مطلوبہ ریسٹورنٹ کے کمرے میں دیر رات تک براجمان رہتا، دروازہ کھلا رہتا اور یہ کمرے پر دھاوا بول دیتے۔ یہ سب کرتے دونوں نے یہ ثابت کردیا کہ اگر ان کا بزنس نہ چلا یا انہیں کوئی جاب نہ ملی تو وہ کامیابی سے اغوا برائے تاوان کا کام شروع کرسکتے ہیں۔ اگر کچھ فائدہ نہ بھی ہوا تو پولیس بھی نہ ڈھونڈتی پھرے گی یا اخبارات میں نام بھی نہ آئے گا۔

ایک مشترکہ پرانک جو تقریباً "سب ڈیپارٹمنٹس نے مقررہ وقت کیا، وہ تیسرے لیکچر کے ختم ہونے کے بعد کلاسوں سے نکل کر کوریڈورز میں لیٹ جانے کا تھا۔ وہ سب چلنے پھرنے کی جگہوں پر بچھ گئے اور پوری یونی جام ہوگئی۔ پروفیسرز جہاں تھے وہیں آدھے گھنٹے تک پھنسے رہے۔ اگلا پرانک انہوں نے لائبریری میں کیا۔ ان سب نے ایک ساتھ لائبریری پر دھاوا بول دیا اور وہ ہر طرف پھیل گئے۔ اف اس لائبریری نے ان کی کتنی نیندیں اڑائی تھیں۔ آج وہ اس کا سکون اڑانے آئے تھے۔ انہوں نے اپنے آئی فونز نکالے اور تیز میوزک چلا دیا اور کتنے ہی قلابازیاں لگانے لگے اور سر کے بل پنکھے بنے فرش پر گھومنے لگے۔ انہوں نے پورے تیس منٹ تک لائبریری بلاک رکھی۔ دیکھا کوئی فرق نہیں پڑا، ایسا کوئی قہر نہیں ٹوٹ پڑا، علم کے سمندروں پر.... دنیا چند سو سال ترقی میں پیچھے نہیں چلی گئی اور کتابوں کے سینے دکھ سے پھٹ نہیں گئے۔ امرحہ نے اپنے پروفیسرز کی کاروں کو نوٹس سے بھر دیا تھا اور کارل، عالیان نے کاروں کو کفن زدہ کردیا تھا۔ انہیں سفید کپڑے سے لپیٹ دیا تھا اور اس پر پروفیسرز کی خاص عادات اور خاص باتوں کو لکھ دیا تھا۔

چند ڈیپارٹمنٹس نے مارچ کی صورت ٹریبوٹ دیا۔ وہ فوجی انداز سے پریڈ کرتے رہے اور اپنے ڈیپارٹمنٹ کے سامنے ایک لمبی سلامی زمین پر پیر مار مار کر اور اونچی آوازیں نکال نکال کر دی، اور دوسرا ٹریبوٹ کچھ یوں تھا کہ آکسفورڈ روڈ پر سائیکل ہی سائیکل ہوگئیں۔ اتنی سائیکل، اتنی سائیکل کہ لگنے لگا کہ دنیا میں چار پہیوں والی موٹر ایجاد ہی نہیں ہوئی ابھی، انہوں نے اپنے منہ UOM کے لوگو

سے پینٹ کر رکھے تھے۔ چند اخبارات اور مقامی ٹی وی چینلز اس کی کوریج کے لیے وہاں موجود تھے' کیونکہ کارل چاہتا تھا اسے گلوبل فیم ملے۔ گلوبل نہ سہی مقامی فیم ضرور اسے ملنے والا تھا۔

پہلے وہ آکسفورڈ روڈ اور ملحقہ سڑکوں پر سائیکلوں سے مارچ کرتے رہے' پھر وہ یونی کے اندر آگئے اور پوری یونی کا ایک چکر لگایا۔ پھر وہ سب ایک مخصوص راستے سے گزرے جہاں رنگوں سے بھرے تالاب نما ڈسپوزیبل قطعے رکھے تھے۔ ان کی سائیکلیں مختلف رنگوں سے گزرنے لگیں اور پھر وہ یونی میں پھیل گئے اور یونی کی سڑکوں کو دھنک رنگوں میں بدلتے چلے گئے۔ پروفیسرز اور اسٹوڈنٹس کھڑے انہیں دیکھ رہے تھے۔ یونی کا ایریل ویو مبہوت کردینے والا تھا جسے ٹی وی پر دکھایا جارہا تھا۔

تو یہ سب جارہے ہیں' زندگی میں کسی تعلیمی ادارے میں جانے سے زیادہ خوش کن لمحہ کوئی نہیں ہوتا اور اسی تعلیمی ادارے کو خیرباد کہہ دینے سے بڑھ کر کوئی جذبہ اداس کردینے والا نہیں ہوتا۔ کاش انسان کے ہاتھ میں یہ اختیار ہوا کرے' اپنی محبوب چیزوں کو وہ مٹھی میں دبا کر دل کے قریب کرلیا کرے' اور یادیں کتنی بھی تازہ کیوں نہ ہوں' وہ ہوتی تو یادیں ہی ہیں نا۔ انہیں کیسے بھی تصویروں یا ڈائریوں میں مقید کرلیا جائے۔ یہ ماضی کا حصہ بنتی چلی جاتی ہیں اور ہاتھ ہلاتی دور سے دور ہوتی چلی جاتی ہیں۔ جو درس گاہ باہیں وا کیے "خوش آمدید" کہہ رہی تھی۔ اب وہ ہاتھ ہلاتے "الوداع" کہنے والی ہے۔

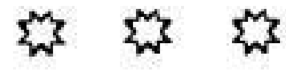
امرحہ نے ان احساسات کو لے کر خود کو دلگرفتہ ہوتے دیکھا۔

"وہ کارل کے سر پر کتابیں مار رہی ہے۔ وہ سائی کے پاس بیٹھی رو رہی ہے۔ وہ ویرا کی رولر کوسٹر کے پیچھے بیٹھی خوف سے چلا رہی ہے۔ وہ آکسفورڈ روڈ پر سائیکل چلا رہی ہے.... اس نے عالیان کو گرا دیا ہے۔ وہ ٹویٹ پر ٹویٹ لے کر کھا رہی ہے اور وہ انہیں واپس کرنا خود کو بھلاتی جارہی ہے۔ اس کے دوپٹے کو اسٹوڈنٹس ایشین فلیگ کہنے لگے ہیں۔ اس کے رونے پر مانچسٹر کے ڈوب جانے کا ڈر ہے۔"

یونی ورسٹی کے اس سفر نے اسے کتنا بدل دیا۔

وہ سب ان ہی سائیکلوں پر بیٹھے مانچسٹر کی سڑکوں کو رنگین کرتے مانچسٹر شہر سے دور جارہے تھے۔ پہلے کارل' سائی اور عالیان نے ریس لگائی۔ پھر کارل اور ویرا نے....

اور وہ انہیں عالیان کے ساتھ کھڑی ہو کر دیکھتی رہی۔



"اعمال نفیس پاکیزہ مخمل پر تحریر وہ نوری رباعی ہے جسے برگزیدوں کے سائے "آب حق" سے لکھا جاتا ہے۔"

لیڈی مہر۔ خدا کے بنائے خوش قسمت انسانوں میں سے ایک میں ہوں۔ میں خود پر نظر ڈالتی ہوں تو یقین رکھتی ہوں کہ خدا کو کیسا پیار ہے مجھ سے۔ میں نے اپنی زندگی کا ورق ورق کھنگال ڈالا کہ کیا مجھے کوئی ایسا دکھ ملا جس نے مجھے برباد کر ڈالا' جواب ہے نہیں۔

میرے عزیز شوہر اپنے وقت مقررہ پر رخصت ہوگئے اور میں نے ان کی موت پر صبر کو شکر سے اپنایا۔ میں جسمانی نقص کا شکار ہوگئی اور مجھے اس نقص پر بھی کوئی تکلیف نہیں ہوئی' کیونکہ میں نے خود کو اس حقیقی تحریر کو پڑھنے کے قابل کرلیا تھا کہ مجھے بنانے والا مجھ سے سب سے زیادہ پیار کرنے والا ہے اور اس پیار کرنے والے کا فیصلہ ہر حال میں میرے حق میں بہتر ہی ہوگا۔ یہ فیصلہ تکلیف کی صورت وارد ہو یا کسی راحت کی صورت نصیب ہو۔ یہ میرے چاہنے والے کا فیصلہ ہوگا اور مہر عالم اپنے چاہنے والے کے ہر فیصلے پر سر کو ایسے جھکاتی ہے کہ وہ کبھی اٹھ نہ سکے۔

خدا کو کتنا راضی کرسکی ہوں میں' یہ شاید میں اس کے بندوں کو کتنا راضی رکھ سکی ہوں سے جان سکوں۔ میں ایک عام خاتون ہوں مہر عالم۔ میرے پیارے بیٹے ڈینس نے بچپن میں مجھے یہ خطاب لیڈی دیا تھا اور میں نے اسی وقت سے خود کو لیڈی مہر مان لیا۔ ڈینس کا دیا خطاب میرے لیے کسی شاہی خطاب کے باقاعدہ دیے جانے سے زیادہ خاص ہے۔ میں نے اپنے اعمال میں انسان کمائے ہیں۔ میری اس کمائی پر یقیناً" خدا خوش ہوگا اور میں یقیناً" خدا اس فلم کو دیکھنے کی درخواست کروں گی۔ جس نے اس نے میری قسمت لکھی' میری گود میں انمول انسان دیے اور مجھے ان کا سرپرست بنایا۔ خدا نے مجھے وہ اعزاز دیا جس پر شکر ممکن نہیں۔ "محبت بقا کی صورت اٹھی اور ماں کی صورت تھمی۔"

"سادھنا: انسان ایک مکمل زندگی گزار سکے' یہ کیونکر ممکن ہے۔ شاید کبھی نہیں' لیکن میرے لیے مکمل زندگی آریان کا ٹھیک ہوجانا ہے اور وہ ٹھیک ہورہا ہے۔ میں اب

اپنی ماں سے کہتی ہوں کہ میں نے جان لیا ہے ماں ہونا کسے کہتے ہیں۔ ماں ہونا عظمت کو کہتے ہیں۔ ہر وہ انسان عظیم ہے جو ماں سا ہے۔ میں عظیم نہیں ہوں، لیکن آریان کہتا ہے۔ "میں ایک باہمت اور عظیم عورت کا بیٹا ہوں۔" اور آریان کے یہ الفاظ میرا کل اثاثہ ہیں۔ میری مکمل زندگی میں انسان دکھی کم اور تنہا زیادہ ہے۔"

سائی:۔ انسان کا اثاثہ کوئی ایک انسان یا چیز ہو سکتی ہے؟

یقیناً" نہیں۔ میرے اثاثے دنیا کے کونوں میں بکھرے ہوئے ہیں۔ وہ مجھ سے فون پر، آن لائن باتیں کرتے ہیں۔ مجھے لمبی لمبی میلز کرتے ہیں اور میں جذباتی ہو جاتا ہوں، کیسا خوش قسمت انسان ہوں میں۔ خدا نے مجھے وہ دل دیا جس میں سب کے سب دکھ ایسے محفوظ ہیں۔ جیسے سیکرٹ باکس میں قیمتی اشیا۔ میں نے اپنی سماعتوں کو نہیں دل کو کھلا رکھا۔ میں کبھی اکتایا نہیں اور میں نے کبھی عجلت کا مظاہرہ نہیں کیا۔ میں نے کسی کی تکلیف کو معمولی نہیں سمجھا۔ میں نے انہیں ویسے ہی اپنے دل پر محسوس کیا جیسے وہ سنانے والے کے دل پر بیتا۔ دنیا بے شک غموں سے بھری پڑی ہے، لیکن اس غم سے بڑھ کر کوئی غم بڑا نہیں کہ آپ کے غم کو سننے والا کوئی نہیں۔ آپ کو تسلی دینے والا، آپ کے آنسو پونچھنے والا کوئی نہیں۔ میں سائی ایک نصیحت کرنا چاہتا ہوں۔

"افراتفری کے اس عالم میں ذرا دیر کو ٹھہر جائیں اور لفظوں کی گونج کا انتظار نہ کریں اور اپنی سماعتوں کو اس گویائی کے قابل کریں جو گونگی ہوتی ہے اور چھپے ہوئے دکھوں اور سسکتی ہوئی تکلیفوں کی خاموشیوں کو سنیں اور یہ جان لیں کہ جو کلام خاموشی کرتی ہے وہ زبان نہیں کر سکتی.... جو بیان نہیں کیا جا سکتا صرف وہی محسوس کیا جا سکتا ہے، تو سب سن لیں اور سب محسوس کریں۔"

"دنیا میں گھوم پھر کر میں یہ ہی خاموشیاں سنتا اور محسوس کرنا چاہتا ہوں۔"

"بلندیوں پر جدوجہد سے پہلے عزم کمندیں ڈالتا ہے۔"

دیراۃ:۔ زندگی سفر مسلسل ہے اور ہم اس کی سواری، زندگی کے اس موجودہ پڑاؤ سے گزرتے میں مشکلات کا شکار ہوئی ہوں۔ کیونکہ خود کو ٹھیک ٹھاک کہتے رہنا کہ ہاں میں ایک اچھا انسان ہوں۔ مجھے ہی کرنا تھا۔ کبھی کبھی بہت مشینی لگتا ہے۔ لیکن مجھے یہ خوشی ہے کہ میں نے محبت کو سرد نہیں پڑنے دیا اور نفرت کو اس کی طرف پیش قدمی نہیں کرنے دی۔ میں جذباتی طور پر کمزور ہو رہی ہوں، لیکن پھر بھی میں آگے بڑھتی رہوں گی۔ میں سخت موسموں میں پلی لڑکی ہوں، کیونکہ میں نے جان لیوا برفانی طوفانوں میں بھاگتے رہنے کا سبق سکھا ہے اور میں اپنے سبق بھولتی نہیں۔

دکھ جس دریا میں بہتا ہے میں اس دریا پر پل بنا کر گزر جاتا ہوں۔"

"کارل:۔ دنیا کیسی وسیع ہے اور کیسے کیسے لوگوں سے بھری پڑی ہے مجھے ذرا تفصیل سے دنیا میں نکل کر دیکھنا چاہیے۔

یہ بات بہت پہلے سے طے تھی کہ ڈگری کے بعد میں اور عالیان، ماما مہر کے گھر میں شفٹ ہو جائیں گے اور مل کر بزنس کریں گے۔ لیکن اب میں نے اپنا ارادہ بدل دیا ہے۔ عالیان کو بزنس کرنا ہے اور مجھے ہنگامہ، مجھے یہ لگتا ہے کہ دنیا میں بہت سے لوگ میرا انتظار کر رہے ہیں کہ کارل آجاؤ اور کچھ کر دکھاؤ اور مجھے یہ یقین سا بھی ہے کہ کہیں کوئی ایک خاص صرف میرے انتظار میں ہے۔ تو میں انتظار کرنے والوں کا انتظار ختم کرنا چاہتا ہوں۔ اسی قلم سے میں دوبارہ آنے کے لیے جا رہا ہوں۔ میرا انتظار کیا جائے۔ میں انتظار ختم کرنے جا رہا ہوں۔

"علم جس وسعت پر محیط ہے شاگرد اس کا کوزہ ہے۔"

امرحہ:۔ فاتحوں کی آنکھوں کی چمک کیسی ہوتی ہوگی؟ شفاف اور نڈر.... عالم کل کی روشنی سے بھرپور.... اور ان کی آہٹیں.... سورج کی آمد سی بروقت اور ان کا ارتکاز، آکاش سا بلند.... قائم اور مضبوط فاتح....

کیا میرا شمار فاتحوں میں نہیں ہوگا.... یقیناً" ہاں کیونکہ میں گری، میں اٹھی اور میں پھر سے چل دی۔ میں کمزور تھی میں مضبوط ہوتی چلی گئی۔ میں نے چلنا سیکھا اور میں دوڑنے بھی لگوں گی اور اڑنے بھی۔ اگر میرے والدین میرے دو پر بن جاتے تو میں بہت پہلے زندگی کے آفاق پر اڑنے لگتی۔ لیکن میرے خطے میں ابھی اڑانے کا رواج نہیں آیا، یہ کوئی فرسودہ یا جاہلانہ رسم نہیں کہ اس پر شرمندہ ہوا جائے یہ تو فخر ہے۔ میں امرحہ اپنی وہ اڑان ضرور اڑوں گی جو ہر انسان کا حق ہے۔ زندگی کی وسعتوں میں، میں اپنے آسمان تلاش کرتی رہوں گی۔

"جوہر کل" "مقصد حیات کے بازار میں عمل کے داموں فروخت ہوتا ہے۔

"عالیان:۔ مقصد حیات کی جامع وضاحت مجھ پر کھلی تو میں نے اس دکھ کو کم ہوتے پایا جو ماما کو لے کر میں اپنے دل پر محسوس کیا کرتا تھا۔

اب میں پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں تو سوچتا ہوں کہ بعض اوقات ہم خود اپنے لیے تکلیفیں بھاگ دوڑ کر اکٹھی کرتے ہیں۔ ان پر بار بار سوال اٹھاتے ہیں۔ انہیں کریدتے ہیں۔ ان پر آنسو بہانے کے مواقع تلاش کرتے ہیں' لیکن انہیں ترک کردینے کے طریقوں پر غور نہیں کرتے۔ ہم سب سے زیادہ ظالم خود اپنے لیے ہوتے ہیں۔ میں اب اپنی سوچ کو پہلے سے زیادہ مثبت اور ارادوں کو مضبوط کررہا ہوں کیونکہ مجھے جلد ہی "مہرہاؤس" کی بنیاد رکھنی ہے' جس کی گنتی ایک سے شروع ہوگی اور پھر گنتی ختم ہونے میں نہیں آئے گی۔ جہاں بچوں کو جو ہر کل کی کہانیاں سنائی جائیں گی اور روشن صبحوں کی نوید دی جائے گی۔



"A Tale of Aliyan and Amarah"
"Join us To Celebrate its End"

لیڈی مہر نے ان کی شادی کے لیے کتابی نما کارڈ پر یہ لکھوایا تھا۔ شنل کاک میں اب ان دونوں کی شادی کی تیاریاں تیز کردی گئی ہیں۔ شنل کاک کے قریب ہی ایک چھوٹا سا خوب صورت گھر ان دونوں کے لیے خرید لیا گیا ہے کہ وہ دونوں اپنی ذمہ دارانہ زندگی کا آغاز اپنے بل بوتے پر کریں۔ ڈینس مستقل ماما مہر کے پاس آکر رہنا چاہتا ہے۔

لیڈی مہر ویڈنگ پلانرز کے ساتھ کافی مصروف رہتی ہیں۔ ان کے لاڈلے بیٹے کی شادی ہے۔ ان کا دل چاہتا ہے سارے مانچسٹر کو اکٹھا کرلیں ورنہ ساری برطانیہ کو تو ضرور ہی سڑکوں پر نکال لائیں کہ میرا بیٹا بگھی میں اپنی دلہن کو بٹھائے گزرے گا تم سب نے ہاتھ ہلانے ہیں' ان پر پھول برسانے ہیں۔ اور ان کے بس میں ہو تو وہ براہ راست ان کی شادی کی ٹرانسمیشن چلا دیں کہ ساری دنیا بیٹھ کر دونوں کی شادی دیکھے کیوں یہ ضروری نہیں کہ شاہی خاندان ہی ایسی شادیاں کرتا پھرے۔

فارغ وقت میں ویرا بھی شادی کے لیے کچھ نہ کچھ پلان کرتی رہتی ہے۔ این نے اپنے ماما پاپا سے جاپان سے Ni Anata No10 لکھا سات رنگی پارچہ منگوالیا ہے۔ اور این ان سے جاپانی رسم کے مطابق شادی کے دن گھر واپسی پر شیشے کی سلیں تڑوانا چاہتی ہے۔ پراگ کے ۔۔۔۔ کچھ دوست ان کی شادی کے دن ایک پودا لگانا چاہتے ہیں کہ ان کی زندگی سرسبز و شاداب رہے۔ ان کے کچھ دوسرے دوست ان کے آگے رنگوں میں بھرے تھال رکھنا چاہتے ہیں جن میں ہاتھ ڈبو کر وہ کینوس پر ثبت کرتے جائیں گے اور اس کینوس کو اپنے گھر میں نمایاں جگہ لگادیں۔ اور بھی بہت سے دوست اپنے اپنے دیس کی دل پسند رسمیں کرنے والے ہیں۔ یوں ان کی شادی یونیورسل ہونے والی ہے۔ اور یہی سب دوست سرد راتوں میں آتش دان کے پاس بیٹھ کر اپنے پوتے پوتیوں کو ان کی کہانی کچھ یوں شروع کرکے سنانے والے ہیں۔

تو تقریب کا آغاز چینی ساختہ بڑے بڑے ڈرموں کے بجنے سے ہوگا' فی الحال یہی سب طے کیا گیا ہے Anselm ہال مینس ڈگری کے بعد اپنے اپنے گھروں کو بالکل جانے والے نہیں ہیں۔ انہیں اور کتنے ہی پروفیسرز' ان گنت یونی فیلوز اور ان دونوں کے کلاس فیلوز کو شادی میں شرکت کرنی ہے جس کی خبر The Tab Manchester میں مختصرا" کہانی کے ساتھ آچکی ہے تو ایک اندازے سے سارا مانچسٹر اکٹھا ہونے ہی والا ہے۔ دیس دیس کے اسٹوڈنٹس الگ سے۔

دنیا بھر سے لیڈی مہر کے سب بچے شنل کاک آنے ہی والے ہیں۔ ویرا' این کے والدین' آریان' آریان کے پاپا' دادا' رانیہ وغیرہ سب' شارلٹ کو جورڈن کے ساتھ مل کر عالیان امرحہ کہانی ایکٹ کرکے پیش کرنی ہے۔ جورڈن' عالیان بنے گا اور شارلٹ' امرحہ۔ مورگن نے بس کسی طرح سے ایک گانا تیار کرلیا ہے۔ سائی' روپا کے ساتھ شادی میں شرکت کرے گا اور ایک لمبی تقریر کرے گا' اب وہ بولے گا اور سب سنیں گے۔ بہت سن لیا سب کو۔

کارل نے ان گنت بے ضرر اور معمولی سے ویڈنگ پرانک تیار کیے ہیں۔ جن میں سب سے بے ضرر دولہا' دلہن کی بغیر چھت کی کار جسے وہ شہ بالا چلا رہا ہوگا' کا ان گنت مہمانوں کے ہجوم میں بے قابو ہوجانا ہوگا۔ مہمان بھاگیں گے' چلائیں گے اور دولہا' دلہن کا گلابی رنگ سفید پڑ جائے گا۔ کیسا مزا آئے گا۔ مزید یہ کہ دور لیکن وہیں موجود پھولوں سے بچی جھیل میں کار کا شڑاپ سے گر سا جانا ہوگا۔ یہ مذاق قطعا" نہیں ہے۔ وہ پورے ہوش و حواس سے سنجیدہ ہے۔

تو امتحانات کے ختم ہوتے ہی' رزلٹ سے پہلے انہوں نے بیچلر پارٹی رکھ لی۔ پارٹی کا افتتاح کارل کے ڈانس سے ہوا۔ پہلے ہاف یعنی شادی سے پہلے میں وہ بھلا چنگا ڈانس کرتا رہا' دوسرے ہاف میں لولے' لنگڑوں کی طرح.... یعنی شادی کے بعد عالیان کا حال۔

دوسرا ہاف ایسے کامیاب رہا کہ سب ہنس ہنس کر تھک چکے ہیں۔ پھر بھی ہنس رہے ہیں۔ شادی کے بعد ساری دنیا تمہارے حال پر ایسے ہی ہنسے گی 'وقت ہے سوچ لو' کارل نے ہنسنے والوں کی طرف اشارہ کرکے دائیں آنکھ دبا کر کہا۔

''مجھے انتظار رہے گا۔'' عالیان نے بھی آنکھ دبائی۔

ہال اندھیرے میں ڈوب گیا' صرف فلور پر روشنی رہ گئی۔ فلور پر لاتعداد الارم رکھ دیے گئے اور وہ ایک ایک کرکے بجنے لگے۔ خطرے کی گھنٹیاں.... خطرہ.... خطرہ.... ویلکم ویک کا منظر.... آسک می کھڑے ہیں۔ اسٹوڈنٹس ادھر ادھر چل پھر رہے ہیں۔ زمین زلزلے کی طرح دھم دھم کرنے لگی ہے.... کیوں....

کیونکہ ایشین فلیگ کو سنبھالتی' لمبے بالوں والی لڑکی چلتی آرہی ہے اور آسک می بنے عالیان کے پاس آکر کھڑی ہوجاتی ہے۔ سب اسٹوڈنٹس ان کے گرد دائرے میں سمٹ آئے ہیں۔ ڈی جے نے دھماکا کیا اور سب اچھل کر قلابازی لگاتے پھٹ کر گر گئے ہیں اور کارل فلور پر بیٹھ کر بھاں بھاں کرکے رونے لگا ہے۔

سمندری لہروں کی آوازیں.... اور یہ ایک بڑی سونامی کی لہر آئی اور سب اس میں بہہ رہے ہیں.... ہائے مانچسٹر گیا.... سب فلور پر تیرتے 'ڈوبنے کی اداکاری کررہے ہیں اور ایسی کامیابی سے کررہے ہیں کہ عالیان ہنس ہنس کر دیوانہ ہورہا ہے۔

اب امرل اٹھا اور فلور پر سر کو جھٹکتے بے نیازی سے چلنے لگا ہے اور پیچھے یونی کی عوام دوپٹے سے الجھ الجھ کر لولی' لنگڑی ہوتی جارہی ہے۔ ہال پھر سے اندھیرے میں ڈوب گیا اور اس بار روشنی ہوئی تو فلور پر ڈریگن پریڈ تیار تھی۔ اور سب نے ماسک پہن لیے اور امرل اور عالیان کے گرد جمع ہونے لگے۔ سائی ڈرم بجا رہا تھا اور شاہ ویز دھاتی پلیٹیں پس منظر میں چینی گانا الگ سے چل رہا تھا۔ ہال پھر سے اندھیرے میں ڈوبا اور روشنی ہوتے ہی امرل سائیکل چلاتا نظر آیا اور عالیان کو گرا کر یہ جا وہ جا.... پھر آیا پھر گرا' پھر آیا پھر....

ہال اندھیرے میں ڈوبا اور اس بار امرل سرخ گھونگھٹ میں نظر آیا اور بھاں بھاں کرکے روتے قبول ہے کہنے کے بجائے عالیان کے کیے ظلم دنیا بھر کو بتارہا ہے۔ ظالم عالیان.... مظلوم بے چاری امرحہ....

اس پورے تھیٹر کے بعد سب نے ایک ایک منٹ کی تقریر عالیان کے لیے کی کہ ابھی بھی وقت ہے' پچھلے دروازے سے بھاگ لو۔ پھر نہ گدھوں میں شمار ہوگا نہ گھوڑوں میں 'صرف شوہروں میں وہ بھی شرمندگی سے۔

کارل نے اپنی تقریر کا آغاز کچھ یوں کیا۔ ''میں نے ہمیشہ آپ سب کا بھلا چاہا۔''

''ہمیں اس میں کبھی شک نہیں رہا۔'' شاہ ویز نے آہ بھری' پھر دانت نکالے۔

''اور میں ہمیشہ چاہتا رہوں گا۔'' کارل نے شاہ ویز سے بڑے دانت نکالے۔

''ظاہر ہے ہماری قسمت اتنی اچھی کیسے ہوسکتی ہے۔'' سائی نے رو کر کہا۔

''مجھے تو یہ آئیڈیا ہی بوگس لگتا ہے کہ دو لوگ اتنا لمبا وقت ایک دوسرے کو برداشت کریں۔''

''تمہارے معاملے میں یہ سچ ہوگا نا۔'' عالیان نے بلند بانگ کہا۔

''تو اگر ایک اچھی زندگی گزارنی ہے تو شادی۔''

''ویسے تمہاری شادی کسی شہزادی سے ہوگی' یہ میری پیش گوئی ہے۔'' جم نے اسے تقریر کے درمیان ہی ٹوکا۔

''مجھے یہ پیش گوئی اچھی لگی جم.... اور تم بھی جو کبھی نہیں لگے۔'' کارل بھول رہا تھا کہ ابھی اس نے ''نو شادی'' کا مشورہ سب کو دیا ہے۔ اب وہ اپنی شادی کی پیش گوئی پر خوش ہورہا ہے۔

''اور وہ شہزادی ساٹھ سیکنڈز کے اندر اندر صدمے سے مرجائے گی۔''

جیسے کارل کی مسکراہٹ ایک دم سے غائب ہوئی' اس پر سارے مینرز ایک طرف رکھ کر وہ سب اجڈ گنواروں کی طرح ہنسے.... رکے.... پھر ہنسے اور ہنستے ہی رہے۔

''یہ بھی برا نہیں' جلدی جان چھوڑ دے گی میری' کارل کی بلا سے دو سو شہزادیاں مرجائیں۔''

''تم مانچسٹر چھوڑ دو گے۔'' جے پیٹرسن نے اگلی پیش گوئی کی۔

''تم برطانیہ بھی چھوڑ دو گے۔'' ڈیرک نے کہا۔

"اب یہ نہ کہہ دینا یہ دنیا بھی چھوڑ دے گا۔" سائی بھی کیوں پیچھے رہتا۔

"اس نے تو کہا نہیں، لیکن اس کے کندھے پر گن رکھ کر تم نے ضرور کہہ دیا۔" کارل نے ان سب کی طرف دیکھا اور گلا کھنکارا۔

"اب یہ سارا ماحول میرے لیے بن ہی گیا ہے تو سنو میں تم سب کے بارے میں پیشن گوئی کرتا ہوں۔ تم سب بری طرح سے مجھے یاد کرنے والے ہو.... اتنا کہ تمہیں میرے نام کے دورے پڑا کریں گے اور تم یہ دعا کیا کرو گے کہ کہیں سے میں آجاؤں' اور تمہاری جان عذاب میں لے آؤں۔ تم اپنے بچوں کے نام کارل رکھو گے اور اپنی سویٹ ہارٹ کو سویٹ کارل کہہ دیا کرو گے۔ تمہارا کہیں دل نہیں لگے گا تم دنیا میں پاگلوں کی طرح مجھے ڈھونڈتے پھرو گے۔ تمہاری بیویاں نفسیاتی ڈاکٹروں کے پاس تمہیں لے کر جائیں گی اور بالآخر تم سے طلاق لے لیں گی۔ تمہارے پاس بڑے گھر ہوں گے' کئی گاڑیاں' کھانے کو دنیا جہان کے کھانے' لیکن تمہارے پاس ایک کارل نہیں ہوگا.... اور بس یوں ہر چیز کا مزا خراب ہوگا۔ تم یونی کی' ایک ایک بات' ایک ایک پل بھول جاؤ گے سوائے کارل دی گریٹ کے۔"

کارل نے آخری جملہ بہت سکون سے ہاتھ ان سب کی طرف لہرا کر کہا۔ یعنی وہ سیدھے سیدھے یہ کہہ رہا تھا کہ "زندہ رہنے کے لیے بہت ضرورتیں در پیش ہوں گی' لیکن ہلچل کے لیے صرف ایک۔"

زندگی میں ایک کارل.... زندگی میں صرف ایک کارل....

اس پارٹی سے اگلی رات امرحہ کو ویرا' لیڈی مہر' این سادھنا' شارلٹ' مورگن کی طرف سے دی جانے والی بیچلر پارٹی تھی۔ جس میں کارل نے لڑکی کا گیٹ اپ اپنا کر گھسنے کی کوشش کی۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس نے ایسے میک اپ کیا تھا کہ لڑکیاں اسے دیکھ کر ڈوب مریں کہ ایسے بھی تیار ہوا جا سکتا ہے۔ لیکن سائی نے پہلے ہی ویرا کو فون کر کے بتا دیا تھا کہ کارل ہال آرہا ہے اور ویرا نے کارل کو ہال کے دروازے پر ہی پکڑ کر چلتا کیا۔

اس پارٹی سے پہلے ویرا نے اس کے کمرے سے پیغامات چرا کر این کے ساتھ رات کو ہال جا کر درخت کو میسج ٹری کی صورت سجا دیا تھا تو عالیان جس کا یہ خواب تھا کہ ایسا سانحہ اس کے ساتھ بھی ہو گزرے' تو وہ خواب اس کا پورا ہوا اور کارل اور سائی کو اس درخت سے دور رکھتے وہ اس حقیقت کو خواب ناکی سے دیکھتا رہا۔

ہال کی آرائش قابل دید تھی۔ یہ وہی پرانے قلعے سا ہال ہے جس میں شارلٹ کی شادی کی پارٹی ہوئی تھی۔ جس کے عین درمیان میں بہت بڑا گول فلور ہے اور جس کی چھت پر ایک انچ ایسی جگہ نہیں تھی جہاں سے روشنی نہ پھوٹ رہی ہو۔

ہلکی نیلی اور سفید روشنیوں کے ملاپ سے اس وقت فلور جگمگا رہا ہے' اور سنہری لمبی فراک میں ویرا' امرحہ کے ایک ہاتھ کو اٹھائے اور ایک کو کمر میں رکھے آہستگی سے فلور پر دائرے میں حرکت میں ہے۔ امرحہ ہنستی جاری ہے۔ پھر شارلٹ نے امرحہ کو پکڑ لیا اور قطعاً" نرمی کا مظاہرہ نہیں کیا اور تیز تیز گھمایا.... پھر این اور پھر ایک ایک کر کے سب نے اور آخر میں اسے ایک منٹ کے لیے سیدھا کھڑا رہنے کے لیے کہا۔

وہ پورے پانچ منٹ تک فلور پر گری پڑی رہی۔

پھر فلور پر مشروبات بھرے گلاس رکھ دیے گئے اور امرحہ کو ایک' لیکن درست مشروب اٹھا کر پینے کے لیے کہا گیا۔ گلاس مختلف رنگوں کے تھے جو اپنے اندر موجود مشروب کے رنگ کو بدل کر منعکس کر رہے تھے۔ امرحہ کو فلور پر لاتعداد گلاسوں کے درمیان چلتے ایک گلاس کو اٹھا کر پینا تھا۔ وہ جھک کر یا سونگھ کر کسی گلاس کا مشاہدہ نہیں کر سکتی تھی۔ غلط مشروب اٹھانے پر فلور پر موجود عوام باقی کے مشروبات بھرے گلاس اٹھا کر اس پر انڈیل دے گی۔ جن میں سے چند میں نیلی پیلی سیاہیاں تھیں۔

"پچیس سیکنڈ۔" ویرا جوش سے چلائی۔

اس کا وقت ختم ہونے والا تھا۔ اس نے آخر کار آنکھیں بند کیں اور اکڑ بکڑ کہا اور جس گلاس پر انگلی آئی اسے اٹھا لیا اور ڈرتے ڈرتے سب کو دیکھا۔ سب مسکراہٹیں دبائے کھڑی تھیں۔ اس نے ہرے رنگ کے گلاس میں نیلے نظر آتے مشروب کا ایک گھونٹ بھرا اور اکڑ بکڑ کام کر گیا۔ وہ انار کا جوس ہی نکلا۔ اس کا لباس تباہ ہونے سے بچ گیا۔

پھر انہوں نے اسے فلور کے عین درمیان کھڑا ہو جانے دیا اور وہ سب اس کے آس پاس' آگے پیچھے اس کے لباس پر جھک گئیں۔ کچھ اس کے دامن کے پاس نیچے بیٹھ گئیں

اور مصنوعی لیکن دلکش پھولوں، بیلوں، ستاروں کو اس کے لباس میں جڑنے لگیں۔ اپنی نیک تمناؤں کو بطور سجاوٹ وہ اسے پیش کررہی ہیں۔

شکل چاند اور مثل تاج پھولوں کو ویرا نے اس کے سر پر رکھا، پھر اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی۔ اب وہ ساری لڑکیاں جن سے ہال بھرا پڑا ہے۔ اس کے گرد سمٹ آئیں۔ ایک دوسرے کو شرارتاً دھکے دینے لگیں اور امرحہ کو کھینچنے لگیں یا امرحہ کے آگے ہونے لگیں۔ ہال میں امرحہ، امرحہ کی آوازیں گونجنے لگیں۔ امرحہ کو یہ تاج کسی ایک کے سر پر رکھنا تھا۔ ایسے موقعے بار بار تھوڑی آتے ہیں۔ امرحہ کسی کے سر پر بھی تاج رکھنے کے لیے تیار نہیں تھی اور آخر کار انہیں خوب تھکا کر اس نے کسی ایک کے سر پر رکھ دیا۔

"میرا دولہا جورڈن جیسا ہو، ورنہ کوئی نہ ہو۔" این خوشی سے چلائی۔ تاج اس کے سر پر رکھا گیا تھا۔

"میرا جورڈن ہی نہ لے اڑنا۔" شارلٹ نے قہقہہ لگایا۔

پھر ایک بہت بڑے بورڈ پر عالیان کی تصویر لگادی گئی اور پندرہ لڑکیوں نے آگے بڑھ کر تصویر کے پندرہ حصے ایک ایک کرکے اپنے ہاتھ میں لے لیے۔ اب امرحہ کو ایک ایک کے پاس جاکر انہیں دعا دے کر، ان کی تعریف کرکے، منت کرکے، خوشامد کرکے، کیسے بھی وہ حصہ لانا تھا اور ایک ایک کرکے تصویر مکمل کرنی تھی۔ وقت مقرر تھا اور اگر وہ وقت مقررہ تک تصویر مکمل نہ کرسکی تو اسے دنیا کی پھوہڑ ترین محبوبہ کی "Sash" کراس پٹی پہنا دی جائے، جو ہر صورت اسے اپنے ویڈنگ ڈریس پر بھی پہنے رکھنی ہوگی۔

اب امرحہ ایک ایک کے پاس جارہی ہے۔ انہیں دعا دے رہی ہے، خوشامد کررہی ہے۔ ان کی تعریف کررہی ہے۔ منت کررہی ہے، پھر ہاتھ جوڑ کر ان کے سامنے رونی صورت بنا کر بیٹھ رہی ہے۔ اتنی ڈھیٹ تھیں سب کہ اسے عالیان دینے کے لیے تیار ہی نہیں تھیں۔ سادھنا نے بڑے آرام سے دے دیا۔ شہزا نے تنگ کیا اور آخر میں وہ ویرا کے پاس آئی اور سنہرے بالوں والی حسن میں کمال کو چھوتی لڑکی کی ہتھیلی کھولنے کو اس کا دل نہیں چاہا۔ وہ پھوہڑ محبوبہ کا خطاب لے لے گی۔

دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں اور جیسے ویرا نے جان لیا کہ وہ کیا سوچ رہی ہے اور اس نے اپنے چہرے کو اس کی محبت سے بھگو لیا کہ امرحہ جان لے کہ آخر کار معصومانہ محبت سے آگے کچھ نہیں ہوتا۔ وہ اپنی ہتھیلی اس کے آگے کھول دیتی، اس سے پہلے امرحہ نے اس کے ہاتھ کو اپنے دونوں ہاتھ میں لے کر محبت سے دبایا اور سرگوشی کی۔

"مجھے تم ہی دعا کی طرح لگی ہو، تمہیں میری دعاؤں کی ضرورت نہیں ہے۔"

ویرا نے ہتھیلی کھول کر اس کے آگے کردی، جسے وہ بند کیے رکھنے کا ارادہ بھی نہیں رکھتی تھی اور امرحہ نے عالیان کو مکمل کرلیا۔

ہال میں اندھیرا چھا گیا۔ امرحہ کو ہال سے باہر لے جایا گیا اور کچھ دیر بعد واپس لایا گیا۔ فلور پر جابجا قد آدم سنہری چوکھٹوں میں جڑے آئینے کھڑے کیے رکھے تھے۔ سارا ہال اندھیرے میں ڈوبا تھا۔ صرف فلور اب نارنجی اور ہلکی گلابی روشنیاں منعکس کررہا تھا۔ اسے بیس آئینوں کے درمیان کھڑا کردیا گیا۔

سارا ماحول جیسے ایک دم سے بدلا۔ اس نے خود کو سنہری قلم سے لکھی جانے والی الوہی داستان پایا جو سنی جاتی ہے نہ سنائی.... صرف دکھائی دیتی ہے۔ خوابوں کی رحم دلی سے۔ اس نے گھوم کر چاروں اطراف دیکھا اور اس کی آنکھیں سب ہی سنہری خواب سموئے چمکنے لگیں۔ اس نے سر کو ذرا سا اٹھایا اور اپنے دامن کا کونا ایک ہاتھ میں پکڑا اور ذرا سا گھوم کر ایسے اترائی جیسے خود سے ہی مرعوب ہو۔

"کیا کررہی ہو امرحہ.... اچھا جلدی کرو۔ کسی ایک آئینے کے پیچھے عالیان کھڑا ہے۔ ہم سب منتظر ہیں کہ تم اسے ڈھونڈ پاتی ہو کہ نہیں۔" ویرا نے اندھیرے حصے سے بلند آواز میں کہا۔ وہ چونکی۔ آئینے اس کے قد سے اونچے تھے اور صورت بگاڑنے والے تھے۔ کسی میں اس کی ٹھوڑی پیروں کو چھو رہی تھی۔ کسی میں وہ بالشت بھر کی نظر آرہی تھی، کسی میں موٹی بھدی، کسی میں چیونٹی سی اور کسی میں اس کا قد آسمان سے باتیں کررہا تھا۔ صرف تین آئینے ایسے تھے جن میں اس کا عکس مکمل تھا۔ "عالیان کس آئینے کے پیچھے ہو کوئی اشارہ ہی دے دو۔" اس نے سرگوشی کی جو ظاہر ہے کان لگانے والوں نے سن لی اور چیٹنگ کا شور ڈال دیا۔

"میں نے سوچا ہال میں خاموشی بہت ہے تھوڑا بہت ہنگامہ ہونا چاہیے۔" اس نے دانت نکال کر جھوٹ بولا۔ ہال میں شور اسی لیے نہیں تھا کہ وہ عالیان سے پوچھ نہ

سکے اور عالیان بھی کھنکھار کر یا کسی اور طرح سے اشارہ نہ دے سکے۔

آئینے کے پیچھے کھڑے عالیان کا دل چاہا کہ وہ ہولے سے پیر مار دے کہ اتنے سارے لوگوں میں اس کا سر بلند رہے' لیکن پھر وہ یوں مسکرا دیا کہ چھپ جانا اور ڈھونڈ نکالنا کبھی تو ایمان داری سے ہو۔

کھلی آنکھوں سے اس نے تصور باندھا کہ کیسے امرحہ آئینوں کے درمیان اپنے عکس پر مترنم ہو گی اور اسے جیت جانے کی جلدی نہیں ہو گی' اسے تو اسے پالینے کی فکر ہو گی۔ اب وہ عارضی طور پر بھی اسے گم شدہ رکھنے کے حق میں نہیں ہو گی۔ تصور کے اگلے پڑاؤ میں اس نے خود کو چند دن پہلے کے ایک منظر کو دہراتے دیکھا وہ دونوں شہر سے دور سبزے پر بیٹھے ہیں اور پھولوں کو اپنے گرد لک چھپ پاتے ہیں۔ عالیان نے اپنی آنکھیں ایک ہاتھ سے بند کر رکھی ہیں' کیونکہ اب وہ اس باکس کو کھولنے ہی والی ہے' جو وہ اتنی دور اپنے ساتھ لائی ہے اور ساتھ ساتھ اسے دھمکاتی جا رہی ہے کہ اگر اس نے آنکھیں کھولیں تو وہ باکس کو تالا لگا کر چابی جھیل میں پھینک دے گی۔ اتنا ہی نہیں۔ جھیل میں کود کر چابی ڈھونڈ کر اسے ہی لانی ہو گی۔

ایک چابی کے لیے جھیل میں کون کودے' اس لیے اس نے آنکھیں بند ہی رکھیں اور اس کے کہنے پر ہی کھولیں اور اپنی کل کائنات کو مل بیٹھ کر بانٹ لینے کے انداز سے اس نے کاغذ کے رول کو کھولا اور اس کے سامنے پھیلا دیا۔

"یہ دیکھو میری بہاروں کا ماخذ۔" وہ دنگ رہ گیا' افشاں اس کے چہرے پر بکھری تھی اور افشاں کی جھلملاہٹ امرحہ کی آنکھوں میں جھل مل تھیں۔

عالیان نے اس کی سمت اپنی گردن ناز سے بلند کی۔ "تو وہ اسے اپنے پاس رکھے ہوئے تھی۔" وہ پلک نہ جھپک سکا اور اسے دیکھتا رہا۔

"میری پیاری امرحہ۔" کیسا دل پر جلترنگ بجا رہنے کا احساس تھا۔

"یہ تم ہو۔" اپنی ساری دلربائی لیے وہ اس کے اسکیچ پر محبت سے ہاتھ رکھ کر مسکرائی۔

اس کے دیکھتے رہنے کے انداز سے بس وہ پوری کی پوری ارغوان سی منور ہو گئی اور اس کے عکس میں وہ خود کو' لیکن دراصل اسے ہی پھر سے تلاشنے لگا۔ اسی کے کام سے لگے رہنا کیسا مسرور کن تھا۔ اس نے ذرا سی آنکھیں بند کیں

'اس سوچ کے لیے جو نعمت کی طرح اس پر نازل ہوئی کہ کیا وہ پہروں اور راتوں میں اس کی تصویر کو دیکھا کرتی رہی ہے۔ اور ٹھیک اسی دوران امرحہ نے اس کی ان آنکھوں سے جن پر اسی کا قبضہ تھا' یہ جانچ لیا کہ وہ کس سوچ میں مبتلا ہیں۔

"ایک بار ایسا ہوا کہ صبح ہو گئی اور مجھے اس سے شکایت ہوئی۔ اس نے بتایا بھی نہیں اور بتا بھی دیا کہ جیسے اس نے پوچھا بھی نہیں اور پوچھ بھی لیا۔"

"تم مجھے رات بھر دیکھتی رہیں۔" اس نے لفظ "مجھے" استعمال کیا۔

امرحہ باکس میں سے سرخ ربن نکالنے لگی' لیکن اس کے ہاتھوں کی نازاں جنبش سے اس نے جان لیا کہ وہ کتنی راتوں تک اسے تھامے آنکھوں کے سامنے رکھتے رہے تھے اور کبھی تھکے نہیں تھے۔

امرحہ ربن ہاتھ میں لیے اب اسے ان کی کہانی سنا رہی تھی اور اس کے لیے مشکل تھا۔ دو کام ایک ساتھ کرنا اسے دیکھتے رہنا اور اسے توجہ سے سننا۔

سچے جذبوں سے مسحور ہوتا ارتکاز دونوں میں آیا۔

ہاں بس یہیں۔ یہیں۔ "سماں یار" قائم ہوا۔

تصور کے اگلے پڑاؤ سے جس میں وہ بے شمار بار جا چکا تھا نکلا اور آئینے کے پیچھے خود کو موجود پایا۔

معصوم کا مینار نور سا شاہکار "آئینے کے اِس اور اُس پار"

آنکھیں بند کر لینے کا مقام "محویت"

آنکھیں کھول دینے کی عجلت "محبوبیت۔"

ایک ایک کر کے وہ ایک ایک آئینے کے پاس چل چل کر جانے لگی اور پھر سب کے درمیان کھڑی ہو گئی۔ یہ ایک پہیلی ہے جسے اسے بوجھنا ہے' کیا وہ اس آئینے کے پیچھے ہو گا' جس میں اس کا قد آسمان سے باتیں کر رہا ہے کہ اسے پا کر وہ خوشی سے آسمان چھونے لگی یا اس میں جس میں وہ ایک سے کئی امرحہ بن گئی یا اس میں جس میں وہ مکمل ہے.... اور ایسے تین آئینے ہیں وہ ان تین آئینوں کے پاس گئی اور غور کیا۔

"اوہ...." اس نے اب غور کیا کہ جس میں وہ اپنے عکس کو مکمل سمجھ رہی تھی اس میں اس کا چہرہ اصل جسامت سے ذرا سا بڑا تھا۔ وہ دوسرے کے پاس گئی اور بہت غور کیا۔ وہ بھی اس کے عکس کو ٹھیک منعکس کر رہا تھا۔ وہ

تیسرے کی طرف پلٹنے لگی اور ایک دم سے رکی۔ بہت مدھم، بہت ہی ہلکا' یہ آئینہ اس کے عکس کو دہرا منعکس کررہا تھا۔ وہ تیسرے آئینے کے پاس گئی اور خود کو اچھی طرح سے دیکھا اور آئینے پر ہاتھ رکھ دیا کہ اسے یقین تھا جو آئینہ اسے مکمل کرے گا اسی کے پیچھے عالیان ہوگا۔

''یہاں ہے عالیان۔'' اس نے بلند آواز سے کہا' پھر آواز دی۔ ''عالیان'' اور عالیان نے سنہری چوکھٹے کے کنارے سے ذرا سا آگے ہو کر دیکھا۔ ارغوانی پوشاک میں ملبوس' گھیردار دامن کو فرش پر پھیلائے' وہ آئینے پر ہاتھ رکھے کھڑی ہے۔ نارنجی اور گلابی روشنیوں کا ملاپ اس کے ادھ گندھے' ادھ کھلے بالوں میں کبھی نہ تھمنے کے لیے جھوم رہا ہے۔

''تو کیا اس کے جوتے کا بکل کھلا ہے۔ تو پھر اسے فوراً بیٹھ کر اسے بند کردینا چاہیے۔''

وہ ذرا سا آگے ہوا۔

اور سب ہی آئینے ''بربط'' میں بدل گئے اور جھرمٹ در جھرمٹ ہی وہ اس کی تاروں سے کھنکنے لگے۔ اور مدھم سروں کی تعلیم دینے لگے۔

''عالیان....'' امرحہ گیت مالا بنی ہنس دی۔

''چلو اب تو وہ گیت گا دو جو گلابی گالوں والیاں سبزہ زاروں میں بھاگتی لہک لہک کر.... ''انتہائے عشق'' میں گاتی ہیں۔

اور ساری چمکیلی مسکراہٹوں کی نگاہیں ہاتھ میں لیے عالیان ستارہ ستارہ ہوتی اپنی آنکھوں کو اس کی آنکھوں کی کمندوں سے مطیع ہوتے ایسے سامنے آیا جیسے ساری دنیا چھپ گئی ہے اور شرارتاً'' انہیں ساکت کرگئی ہے۔

اور چلو اب وہ گیت بھی سنا دو جو شب کو سحر کرتا ابتدائے جمال یار ہے۔

امرحہ خوشی سے چلاتی اس سے پہلے اس نے اپنی سوچ کو نذرانہ عقیدت پیش کیا۔

''میرے عکس کو تم ہی منعکس کرتے ہو.... مکمل.... تم میرا آئینہ ہو۔''

عالیان آگے بڑھا اور اس کے ساتھ کھڑا ہوگیا اور اس کے عکس پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

''میں تم سے مکمل ہوں امرحہ۔''

''اور اب اس گیت کی ابتدا بھی کردو جو ''جہان جاوداں'' کی اور لیے جاتا ہے۔'' اس کی بھوری آنکھیں سیاہ ہونے لگی اور امرحہ نے اپنی آنکھوں کو بھی سیاہ نہ پایا۔

ہال میں چھائی خاموشی مسرت انگیز لفظوں سے کلام میں بدلی' اور وہ سب بڑے دل سے مسکرائیں جیسے وہ بھی چاہتی تھیں کہ وہ اسی آئینے کو پالے جس کے پیچھے عالیان تھا۔

پھر وہ باہر باغ میں آگئے' جہاں باغ میں پھیلا کر انسانی قد سے ذرا سی اونچی آسمانی لالٹینیں رکھی تھیں۔ وہ سب سرخ تھیں اور مختلف زبانوں میں ان پر عالیان' امرحہ لکھا تھا۔

''اوہ!'' امرحہ بے یقینی سے چلا اٹھی۔ دائم اور نوال کی شادی میں جس طرح ان کے دوستوں نے ان کے لیے آسمان کو روشن کیا تھا امرحہ کے لیے مسحور کن تھا۔ وہ اتنی دیر تک سر کو اٹھائے دیکھتی رہی تھی کہ عالیان اور ویرا اس کے انہماک پر حیران تھے۔

''کیا تمہیں بھی ان کے سنگ اڑنا ہے۔'' عالیان نے مذاقاً'' کہا تھا۔

''اگر ایسا ہوجائے تو کیا حرج ہے۔'' وہ سنجیدہ تھی۔

اور ویرا اسے مبہوت کرنے کے لیے تیار تھی اور اس کے قد سے اونچی لالٹین بنوائی تھیں۔ وہ سب دو' دو کرکے ایک ایک لالٹین کے قریب کھڑی ہوگئیں۔

خوشی سے امرحہ کی آنکھیں جگمگ کرنے لگیں اور کتنے ہی آنسو اس کی آنکھیں بھگو گئے اور اس نے ویرا کو شانوں سے تھام لیا۔

''یہ تحفہ ہم سب کی طرف سے ہے امرحہ۔'' ویرا نے این' سادھنا' شارلٹ' مورگن کی طرف ہاتھ سے اشارہ کرکے کہا۔

امرحہ نے مسکرا کر ان سب کو دیکھا' شدت جذبات سے وہ ایک لفظ نہیں بول سکی۔

عالیان نے جھک کر لالٹین کو روشن کیا اور ان دونوں نے مل کر اسے بلند کردیا اور پھر اپنی گرفت سے انہیں آزاد کردیا۔

نام اس کا.... نام میرا....

ساتھ اس کا.... ساتھ ہمارا....

سرخ خیموں نے ان کے ناموں کو اپنی دسترس میں رکھتے طشت سیاہ کو جلوہ افروزی سے روشن کرنا شروع کردیا۔

حقیقت جمال کی عکاس ہے۔

سماں بے مثال ہے۔

امرحہ اپنے آپ پر معصومانہ سامان کرنے لگی۔

"مجھے اس حقیقت پر گمان ہے عالیان! وہ ذرا سا اس سے آگے بڑھ گئی تھی کہ گردن موڑ کر اس سے کہا۔"

اس کی گردن کا مرغولہ بانہ خم اور اس کے کانوں کے دمکتے بندوں کے ہلکوروں نے اسے سارے الفاظ بھلا دیے اور صرف اسے دیکھنا یاد رہ گیا۔

"میں نے آسمانوں کی مسند سے اسے اترتے دیکھا
اور درخشاں پانیوں میں جھلملاتے
انوار نور کی دسترس میں
محبوب کی آواز سے آواز ملاتے
لوح یار پر قلم بند ہوتے....."

اس کے ایسے دیکھنے پر امرحہ نے چاہا کہ وہ کئی سو پھول بن جائے اور اس پر نچھاور ہو جائے، اس کی پوروں سے عطر پھوٹ نکلے اور وہ اس کی فضاؤں کو عطر آگیں کرتی جائے۔

سرخ لالٹین بلند ہوتی چار اطراف پھیل رہی تھیں۔

رات اسی سجاوٹ سے سجنے کے لیے پوری طرح سے تیار تھی۔

"تم سے محبت مجھ پر فرض ہے۔" وہ اس کے پاس چلا آیا۔

لالٹینوں کے سنگ اڑتیں امرحہ کی نظریں جہان روشن کو پلٹیں اور اسے ذرا دیر نہ لگی یہ کہنے میں۔

"اس فرض کو میں کبھی قضا نہیں ہونے دوں گی۔"

اور روشنیوں نے اپنے سارے ماخذ ڈھونڈ نکالے۔

"ایک امرحہ اور ایک عالیان سے۔"

اور وہ انہیں مرکز بناتیں، کائناتی پنکھڑیاں بن کر کھل کر "گل نور" ہوئیں۔

✡ ✡ ✡

درسگاہیں عبادت گاہوں کا درجہ رکھتی ہیں اور علم "ایمان" کا۔ دنیا میں کوئی ایسا میزان نہیں، جس میں علم کو رکھ کر تولا جا سکے کہ کوئی وزن اس کے ہم پلہ ہو ہی نہیں سکتا۔ قومیں علم کے دم قدم سے زندہ رہتی ہیں اور پائندگی پاتی ہیں۔ اس لیے خوش قسمتی میں دو لوگ امتیازی ہیں ایک وہ جو شاگرد ہے ایک وہ جو استاد ہے۔

بہار کا روشن دن آچکا ہے۔

دادا آچکے ہیں اور ویرا، این کے والدین بھی۔ شنل کاک میں میلہ سج گیا ہے۔ دیس دیس کی کہانیاں دو ہی راتوں میں نشست گاہ میں سنادی گئی ہیں۔ اور اب وہ سب سادھنا سمیت مانچسٹر یونی میں تقریب تقسیم اسناد میں موجود ہیں۔

ایک ایسا دن جب اعزاز یافتہ ہونے کا احساس ہوتا ہے اور خاص ہونا اچھا لگتا ہے۔ جب دل چاہتا ہے اور آگے بڑھا جائے اور ساری دنیا فتح کر لی جائے، جب بلندیاں چھوٹی لگتی ہیں اور حوصلے جوان۔ یونی کا سفر ختم ہونے جا رہا ہے۔ زندگی نئے اعزازات لیے آگے بھی تیار کھڑی ہے، سخت مقابلے اور نہ ختم ہونے والی دوڑ کے ساتھ۔

تو اس کھلے کھلے دن، گولڈ میڈل گلے میں پہنے ویرا اور کارل نے، ڈگریاں ہاتھ میں لیے عالیان امرحہ، این، شاہ ویز اور سائی نے، اپنے سب ہی کلاس فیلوز اور یونی فیلوز کے ساتھ کھلے آسمان تلے، سروں پر تاج کی طرح سجی سیاہ ٹوپیوں کو ہاتھ بلند کر کے پورے جوش سے ہوا میں اچھال دیا۔

"علم وہ روشنی ہے جس پر کوئی اندھیرا غالب نہیں۔"

وہ خود ہی فضا میں اچھلے۔

"علم سے قیمتی کچھ نہیں۔"

"ہم چیمپئن ہیں۔" وہ ایک ساتھ چلائے۔

اور علم کسی کی میراث نہیں۔

ٹوپیاں ایک بار پھر اچھالی گئیں۔ سیاہ گاؤن دلکشی سے پھڑپھڑاتے۔

میں نے علم کی طرف لاعلمی سے سوال اٹھایا۔ علم نے "لا" مٹا کر "علم" ہو کر جواب دیا۔

اب وہ یونی میں بھاگ رہے ہیں اور چلا چلا کر اچھل رہے ہیں۔

میں نے علم کو سوچ سے شروع کیا۔ سوال سے کھوج نکالا اور جواب پر اگلے سوال کی طرف لپکا۔

یونیورسٹی کی حدود میں ان کے پرجوش نعرے گونجتے رہے اور ٹوپیاں گاہے بگاہے اچھلی جاتی ہیں۔

"اور علم کی فرضیت پر کوئی شک نہیں۔"

✡ ✡ ✡

مہک ہے کہ کہیں ماند نہیں اور سجاوٹ ہے کہ کہیں کم نہیں۔ زمین کی وسعت پر سبزہ ہے اور اس کے کناروں پر گلستان، آب رواں پر لمبی نوکوں والی کشتیاں پھولوں سے لدیں رواں ہونے کے لیے تیار ہیں۔ انہیں اپنے مہمانوں کا انتظار ہے۔

مسکراہٹوں کی اجارہ داری ہے اور جشن کا سماں۔

وہ سب اس رستے کے کنارے کھڑے ہیں، جہاں سے سرخ کار کو آنا ہے۔ اور دور سے وہ آتی نظر آنے لگی ہے جس کی پچھلی سیٹ پر ماما مہر کا شہزادہ بیٹھا نظر آرہا ہے اور اس کے ساتھ بیٹھی دادا کی پری امرحہ اور آگے دولہا سا ہی خوب صورت لگتا شہہ بالا کارل اور اس کے ساتھ بیٹھی دلہن سی چکا چوند شہہ بالی ویرا۔

ان کے آتے ہی فضا میں شور اٹھا ہے اور وہ جوش سے چلانے کے لیے تیار ہونے لگے ہیں۔ عالیان کار سے اتر کر امرحہ کا ہاتھ پکڑنے کے لیے تیار ہے اور امرحہ اسے اپنا ہاتھ پکڑانے کے لیے تیار ہے۔ اور یہ شہنائیاں بجنے کی ابتدا ہے۔

سورج کی کرنیں درختوں کے جھنڈوں سے مصافحہ کرتیں، شاخوں پر ذرا ذرا رکتیں، دھند کے ذروں سے اپنائیت برتیں، ان کے انتظار میں درآویزی کی چاپ لیے اتر رہی ہیں، مور پنکھ ہوائیں اپنے سنگ خوب صورت پروں والے پرندوں کی آوازیں دیس دیس سے اپنے پنکھوں پر بٹھائے لا رہی ہیں۔

عالیان نے اس کا ہاتھ پکڑ رکھا ہے اور وہ اسے لیے گزار کر دوسری طرف لے جارہا ہے۔ وہ سمجھی وہ اسے وہ جگہ دکھانے لایا ہے جہاں ان کی شادی کی تقریب ہونی متوقع ہے، لیکن دھند کے بادلوں میں اترتے ہی اسے اپنا خیال بدلنا پڑا۔ اور خیال سا آیا کہ اس نے لہراتے بالوں کی فرمائش کی تھی اور اسے اس کے لباس کے خاص ہونے کی اتنی فکر رہی تھی۔

"تم کس یاد کو تازہ کرنے آئے ہو یہاں عالیان۔"

"یاد نہیں خواب، بہت سارے خواب۔ ماما کا کافی خرچ ہوا میرے ان خوابوں کو پورا کرنے کے لیے۔" عالیان نے اسے شانے سے پکڑ کر ذرا سا گھما کر کہا کہ وہ دیکھ لے وہ اسے کہاں لایا ہے۔

امرحہ کو اگلا سوال کرنے کی ضرورت نہیں تھی وہ اسے اپنے ہر خواب کے بارے میں بتا چکا تھا اور اسے ان خوابوں کی عملی صورت شمولیت پر اعتراض نہیں تھا۔

"تم نے کہا تھا میں جب بوڑھا ہو جاؤں گا تو مجھے پچھتانا پڑے گا، گھوڑے پر بیٹھنے میں مجھے تمہاری مدد کرنی چاہیے تھی۔ آؤ اب مل کر ان گھوڑوں سے پوچھیں آج ان پر لگام اور زین کہاں سے آگئی۔" وہ اسے لے کر آگے بڑھا۔

"تم نے یہ سب صرف اس ایک بات کے لیے کیا؟"

امرحہ دیر تک مسکراتی رہی۔

"ہاں۔ میں پچھتانا نہیں چاہتا امرحہ۔ اور تمہاری باتیں میرے لیے صرف باتیں نہیں ہیں، میں خود کو ان کا مطیع پاتا ہوں۔" وہ اسے ایک گھوڑے کے پاس لے آیا اور گھوڑے پر بیٹھنے میں اس کی مدد کی۔ اور پھر گھوڑے کی لگام پکڑ لی۔

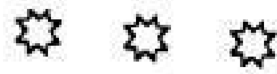
مسرتیں امرحہ کے ذہن سے خوشنما کلیاں بن کر جھڑیں اور دھند کے مرغولوں نے ان دونوں کی موجودگی کو ترنم سے کچھ یوں گویا کیا۔

"عشق جو اسرار اعظم ہے۔"

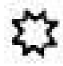
"یہ دونوں اس کے رازدار ہیں۔"

اور ان آخری الفاظ پر بنت حمید اپنے قلم کو روک دیتی ہے کہ مکمل کی میں نے داستان افکار۔

داستان یار۔ "یارم"



"سب تعریفیں صرف اور صرف خدائے برتر کے لیے جو لفظ اتارتا ہے انہیں ترتیب دلواتا ہے اور جو ہر تخلیق پر قادر ہے۔"



نبیلہ عزیز

رقصِ بسمل ہے

ماورا مرتضیٰ، عافیہ بیگم کی اکلوتی بیٹی ہے۔ فارہ کے ساتھ یونیورسٹی میں پڑھتی ہے۔ عافیہ بیگم اس کا اپنی سہیلیوں سے زیادہ ملنا جلنا پسند نہیں کرتیں۔ اس کے علاوہ بھی اس پر بہت ساری پابندیاں لگاتی ہیں جبکہ ماورا خود اعتماد اور اچھی لڑکی ہے۔ عافیہ بیگم اکثر اس سے ناراض رہتی ہیں۔ البتہ بی گل اس کی حمایتی ہیں۔

فارہ اپنی ثمینہ خالہ کے بیٹے آفاق یزدانی سے منسوب ہے۔ دو سال پہلے یہ نسبت آفاق کی پسند سے ٹھہرائی گئی تھی مگر اب وہ فارہ سے قطعی لاتعلق ہے۔

منزہ، ثمینہ اور نیرہ کے بھائی رضا حیدر کے دو بچے ہیں۔ تیمور حیدر اور عزت حیدر۔ تیمور حیدر بزنس مین ہے اور بے حد شاندار پرسنالٹی کا مالک ہے۔ ولید رحمٰن اس کا بیسٹ فرینڈ ہے۔ اس سے حیثیت میں کم ہے مگر دونوں کے درمیان اسٹیٹس حائل نہیں ہے۔ نیرہ کے بیٹے سے فارہ کی بہن حمنہ بیاہی ہوئی ہے۔

عزت اپنی آنکھوں سے یونیورسٹی میں بم دھماکا ہوتے دیکھ کر اپنے حواس کھو دیتی ہے۔ ولید اسے دیکھ کر اس کی جانب لپکتا ہے اور اسے سنبھال کر تیمور کو فون کرتا ہے۔ تیمور اسے اسپتال لے جاتا ہے۔ عزت کے ساتھ یہ حادثاتی ملاقات ولید اور عزت کو ایک خوشگوار حصار میں باندھ دیتی ہے۔ تاہم عزت کھل کر اس کا اظہار کر دیتی ہے۔ ولید ٹال مٹول سے کام لے رہا تھا۔

آفاق فون کر کے فارہ سے شادی کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔ فارہ روتی ہے۔ اشتیاق یزدانی، آفاق سے حد درجے خفا ہو کر اس سے بات چیت بند کر دیتے ہیں۔ آفاق مجبور ہو کر شادی پر راضی ہو جاتا ہے۔ فارہ دل سے خوش نہیں ہو پاتی۔ رضا حیدر، تیمور کو فارہ کی شادی کے سلسلے میں فیصل آباد بھیجتے ہیں۔ فارہ اپنی تاریخ میں ماورا کو بصد اصرار مدعو کرتی ہے۔

انیسویں قسط





ولید اپنے بستر پہ لیٹا اپنے کمرے کی چھت کے کسی نادیدہ نقطے کو گھورتے ہوئے بے حد گہری سوچ میں گم نظر آرہا تھا' وہ آج ہی اسپتال سے ڈسچارج ہو کر گھر آیا تھا اور لاشعوری طور پہ مسلسل کسی انتظار میں لگ رہا تھا۔

''امی...!'' اس نے بڑے ٹھہرے ہوئے اور پُرسوچ لہجے میں پکارا تھا اور کمرے سے باہر نکلتی زبیدہ خاتون کے قدم رک گئے تھے۔

''ہاں کہو...؟'' انہوں نے فوراً'' پلٹ کر ولید کی طرف دیکھا۔

''اسپتال کون کون آیا تھا مجھ سے ملنے...؟'' ولید جیسے کچھ سننا چاہتا تھا۔

''بہت سے لوگ تھے... میں تو کسی کو جانتی بھی نہیں... اب تمہیں کس کا بتاؤں؟'' وہ لاعلمی سے بولیں۔

''جن کو جانتی ہیں' ان میں سے کوئی بھی نہیں آیا؟'' ولید کرید رہا تھا۔

''تیمور کے سوا اور کسی کو جانتی ہوں بھلا...؟'' انہوں نے لاپروائی سے کہا۔

''تیمور کی فیملی کو بھی جانتی ہیں آپ... اس کی مدر' اس کے فادر' اس کی سسٹر... سب کو جانتی ہیں' کیا وہ نہیں آئے...؟'' اس نے اپنے سوال کو خاصا گول مول سا کر دیا تھا۔

''نہیں... ان میں سے تو کوئی بھی نہیں آیا... تیمور اکیلا ہی تھا۔'' انہوں نے نفی میں سر ہلایا تھا۔

''اچھا...!'' وہ بے حد آہستگی سے کہہ کر چپ ہو گیا تھا۔

اس کی آس ٹوٹ گئی تھی اور وہ پھر سے کسی سوچ میں ڈوب گیا تھا۔

''یعنی کہ وہ بھی نہیں آئی...؟'' اس نے دل ہی دل میں خود کلامی سی کی تھی۔

''مگر کیوں...؟ اسے پتا بھی تھا پھر بھی...؟ پھر بھی نہیں آئی...؟ ایسی کیا بات ہے بھلا...؟ اس نے پلٹ کر خبر ہی نہیں لی...؟ وہ... وہ ٹھیک تو ہے نا...؟''

ولید کو سوچتے سوچتے اس کی فکر لگ گئی تھی اور تب ہی باہر دروازے پہ دستک ہوئی تھی' وہ بے اختیار چونک گیا تھا۔

''کون ہے...؟'' باہر سے زبیدہ خاتون کی آواز سنائی دی تھی۔

اور جواب میں باہر سے کس کی آواز آئی تھی' یہ ولید کو سنائی نہیں دیا تھا۔

پھر چند منٹ بعد قدموں کی چاپ ابھری اور زبیدہ خاتون کے ساتھ کوئی اندر داخل ہوا۔

''ولید...! دیکھو بیٹا... کون آیا ہے...؟''

زبیدہ خاتون نے اندر داخل ہوتے ہی اسے متوجہ کیا تھا اور ولید ان کے ساتھ ماورا مرتضیٰ کو دیکھ کر ایک خوش گوار حیرت میں مبتلا ہو گیا تھا۔

''ارے... آپ...؟'' ولید نے بے اختیار ذرا سا اٹھنے کی کوشش کی۔

''ارے... رہے... لیٹے رہیں... اتنی بہادری کا مظاہرہ مت کریں... پلیز ریلیکس...!'' ماورا نے فوراً'' بڑی تیزی سے کہتے ہوئے اسے اٹھنے سے روکا تھا۔

''امی پلیز...!'' ولید نے ذرا سہارے کے لیے ماں کی طرف دیکھا تھا اور زبیدہ بیگم نے سر ہلاتے ہوئے آگے بڑھ کے اسے سہارا دیا اور تکیوں کے سہارے اسے نیم دراز سا کر دیا تھا۔

''بیٹھیے نا... آپ کھڑی کیوں ہیں؟'' ولید نے اپنے آپ کو پُرسکون کرتے ہوئے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا تھا۔

''تھینکس...!'' ماورا کہتے ہوئے آگے بڑھ کے اس کے بستر کے قریب رکھی کرسی پہ بیٹھ گئی تھی۔

''تھینکس کہنے کا حق تو میرا بنتا ہے کہ آپ میری عیادت کے لیے میرے گھر تک آگئی ہیں۔'' ولید حقیقتاً دل سے ممنون ہوا تھا اس کا۔

"یہ زبردستی کی عیادت ہے۔۔۔ یاد ہوگا آپ کو۔۔۔" ماورا نے اسے ہاسپٹل والی ملاقات یاد دلائی۔
"یاد ہے۔۔۔ دراصل آپ جیسے بڑے لوگوں سے سارے کام خود کہہ کر ہی کروانے پڑتے ہیں۔ چاہے وہ عیادت ہی کیوں نہ ہو۔" ولید نے بڑے عاجزانہ انداز سے کہتے ہوئے کندھے اچکائے تھے۔
"اب ایسی بات بھی نہیں ہے، جو کام ہم نے نہیں کرنا ہوتا' وہ ہم کسی کے کہنے پر بھی نہیں کرتے۔ جب بھی کرتے ہیں اپنی مرضی سے کرتے ہیں۔" ماورا بھی بھلا کب لگی لپٹی رکھ سکتی تھی۔
"چلیں جی۔۔۔! پھر تو آپ کا دوبارہ تھینکس کہ آپ میرے کہنے پہ نہیں' اپنی مرضی سے عیادت کے لیے آئی ہیں۔ میرے لیے یہ واقعی خوشی کی بات ہے۔"
ولید نے سچ مچ خوشی کا اظہار کیا تھا۔
"اچھا رہنے۔۔۔! آپ ان باتوں کو چھوڑیں۔۔۔ یہ بتائیں کہ طبیعت کیسی ہے اب۔۔۔؟" ماورا نے سر جھٹکتے ہوئے پوچھا۔
"طبیعت اللہ کے کرم سے فٹ فاٹ ہے۔ جیسے ہی زمین پہ پیر لگ گیا' سمجھ لیجیے گا کہ میں بھاگ گیا۔" ولید نے اپنی ٹانگوں کو ذرا سی حرکت دینے کی کوشش کرتے ہوئے کہا تھا۔
"اچھا۔۔۔! تو پھر زمین پہ پیر کب لگا رہے ہیں؟ مطلب کہ کب بھاگ رہے ہیں۔"
ماورا خاصی دلچسپی سے پوچھ رہی تھی اور ولید اس کی دلچسپی پہ بے ساختہ مسکرا دیا تھا۔
"بس۔۔۔! دو دن اور۔۔۔" وہ اپنے ہاتھوں پیروں کو حرکت دیتے ہوئے بولا۔
"اور دو دن بعد۔۔۔؟" اس کا سوال مختصر تھا۔
"بھاگ جاؤں گا۔" وہ بڑے اطمینان سے کہہ رہا تھا۔
"کہاں۔۔۔؟" اس کا سوال پھر برجستہ تھا۔
"جہاں دل لے چلا۔۔۔" وہ بھی بڑی ترنگ سے بولا۔
"تیمور حیدر کے گھر۔۔۔؟" ماورا نے اس کی اصل نبض پہ ہاتھ رکھا۔
ولید نے بے اختیار چونک کر اس کے چہرے کی سمت دیکھا وہ بہت نارمل سے انداز میں اسے ہی دیکھ رہی تھی۔
"تیمور حیدر کے گھر۔۔۔؟ مگر کیوں۔۔۔؟" اس نے وجہ جاننا چاہی۔
"کیونکہ تیمور حیدر کے گھر سے جب کوئی بھاگم بھاگ آپ کے پاس آسکتا ہے تو پھر ظاہر سی بات ہے کہ آپ بھی وہاں ہی جائیں گے۔" اس نے کندھے اچکائے اور ولید کی الجھن مزید بڑھا دی تھی۔
"تیمور حیدر کے گھر سے بھاگم بھاگ کون آسکتا ہے بھلا۔۔۔؟ سوائے تیمور حیدر کے۔۔۔؟"
ولید انجان بننے کی کوشش نہیں کر رہا تھا بلکہ واقعی انجان تھا۔
"مگر میں نے تو تیمور حیدر کے ساتھ کسی اور کو بھی دیکھا تھا۔" ماورا نہیں جانتی تھی کہ ولید سچ مچ انجان ہے۔
"کسی اور کون۔۔۔؟" وہ سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔
"جس کا آپ کو یقیناً اب بھی انتظار ہوگا۔" وہ قدرے لاپروائی سے بولی۔
"مگر آپ کیسے۔۔۔؟" ولید اپنی حیرانی چھپا نہیں سکا تھا۔
"مجھے بھلا کیسے پتا چل سکتا تھا؟ بس اس وقت اس کی حالت ہی ایسی تھی کہ وہ چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔ میری بھی آنکھیں ہیں۔ میں نے بھی اسے دیکھا تھا' مجھ سے بھی نہیں چھپ سکی وہ۔ کیا نام ہے اس کا۔۔۔؟" ماورا بات کرتے ہوئے آخر میں جیسے یاد کرتے ہوئے ذرا سا سوالیہ انداز میں بولی تھی۔
"عزت حیدر۔۔۔!" ولید کو اپنی ہی زبان سے اعتراف کرنا پڑ گیا تھا اور ماورا اس کے اعتراف پہ بڑے سکون سے

مسکرا دی۔

"ہاں۔۔۔! یہی نام تھا۔" اس کے لہجے اور مسکراہٹ سے دلچسپی اور شرارت جھلک رہی تھی۔

"اس کا مطلب ہے کہ وہ آئی تھی؟" ولید زیر لب بولا۔

"جی ہاں۔۔۔ آئی تھی۔۔۔ ساری رات اسپتال میں گزار کر گئی تھی۔ میں گواہ ہوں اس چیز کی۔۔۔" ماورا اس سچویشن اور ولید کی کیفیت سے خاصی لطف اندوز ہو رہی تھی۔

"ہوں۔۔۔!" وہ محض "ہوں" کر کے رہ گیا تھا۔

"کانٹیکٹ نہیں ہے اس سے۔۔۔؟"

"جب فائرنگ ہوئی، موبائل میرے ہاتھ میں تھا۔ بعد میں پتا نہیں کہاں گیا۔ میں نے اپنے دوست سے کہا ہے، وہ میری سم ایشو کروا دے گا آج۔۔۔ اس میں میرے کافی کانٹیکٹس ہیں۔"

"بیٹا! چائے پیو۔" زبیدہ خاتون چائے کے ساتھ چند دیگر لوازمات بھی لے آئی تھیں اور ٹرے چھوٹی سی ٹیبل پہ لا کر رکھ دی تھی۔

"ارے آنٹی۔۔۔! یہ کیا تکلف کیا آپ نے۔۔۔؟ میں ابھی گھر سے لنچ کر کے ہی آئی ہوں۔" ماورا کو ان کے اتنے تکلف پہ شرمندگی ہوئی تھی۔

"ارے نہیں بیٹا۔۔۔ اس میں تکلف کی کیا بات ہے بھلا؟ مجھے تو خوشی ہوتی ہے، جب میرے بچوں کے مہمان ہمارے گھر آتے ہیں، کیونکہ ان کے علاوہ تو کوئی آتا بھی نہیں ہے نا۔۔۔؟" زبیدہ خاتون کی بات پہ ماورا نے بے ساختہ ان کی طرف دیکھا تھا اور پھر ولید کی طرف۔

"جی ہاں۔۔۔! ہماری فیملی میں صرف ہم ہی ہیں، کوئی اور رشتہ دار نہیں ہے۔ اس لیے لوگوں کا زیادہ آنا جانا بھی نہیں ہے۔" ولید نے ان کی بات کی وضاحت دی تھی۔

اور ماورا سر ہلا کر رہ گئی۔

"لیکن آج تو آپ کو کسی اور کے آنے کا انتظار تھا نا؟" ماورا نے چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے شرارت سے اسے چھیڑا اور جواباً ولید بھی مسکرا دیا تھا۔

"وہ تو ہے۔۔۔ لیکن آپ کا آنا بھی کچھ کم نہیں ہے۔ آج کے دن کے لیے یہی کافی ہے۔ میں خوش ہوں۔" ولید نے بے ساختہ سے اپنی خوشی کا اظہار کیا تھا، ماورا ہنس پڑی تھی۔

☆ ☆ ☆

"کیا بات ہے حیدر۔۔۔؟ تم نے مجھے کوئی جواب ہی نہیں دیا؟ اور ادھر میں ہوں کہ مسلسل انتظار میں ہوں۔" قیام مرزا دعا سلام کے بعد اصل بات کی طرف آ گئے تھے، کیونکہ مونس مرزا خفگی اور جھنجھلاہٹ کا اظہار کرنے پہ اتر آیا تھا۔

"جواب تو میں ضرور دیتا۔۔۔ دراصل ابھی میری تیمور سے بات نہیں ہوئی اور ایسے معاملوں میں تمہیں پتا ہے، کہ گھر میں کچھ ڈسکشن تو ضروری ہے نا، جبکہ تیمور اس ہفتے بہت بزی رہا ہے۔ اس کا دوست زخمی ہو گیا تھا اسی لیے میں نے اس ٹاپک پہ بات ہی نہیں کی۔" رضا حیدر نے بڑے اطمینان سے جواب دیا تھا۔

"اچھا۔۔۔؟ ایسا کون سا دوست ہے اس کا، جس کے لیے وہ اتنا بزی ہو گیا کہ تم بات ہی نہیں کر سکے؟" قیام مرزا کے انداز میں عجیب چبھن سی تھی۔

"ولید رحمان۔۔۔ بچپن کا دوست ہے اس کا۔۔۔ ایک نیوز چینل پہ پروگرام بھی کرتا ہے، اخبار میں بھی کام کر چکا

ہے۔ اسی وجہ سے اس پہ فائرنگ بھی ہوئی ہے۔"

رضا حیدر ان کے لہجے کی چبھن محسوس نہیں کر پائے تھے اس لیے بڑا نارمل سا جواب دیا تھا۔

"اچھا... صرف تیمور کا دوست ہے یا عزت کا بھی...؟" قیام مرزا کے لہجے میں ذرا اور کھنچاؤ آیا تو رضا حیدر بری طرح چونک گئے تھے۔

"عزت کا...؟ کیا مطلب...؟ تم کہنا کیا چاہتے ہو...؟ صاف بات کہو۔" رضا حیدر کے لہجے میں بھی نرمی کے بجائے سنجیدگی آگئی تھی۔

"مطلب کہ جب وہ ولید رحمان زخمی ہوا ہے تو تیمور سے زیادہ پریشان حال عزت ہی تھی اور رات بھر اسپتال میں موجود رہی ہے۔ آخر کچھ تو ریلیشن ہے ان کا...؟"

"قیام مرزا...! یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟ تم جانتے ہو' تم میری بیٹی کے بارے میں بات کر رہے ہو؟" رضا حیدر کچھ سخت بولتے بولتے رک گئے تھے۔

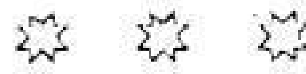
"دیکھو حیدر... میں جانتا ہوں اور بہت اچھی طرح جانتا ہوں' مگر افسوس اس بات کا ہے کہ تم نہیں جانتے اور آج تم سے بات بھی اسی لیے کی ہے کہ تم بھی جان جاؤ' تمہارے بیٹے کا دوست بڑی اونچی اڑان بھر رہا ہے اور اس اڑان میں تمہاری اولاد اس کا پورا پورا ساتھ دے رہی ہے۔ اگر میں اس معاملے میں غلط ہوا تو مجھے بیچ چوراہے میں بے عزت کرنے کا پورا حق رکھتے ہو' میں اف بھی نہیں کروں گا۔" قیام مرزا نے بات اتنے وثوق سے کی تھی کہ رضا حیدر کے پاس سوائے خاموشی کے اور کچھ رہا ہی نہیں تھا۔

"اور دیکھ لینا... تیمور اس پروپوزل سے انکار کردے گا۔ یہ میرا یقین ہے۔ باقی تمہاری مرضی..." قیام مرزا نے پیشن گوئی کی تھی۔

"ایسا کبھی نہیں ہو گا قیام مرزا...! ایسا کبھی نہیں ہو گا۔ عزت کی شادی مونس مرزا سے ہی ہو گی۔ چاہے دنیا اِدھر کی اُدھر ہو جائے۔" رضا حیدر نے انتہائی پتھریلے لہجے میں کہہ کر فون بند کر دیا تھا۔

"ولید! نہیں...!" وہ زیرِ لب بڑبڑائے تھے اور پھر یک دم دل میں نجانے کیا ابال آیا تھا کہ انہوں نے ہاتھ میں پکڑا موبائل یک دم دیوار پہ دے مارا تھا۔

"کبھی نہیں...!" وہ غصے سے دھاڑ اٹھے تھے اور یہی ان کا اصل روپ تھا' اصل شخصیت تھی۔ ورنہ باقی سب تو...!



"السلام علیکم سر...!" ماورا نے ٹیبل کے قریب آتے ہوئے سلام کیا۔

"وعلیکم السلام... پلیز... تشریف رکھیے۔" تیمور نے اپنے کام سے دھیان ہٹاتے ہوئے اسے بیٹھنے کا کہا تھا۔

"جی... کیسے بلایا...؟" ماورا نے مطلب کی بات کی۔

"یہ ایک پراجیکٹ چیک کریں اور اپنی رائے سے آگاہ کریں۔" تیمور نے ایک فائل اپنے سامنے سے اٹھا کر ماورا کے سامنے رکھ دی تھی۔

"اس پراجیکٹ میں کیا چیز اسپیشل ہے جو آپ مجھے چیک کروا رہے ہیں؟" ماورا نے فائل کھولتے ہوئے اس سے استفسار کیا تھا اور فائل پہ بھی نظر دوڑائی تھی۔

"آپ کا نام... اور آپ کے کام کی ڈیمانڈ... آپ کے ڈیزائن ہاتھوں ہاتھ بک رہے ہیں اور اس چیز کی خوشی جتنی مجھے ہو رہی ہے... اتنی شاید آپ کو بھی نہ ہو۔ کیونکہ اس کی بنیاد میں نے خود رکھی ہے' اس کو دریافت میں

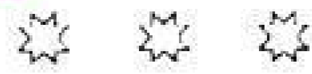
نے کیا ہے۔۔۔ وہ بھی فیصل آباد سے اور اتنی مشکل سے۔۔۔"
تیمور نے بڑے پُرجوش اور خوشی بھرے لہجے میں کہتے ہوئے شرارت سے اس کی طرف دیکھا۔ ماورا نے نظریں اٹھا کر اس کے چہرے کی سمت دیکھا تھا' دونوں کی نظروں کا تصادم ہوا تھا۔ ماورا اس کی نظروں کی شوخی سے نظر چرا گئی تھی۔
"یعنی اس کا کریڈٹ آپ کو جاتا ہے؟" ماورا بڑے ٹھہرے ہوئے سے لہجے میں بولی تھی۔
"ہاہاہا۔۔۔!" تیمور بے ساختہ قہقہہ لگا کر ہنسا تھا اور اتنے جان دار انداز سے ہنسا تھا کہ ماورا اب کی بار نظر نہیں چرا سکی تھی اور نہ ہی اپنے دل و نظر پہ کوئی اختیار رکھ سکی تھی۔
"ارے۔۔۔ نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ میں نے یہ کب کہا ہے۔۔۔ میں نے تو خوشی کی بات کی ہے۔"
تیمور نے اس چیز کا کریڈٹ لینے سے صاف انکار کر دیا تھا بلکہ دونوں ہاتھ کھڑے کر دیے تھے۔
"لیکن ہے تو یہ سچ۔۔۔! اس کا کریڈٹ آپ کو ہی جاتا ہے اگر آپ مجھے جاب آفر نہ کرتے تو یقیناً" میں اس وقت اپنے ٹیلنٹ سے ہٹ کے کوئی اور جاب کر رہی ہوتی۔"
ماورا نے اس کا کریڈٹ کھلے دل سے اسے دیا تھا۔
"جاب آفر کر دینے سے کیا ہوتا ہے؟ جو بھی ہوتا ہے انسان کی اپنی محنت اور لگن سے ہوتا ہے۔" تیمور نے کندھے اچکائے۔
"ہاں۔۔۔ یہ بھی ٹھیک کہا آپ نے۔۔۔ جو بھی ہوتا ہے' انسان کی اپنی محنت اور لگن سے ہوتا ہے اور یہ ایک اٹل حقیقت ہے کہ ہوتا ضرور ہے۔" ماورا نے اعتراف میں سر ہلایا تھا۔
"اچھا۔۔۔ مگر میں تو ابھی تک اس "ہونے" کے انتظار میں ہوں کہ جانے کب ہوگا؟" وہ اپنی روانی میں کہہ ہی گیا تھا۔
"بہت جلد ہوگا۔" ماورا کا جواب مختصر اور مبہم سا تھا۔
"کیا۔۔۔؟" وہ بے ساختہ بولا۔
"آپ جس کے انتظار میں ہیں۔" تیمور کے دل میں خوش گمانیوں نے یک دم سر ابھارا تھا۔
"میں سمجھا نہیں۔۔۔ مطلب۔۔۔؟" اس نے اپنے آپ کو کنٹرول کرنے کی کوشش کی تھی۔
"مطلب کہ میں آپ سے۔۔۔" اس سے پہلے کہ ماورا زبان پہ آیا جملہ مکمل کرتی' اچانک تیمور کے موبائل پہ رنگ ٹیون بج اٹھی تھی۔
"اف بابا۔۔۔!" تیمور دل ہی دل میں کراہا تھا۔
"ایکسکیوز می۔۔۔!" اس نے معذرت کرتے ہوئے کال ریسیو کی تھی۔ دوسری طرف رضا حیدر تھے۔
"ہیلو۔۔۔!" تیمور کا دھیان ماورا کے ادھورے جملے کی طرف تھا۔
"گھر کب آ رہے ہو۔۔۔؟" ان کا لہجہ سرد سپاٹ سا محسوس ہو رہا تھا۔
"کیوں۔۔۔؟ خیریت۔۔۔؟" تیمور چونکا۔
"جو پوچھا ہے۔۔۔ وہ بتاؤ۔۔۔" ان کے انداز میں ذرا بھی نرمی نہیں تھی۔ لہجہ بے لچک اور کرخت سا لگ رہا تھا۔
"جس وقت روز آتا ہوں' اسی وقت آؤں گا۔" اس نے بڑے نارمل سے انداز میں جواب دیا تھا۔
"ابھی آؤ۔۔۔" انہوں نے حکم صادر کیا۔
"ابھی۔۔۔؟" اسے حیرت ہوئی۔
"ہاں۔۔۔ ابھی۔۔۔ گھر پہنچو۔۔۔" انہوں نے کہہ کر فون بند کر دیا تھا۔

"مگر بابا۔۔۔!" تیمور کچھ پوچھنے کی کوشش کرتا رہ گیا تھا اور دوسری طرف سے فون بند بھی ہو گیا تھا۔
"مجھے اجازت ہے 'میں جاؤں اب۔۔۔؟" ماورا کہتے ہوئے کھڑی ہو گئی تھی۔
"لیکن وہ۔۔۔؟" تیمور کہتے کہتے رک گیا تھا۔
"آپ ابھی پریشان ہیں۔۔۔ اپنی پریشانی سولو کریں۔ باقی بات بعد میں ہو جائے گی۔ ابھی میری ٹیبل پہ بھی کافی کام پڑا ہے۔ چلتی ہوں۔" ماورا کہہ کر پلٹ گئی تھی اور تیمور پریشانی سے سر پکڑ کے بیٹھ گیا تھا۔
پھر ایک دم گہری سانس خارج کرتے ہوئے اٹھا اور موبائل لے کر آفس سے نکل گیا تھا۔



تیمور بڑی پریشانی کے عالم میں گھر پہنچا تھا اور سیدھا رضا حیدر کے پاس آیا تھا۔ وہ اسٹڈی روم میں تھے اور انگلیوں میں سگریٹ دبائے چیئر پہ بیٹھے اسی کے انتظار میں تھے۔ تیمور دروازے پہ دستک دے کر اندر آگیا تھا۔
"جی۔۔۔ کہیے۔۔۔ خیریت تو ہے نا؟" تیمور نے ادھر ادھر کے بجائے سیدھا سوال پوچھا تھا۔
"ولید رحمان کون ہے۔۔۔؟" انہوں نے سگریٹ کا کش لے کر دھواں فضا میں چھوڑتے ہوئے استفسار کیا۔
تیمور کو ان کے بدلے بدلے انداز سے الجھن ہوئی تھی۔
"یہ بات تو آپ بھی جانتے ہیں کہ ولید رحمان کون ہے۔۔۔؟" تیمور نے لاپروا سے انداز سے کہا تھا۔
"میں تم سے جاننا چاہتا ہوں کہ ولید رحمان کون ہے۔۔۔؟" انہوں نے اپنی بات پہ زور دیا تھا۔
"ظاہر ہے۔۔۔ میرا دوست ہے۔۔۔ اور کون ہے۔" اس نے کندھے اچکائے۔
"تمہارا دوست ہے تو پھر عزت کا کیا ہے۔۔۔؟" رضا حیدر کے حد درجہ بے تکے سوال پہ تیمور بری طرح ٹھٹکا تھا۔۔۔ یعنی یہ بھانڈا پھوٹ چکا تھا۔۔۔؟
"کیا مطلب ہے آپ کا۔۔۔؟" تیمور کو ان کا یہ سوال کچھ مناسب نہیں لگا تھا۔
"مطلب ہی تو پوچھ رہا ہوں کہ اگر تمہارا دوست ہے تو پھر عزت کا کیا ہے۔۔۔؟" انہوں نے پھر دہرا کے پوچھا تھا۔
"بابا۔۔۔ یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ۔۔۔؟ کیا ہوا ہے؟ کچھ بتائیے تو۔۔۔" تیمور نے پھر بھی نرمی اور تحمل سے کام لیا تھا۔
"پوری رات ہاسپٹل میں رہی ہے اس کے پاس۔۔۔ آخر کیوں؟" رضا حیدر نے سختی سے پوچھا۔
"پلیز۔۔۔ غلط فہمی میں مت پڑیں۔۔۔ وہ اس کے پاس نہیں رہی۔۔۔ وہ میرے ساتھ تھی۔ میرے ساتھ گئی تھی۔۔۔" تیمور کو بہن کے لیے بولنا پڑا۔
"تمہارے ساتھ کیوں گئی تھی۔۔۔؟ کیا تک بنتی تھی اس کے جانے کی؟ وہ بھی ایسی ہنگامہ خیز سچویشن میں۔۔۔؟ کوئی تو وجہ ہو گی نا۔۔۔؟" وہ اپنی بات 'اپنی ضد' پہ اٹکے ہوئے تھے۔
"ہاں۔۔۔ وجہ تو تھی۔" تیمور کے ذہن میں اچانک خیال آیا تھا۔
"کیا۔۔۔؟"
"ہماری نئی ڈیزائنر ماورا مرتضیٰ کی مدر ایڈمٹ تھیں' ان کا نروس بریک ڈاؤن ہو گیا' تھا وہ اکیلی تھیں۔۔۔ میں عزت کو ساتھ لے گیا۔۔۔ عزت ان کے پاس تھی رات بھر۔۔۔"
تیمور نے پہلی بار شاید بات کو گھمانے کی کوشش کی تھی اور اسے طریقہ بھی نہیں آیا تھا۔
"دیکھو تیمور! تم میرے باپ نہیں ہو۔ میں تمہارا باپ ہوں۔ جھوٹ بولنے سے پہلے سوچو کہ کس کے

سامنے بول رہے ہو؟" رضا حیدر نے اس کی بات کو سنجیدگی سے نہیں لیا تھا۔
"میں جھوٹ نہیں کہہ رہا بابا۔ عزت ان کے پاس تھی۔"
"ٹھیک ہے۔ تم اگر کہہ رہے ہو تو میں مان لیتا ہوں۔" انہوں نے سر جھٹکا۔
"تھینک یو۔!" اس نے فوراً "شکریہ" ادا کیا۔
"لیکن تمہیں بھی ایک بات ماننی ہوگی۔" انہوں نے اب کی بار قدرے مبہم سے لہجے میں کہا تھا۔
"کیا۔؟" تیمور چونکا۔
"میں مونس مرزا کے پرپوزل کے لیے ہامی بھر رہا ہوں۔ ایک مہینے کے اندر اندر شادی ہو جائے گی۔ انکار کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔" رضا حیدر کا انداز دوٹوک تھا۔
"واٹ۔؟ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ میں اس پرپوزل کو ریجیکٹ کر چکا ہوں۔" تیمور کو اک جھٹکا سا لگا تھا۔
"ریجیکٹ کرنے کا حق اور اختیار صرف میرے پاس ہے اور فیصلہ بھی میں ہی کروں گا۔ عزت کی شادی مونس مرزا سے ہی ہوگی۔ جو خیال تم لوگوں کے دل میں ہے' وہ نکال دو۔" وہ فیصلہ کن لہجے میں کہہ کر اپنی جگہ سے اٹھ کر جانے لگے۔
"مگر بابا۔!" اس نے کچھ کہنا چاہا ہی تھا کہ وہ جاتے جاتے رک گئے تھے اور اس کی سمت پلٹے تھے۔
"میں دوست کو دوست کی اوقات تک ہی رکھنا پسند کرتا ہوں۔ اس لیے تم بھی دوست کو دوست ہی رہنے دو۔ رشتہ بدلنے کا سوچنا بھی مت۔" انہوں نے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کے تھپکی دی تھی۔
"اگر دیکھا جائے تو۔ ایسا تو آپ بھی سوچ رہے ہیں۔ آپ کیوں رشتہ بدلنا چاہتے ہیں۔" تیمور کا لہجہ بھی دوٹوک ہو چکا تھا۔
"میرے بدلنے میں اور تمہارے بدلنے میں بہت فرق ہے صاحبزادے۔! میرا دوست میری ٹکر کا ہے۔ تمہارا دوست تمہاری ٹکر کا ہوتا تو اور بات تھی۔ کیونکہ قیام مرزا سے رشتہ بدلنے میں بھی میرا ایک مقصد ہے۔ تم آج کا وقت دیکھ رہے ہو۔ میں کل کا وقت دیکھ رہا ہوں۔ سمجھے؟"
وہ استہزائیہ انداز سے کہہ کر باہر نکل گئے تھے اور تیمور وہیں کا وہیں کھڑا رہ گیا تھا۔!



شام سے پہلے کا وقت تھا۔
ولید دواؤں کے زیر اثر سو رہا تھا' کوئی دبے پاؤں اس کے قریب آیا تھا' اور پھر یونہی بے حد آہستگی اور نرمی سے اپنا نرم و نازک سا ہاتھ اس کی پیشانی پہ رکھ دیا تھا' اس کے ہاتھ کے لمس کی تاثیر اس کی روح تک محسوس ہوئی تھی۔ اور اک مانوس سی خوشبو تھی جس نے اس کے سوئے ہوئے اعصاب کو بھی اپنے حصار میں لے لیا تھا اور ولید نے نیند سے چونک کر آنکھیں کھول دی تھیں جیسے اسے الہام ہوا ہو۔
"کیسے ہیں۔؟" عزت اس کی پیشانی سے ہاتھ ہٹاتے ہوئے بولی۔
"تم۔؟" ولید اعصاب ٹھکانے پہ آتے ہی ایک بار پھر چونکا تھا۔
"جی۔ میں۔ عزت حیدر۔ بذات خود۔" وہ ہلکے سے مسکرائی تھی۔ ولید نے بے ساختہ اٹھنے کی کوشش کی تھی۔
"لیٹے رہیے۔ لیٹے رہیے۔ دونٹ وری۔" اس نے ولید کو اٹھنے سے منع کیا تھا۔
"نہیں۔ میں اٹھنا چاہتا ہوں۔" اس نے بستر کی دونوں سائیڈوں پہ ہاتھ جماتے ہوئے اٹھنے کی کوشش کی' مگر وہ

پھر بھی اکیلا نہیں اٹھ سکتا تھا۔
اور عزت بے اختیار اس کے قریب آئی تھی۔
"رکیے۔ میں اٹھاتی ہوں۔" اس نے قریب جھکتے ہوئے کہا تھا اور ولید نے اپنے قریب جھکی عزت حیدر کے پیکر سے بمشکل نظر چرا کر نظر کا رخ بدل دیا تھا۔
عزت نے اسے بڑی احتیاط سے سہارا دے کر پیچھے تکیے رکھتے ہوئے ٹیک لگا کر بٹھا دیا تھا۔
"یہ سہارا مجھ پہ ادھار تھا۔" عزت اسے بٹھا کر پیچھے ہٹتے ہوئے بولی۔
ولید نے بے ساختہ سوالیہ نظروں سے دیکھا۔
"اسی سہارے سے تو شروعات ہوئی تھی۔ اور ابھی تک اسی کے زیر اثر ہوں۔" عزت بڑے اطمینان سے کہتی کرسی پہ بیٹھ گئی تھی۔
"اور میں ابھی تک اس خوشبو کے حصار میں ہوں۔ جو اس وقت بھی میرے حواسوں میں اتر رہی ہے۔" ولید رہ نہیں سکا تھا۔
"فنٹاسٹک۔؟" عزت دلچسپی سے بولی۔
"کیا۔؟" بے ساختہ بولا تھا۔
"پرفیوم۔" وہ ہنوز دلچسپی سے بات کر رہی تھی۔
"اچھا نام ہے۔" ولید نے سرہلایا۔
"چاہیے۔ اگر پسند ہے تو۔؟" عزت نے اسے چھیڑنے کی کوشش کی۔
"صرف پرفیوم نہیں۔" اس نے نفی میں گردن ہلائی۔
"صرف خوشبو کا کیا کروں گا میں۔؟" ولید کی سوالیہ نظریں عزت کے چہرے پہ اٹھیں تو وہ خود نظر اٹھانے کے قابل نہیں رہی تھی۔ پلکیں جھک گئی تھیں۔
"آپ کو یہ خوشبو اچھی لگتی ہے۔ یوز کریں گے تو اور اچھی لگے گی۔" عزت نے بات بدلنے کی کوشش کی۔
ولید جان چکا تھا کہ وہ اندر سے نروس ہو چکی ہے۔
"مجھے یہ اچھا نہیں لگتا کہ یہ خوشبو میرے ملبوس سے اٹھے۔ بلکہ یہ اچھا لگتا ہے کہ یہ خوشبو آپ کے ملبوس سے اٹھے اور مجھ تک آئے۔ میں اسے اپنی روح تک محسوس کروں۔ اور مسحور ہو جاؤں۔" ولید نے اپنی خواہش کا اظہار بڑے سلیقے سے کیا تھا۔
عزت حقیقتاً کچھ کہہ نہیں سکی تھی۔
"چلتی ہوں اب۔" عزت نے یکدم کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔
"اتنی جلدی؟ تھوڑی دیر بیٹھیں تو سہی۔ میرے کمرے کو اس خوشبو سے مہکنے دیں ابھی۔" ولید کو اس کے جانے کا سن کر بے چینی ہوئی تھی۔
"ابھی کے لیے اتنا مہک جانا ہی کافی ہے۔" عزت نے اپنے بیگ کے ساتھ لٹکے گلاسز اتار کر اپنے بالوں میں اٹکا لیے تھے۔
"اور آئندہ۔؟" وہ فوراً بولا۔
"آئندہ کی آئندہ دیکھیں گے۔ ابھی کے لیے اجازت۔" عزت کی اس جلد بازی پہ ولید دل مسوس کے رہ گیا تھا۔
"اگر اتنی جلدی تھی جانے کی تو مجھے جگانے کی کیا ضرورت تھی بھلا۔؟" اس نے آخر کہہ ہی دیا۔

"میں آپ کو جگانا نہیں چاہتی تھی۔ آپ خود جاگے ہیں۔ ورنہ میں تو آپ کو دیکھ کر ہی چلی جاتی۔" عزت بڑے اطمینان سے بولی تھی۔

"تو اب مجھے بھی تو دیکھنے دیں کہ آپ آئی ہیں۔" ولید اتنے دنوں بعد اسے دیکھ رہا تھا' اس لیے چاہتا تھا کہ وہ اس کے پاس تھوڑی دیر اور بیٹھے۔

"نہیں۔ بس اتنا ہی کافی ہے۔ ورنہ تیمور بھائی کو اچھا نہیں لگے گا۔"

"تیمور کو۔؟" ولید چونکا۔

"ہاں۔! وہ جان گئے ہیں کہ ہم ایک دوسرے میں انٹرسٹڈ ہیں۔" عزت نے کہتے ہوئے سر جھکا لیا تھا اور ولید کو جیسے کرنٹ چھو گیا تھا۔

"واٹ۔؟ تیمور کو پتا چل گیا۔؟ مگر کیسے۔؟" ولید کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔

"اس روز جب آپ کا فون بند ہونے سے پہلے فائرنگ کی آواز اور آپ کی آواز سنی تو میرا دماغ بالکل ماؤف ہو گیا تھا' میں سیدھی تیمور بھائی کے پاس گئی تھی اور سب بتا دیا کہ آپ مجھ سے بات کر رہے تھے تو یہ سب ہو گیا۔ پھر ان کے ساتھ ہی میں بھی گھر سے نکل آئی۔ اور اسپتال میں بھی پوری رات ان کے ساتھ جاگتی رہی اور روتی رہی۔ اس لیے انہیں پھر پتا تو چلنا ہی تھا ناں۔؟" عزت بڑے معصوم سے انداز میں بولی تھی اور ولید کے ذہن کے پردے پہ ماورا کی آواز لہرائی تھی۔

"مجھے بھلا کیسے پتا چل سکتا تھا۔؟ بس اس وقت اس کی حالت ہی ایسی تھی کہ چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔ میری بھی آنکھیں ہیں۔ میں نے بھی اسے دیکھا تھا۔ مجھ سے بھی نہیں چھپ سکی وہ۔ (اوہ تو ماورا مرتضیٰ ٹھیک ہی کہہ رہی تھیں کہ وہ چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔)

"کیوں۔؟ کیا ہوا ہے۔؟" عزت نے اسے اس طرح شاک کی سی کیفیت میں دیکھ کر چونکایا تھا۔

"نن۔۔۔ نہیں۔۔۔ کچھ نہیں۔" ولید نے نفی میں سر ہلایا۔

"پلیز۔ شیئر کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں۔" عزت نے اسے حوصلہ دیا۔

"کیا شیئر کروں۔؟ تم میری فیلنگز نہیں سمجھ سکتیں۔" وہ بار بار نفی میں ہی سر ہلا رہا تھا۔

"کیسی فیلنگز۔؟" وہ سمجھی نہیں تھی۔

"میں نہیں چاہتا تھا کہ تیمور کو اس طرح کچھ پتا چلے۔ میں یہ بات خود کرنا چاہتا تھا۔ تاکہ وہ کوئی غلط بات نہ سوچ لے۔" ولید بیٹھے بیٹھے ٹینشن اور تاسف کا شکار ہو گیا تھا۔

"انہوں نے کچھ غلط نہیں سوچا۔ انہیں اعتماد ہے آپ پہ۔ مجھ سے بھی زیادہ۔"

"بے شک اسے مجھ پہ اعتماد ہے۔ مگر اس نے پھر بھی میرے بارے میں کیا سوچا ہو گا بھلا۔؟ اف۔ یہ دل بھی انسان کو کبھی کبھی کسی کے سامنے نظر اٹھانے کے قابل بھی نہیں چھوڑتا۔" اس نے کہتے ہوئے سر جھکایا تھا۔

"اسی لیے کہہ رہی ہوں ناں کہ میں اب چلتی ہوں۔ کہیں یہ نہ ہو کہ میں بھی۔" اس نے کہتے ہوئے بات ادھوری چھوڑ دی تھی اور ولید مفہوم سمجھ گیا تھا۔

"اوکے۔! اب میں بھی نہیں روکوں گا۔ ٹھیک ہے' آپ جائیں۔" ولید نے بھی اصرار کرنے کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔ اور عزت مسکرا کر اسے دیکھتی ہوئی خدا حافظ کہہ کر باہر نکل آئی تھی۔

"اوکے آنٹی! اللہ حافظ۔" عزت نے کچن سے باہر نکلتی زبیدہ خاتون کو مخاطب کیا' وہ دوپٹے سے ہاتھ پونچھتے ہوئے ٹھٹک گئیں۔

"ارے بیٹا۔ اتنی جلدی۔؟ ابھی بیٹھو تو سہی۔ میں ولید کے لیے کھانا بنا رہی تھی' اس لیے کچن میں دیر ہو گئی۔"

انہوں نے اسے روکا۔
"تھینک یو آنٹی! لیکن ابھی نہیں۔ ان شاء اللہ دوبارہ آئی تو میں بھی آپ کے ہاتھ کا کھانا ضرور کھاؤں گی۔"
عزت نے بڑے پیار سے کہتے ہوئے ان کے دونوں ہاتھ تھام لیے تھے۔
"ضرور بیٹا۔! مجھے خوشی ہوگی۔" زبیدہ خاتون نے اس کے بال تھپکے تھے اور عزت مسکرا دی تھی۔



فیصل آباد سے واپس آتے ہی فارہ کو بخار نے گھیر لیا تھا۔
اور وہ بستر سے لگ گئی تھی' جس کی وجہ سے آفاق کو بے حد پریشانی ہوئی تھی اور اسے اس قدر پریشان دیکھ کر ثمینہ یزدانی کا سیروں خون بڑھ گیا تھا اور اسی وجہ سے وہ خود فارہ سے ذرا فاصلے پر ہی رہی تھیں۔ کیوں کہ انہیں پتا تھا' جیسے ہی وہ اس پر توجہ دیں گی' وہ فوراً" لاپروا اور بے نیاز ہو جائے گا۔ اس لیے بہتر تھا کہ وہ خود ہی اس فکر میں مبتلا رہتا۔
لیکن وہ اتنا پریشان تھا کہ اپنی پریشانی لے کر ان کے سامنے بھی پہنچ ہی گیا تھا۔
"ممی! وہ بہت زیادہ ویک ہو چکی ہے۔ اسے روز بخار ہو جاتا ہے۔ میڈیسن بھی نہیں لے رہی۔ آپ اسے سمجھائیں۔ پلیز۔" آفاق جیسے تھک ہار کر ان کے سامنے بیٹھ گیا تھا۔
"کیوں۔؟ میڈیسن کیوں نہیں لے رہی۔؟" ثمینہ یزدانی نے لاپروائی کا مظاہرہ کیا۔
"کہتی ہے' مجھے وومٹنگ ہونے لگتی ہے۔" آفاق پریشانی اور تشویش سے بتا رہا تھا۔
"وومٹنگ۔؟" ثمینہ یزدانی اپنی لاپروائی کے خول سے یکدم باہر آئی تھیں۔
"صرف میڈیسن لینے کی وجہ سے ہوتی ہے یا ویسے بھی۔؟" انہوں نے بڑے کھوجنے والے انداز سے دریافت کیا۔
"ویسے بھی۔ بلکہ جب سے اسے بخار ہوا ہے' تب سے وومٹنگ ہو رہی ہے۔"
آفاق کی پریشانی اس کے چہرے سے ہویدا تھی اور اب یہی حال ثمینہ یزدانی کا بھی تھا۔
"اوہ مائی گاڈ! تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا۔؟ میں اسے ابھی کسی اچھی سی لیڈی ڈاکٹر کے پاس لے کر جاتی ہوں۔ اس کا مکمل چیک اپ ضروری ہے اب۔" ثمینہ یزدانی تو اک لمحے کی بھی تاخیر کیے بغیر فوراً" اٹھ گئی تھیں۔
"لیڈی ڈاکٹر۔؟" آفاق ساری بات سے صرف لیڈی ڈاکٹر پہ اٹکا تھا اور اس کا مفہوم سمجھنے کی کوشش کرتا رہ گیا تھا۔ مگر وہ ابھی انجان تھا' اس لیے سمجھ نہیں پایا تھا۔



ثمینہ یزدانی جیسے ہی آفاق کے بیڈ روم میں داخل ہوئیں' ان کے قدم مزید ٹھٹکے تھے۔
کیونکہ واش روم سے فارہ کی ابکائیوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔
وہ باہر کمرے میں ہی ٹہلتے ہوئے اس کے باہر نکلنے کا انتظار کرنے لگیں۔
کچھ دیر بعد وہ باہر نکلی تو اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے اور رنگت پیلی زرد ہو رہی تھی۔ ثمینہ یزدانی لپک کے اس کے قریب آئیں اور اسے کندھوں سے تھام لیا تھا۔
"فارہ۔ میری بچی۔ یہ کیا حالت بنا رکھی ہے تم نے؟ مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا۔؟" ثمینہ یزدانی اسے اپنے ساتھ لگائے بیڈ کے قریب آئیں اور بڑی احتیاط سے اسے بیڈ پر لٹا دیا تھا۔ وہ نقاہت کی وجہ سے ہلکے ہلکے لرز رہی تھی۔
"میرا۔ میرا۔ سر۔ چکرا رہا ہے آنٹی۔!" اس نے اپنے لرزتے کانپتے ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔

"ڈونٹ وری بیٹا۔ ابھی ٹھیک ہو جائے گا۔ میں ابھی ڈاکٹر سے ٹائم لیتی ہوں۔"
انہوں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کسی ڈاکٹر کا نمبر ڈائل کیا تھا اور رفارہ کی اتنی بری حالت ہو چکی تھی کہ وہ چاہتے ہوئے بھی انہیں انکار نہیں کر سکی تھی ورنہ اتنے دنوں سے وہ آفاق کے ساتھ ایک ہی ضد لگائے بیٹھی تھی کہ نہ میڈیسن لینی ہے نہ ڈاکٹر کے پاس جانا ہے اور آفاق تھا کہ منتیں کر کے تھک گیا تھا۔ اس لیے آج مجبوراً "فریاد لے کر ثمینہ یزدانی کے پاس پہنچ گیا تھا۔



میں نعرہ مستانہ
میں نعرہ مستانہ
میں شوخئی رندانہ
میں تشنہ کہاں جاؤں
پی کر بھی کہاں جانا؟
عزت آج پھر بڑے موڈ میں تھی اور آج پھر اس کی گاڑی میں عابدہ پروین فل والیوم سے گونج رہی تھی۔ اور اس آواز اور میوزک کی لے پر عزت خود بھی ہمیشہ کی طرح جھوم رہی تھی۔
میں شمع فروزاں ہوں
میں آتش لرزاں ہوں
میں سوزش ہجراں ہوں
میں سوزش ہجراں
میں منزل پروانہ
میں نعرہ مستانہ
میں شوخئی رندانہ
اس کی گاڑی میں یہ میوزک گھر کے پورچ میں داخل ہونے تک بجتا رہا تھا اور گاڑی سے اترنے کے بعد وہ بیگ لے کر گنگناتی ہوئی اندر کی سمت بڑھی تھی۔
"بی بی جی۔! تیمور صاحب نے آپ کو اپنے بیڈ روم میں بلایا ہے۔" ملازمہ نے عزت کو دیکھتے ہی اطلاع کی تھی۔ اور عزت کے سیڑھیاں چڑھتے قدم یکدم رک گئے تھے۔
"تیمور بھائی نے بلایا ہے۔؟ مگر کب۔؟" اس نے تعجب سے ملازمہ کو دیکھا۔ کیونکہ وہ ابھی تو گھر میں داخل ہوئی تھی اور ابھی پیغام بھی آ گیا۔؟ حیرت ہی تو تھی۔
"کافی دیر سے کہہ رکھا ہے کہ آپ جیسے ہی گھر آئیں۔ ان سے ضرور مل لیں۔" ملازمہ نے اس کی حیرانی دور کی تھی۔
"اوہ اچھا۔!" عزت کے قدم سست پڑ گئے تھے اور وہ بیگ ملازمہ کے حوالے کر کے خود تیمور کے بیڈ روم کی طرف آ گئی تھی، اندر سے تھوڑی پریشانی بھی ہوئی تھی کہ آخر ایسی کیا بات ہے کہ تیمور نے اتنی دیر سے اس کے لیے پیغام چھوڑ رکھا ہے۔
اس نے دروازے کے سامنے پہنچ کر آہستگی سے دروازہ پر دستک دی تھی۔
"آ جاؤ..." تیمور جان گیا تھا کہ دروازے پہ کون ہے۔

"السلام علیکم بھائی۔!" عزت بڑے محتاط انداز سے اندر داخل ہوئی تھی۔
"وعلیکم السلام۔!" تیمور بیڈ پہ بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے بیٹھا یقیناً کسی گہری سوچ میں مبتلا تھا، جب اسے دروازے کی دستک نے چونکایا تھا اور اب وہ عزت کی طرف متوجہ تھا۔
"آپ نے بلایا تھا بھائی۔؟" عزت نے بلا تمہید پوچھ لیا۔
"ہاں۔ آؤ بیٹھو۔" تیمور نے اسے قریبی صوفے پہ بیٹھنے کا اشارہ کیا۔
اور عزت نے صوفے پہ بیٹھتے ہوئے دوبارہ تیمور کی طرف دیکھا تھا۔ وہ بھی سوالیہ۔!



"تو پھر فیصلہ سنا دیا تم نے۔؟" ماورا لاؤنج کے صوفے پہ لیٹی، بہت آرام سے اپنے موبائل پہ کوئی نیو ڈیزائن کری ایٹ کر رہی تھی جب بی گل بھی وہیں آ گئیں۔
"کیسا فیصلہ۔؟" وہ اپنے دھیان میں مگن ان کی بات سمجھ نہیں پائی تھی۔
"تمہاری شادی کا فیصلہ۔" انہوں نے واضح کیا۔
"اوہ ہاں۔ بس یوں سمجھیں کہ ابھی تیلی جلائی ہی تھی کہ رضا حیدر نے پھونک مار دی۔" ماورا کافی خفگی اور جھنجھلاہٹ سے بولی تھی۔
"کیا مطلب ہے تمہارا۔؟ کیا پھونک مار دی۔؟" بی گل کے بھلا کیا سمجھ میں آسکتا تھا۔
"مطلب کہ ابھی فیصلہ سنانے ہی والی تھی کہ رضا حیدر کی کال آ گئی اور بات ادھوری رہ گئی۔" اس نے وجہ بتائی۔
"پھر۔؟" انہوں نے مزید استفسار کیا۔
"پھر کیا۔ پھر وہ گھر چلا گیا۔ اور میں اپنے گھر آ گئی۔" اس نے لاپروائی سے کندھے اچکائے۔
"اور آگے۔؟" برجستہ سوال جاری تھے۔
"آگے کیا۔؟ وہ پوچھے گا۔ میں بتا دوں گی۔ بس بات ختم۔" اس کی لاپروائی کا وہی عالم تھا۔
"بات کیسے ختم ہو سکتی ہے بیٹا۔ پوری زندگی کا سوال ہے۔ یہ فیصلے روز روز نہیں ہوتے۔"
"یہ پوری زندگی کا نہیں۔ میرے کیریئر کا سوال ہے بی گل۔ جس کے لیے میں یہ رسک لے رہی ہوں۔" ماورا کے انداز میں سنجیدگی اتر آئی تھی۔
"کبھی کبھی تیری ماں کی طرح سوچتی ہوں کہ تم یہ رسک نہ لو۔ مگر پھر جب تمہارے کیریئر کا خیال آتا ہے تو چپ ہو جاتی ہوں۔ کہ چل ٹھیک ہے۔ اللہ کے بھروسے پہ تو یہ رسک لے ہی لے تو اچھا ہے۔" بی گل بھی جیسے ڈانواں ڈول سی لگ رہی تھیں۔
"بی گل پلیز۔!" ماورا بیزاری سے صوفے پہ اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔ اور ان کی بات سنتی عافیہ بیگم دروازے سے ہی پلٹ کر چلی گئی تھیں۔



اپنے بیڈ روم میں اپنے بیڈ پہ بیٹھی عزت کا چہرا دھواں دھواں ہو رہا تھا۔
اسے رضا حیدر کے ردعمل کا سن کر ہی اپنی آنکھوں کے سامنے تارے سے ناچتے ہوئے محسوس ہوئے تھے اور دماغ ماؤف سا ہو رہا تھا۔
"لیکن اس سب کے باوجود تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے، تمہیں اور ولید کو کوئی بھی الگ نہیں

کر سکتا۔ مجھے تم دونوں کی کورٹ میرج بھی کروانی پڑی تو کروادوں گا۔ یوڈونٹ وری۔ اینڈ۔ بی کیئر فل۔'' تیمور کی آواز اس کے کانوں میں ابھی تک جیسے سائیں سائیں کر رہی تھی۔!



ماورا بڑے دل سے تیار ہو کر نیچے آئی تھی۔

نیچے پارکنگ میں تیمور گاڑی سے ٹیک لگائے اس کا انتظار کر رہا تھا۔ ماورا کو نیچے آتے دیکھ کر فوراً سیدھا ہو گیا تھا اور اپنی گھڑی میں ٹائم دیکھا تھا۔

''اتنا لیٹ کر دیا۔؟'' وہ بڑی نرمی سے بولا۔

''بس تیار ہونے میں ٹائم لگ گیا۔'' ماورا عجلت سے کہتے ہوئے قریب آئی۔

''وہ تو نظر آرہا ہے۔'' اس نے سر تاپا اسے دیکھا۔

''اچھا۔؟'' وہ مسکرائی۔

''ہوں۔ اچھی لگ رہی ہیں۔'' تیمور نے تعریف کی۔

''تھینکس۔! چلیں اب۔'' وہ گاڑی کی دوسری سائیڈ کی طرف مڑی اور تیمور نے بھی مسکراتے ہوئے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی تھی۔

''کہاں جانا ہے اب۔؟'' روڈ پہ آتے ہی ماورا نے تیمور کی طرف دیکھا۔

''کورٹ۔ اور کہاں۔'' تیمور بڑا پرسکون اور خوش نظر آرہا تھا۔

''اور بعد میں۔؟'' وہ کچھ جاننا چاہتی تھی۔

''جہاں تم کہو۔'' وہ مسکرایا۔

''اوکے۔!'' وہ بھی مسکرائی تھی۔

اور اگلے چند منٹ بعد وہ کورٹ میں موجود تھے گواہ بھی تھے اور وکیل بھی۔

''ماورا پلیز۔!'' تیمور نے اسے پیپر اور پین تھمایا۔

ماورا نے چند سیکنڈ کے لیے سوچا پھر تیمور کو دیکھا۔

تیمور بھی پیپرز اور پین لیے بیٹھا تھا' ادھر تیمور نے پراپرٹی کے پیپرز پہ سائن کیے تھے اور ادھر ماورا نے نکاح نامے پہ دستخط کر دیے تھے۔

''مبارک ہو۔'' لوگوں نے انہیں مبارک باد دی تھی اور کمرے سے باہر نکل گئے تھے۔

''آج سے سب کچھ تمہارا ہے۔'' تیمور پرسکون تھا۔

''لیکن میں تمہاری نہیں ہوں۔'' ماورا کے چہرے کے تاثرات یکسر بدل گئے تھے۔

''کیا مطلب۔؟'' تیمور یکدم ٹھٹکا اور ماورا نے اپنے بیگ سے ریوالور نکال لیا تھا۔

''مطلب کہ اب گیم ختم ہو چکا ہے۔ اب بس۔'' ماورا نے اس پہ ریوالور تان لیا تھا۔

''مگر ماورا۔! تیمور نے کچھ کہنا چاہا تھا مگر ماورا نے سننے کی بھی زحمت نہیں کی تھی اور گولی چلا دی تھی۔ جو سیدھی تیمور کے سینے میں لگی تھی۔

''ماورا۔'' وہ زور سے چیخا۔

''تیمور۔!'' ماورا انتہائی زور سے چیخ کر یکدم اپنے بستر سے اٹھ بیٹھی تھی اور ہاتھ مار کر سائیڈ ٹیبل کا لیمپ جلا دیا تھا' وہ پسینے میں شرابور ہو رہی تھی اور اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا' یوں جیسے سینے کے اندر کوئی بے لگام گھوڑا

دوڑ رہا ہو۔ اس کے ڈراؤنے خواب نے اسے حقیقتاً "دہلا کے رکھ دیا تھا۔

"تیمور۔؟" اس نے خود کلامی کے سے انداز میں اس کا نام لیا تھا اور پھر پسینے سے بھیگے اپنے چہرے کو چھو کر محسوس کیا تھا۔ قتل۔؟ تیمور حیدر کا۔؟ مم میرے ہاتھوں۔

اس نے لیمپ کی روشنی میں اپنے دونوں ہاتھ پھیلا کر دیکھے تھے' دل ابھی بھی دھک دھک کر رہا تھا۔



"مبارک ہو مسز یزدانی آپ دادی بننے والی ہیں۔ آپ کی بہو کی رپورٹس آگئی ہیں۔"

ڈاکٹر نے فارہ کی رپورٹس چیک کرتے ہی ثمینہ یزدانی کو اندر بلایا تھا اور ثمینہ یزدانی کو تو پہلے ہی شک تھا اب تو ڈاکٹر کی طرف سے بھی تصدیق ہوگئی تھی۔

"خیر مبارک ڈاکٹر صاحبہ۔ خیر مبارک۔ میں بس ابھی آئی۔ پہلے اپنی بہو اور بیٹے کو یہ خوشخبری سنا دوں۔" ثمینہ یزدانی سے ذرا صبر نہیں ہوا تھا اور ڈاکٹر مسکرا دی تھی۔

"آفاق۔ آفاق۔ فارہ!" وہ دور سے ہی انہیں پکارتی ہوئی روم میں داخل ہوئی تھیں۔

"جی ممی۔؟ خیریت۔؟" آفاق کھڑا ہو گیا' بیڈ پر پڑی فارہ نے بھی سوالیہ نظروں سے دیکھا تھا۔

"مبارک ہو میری جان۔ مبارک ہو۔ میں دادی بننے والی ہوں۔ فارہ کی رپورٹس آگئی ہیں۔"

ثمینہ یزدانی نے خوشی سے چہکتے ہوئے آفاق کے دونوں بازو پکڑ کر مبارک باد کا اعلان کیا تھا۔ مگر دوسری طرف کا رد عمل وہ نہیں تھا جو ہونا چاہیے تھا۔

آفاق کے چہرے پہ خوشی کے بجائے اک تاریک سا سایہ لہرا گیا تھا۔

"دادی بننے والی ہیں۔؟"

(باقی آئندہ ماہ ان شاءاللہ)

کچھ دِنوں کی یہ ملاقاتیں بہت اچھی لگیں
اس سے جو کچھ ہو سکیں باتیں بہت اچھی لگیں

اس کی ہمراہی میں جو بھی وقت گزرا یادگار
دن بہت اچھے لگے، راتیں بہت اچھی لگیں

وقتِ رخصت اس نے تھوڑے پھول اور کچھ پھل دیے
آنسوؤں سے تر یہ سوغاتیں بہت اچھی لگیں

حالِ دل اس کو سنانا حوصلے کی بات تھی
حوصلے کی یہ کراماتیں بہت اچھی لگیں

شہر واپس جا نہ پایا وہ کہ رستے بند تھے
اس برس زرتار برساتیں بہت اچھی لگیں

بعد مدت اس کی دعوت پر جو اس کے گھر گیا
پھر اسی گھر میں مداراتیں بہت اچھی لگیں

ہم بساطِ عشق پر کب ہارتے اس سے مگر
جان کر کھائی ہوئی ماتیں بہت اچھی لگیں

علی عباس زیدی

گزر گئی جو چمن پر وہ کوئی کیا جانے
چھڑے ہوئے ہیں بہار و خزاں کے افسانے

جہاں یہ چاک گریباں بھی چاک دل بن جائے
گزر رہے ہیں اب منزلوں سے دیوانے

میرے لبوں کا تبسم تو سب نے دیکھ لیا
جو دل پہ بیت رہی ہے وہ کوئی کیا جانے

تیرے حضور جنہیں کہہ سکی نہ گویائی
میرے سکوت نے دہرا دیے وہ افسانے

تمام وسعتِ کونین کو ڈبو دیں گے
چھلک گئے جو کہیں اس نظر کے پیمانے

نہ اشتیاقِ نظارہ نہ اعتبارِ جمال
ٹھہر گئی ہے کہاں زندگی خدا جانے

نہ شمع بزم پہ کچھ آنچ آئے گی اقبال
خود اپنی آگ میں جلتے رہیں گے پروانے

اقبال صفی پوری



خواب خواب آنکھوں میں
اجنبی سا چہرہ تھا
خواب بُنتے بُنتے ہی
خواب کی مسافت میں
دُور تک نکل گئے ہم بھی
آنکھ جب کھلی اپنی
بھید اتنا پایا کہ
خواب خواب ہوتا ہے
بخت کی لکیروں کا
خواب کے جزیروں سے
واسطہ نہیں ہوتا
اپنی پلکوں پہ ہر شب
اک ہی خواب رکھنے سے
خواب سچ نہیں ہوتا

ثناء شیخ

زخم کب کا تھا درد اُٹھا ہے اب
اس کے جانے کا دُکھ ہوا ہے اب

میری آنکھوں میں خواب ہیں جس کے
اس کی آنکھوں میں رت جگا ہے اب

کتنے موسم ہیں صرف اس کے لیے
کتنے چہروں پہ وہ سجا ہے اب

اُس حوالے سے زندگی میری
گھنے جنگل کا سلسلہ ہے اب

ایک دیوانہ اپنی وحشت میں
بات کہنے کی کہہ گیا ہے اب

تاجدار عادل

صبا ساگر

اسے ہماری ہنسی کا خیال

مسکراہٹیں

نقوش کے مدیر محمد طفیل نے ایک بار اپنے معاصر مرزا ادیب کو اپنی ایک کتاب دی اور داد کے طالب ہوئے۔ مرزا صاحب نے کہا۔ ”ٹائٹل اچھا ہے۔“

محمد طفیل اس خاموش طنز کو خاموشی سے پی گئے۔

کئی سال بعد مرزا ادیب نے اپنی کتاب نقوش میں تبصرہ کے لیے دی۔ محمد طفیل نے کسی رائے کا اظہار کیے بغیر کتاب ایک طرف رکھ دی۔ مرزا صاحب نے بے چینی سے ان کی طرف دیکھا اور کہنے لگے۔ ”طفیل صاحب! کیا خیال ہے کتاب پسند آئی؟“

طفیل صاحب نے سادگی سے جواب دیا۔ ”اس کا تو ٹائٹل بھی اچھا نہیں ہے۔“

عینی عابد... کراچی

تحفظ

ایک لڑکی نے نجومی کو اپنا ہاتھ دکھایا۔

”بی بی! کیا پوچھنا چاہتی ہو؟“ نجومی نے پوچھا۔

”یہ ہی کچھ اپنے مستقبل کے بارے میں۔“ لڑکی نے سرسری انداز میں کہا۔

”تمہارا مستقبل کافی حد تک محفوظ ہے۔“ نجومی نے ہاتھ کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اگر تم اپنے ناخنوں کی لمبائی تھوڑی اور بڑھالو تو یہ مزید محفوظ ہو جائے گا۔“

حنا حبیب.... راولپنڈی

سارے گناہ

استاد نے کلاس میں روزے کے فضائل پڑھاتے ہوئے سوال کیا۔

”ہاں تو بچو! وہ کون سی چیز ہے، جس سے انسان کے سارے گناہ معاف ہو جاتے ہیں؟“

شاگردوں نے ایک زبان ہو کر جواب دیا۔ ”این آر او۔“

نازیہ سلطان۔۔۔ حیدر آباد

مخیر

صنعت کار: ”بیٹے! میری طرف سے تمام کارکنوں کو کپڑوں کے دو دو جوڑے بطور سردیوں کا تحفہ دینے کا اعلان کر دو۔“

بیٹا: ”اعلان کیا۔ دو جوڑے تو انہیں دیے بھی جا چکے ہیں، آپ تو بہت جلد بھول جاتے ہیں۔“

صنعت کار: ”بے چارے اللہ بخش کا ہاتھ مشین میں آکر کٹ گیا تھا، میں نے کہا تھا کہ تمام عمر کے لیے اس کی تنخواہ دینے کے آرڈر جاری کیے جائیں، اس کا کیا بنا؟“

بیٹا: ”یہ کام ہو گیا تھا، آپ کو بہت دعائیں دیتا ہے۔“

صنعت کار: ”اور ہاں دیکھو! نذیر کی بیوہ کے لیے تاعمر وظیفہ جاری کر دو، اللہ بخشے وہ بھی بہت محنتی کارکن تھا۔“

بیٹا۔ ”ٹھیک ہے ابو!“

صنعت کار۔ ”مجھے اگلے ہفتے یاد دلانا، محمد دین کو اس کی بیٹی کے جہیز کے لیے پچاس ہزار روپے کا چیک دینا ہے۔“

بیٹا۔ ”بہت اچھا ابو، مگر وہ بے چارا افضلو چھ ماہ سے اسپتال میں پڑا ہے۔“

صنعت کار۔ ”اسے اس کی تنخواہ تو مل رہی ہے نا؟“

بیٹا۔ ”جی ابو! مگر بے چارہ غریب آدمی ہے، ہسپتال کا خرچ اس کی استطاعت سے بہت زیادہ ہے۔“

صنعت کار: "کوئی بات نہیں، اسے کہو کہ اسپتال کے سارے بل ہم ادا کریں گے۔"

بیٹا: "ابو! آپ کتنے اچھے ہیں، لیکن میں ایک بات کہوں؟"

صنعت کار: "کہو بیٹا کہو۔"

بیٹا: "آپ اس قدر صدقہ زکوٰۃ، خیرات دیتے ہیں، لیکن ان مددوں سے جتنی مراعات آپ اپنے مزدوروں کو دے رہے ہیں، اگر اس سے آدھی مراعات بھی آپ ان کی شرائط ملازمت میں شامل کردیں تو اس سے ان کی عزت نفس مجروح ہونے سے بچ جائے۔"

صنعت کار: "وہ تو ٹھیک ہے بیٹا! مگر پھر ہمیں مخیر کون کہے گا؟"

شاہینہ عمران۔۔۔ گجرات

مشکلات

ایک شخص گھر لوٹا تو دیکھا، اس کی بیوی نماز پڑھ رہی ہے۔ سلام پھیرنے کے بعد خاتون نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو احساس ہوا کہ کوئی پیچھے کھڑا ہے۔ اس نے گردن گھما کر دیکھا تو پیچھے اس کا شوہر مسکرا رہا تھا۔ خاتون نے جوابی مسکراہٹ سے شوہر کو دیکھا اور دعا مانگے بغیر جاء نماز اٹھانے لگی۔

"تم نے دعا کیوں نہیں مانگی؟" شوہر نے حیران ہو کر سوال کیا۔

"میں دعا مانگنے والی تھی کہ اللہ! میرے میاں کی مشکلات ختم کردے پھر میرے ذہن میں آیا کہ اگر یہ دعا قبول ہوگئی تو میں مرجاؤں گی۔" بیوی نے مسکرا کر جواب دیا۔

مہرین ظفر۔۔۔ ڈہرکی

حاضر دماغی

ایک صاحب جوتے ہاتھ میں لیے دبے پاؤں زینے چڑھے۔ بیڈ روم کا دروازہ کھولا اور اندر پہنچ کر آہستہ سے دروازہ بند کیا۔ بستر پر لیٹنے ہی والے تھے کہ ان کی بیگم نے غنودگی میں پکارا۔

"ستائی! کیا یہ تم ہو۔"

اگلے روز وہ صاحب اپنے دوست کو یہ روداد سناتے ہوئے کہنے لگے۔

"اور زندگی میں، میں نے پہلی بار اس وقت زبردست حاضر دماغی سے کام لیا اور اپنی بیوی کا ہاتھ چاٹنے لگا۔"

رشیدہ بتول۔۔۔ کراچی

ضرورت

ڈاکٹر: "اگر میں تمہارا آپریشن کرنا ضروری سمجھوں تو کیا تمہارے پاس میری فیس کی رقم ہے؟"

مریض: "فرض کیجیے کہ میرے پاس آپ کی فیس کی رقم نہیں ہے تو کیا آپ تب بھی میرا آپریشن کرنا ضروری سمجھیں گے؟"

الماس تنویر۔۔۔ ہزارہ

بہری

ایک عورت نے اپنے شوہر پر بارہ گولیاں چلائیں۔ مقدمے کے دوران جج نے پوچھا۔

"ملزمہ نے اتنی زیادہ گولیاں اپنے شوہر کے جسم میں کیوں اتاریں آخر؟"

"دراصل۔۔۔ میری موکلہ اونچا سنتی ہے۔" ملزمہ کے وکیل نے دفاع کرتے ہوئے کہا۔

سعدیہ ہاشمی۔۔۔ رحیم یار خان

کام کے کاغذ

ایک افسانہ نگار نے اپنے ان پڑھ نوکر کو کاغذ جلاتے ہوئے دیکھا تو پریشان ہو کر کہا۔ "ارے۔۔۔ کہیں میرے کام کے کاغذ تو نہیں جلادیے؟"

نوکر نے جواب دیا۔ "حضور! میں اب اتنا بھی احمق نہیں۔ صرف لکھے ہوئے جلائے ہیں۔ سادے کاغذ ویسے ہی چھوڑ دیے ہیں۔"

نور فاطمہ۔۔۔ نواب شاہ

شگفتہ جاہ

باتوں سے خوشبو آئے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت سفینہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا۔

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک مد (پانی) سے وضو اور ایک صاع (پانی) سے غسل کر لیا کرتے تھے۔

فوائد و مسائل:

1۔ صاع پیمائش کا ایک پیمانہ ہے جس کی مقدار کلوگرام کے حساب سے دو کلو اور سو گرام اور بعض کے نزدیک ڈھائی کلو ہے۔

مد، چوتھائی صاع کو کہتے ہیں، اس کی مقدار پانچ سو پچیس گرام ہے۔

مائع کے لیے صاع تقریباً دو لیٹر سے کچھ زیادہ اور مد اس سے چوتھائی سمجھا جا سکتا ہے۔ یعنی تقریباً آدھا لیٹر۔

2۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ غسل اور وضو کے لیے اس سے کم یا زیادہ پانی جائز نہیں۔ مقصد محض ایک اندازہ بیان کرنا ہے تاکہ بلا وجہ بہت زیادہ پانی ضائع نہ کیا جائے بلکہ تھوڑے سے پانی کو اس طرح استعمال کیا جائے کہ پوری صفائی حاصل ہو جائے۔

(مسلم)

والدین کا احترام،

- اگر ماں باپ کے پاس علم کم ہو پھر بھی ماں باپ کا مرتبہ بڑا ہے۔
- جو آدمی یہ کہتا ہے کہ ابا جان کا دماغ چل گیا ہے تو وہ آدمی پاگل ہو کے مرے گا۔ آپ کے ماں باپ قیامت تک آپ کے ماں باپ رہیں گے، چاہے آپ کچھ بھی بن جاؤ۔
- اگر باپ کے نالائق ہونے کے باوجود اس کا حکم پورے طور پر مانتے ہیں تو شیطان آپ پر غالب نہیں آسکے گا۔
- اگر ماں باپ ان پڑھ ہیں اور بچہ پڑھا ہوا ہے تو بھی ان کا حکم ماننا، اگر آپ کی خواہش کو ماں باپ نے روند ڈالا ہے تو بھی ان کا کہنا ماننا

یہ کر کے دیکھو تو اس کے نتیجے میں بے شمار فضل ہو جائیں گے۔

- اگر آپ کے ماں باپ نے آپ کی خواہش کو روند ڈالا ہے تو بھی ان کا کہنا مانو۔

(واصف علی واصف)

نخبہ اکرم۔ گاؤں گوئیکی

مہمانی اور اخلاص،

ایک قبیلے کا سردار طلحہ قیس کے قبیلے کی طرف جا نکلا۔ اس قبیلے کا سردار مالک بن عوف تھا۔ اس نے طلحہ کو نہ پہچانا نہ اس کی آؤ بھگت کی۔

جب طلحہ اپنے قبیلے میں واپس آگیا تو مالک کو پتا چلا وہ کون تھا۔ افسوس ہوا اور اس نے طلحہ کو خط لکھا کہ

"میں بہت پشیمان ہوں اور اپنی غلطی پر معافی کا طالب۔ میں نے آپ کو نہ پہچانا ورنہ خاطر تواضع میں کوتاہی نہ ہوتی۔" اس نے جواب دیا۔

"معافی کی ضرورت نہیں لیکن تمہارا یہ کہنا کہ مجھے پہچاننے پر میری خاطر تواضع کرتے۔ یہ بہت گری ہوئی بات ہے۔ کوئی بھی مہمان ہو، اس کی مہمان داری میں کسر اٹھا نہ رکھنی چاہیے۔ اگر مہمان کوئی بزرگ یا عزیز ہے تو یہ مہمان داری اس کا حق ہے۔ اگر مہمان کوئی اجنبی یا معمولی شخص ہے تو اس کی خاطر تواضع کو واقعی مہمان داری

سمجھا جائے گا۔"

توبیہ رحمن۔ بتول

اچھے حکمران،

فضیل بن عیاضؒ کہتے ہیں۔
"اگر میں مستجاب الدعوات ہوتا تو اللہ سے دعا کرتا یا اللہ! ہمیں اچھے حکمران نصیب فرما۔ اگر حکمران اچھے ہوں تو شہر سرسبز و شاداب اور پُر رونق ہو جاتے ہیں۔ لیکن اگر حکمران برے ہوں تو وہ اپنی خیانتوں اور مظالم کے ذریعے بستیاں اُجاڑ دیتے ہیں اور خزانے خالی کر دیتے ہیں۔"

صبیحہ شوکت۔ لاہور

تنقید،

ایک نوجوان نو بیاہتا جوڑے کے گھر کے سامنے نئے پڑوسی آئے۔ اس جوڑے کی بیوی کی عادت تھی کہ وہ ہر ایک پر تنقیدی نظر رکھتی تھی۔ ان کے ڈائننگ ہال سے سامنے والوں کا گھر صاف نظر آتا تھا۔

ایک دن جب وہ دونوں ناشتے کی میز پر بیٹھے ناشتا کر رہے تھے تو بیوی نے دیکھا کہ سامنے والوں نے کپڑے دھو کر باہر بالکونی میں پھیلائے ہوئے ہیں۔

"یہ لوگ کتنے خراب اور گندے کپڑے دھوتے ہیں۔"
بیوی اپنے شوہر سے بولی۔ "ان کو چاہیے کہ اپنا صابن تبدیل کریں۔ یا کم از کم کسی سے سیکھ ہی لیں کہ کپڑے کس طرح دھوئے جاتے ہیں۔"

شوہر نے نظریں اٹھا کر باہر کی طرف دیکھا لیکن خاموش رہا۔

ہر بار جب بھی ان کے پڑوسی اپنے کپڑے دھو کر پھیلاتے، وہ گھر اور ان کے کپڑوں کی دھلائی ہمیشہ ہی اس خاتون کی تنقید کا نشانہ بنتے رہتے۔

ایک دن وہ صاف کپڑے دیکھ کر حیران رہ گئی اور اپنے شوہر سے بولی۔

"دیکھا! بالآخر انہوں نے سیکھ ہی لیا کہ کپڑے کیسے دھوئے جاتے ہیں۔ شکر ہے کہ آج ان کے کپڑے صاف ہیں۔"

شوہر نے اپنی بیوی کی طرف غور سے دیکھا اور بولا۔
"آج صبح میں جلدی اٹھ گیا تھا اور میں نے اپنے ڈائننگ ہال کی وہ کھڑکی صاف کی ہے جہاں سے تم سامنے والوں کو دیکھتی تھیں۔"

بالکل ایسا ہی ہماری روزمرہ زندگی میں ہوتا ہے۔ خرابی ہمارے اندر ہوتی ہے اور ہم دوسروں کو موردِ الزام ٹھہراتے ہیں۔

نمرہ، اقراء۔ کراچی

غم،

- جب اللہ تعالیٰ نے خلقت کو رزق تقسیم کیا تو غم جواں مردوں کے حصے میں رکھا اور انہوں نے اسے شکریے کے ساتھ قبول کیا۔
(ابوالحسن خرقانی)
- ہر شے کا غم کھانا، مومن کے لیے باعث فضیلت ہے۔ بشرطیکہ کسی گناہ کے سبب سے نہ ہو۔
(حضرت جنید بغدادیؒ)
- جس کو اللہ تعالیٰ مقبول کرتا ہے، اس پر ظالم کو مسلط کرتا ہے، جو اس کو رنج دیتا ہے۔
(حضرت بایزید بسطامیؒ)
- لوگوں کو تین باتوں سے غم ملتا ہے۔ پیش از وقت چاہتے ہیں۔ بیش از قسمت مانگتے ہیں اور دوسروں کے مال کو اپنا بنانا چاہتے ہیں۔
(اقلیدس)
- تمہاری شادمانی دراصل تمہارا غم ہے جسے بے نقاب کر دیا گیا ہے۔
(خلیل جبران)
- جب تو کوئی غم دیکھے تو استغفار کر۔ غم خالق کے حکم سے آتا ہے تو اپنے کام میں لگا رہ۔

عذرا، اقصیٰ ناصر۔ کراچی

زندگی،

زندگی صرف نیوٹن ہی نہیں زندگی ملٹن بھی ہے

زندگی صرف حاصل ہی نہیں ایثار بھی ہے۔ ہرن کا گوشت الگ حقیقت ہے چشمِ آہو الگ مقام ہے زندگی کارخانوں کی آواز ہی نہیں احساسِ پرواز بھی ہے زندگی صرف میں ہی نہیں زندگی وہ بھی ہے۔ تو بھی ہے زندگی میں صرف مشینیں ہی نہیں، چہرے بھی ہیں۔ متلاشی نگاہیں بھی زندگی مادہ ہی نہیں روح بھی ہے اور سب سے بڑی بات زندگی خود ہی معراجِ محبت بھی ہے۔

(دل، دریا، سمندر۔ واصف علی واصف)

فوزیہ ثمر۔ گجرات

بڑے آدمی،

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بڑے آدمی انعام کے طور پر دیے اور سزا کے طور پر روک لیے جاتے ہیں عطا تو اس کے حق میں ہوتی ہے جو حق دار ہو۔ آخر قدرت ایک سپاس ناآشنا قوم کو بڑے آدمی کیوں عطا کرے۔ اسے اپنے عطیے کی رسوائی اور بےقدری ناگوار گزرتی ہے۔

(مختار مسعود کی قحط الرجال سے اقتباس)

ناہید راشد۔ کراچی

حکیم لقمان نے کہا،

میں نے زندگی میں مختلف دواؤں سے لوگوں کا علاج کیا۔ مگر اس طویل تجربے کے بعد میں نے سیکھا کہ انسان کے لیے سب سے بہترین دوا محبت اور عزت ہے۔ کسی نے پوچھا۔

"اگر یہ اثر نہ کرے تو؟"

وہ مسکرائے اور بولے۔

"دوا کی مقدار بڑھا دو۔"

مدیحہ نہید۔ کراچی

عالمانہ فراست،

حضرت امام احمد بن حنبلؒ اور حضرت امام شافعیؒ دونوں جامع مسجد میں تھے کہ ناگہاں ایک اجنبی مسجد میں داخل ہوا تو حضرت امام احمد بن حنبلؒ نے فرمایا کہ میری فراست یہ کہتی ہے کہ یہ شخص "لوہار" ہے۔"

"اور میری فراست یہ کہتی ہے کہ یہ شخص "بڑھئی" ہے۔ امام شافعیؒ نے فرمایا۔

یہ شخص جب نماز سے فارغ ہو گیا تو لوگوں نے اس سے دریافت کیا کہ تمہارا پیشہ کیا ہے؟"

اس نے بتایا۔ "سالِ گزشتہ تک تو میں بڑھئی کا کاروبار کرتا رہا مگر اس سال میں نے "لوہاری" کا پیشہ اختیار کر لیا ہے۔"

حیرا نوشین۔ منڈی بہاؤالدین

سیکھنے کی بات،

ایک قافلہ ایک اندھیری گلی سے گزرا۔ ان کے پاؤں میں کنکریاں چبھیں۔ کچھ لوگوں نے اس خیال سے کہ یہ کسی اور کو بھی چبھ سکتی ہیں، نیکی کی خاطر اٹھا کر جیب میں رکھ لیں۔ کچھ نے زیادہ اور کچھ نے کم۔ جب اندھیرے سے باہر آئے اور دیکھا تو وہ ہیرے تھے۔ جنہوں نے اٹھائے وہ پچھتائے کہ کم کیوں اٹھائے۔ جنہوں نے نہیں اٹھائے وہ بھی پچھتائے۔ دنیا کی زندگی کی مثال اس اندھیرے کی ہے۔ نیکیاں کنکریوں کی طرح ہیں۔ اس زندگی میں جو بھی نیکی کرے گا وہ آخرت میں ہیرے جیسی ہو گی اور انسان ترسے گا کہ زیادہ کیوں نہیں کی۔

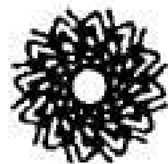
فوزیہ ثمر بٹ۔ ثانیہ عمران۔ گجرات

وقت بھی مرتا ہے

وقت پتا نہیں جان دار ہوتا ہے یا بے جان لیکن مر جاتا ہے۔ جیسے مردے کو دوبارہ زندہ کرنا ناممکن ہے اسی طرح ہم لاکھ چاہیں تو بھی گزرے لمحے کو پھر سے جی نہیں سکتے۔

ہر لمحہ ایک مکمل زندگی ہے۔ لمحے کو جینا ہی دراصل زندگی جینا ہے۔

نیلم ملک



خالدہ جیلانی

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ

شائستہ اکبر ـــــــ گدو کالونی

تیری بزم دل تو اجڑ چکی، میرا فرش جاں تو سمٹ چکا
سبھی جا چکے مرے ہم نشیں مگر ایک شخص گیا نہیں
بس کارواں سرِ رہگزر، میں شکستہ پا ہوں تو اس لیے
کہ قدم تو سب سے ملا لیے، مرا دل کسی سے ملا نہیں

عظمی شفیق ـــــــ جڑانوالہ

ہاں ملتی آیام ابھی اور بڑھے گی
ہاں اہل ستم مشق ستم کرتے رہیں گے

ماریہ جہانگیر ـــــــ کبیروالا

اک نگاہ برفیلی، ایک دل پتھر سا
آدمی نہیں مرتا صرف خون بہنے سے

حیا بنگش ـــــــ کوہاٹ

خوشی کی بات نہیں ہے کوئی فسانے ہیں
ورنہ عذر نہ تھا آپ کو سنانے ہیں

ہما بنگش ـــــــ کوہاٹ

اے شخص! میں تیری جستجو سے
بے زار نہیں، تھک گیا ہوں

شکیلہ زر ـــــــ لالہ موسیٰ

نگاہ قیس سے دیکھو ہمیشہ حسن لیلی کو
صنم جیسا بھی ہو، جس کا بھی ہو، بے مثال ہوتا ہے

حمیرا قریشی ـــــــ لاہور

چکنا چور ہو جاتا ہے آبگینہ وفاؤں کا
کنکر بے یقینی کا جو اک بار لگ جائے

درِ نایاب کنول ـــــــ تلہ گنگ

منافقتوں کا نصاب پڑھ کر محبتوں پہ کتاب لکھنا
بہت کٹھن ہے خزاں کے ماتھے پہ داستانِ گلاب لکھنا

انجل ـــــــ ڈہرکی

ہم ڈہری اذیت کے ہیں گرفتار مسافر
پاؤں بھی ہیں شل ذوقِ سفر بھی نہیں جاتا

نخبہ اکرم ـــــــ گاؤں کوئیکی

جگر ہو جائے گا چھلنی یہ آنکھیں خون روئیں گی
وصی بے فیض لوگوں سے نبھا کر کچھ نہیں ملتا

نمرہ، اقرأ ـــــــ کراچی

بچھڑا تھا جس غرور سے وہ بھی تو یاد کر
آنکھوں میں تیری آج یہ آنسو فضول ہیں

صائمہ عمران ـــــــ وہاڑی

اپنی خاموشیوں میں پنہاں تھے
لوگ باتوں کے درمیاں کھلے

افشاں غلام ـــــــ کراچی

ہمارے پاؤں الٹے تھے فقط چلنے سے کیا ہوتا
بہت آگے گئے لیکن بہت پیچھے نکل آئے

سعدیہ ہاشمی ـــــــ کراچی

زندگی تیرے تعاقب میں ہیں لوگ
اتنا چلتے ہیں کہ مر جاتے ہیں

اقرأ ملک ـــــــ گوجرانوالہ

میری زندگی کے چراغ کا یہ مزاج کوئی نیا نہیں
ابھی تیرگی، ابھی روشنی، نہ جلا ہوا، نہ بجھا ہوا

نادیہ مہر علی ـــــــ لاہور

پھر آج مسکرا کر انہوں نے کیا سلام
پھر اک ذرا سی آس پہ جینا پڑا مجھے

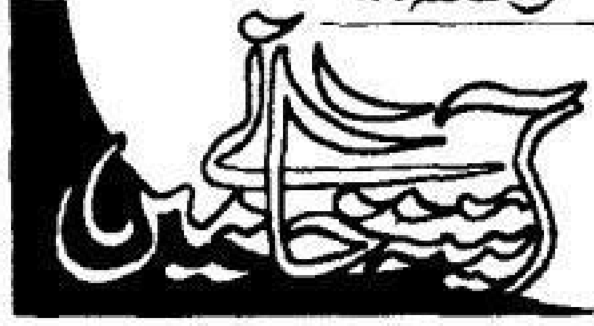
نگہت ذوالفقار ـــــــ کراچی

بہت سوچا بہت سمجھا بہت ہی دیر تک پرکھا
تنہا ہو کر جی لینا محبت سے تو بہتر ہے

زینت پروین ـــــــ کراچی

کہاں لے جاؤں گا تجھ کو شب تاریک میں اس وقت
اسے میرے دکھ! میں بے بس ہوں میرے پہلو میں ہی سو جا

واصفہ سہیل





سنہری دور

ماہ نور بلوچ کہتی ہیں کہ "میں اس لحاظ سے خوش قسمت ہوں کہ پاکستانی فلم انڈسٹری کی بحالی میں میرا بھی تھوڑا بہت حصہ ہے۔ (اب "میں ہوں شاہد آفریدی" اتنی بھی ہٹ نہیں ہوئی کہ آپ....؟) ماہ نور نے مزید کہا کہ پاکستانی فلم انڈسٹری کا سنہری دور لوٹ آیا ہے۔ (ایک فلم سے ہی اتنی خوش فہمی.... واہ جی واہ) اور میری فلم کو میری سوچ سے بھی زیادہ رسپانس ملا ہے۔ (آپ کی سوچ اتنی....؟) اب ہماری فلم انڈسٹری میں معیاری اور اچھی فلمیں بن رہی ہیں (کیا آپ ان میں کام کر رہی ہیں اس لیے....؟) جبکہ ڈراما انڈسٹری میں بھی میرے کام کو سراہا گیا ہے (کام کو یا....؟)

انہوں نے فلم میں اپنے آئٹم سونگ کے متعلق کہا کہ اس پر بہت تنقید ہوئی لیکن میں سمجھتی ہوں کہ اب وہ دور گزر گیا جب پاکستانی فلم میں بھاری بھرکم ہیروئنز کھیتوں میں ڈانس کے نام پر چھلانگیں لگاتی تھیں۔ (ماہ نور! آپ نے عمر دار ہیروئنز کا لفظ نہیں استعمال کیا... کیونکہ آپ بھی تو.....)

زندہ قوم

عافیہ صدیقی پر امریکی عدالت میں کوئی بھی جرم ثابت نہ ہو سکا' اس کے باوجود انہیں چھیاسی سال کی سزا سنائی گئی۔ فیصلے کے بعد کمرہ عدالت میں "شیم شیم" کی صدائیں گونجنے لگیں ہماری حکومت کی بے حسی پر وہاں کسی نے کہا کہ "شی از وا ڈاٹر آف آ ڈیڈ نیشن" (یہ ایک مردہ قوم کی بیٹی ہے) لیکن اگر دیکھا جائے تو قوم مردہ نہیں ہے آج بھی عافیہ کے لیے آواز بلند کرنے والوں کی کمی نہیں ہے۔ کراچی میں مزار قائد پر ہر مکتبہ فکر کے لوگوں نے متفق و متحد ہو کر اس کے لیے آواز اٹھائی۔ آٹھ فروری کو کراچی میں ہونے والا قومی جرگہ اس کی تازہ مثال ہے جس میں کراچی کے لوگوں کی کثیر



تعداد نے شرکت کی اس کے علاوہ ملک کے دوسرے شہروں سے بھی لوگ اس میں شریک ہوئے، جبکہ وزیر اعظم نواز شریف صاحب کا بھی فوزیہ صدیقی کے پاس فون آیا اور انہوں نے عافیہ کے لیے نیک تمناؤں کا اظہار کیا اور کہا کہ وہ اللہ سے عافیہ کے لیے دعا کرتے ہیں (اور امریکا سے؟)

تبدیلی

کہتے ہیں کہ ماں بننے کے بعد لڑکی میں بہت تبدیلیاں آجاتی ہیں لیکن میرا میں اتنی تبدیلی آئے گی یہ شاید کسی کے تصور میں بھی نہ ہو۔ اب دیکھیں میرا کہتی ہیں کہ ماں بننے کے بعد انہیں اپنی ذمہ داریوں کا احساس ہو گیا ہے۔ شادی کے بعد انہوں نے متعدد آفرز بولڈ شوٹس کی ٹھکرا دی ہیں اور اب وہ صرف ماڈلنگ اور ڈراموں میں کام کریں گی۔ ان کا جیون ساتھی انہیں بہت پیار کرتا ہے اور وہ ان پر اعتماد بھی کرتا ہے (میرا اس اعتماد کو قائم رکھنا) میرا نے مزید کہا کہ "شادی سے پہلے جو بولڈ شوٹس کروا دیے وہ میری غلطی ہے اب میں ایک شادی شدہ عورت ہوں اور ماں بننے کے بعد مجھے احساس ہوا ہے کہ وہ میری بہت بڑی غلطی تھی اور غلطی انسانوں سے ہی ہوتی ہے (دیکھا! میرا کے منہ سے یہ باتیں.... حیرت ہوئی ناں؟)

دکھ

ہمارے ہاں ہر چیز، ہر بات ہر سانحہ کو کیش کرنے کی روایت سی بن گئی ہے۔ اب دیکھیں سانحہ آرمی اسکول پشاور پر اداکار حمزہ علی عباسی نے ایک ٹیلی فلم بنانے کی تیاریاں شروع کر دی ہیں اور ان دنوں وہ فلم میں کام کرنے کے لیے معصوم بچوں کی تلاش میں ہیں۔ اس کے علاوہ بھی کئی ٹی وی پروڈیوسر اس سانحے پر ڈرامے بنانے کی تیاری کر رہے ہیں۔ اس سانحے کی اہمیت لوگوں کے دلوں میں کم نہ ہو جائے اس لیے علی ظفر نے بھی ایک گانا بنا لیا جس میں ان کے ساتھ ساتھ بہت سارے آرٹسٹ شریک ہوئے۔ یہ سب تو ٹھیک ہے لیکن اگر دیکھا جائے تو ہمارے ملک میں ایک سے بڑھ کر ایک سانحہ ہوا ہے۔ ذرا بتلائیے! حمزہ علی عباسی کس کس پر فلم بنائیں گے؟ ہونا تو یہ چاہیے کہ دہشت گردی کی جڑ ختم کی جائے۔

احتیاط

"جرنل آف مائیکرو اسکوپی اینڈ الٹرا اسٹرکچر" میں شائع ہونے والے ایک تحقیق کے مطابق وائی فائی سگنلز بچوں کے لیے انتہائی خطرناک ہیں۔ یہ سگنلز اس حد تک نقصان دہ ہیں کہ حاملہ عورت بھی اس سے محفوظ نہیں، تحقیق کرنے والوں کا کہنا ہے کہ پریگننسی کے دور سے گزرنے والی مائیں اپنے ساتھ موبائل فونز نہ رکھیں کیونکہ ان سے نکلنے والی شعاعیں ان کے بچوں کے لیے زہر قاتل ہیں۔ بڑوں کی نسبت بچوں کے دماغ وائی فائی اور موبائل سے نکلنے والی شعاعوں کو زیادہ جذب کرتے ہیں۔ ہم اپنے بچوں کو عموماً" دواؤں اور کیڑے مکوڑے مارنے والی دواؤں کے اسپرے اور اسی طرح کی چیزوں سے تو بچاتے ہیں لیکن موبائل فونز اور وائی فائی کے خطرے سے بھی بچانے کی ضرورت ہے۔

کچھ اِدھر اُدھر سے

☆ سانحہ پشاور میں شہید ہونے والے بچوں کی یاد میں اتنے تعزیتی اجتماع نہیں ہوئے جتنی زیادہ شمعیں روشن کی گئیں۔ شہدا کے لیے دعا ہوتی ہے، انہیں خراج عقیدت پیش کیا جاتا ہے مسلمانوں کی تاریخ میں ہمیشہ یہی ہوا ہے "کربلاؤں پر ماتم ہوتے ہمیشہ سنا لیکن کربلا پر چراغاں کرتے کبھی نہیں دیکھا۔ نجی سیاسی سول سوسائٹی نے سڑکوں پر اتنی موم بتیاں روشن کی ہیں کہ چراغاں کا سماں بندھ گیا۔

(عبداللہ طارق سہیل۔ نئی بات)



پہلی بارش

مصنف: خولیو لیامازاریس
ترجمہ: اجمل کمال

جاننے کو حق جاننے کے لیے' جاننے کی جستجو پہلا مرحلہ ہے۔ ذوق انتخاب اور معیار کے مدارج طے کرنے کے بعد حاصل ہونے والا لطف' ذہن کو پرکھ کی صلاحیت اور فہم کو نئے جہان کا عطا ہونا اس کا ثمر بے مثل ہے۔

المیہ ہر دور میں زندگی کی ایسی حقیقت رہا ہے' جس کو تسلیم نہ کرنے سے اس کی حقیقت کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ماسوائے اس کے کہ آپ اسے فراموش کردیں۔

زندگی کی کہانی کا انجام موت کے بغیر ناممکن ہے اور یہی وہ حقیقت ہے' جس کا سامنا ہم کرنا نہیں چاہتے مگر ہمیں کرنا پڑتا ہے۔

المیہ۔۔۔ جدائی سے عبارت ہے اور اس کے ظہور کے بھی اتنے ہی امکان موجود ہیں جتنے زندگی کے۔۔۔ بعض ایسے قدرت کے قلم کا شاہکار ہوتے ہیں اور بعض انسان کے فیصلوں کا نتیجہ۔۔۔ جو بھی۔۔۔ جیسے بھی۔۔۔ المیہ روز ازل سے انسانی رویے کے ارتقا اور بقا کا امتحان بن کر ظاہر ہوتا ہے۔

ایک لکھنے والا اگر تحریر کے طلسماتی کرشمے جیسا ہنر رکھتا ہے تو موضوعات کا انتخاب اس کی ہنر آزمائی کا منفرد اظہار بن جاتا ہے۔ زندگی سے بھرپور چمکتے رنگوں اور چہروں' ڈوبتے ابھرتے رنگوں کے بجائے تنہائی' خاموشی اور ویرانی میں گھرے ایک اکیلے شخص کی خود کلامی کو اپنے اظہار کا ذریعہ بنانا۔۔۔ اپنی نوع کا منفرد انتخاب ثابت ہوتا ہے۔

ہسپانوی زبان کا شاہکار ناول "پہلی بارش" ایک ایسے اکیلے کی روداد ہے' جو نہ صرف انفرادی تاثرات کا بیانیہ ہے' بلکہ اجتماعی اہمیت کے مسائل کا بھی موثر اظہار ہے۔

"اینائی۔۔۔" کا المیہ ایک ایسے گاؤں کا المیہ تھا' جسے اس کے مکینوں نے بہتر زندگی کے انتخاب کا حق استعمال کرتے ہوئے الوداع کہنا شروع کیا۔ حتی کہ گاؤں میں خالی مکانوں' ویران گلیوں کی وحشت زدہ فضا میں محض دو نفوس بچ رہے' جن کے لیے یہ انتخاب ناقابل قبول تھا۔ گاؤں نہ چھوڑنے کا فیصلہ' ان کی زندگی کو بیک وقت انفرادی اور اجتماعی تنہائی' وحشت اور ویرانی عطا کرنے والا تھا۔

"حقیقت یہ ہے کہ اینائی گاؤں کے در و دیوار زندہ رکھنے کی میری تمام کوششوں کے باوجود' یہ کبھی کا مر چکا ہے۔ یہ اسی وقت مر گیا تھا جب بینا اور میں یہاں اکیلے رہ گئے تھے' بلکہ ہمارے آخری پڑوسیوں کی موت یا نقل مکانی سے بھی پہلے۔"

ماضی سے خوف اور مستقبل سے اندیشے وابستہ ہوا کرتے ہیں۔ مگر ایک ختم شدہ امکان اور ڈھے جانے والی امید کے ساتھ زندگی کو بسر کرنا؟

"میں نے اینائی کے زوال کے سست رفتار' متواتر عمل کو ایک ایک دن کر کے جیا ہے۔ میں نے مکانوں کو ایک ایک کر کے شکستہ ہوتے دیکھا ہے اور اس عمل کا راستہ روکنے اور اپنے مکان کو اپنا مقبرہ بننے سے باز رکھنے کی کوشش کی ہے۔ ان تمام برسوں میں۔۔۔ میں بے بسی سے پاس کھڑے ہو کر اس طویل' سفاک جان کنی کی اذیت کو دیکھتا رہا ہوں اور اب جب میں خود موت اور فراموشی کی گگر پر کھڑا ہوں۔ میرے کانوں میں جو آواز گونج رہی ہے وہ کائی کی تہ کے نیچے دبے

پتھروں کی چیخوں اور گل سڑ کر مٹتے ہوئے لکڑی کے شہتیروں اور دروازوں کی ختم نہ ہونے والی سسکیوں کی آواز ہے۔"

یہ ناقابل یقین واقعہ اینائی کے ساتھ ساتھ اکیلے شخص کا بھی المیہ تھا۔ امکان سے باہر کی چیز ہمارے لیے ہمیشہ ناقابل یقین ہوتی ہے۔ مگر۔۔۔ دنیا ہی نہیں 'امکان کا دائرہ بھی اتنا ہی وسیع ہے۔

دائرے کی دنیا میں دوسرے زاویے پر موجود زندگی بھی انسانی وجود سے عبارت ہے۔ وہ انسان اپنی وضع قطع، بول چال رہن سہن اور عادت و اطوار میں ہم سے مختلف سہی، مگر بنیادی جبلت اور جذبات میں یکساں شراکت رکھتے ہیں۔ دیگر زبانوں کے ادب کا مطالعہ ہمیں ان کے مسائل، ادراک اور ذوق اظہار کے فہم تک رسائی کا موقع تو دیتا ہی ہے' اس فہم کے آئینے میں اپنے عکس کو ڈھونڈنے کا ذریعہ بھی بنتا ہے۔

ترجمہ نگار اجمل کمال کا کہنا ہے کہ۔۔۔

"دنیا جہان کے ادیبوں کی تحریروں سے آشنا ہونا۔۔۔ اس آشنائی کے لطف میں اوروں کو شریک کرنا' ان کا ترجمہ کرنا' ان کی تحریروں سے حاصل کی ہوئی روشنی میں اپنے زمانے' اپنے خطے اور اپنی زبان کے ادب کو پرکھنا اور اس کے مقام اور اس کی سمت کا کھوج لگانے کی کوشش کرنا' یہ سب پڑھنے ہی کے عمل کا حصہ ہے اور اسی کے باعث لکھنے والے نئے نئے مطالبوں کا سامنا کرتے ہیں۔"

کہانی غیر معمولی اور چونکا دینے والے بیانیے سے شروع ہوتی ہے۔ عموماً یہ آغاز ماضی کی کسی بھی روایت سے ہوتا ہے' چاہے کتنا ہی پرتجسس کیوں نہ ہو۔۔۔ مگر معدوم ہوتے اینائی کے آخری دم توڑتے باشندے کے پاس خود کلامی اور خود ساختہ صورت گری کے سوا چارہ ہی کیا تھا؟

"دور اس ڈھلان پر جوان کی نظروں کے سامنے ہوگی۔ اینائی گاؤں کے مکانوں کی چھتیں اور درخت' چٹانوں اور چیش دالانوں کے درمیان سے بمشکل دکھائی دیتے ہوئے اب رات کے ابتدائی سایوں میں گھلنے لگے ہوں گے۔ وہ سائے جو یہاں ہمیشہ بہت پہلے پہنچ جاتے ہیں۔ جوں ہی سورج مغرب میں ڈوبنے کو ہوتا ہے۔ کھڑکیوں اور ننگی چھتوں پر سورج کی بچی کھچی شعاعیں کہیں کہیں روشنی کے اکا دکا قطعے بنا رہی ہوں گی۔ اس کے سوا ہر طرف مکمل سکوت اور سناٹا چھایا ہوا ہوگا۔ نہ کوئی آواز' نہ دھوئیں کا کوئی مرغولہ' نہ کسی گلی میں کسی انسانی وجود کا سایہ۔"

ہر وہ چیز جو وجود رکھتی ہے۔ قابل بیان ہوتی ہے۔ مگر ویرانی' معدوم شدہ امید اور خود فریبی سے بھرے ہوئے تنہائی' بھوک اور یادداشت کے دھوکے جھیلتے شخص کے احساس کو ہر زاویے سے پیش کرنا' اپنی نوع میں ندرت بیان کا انوکھا نمونہ ہے۔ تحریر اپنے لکھنے والے کے احساس کی اتھاہ گہرائی میں ڈوب کر ابھرتی ہے۔۔۔ تب ہی اپنے پڑھنے والے کے فہم پر مہربانی سے دستک دیتی ہے۔

اس تحریر کو پڑھنے کے تجربے سے گزرنے کے بعد ہی مجھ پر یہ وا ہوا کہ کائی' کیچڑ' زنگ اور سیلن بھی وجود رکھتے ہیں اور ان کا حاوی ہو جانا کس طرح آبادی کو بربادی میں بدل دیتا ہے۔ آباد رہ چکی بستی کو رفتہ رفتہ ویرانی میں ڈھلتے دیکھنا' اس عمل کو روکنے کی ناکام 'مگر کوشش کرتے رہنا۔

"جب تک گاوین اور کولو اینائی میں رہے تب تک ہم تینوں گاؤں کو بے توجہی کا شکار ہونے سے بچانے کی کوشش کرتے رہے۔ ہم سب مل کر آبپاشی کی نالیوں کو صاف کرتے' دیواروں اور آہنی جنگلوں کی مرمت کرتے' بلکہ کبھی کبھی تو ایسے مکانوں میں جو گرنے کے قریب ہوتے' شہتیروں کو مضبوط کرنے یا دیواروں کے رخنے بھرنے کا بھی کام کرتے۔"

اینائی کے اس آخری باشندے کی تمام تر گفتگو اور تذکروں کا مخاطب قاری ہے۔ مگر اس سارے تذکرے میں ہمیں اس کا نام معلوم نہیں ہو پاتا۔

یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ سناٹے کو بیان عطا کرنے

والے قلم' اس ایک شخص کو نام دینا بھول گیا ہو؟

کیا اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ فراموش ہونے والی حقیقت کا کوئی نام نہیں ہوتا؟ دھیرے دھیرے دوستوں' ہمسایوں اور آخر کار شریک حیات کی دائمی جدائی کے وار سہہ کر اس نے خود کو تقدیر کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔

"پھر بپنا والا واقعہ پیش آیا اور پھر پورا گاؤں۔ جیسے میرے تخیل کے باہر اس کا وجود ہی نہ ہو۔ زنگ اور بے توجہی کے شدید' سفاک حملے کی زد میں آ گیا۔ سب لوگ میری بیوی سمیت مجھے چھوڑ گئے تھے' اپنا ئی مر رہا تھا اور میں اس عمل کو روکنے کے لیے کچھ بھی نہ کر سکتا تھا اور اس خاموشی کے عین وسط میں' میں اور کتیا' دو اجنبی سایوں کی طرح ایک دوسرے کو تکتے رہتے تھے۔ حالانکہ ہم دونوں کو اچھی طرح معلوم تھا کہ ہم میں سے کسی کے پاس وہ جواب نہیں ہے جس کی ہمیں تلاش ہے۔"

"میں اس تقدیر کے رحم و کرم پر تھا جو زنگ اور کائی نے میرے لیے مقرر کر رکھی تھی۔"

لیکن کیا یہ واقعی تقدیر ہوتی ہے جو ہمیشہ آدمی پر مسلط ہو جاتی ہے؟ یا کچھ کچھ انسان خود بھی اس کا شریک کار ہو جاتا ہے؟ سیدھی سی بات جو ہم سوچ سکتے ہیں وہ یہ کہ۔۔۔ جو راستہ سب نے اپنایا۔۔۔ وہ کیوں اختیار نہ کیا گیا؟ لیکن ہم میدانوں کے رہنے والے' سیدھے اور ہموار راستوں کے عادی' سہولت کو آسانی سے اختیار کر لینے کے عادی لوگ ہیں۔۔۔ شاید پہاڑوں پر بسنے والے لوگ ہم سے مختلف زندگی کا تجربہ کرتے ہوں۔ اگر ایسی غیر معمولی وابستگی رکھنے والے لوگ ناپید ہو جائیں تو غیر معمولی کہانیاں کس طرح جنم لیں گی؟ پھر سوال کس طرح پیدا ہوں گے کہ۔۔۔ کیوں۔۔۔ یہ کیسے ممکن ہے۔

"یہ نہیں ہو سکتا۔" کا کلیہ دہرایا جانا ممکن ہے۔۔۔ مگر کچھ اور ممکنات کو اسی دنیا' اسی خطے' اسی تقدیر سے واسطہ پڑتا رہتا ہے۔ ہمارے علم میں نہ آنا ہماری بے خبری ہو سکتی ہے۔ ان کے نہ ہونے کی توجیہہ ہرگز نہیں۔

بپنا نے وحشت' ویرانی اور اپنے بچوں سے جدائی کے غم میں سپر ڈالتے ہوئے خودکشی کر لی۔ چار سالہ سارہ نے سانس کے عارضے سے مر کر نجات پائی اور آندریاس نے بھی گاؤں کے دوسرے لوگوں کی طرح خیرباد کہنے کا فیصلہ کر لیا۔

"آندریاس کا جانا صرف ایک بیٹے کا رخصت ہونا نہ تھا' بلکہ اس گھر کے قائم رہنے کے آخری امکان اور ہمارے بڑھاپے میں۔۔۔ جو اب خوف ناک حد تک قریب آ پہنچا تھا۔ مدد اور رفاقت کی آخری امید کا رخصت ہونا تھا۔"

ماں۔۔۔ باپ کا بڑھاپا اور بیٹوں کا سہارا۔۔۔ کچھ حقیقتیں خطوں کی قید سے ماورا ہوتی ہیں۔۔۔ اور اسی لیے وہ انسانوں کو جذبات کی قدر مشترک کے رشتے میں پرونے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔

"موت کی نشانیاں ٹھوس صورت رکھتی ہیں۔

قبر۔۔۔ اس پر بولے ہوئے لفظ' یاد کے چہرے کو تازہ کرنے والے پھول اور سب سے بڑھ کر موت کے حتمی پن کا مطلق شعور جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مانوس ہوتا جاتا ہے اور جانے والے شخص کی عدم موجودگی جانی پہچانی عادتوں میں شامل ہو جاتی ہے۔ لیکن کسی شخص کا مفقود الخبر ہو جانا ایسی چیز ہے جس کی حدیں نہیں ہوتیں۔۔۔ یہ کسی بھی ٹھوس حالت کا بالکل الٹ ہوتا ہے۔"

معلوم ہوا کہ دوسرا بیٹا کامیلو' خانہ جنگی کے دوران لاپتا ہو چکا تھا اور جس کی موت کی تصدیق بھی نہ ہو سکی تھی۔ کیا یہ بھی ایک ایسی حقیقت نہیں' جو دنیا میں بہت سے لوگوں کو کسی نہ کسی صورت جھیلنی پڑتی ہے کہ ان کے پیارے "لاپتا" قرار دے دیے جاتے ہیں۔۔۔ اور پتا مانگنے والے التجائیں کرتے رہ جاتے ہیں کہ اور کچھ نہیں تو قبر کا پتہ ہی مل جائے۔

آدمی کے لیے آدمی سے زیادہ خوف ناک کوئی اور

شے نہیں ہوتی۔ خاص طور پر جب وہ دوسرا آدمی وہ خود ہو۔

ویسے آپ کا کیا خیال ہے؟ خود کلامی تنہائی کی انتہا پر ہی پیش آتی ہے۔۔۔ وہ تنہائی چاہے حقیقی ہو یا محض ذہنی۔۔۔ ہوتی بہرحال تنہائی ہے جس کا فطری ردعمل خود سے باتوں اور خود فریبی پر **مشتمل تخیلاتی** منظر کی صورت گری میں ظاہر ہوتا ہے۔۔۔ کہ انسان اپنے پاگل قرار دیے جانے کے خدشے کے باوجود دوسرا ہٹ کے احساس اور سہارے کا متلاشی و طلب گار رہتا ہے۔

ایسا نہیں ہے کہ انسان کو مصیبتوں کے چناؤ پر مکمل اختیار ہے، لیکن پھر بھی کبھی کبھی مصیبتیں ایکا کر لیتی ہیں۔ (کیا وہ ایسا نہیں کرتیں؟) تو سب کچھ تقدیر کا کیا دھرا قرار دینا، انسانوں کے لیے فراموشی اور فرار ہی کا ایک راستہ بن جاتا ہے۔

"بینا کی موت کے بعد یادداشت ہی میرے زندہ رہنے کا واحد جواز تھی اور میری زندگی کا تمام منظر اس پر مشتمل رہ گیا تھا۔ ان تمام برسوں کے دوران وہ میں نہ تھا جو آگ کے پاس بیٹھا رہا۔ یا گلی کے کسی تنہا آوارہ کتے کی طرح گاؤں بھر میں بھٹکتا پھرا۔ وہ میں نہ تھا جو اس بستر میں داخل ہو کر خاموشی میں لپٹ جاتا اور صبح تک بارش کی آواز سنا کرتا تھا۔ ان تمام برسوں میں یہ میرا حافظہ تھا جو گاؤں بھر میں بھٹکتا پھرا۔۔۔ اور اب جب آخری رات آپہنچی ہے، جب وقت ختم ہونے کو ہے اور میرا حافظہ آخر کار یوں پگھل رہا ہے جیسے لمبے جاڑے کے بعد زمین سورج کی حدت پا کر پگھلنے لگتی ہے۔"

اینائی کے ساتھ ساتھ ہمیں ایک ایسی موت کو قریب سے دیکھنا پڑے گا، جس کا شکار ہونے والے پر قریب ہوتی اس کی چاپ سے آگاہی کا عذاب بھی مسلط ہے۔

"موت اس کہانی کا مرکزی کردار ہے اور کیا یہ کردار بہت مانوس ہونے کے باوجود۔۔۔ فراموش شدہ نہیں؟

ہر تحریر اپنے پڑھنے والے کو پیش کردہ خیال سے رائے اخذ کر کے نتیجے تک پہنچنے کا فطری تقاضا رکھتی ہے۔ ہم میں سے کتنے ہیں جو بطور قاری حوصلہ ہارے بغیر یہ سفر، یہ تقاضا پورا کرتے ہیں؟"

بطور قاری، کسی بھی نئی اور اجنبی چیز کو سمجھنے میں مشکل پیش آنا غیر قدرتی نہیں ہے، بلکہ بعض چیزوں کو سمجھنے کے لیے بار بار پڑھنا ضروری ہوتا ہے۔ اس کتاب کا حجم اور قیمت دونوں ہی مختصر ہیں، مگر اس میں موجود بے رحم حقیقتوں کی صورت گری اس لائق ہے کہ اسے شاہ کار قرار دیا جائے۔

"جاڑے کی موت" کی ترکیب سن کر دل میں ایک ایسی مخاصمت کا تاثر ابھرتا ہے جو منجمد اور مفلوج کر دینے والی یکسانیت سے بے زاری کا نتیجہ ہوتی ہے۔

"ہم سب سمجھتے ہیں کہ موت کے خیال کا خوف کے بغیر سامنا نہیں کر سکیں گے۔ کم عمری میں یہ خیال اس قدر دور کی بات معلوم ہوتا ہے، وقت میں اتنے زیادہ فاصلے پر کہ یہ فاصلہ ہی اسے ہمارے لیے ناقابل قبول بنا دیتا ہے۔ پھر جوں جوں سال گزرتے جاتے ہیں اس کا بالکل الٹ۔۔۔ یعنی موت کا قرب۔۔۔ ہمیں خوف میں مبتلا کر دیتا ہے اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے سے باز رکھتا ہے۔ دونوں صورتوں میں خوف یکساں رہتا ہے۔ معدوم ہو جانے کا خوف، فراموشی کے لامتناہی، بے انصاف سردپن کا خوف۔"

اس روداد میں آپ کہاں کہاں چونکتے ہیں۔۔۔ تحریر کی گرفت پر یا پیش آنے والے کسی واقعے کی خوف ناکی پر۔۔۔ یہ کہنا مشکل ہے۔۔۔ مگر حیرت، صدمے، دکھ اور خوف کے مرحلوں سے گزرتے ہوئے۔۔۔ ایک پڑھنے والا کہہ اٹھتا ہے کہ یہ کیسے کردار ہیں۔۔۔ جو زندہ نہیں، مگر زندہ محسوس ہونے لگے ہیں۔

"اچانک وہ درد لوٹ آیا ہے، تیز دھار، دم گھونٹ دینے والا درد۔۔۔ جیسے سانپوں کے گروہ نے میرے پھیپھڑوں میں اپنا مسکن بنا لیا ہو۔ یہ درد چند لمحوں

تک میرے پھیپھڑوں کی دیواروں کو کسی کتے کی طرح اپنے پنجوں سے کھرچتا رہتا ہے۔ پھر آہستہ بہت آہستہ، دور ہونے لگتا ہے اور اپنے پیچھے میرے سینے میں سرد، چمک دار دھوپ چھوڑ جاتا ہے۔"

چھت اور چاند۔۔۔ کھڑکی اور ہوا۔۔۔ میرے مرنے کے بعد ان سب کا کیا باقی رہ جائے گا؟ اور اگر یہ برسوں سے آنے والے لوگوں کے میری تلاش میں آنے، مجھے پالینے اور میری آنکھوں کو ہمیشہ کے لیے بند کردینے سے پہلے ہی میں مرچکا ہوا تو یہ سب چیزیں کس کی آنکھوں میں زندہ رہیں گی؟

موت ایک ایسا تجربہ ہے جس میں انسان دوسرے کو شریک نہیں کرسکتا۔ ناگزیریت کو ٹالنا کسی کے بس کی بات نہیں، مگر الوداعی لمحات میں اپنوں کی موجودگی فطری سی معلوم ہوتی ہے۔۔۔ مگر کسی بھی موجودگی کے احساس کے بغیر بھوک، بڑھاپے اور لاچاری کے ہاتھوں جان دیتے ہوئے ایک شخص کے لیے یہ مشکل لمحہ، مشکل کی بدترین صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ ایسے میں انسانی ذہن، فریب نظر کے کرشمے دکھاتا ہے کہ اسے وہ سب اپنے پاس آتے اور جاتے دکھائی دینے لگتے ہیں، جو کبھی تم کے اس مشکل سے گزر چکے ہوتے ہیں۔۔۔ مگر فریب تو زندگی سے مشروط ہیں نا۔۔۔ اٹل انجام کے وقت ان کا کیا کام؟ تو کیا پھر اس وقت ابدی سفر پر روانہ ہونے سے پہلے انسان کی حسیات پر غیر معمولی خیال وارد ہوتے ہیں؟

"اب جبکہ میری زندگی ختم ہونے کے قریب ہے اور کھڑکی کے باہر ہونے والی پہلی بارش موت کی آمد کا اعلان کررہی ہے۔"

آخری ابواب۔۔۔ معدوم ہوتی دھڑکن اور بند ہوتی آنکھوں کی تھکن۔۔۔

"پہلی بارش منظر پر غالب ہے۔"

"وقت بہت سست روی سے گزر رہا ہے اور پہلی بارش رفتہ رفتہ پسکوس کے مکان کی چھت کے سائے اور چاند کے لامحدود دائرے کو مٹاتی جارہی ہے۔

یہ وہی پہلی بارش ہے جو ہر خزاں میں برستی ہے۔ وہی بارش جو مکانوں اور قبروں کو ڈھانپ لیتی ہے۔ جو آدمیوں پر بڑھاپا لے آتی ہے۔ جو ذرا ذرا کرکے ان کے چہروں اور ان کے خطوں اور تصویروں کو ختم کرتی جاتی ہے۔"

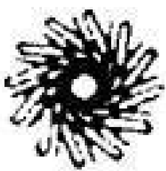
اینائی کے موسم اور مقدر پر خزاں ٹھہری ہوئی تھی۔۔۔ گرتے ہوئے مردہ پتوں نے سارے کو پیلے رنگ سے ڈھک دیا۔

خزاں۔۔۔ زوال کی علامت! درختوں کو پھر سے حیات ملنا ممکن ہے اور عین امید کی علامت۔۔۔ مگر۔۔۔ انسانی زندگی سے جھڑتے لمحوں پر بہار پلٹ کر نہیں آتی۔

معدوم ہوتے لمحوں کی داستان سنتے سنتے ہم یہ فراموش کر بیٹھتے ہیں کہ اینائی کی بربادی، آباد رہ چکنے کے بعد کا واقعہ تھی۔ یہ کسی طوفان، کسی آفت کے ملیامیٹ کردینے جیسا عمل نہیں تھا۔ حرکت اور چہل پہل سے بھرپور زندگی کا جو افراد کے مرہون منت ہوتی ہے، لوگوں کی موجودگی کے احساس سے تہی ہوتے جانا ایک سست رفتار عمل تھا۔

"ترک کردینا"، بے توجہی اور فراموشی اینائی کی بربادی کے سبب تھے تو پھر ہمارے پاس بھی نئی اینائی موجود ہیں۔۔۔ لیکن کیا ہمارے اینائی کا دکھ لفظوں میں پرونے کے لیے ہمارے پاس "خولیو لیاما زاریس" بھی ہے؟

اور ہمارے اردگرد، بہت قریب بھی ہوسکتا ہے ایک دل۔۔۔ اینائی بن چکا ہو۔۔۔ بے امکان اور ڈھے جانے والی امید کے ساتھ۔۔۔ آپ کی بے توجہی اور فراموشی کا شکار تو پھر۔۔۔ کیا آپ کو اس کی خبر ہے؟



شعاع کے ساتھ

اِدارہ

حنا کنول بیگ..... سیالکوٹ

(1) شعاع سے وابستگی کو کتنا عرصہ ہوا؟ یہ وابستگی کیسے اور کب ہوئی؟ یہ مجھے خود علم نہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے شعاع سے اپنا تعلق بہت پرانا ہے۔ شعور، آگہی کے سب راز ہم کو شعاع نے سکھائے۔ اکثر ہوا، اندر کسی کام سے گئے اور وہاں شعاع دیکھا تو بس.... وہی کے ہو رہے۔ میری دلچسپی صرف شعاع تک محدود نہیں رہی۔ کرن، خواتین ڈائجسٹ سب سے اپنائیت ہے۔ گھر والوں نے ہمیشہ ہی سے اس شوق کی حوصلہ افزائی کی۔

شعاع سے متعلق دلچسپ واقعہ.... چونکہ تعلیمی سفر کے لیے کچھ عرصہ ہاسٹل میں گزارا جو کہ بے حد خوب صورت دور تھا۔ ہاسٹل میں ہم (میری جونیئر فرینڈز) نے ایک روز مشاعرہ کرنے کا منصوبہ بنایا میں نے تیاری کے لیے شعاع کے مقبول سلسلے "شاعری سچ بولتی ہے" سے مدد لی۔ مشاعرہ رات کو ہونا تھا۔ میں نے اپنی روم میٹس اور فرینڈز کو مشاعرہ کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ ارے میں وجہ بتانا بھول گئی وہ "باذوق" تھیں۔ وہ شاعری کو جذبات واحساسات کی مشکل ترین زبان قرار دیتی تھیں خیر۔ حسب معمول جب میں مشاعرہ کر کے واپس آئی تو میری سب فرینڈز ناراض تھیں۔ میں نے ان کو منانے کے لیے بھنے چنے (جو جونیئر فرینڈ صفورا نے مجھے تھمادیے تھے) دیے۔ انہوں نے شان بے نیازی سے فوراً" قبول کر لیے اور اب ملاحظہ فرمایئے میری فرینڈ عروج کے ارشادات۔

"آپ یہ چنے مشاعرہ میں اس لیے کھاتی ہیں تاکہ اس سے درد بھرے اشعار لکھتے ہیں"

ہاہاہا... تو پھر ہوئی نا میری فرینڈز کے "اعلیٰ ذوق" کی عکاسی۔ یہ واقعہ بہت یادگار ہے جب بھی یہ سلسلہ پڑھتی ہوں بیتے دنوں کی خوب صورت یادیں تازہ ہو جاتی ہیں۔

(2) تمام دن کی مصروفیت... دن کے آغاز سے لے کر سورج ڈھلنے تک کا احوال کچھ یوں ہے کہ صبح نماز

فجر کے بعد ہزار کوشش کے باوجود بھی خود کو سونے سے روک نہیں پاتی۔ سات بجے تک اٹھ کر بینک جانے کے لیے تیار ہوتی ہوں۔ تمام دن بینک میں مصروفیت کی نذر ہو جاتا ہے۔ بینک میں حال ہی میں تعیناتی ہوئی ہے چونکہ نئی ہوں اس لیے سیکھنے کے مراحل سے گزر رہی ہوں۔ ایم اے اکنامکس بھی جاری ہے۔ بینک، پڑھائی اور ہماری جان ناتواں۔ اس قدر مصروفیت ہے کہ خود کو میسر نہیں ہوں میں۔ مغرب تک واپسی ہوتی ہے۔ رات کا کھانا کھایا، کپڑے صبح جانے کے لیے تیار کیے اور بس دن تمام، لیکن شعاع کے لیے وقت نکال لیتے ہیں۔

(3) میرے نزدیک مشکل ترین سوال ہے۔ اپنی خوبیاں اور خامیاں بتانا۔ سب سے پہلے خامیوں پر اک نظر، بے حد حساس اور بہت جلدی پریشان ہو جاتی ہوں۔ خوبیاں.... میں کسی سے زیادہ عرصہ ناراض نہیں رہ سکتی۔ کسی کو دکھی نہیں دیکھ سکتی۔ غصے میں بالکل خاموش ہو جاتی ہوں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے جس سے ناراض ہوتی ہوں یا جس پر غصہ ہوتا ہے وہی انجان، بے خبر ہوتا ہے اور پھر میرا غصہ عروج پر جا پہنچتا ہے۔

پتا پتا ' بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

سب دوستوں میں کیئرنگ مشہور ہوں۔ فرینڈز ' فیملی کو بہت اہمیت دیتی ہوں۔ ہر کسی کی برتھ ڈے یاد رہتی ہے۔ چاہے کچھ بھی ہو میں ہر کسی سے رابطے میں رہتی ہوں۔

تعریفی جملہ ... اپنی یادداشت اور جنرل نالج وسیع ہونے کی بنا پر عروج اور ماریہ کا یہ کہنا۔

"آپی! آپ سی ایس ایس ضرور کریں ' آسانی سے کلیئر کرلیں گی۔"

اتنی لائق اور قابل تو نہیں لیکن ہاں ذہین ہوں لیکن ان کا اس انداز میں سراہنا 'بہت اچھا لگا تھا۔

سر عامر کا کہنا "آپ کی قوت مشاہدہ بہت اچھی ہے۔"

مما نے کانوو کیشن ڈے پر گولڈ میڈل ملنے پر ستائش بھرے انداز میں کہا تھا۔

"میری حنا! تم نے آج میرے سب خواب پورے کردیے۔" آج بھی سیروں خون بڑھا دیتا ہے۔

ہاسٹل آنٹی عصمت کے بارے میں سنڈے میگزین میں میرا آرٹیکل "اک رشتہ 'اک کہانی" شائع ہونے پر آنٹی کی بیٹی آمنہ آپا کا گلوگیر آواز میں کہنا۔

"حنا! تم نے بیٹی ہونے کا حق ادا کردیا 'اک غیر ہو کر تم نے وہ کیا جس کی کبھی ہم نے توقع بھی نہیں کی تھی خوش رہو۔"

(4) شعاع میں چھپنے والے تمام ناول اعلا ہوتے ہیں۔ بہت سے ناول پسند آئے۔ فرحت اشتیاق ' شازیہ چودھری ' ساجدہ حبیب ' عمیرہ احمد ' ہما کوکب اور اب نمرہ جی... شازیہ چودھری کی ہر ہیروئن کا کردار خود سے ملتا جلتا محسوس ہوتا۔ جانے کیوں 'شازیہ جی! کیوں اتنی جلدی موت کی وادی میں چپکے سے اتر گئیں۔ دشت وفا کے مسافر 'شہر دل کے دروازے ' آنچل میں جگنو ... ان کی ہر تحریر کو بہت پڑھا اور لاجواب پایا۔ ام مریم بھی اچھا اضافہ ہیں۔ فرحت جی کے ناول "ہم سفر" اور "وہ جو قرض رکھتے تھے جاں پر" کی مدح سرائی میں کیا کہوں۔ الفاظ ہی نہیں ہیں۔ ساجدہ حبیب کی بنگلہ دیش سے جڑی تحریریں دل پہ کیا غضب ڈھاتی ہیں 'لفظوں میں بیان مشکل ہے۔

(5) ساون ... خوب صورت موسم جس کے آتے ہی بیتی یادیں دبے پاؤں چلی آتی ہیں۔ کوئی کتنا ہی جتن کرلے 'اس سے چھٹکارہ ممکن نہیں بقول شاعر۔

"اک گھر ہے تنہا یادوں کا اور اس میں ہم رہتے ہیں"

(6) پسندیدہ شعر 'کتاب 'اقتباس ایک نہیں بہت سے ہیں۔

ساجدہ حبیب کی ہر تحریر جو بنگلہ دیش سے جڑی ہو ' انجانا دکھ ' اداسی دے جاتی ہے۔ کراچی کے بدلتے بگڑتے حالات 'خون کے آنسو رلاتے ہیں۔ بنگلہ دیش کے المناک قیام پر فراز کی نظم "اب کس کا جشن مناتے ہو!" دل پہ نقش ہے اور کراچی کے موجودہ حالات کے پس منظر میں سچے پاکستانی کے احساسات کی ترجمانی عبیداللہ علیم کی نظم گویا پیروں تلے زمین کھینچ لیتی ہے 'چند اشعار آپ کی نذر۔

میں کس کے نام لکھوں جو الم گزر رہے ہیں
مرے شہر جل رہے ہیں میرے لوگ مر رہے ہیں
کبھی رحمتیں تھیں نازل اس خطہ زمین پر
وہی خطہ زمیں ہے کہ عذاب اتر رہے ہیں
کوئی اور تو نہیں ہے پس خنجر آزمائی
ہم ہی قتل ہو رہے ہیں ہم ہی قتل کر رہے ہیں

پسندیدہ کتاب... شہاب نامہ اور ماں جی۔

پسندیدہ اقتباس... بہت مشکل ہے کسی ایک کو چننا۔

"وہ جو قرض رکھتے تھے جاں پر" عنواں سمیت بے حد پسند آیا تھا۔ فریا کا اپنی ماں کے وعدے کو نبھانا اور پھر عزم کرنا۔

"اگر مجھ سے چننے کو کہا جائے ایک رشتہ یا بہت سے رشتے تو ہر بار میرا انتخاب ہوگا 'بہت سے رشتے۔"

امۃ الصبور

تاریخ کے جھروکوں سے

ستارہ

یہ اس وقت کی دلّی ہے، جب نادر شاہ درانی کی یلغار نے مغل سلطنت کو ہلا کر رکھا ہوا تھا۔

محمد شاہ، فرماں روائے ہند کا برا حال ہو چکا تھا۔ اسے تاریخ میں محمد شاہ رنگیلا کہا گیا ہے۔ وہ ایک احمق اور عیاش بادشاہ تھا۔

اس روز نادر شاہ خاصا خوش تھا۔ اس کا لشکر دہلی سے ذرا فاصلے پر خیمہ زن تھا۔ اور وہ فرماں روائے ہند کی جانب سے ان تحائف کا منتظر تھا، جس کا وعدہ اس شکست خوردہ حکمران نے کر رکھا تھا۔ ذرا سی دیر کے بعد اس کے خیمے کا پردہ ہٹا اور اس کے خادم خاص نے بتایا کہ تحائف آ گئے ہیں۔

"تفصیل؟" نادر شاہ نے دریافت کیا۔

"ایک ہاتھی، ایک درجن گھوڑے، پچاس غلام اور درجن بھر حسین و جمیل ہندی دوشیزائیں۔"

یہ تحفے کافی دیر میں پہنچے تھے، اور نادر شاہ اس تاخیر پر اندر ہی اندر برہم تھا۔ اس وقت شام ہو رہی تھی۔ نادر شاہ نے ان کا معائنہ دوسری صبح پر ملتوی کر دیا لیکن عورتیں...

نادر شاہ نے ہندی عورتوں کے حسن کی بہت تعریفیں سنی تھیں۔ وہ خیمے سے نکلا اور اس طرف چلا جہاں یہ عورتیں رکھی گئی تھیں۔

جس خیمے میں وہ پہنچا، وہاں داخل ہوتے ہی نادر شاہ حیرت سے ششدر رہ گیا۔ جو کچھ اس نے سنا تھا، یہاں معاملہ اس سے بھی سوا تھا۔ لگتا تھا ایک ہی جگہ پر بہت سے چاند نکل آئے ہوں۔ ہر حسینہ دوسری سے بڑھ کر لگ رہی تھی۔

نادر شاہ انہیں دیکھتا اور تولتا رہا پھر اس کی نگاہیں سب کا جائزہ لینے کے بعد ایک چہرے پر آ کر رک گئیں۔ لڑکی نے نادر شاہ کو اپنی جانب گھورتے پایا تو اس نے نظریں جھکا لیں۔

"یہ۔ یہ کون ہے؟" نادر شاہ نے خواجہ سرا سے دریافت کیا جو اس کے عقب میں تلوار سونتے کھڑا تھا۔

"عالی جاہ، یہ ایک راجپوت دوشیزہ۔" خواجہ سرا نے بتایا۔

"دوشیزہ؟" اچانک اس لڑکی کے گلاب جیسے لب کھلے اور اس کی طنزیہ آواز بلند ہوئی جس میں زبردست بے باکی تھی۔

"غلط!" اس نے کہا "میں دوشیزہ نہیں بلکہ ایک شادی شدہ عورت ہوں۔"

نادر شاہ کو لڑکی کی دلیری اچھی لگی۔ اس نے پوچھا "تمہارا نام کیا ہے؟"

"ستارہ!" لڑکی نے پرسکون آواز میں جواب دیا۔

لڑکی، جس کا نام ستارہ تھا، ابھی اسی جگہ کھڑی ہوئی تھی جہاں اسے خواجہ سرا چھوڑ کر گیا تھا۔

"ادھر آؤ۔ میرے قریب" نادر شاہ نے کہا۔

لڑکی جھجکی، اس کے چہرے پر وحشت اور اداسی نے عجیب سی کیفیت طاری کر رکھی تھی اور وہ کچھ زیادہ ہی اچھی لگ رہی تھی۔ حقیقتاً" وہ خوف زدہ تھی۔ اس نے اس ایرانی حملہ آور کی سفاکی کی داستانیں سن رکھی تھیں۔ مگر اب رہا ہی کیا تھا، وہ تن بہ تقدیر ہو کر آگے بڑھی۔

"مجھے کچھ اپنے بارے میں بتاؤ۔" نادر شاہ نے کہا۔

لڑکی نے اسے بتایا کہ وہ نسلاً" راجپوت ہے۔ وہ چھوٹی ہی تھی کہ اسے گرفتار کر لیا گیا تھا۔ پھر اس کی

شادی ایک مغل سپاہی سے کردی گئی۔ جس کے گھر سے وہ موقع پاتے ہی بھاگ نکلی تھی۔ اسے ایک تاجر گھرانے نے پناہ دی۔ یہ گھرانہ اسے دلی لایا۔ یہاں بادشاہ کی ایک ملکہ نے اسے پسند کرلیا اور وہ شاہی محل میں پہنچ گئی۔ جہاں وہ اب تک ایک کنیز کی حیثیت سے رہ رہی تھی۔

نادر شاہ اسے مسلسل دیکھ رہا تھا۔ وہ ایک پکی عمر کا آدمی تھا' فولادی ذہن کا۔ مگر یہ لڑکی کسی بادو کی طرح اس کے سر چڑھ گئی تھی۔

اچانک اس نے نرمی سے کہا۔

"کیا تم میری ملکہ بننا پسند کرو گی؟"

ستارہ کا جسم آہستہ سے لرزا تھا۔ وہ کسی بوجھ کو محسوس کرتے ہوئے ڈگمگائی اور وہیں فرش پر ڈھیر ہوگئی۔

یہ تقدیر کا ایک کھیل تھا۔

وہ جو لونڈی بنا کر دشمن کے حوالے کردی گئی تھی۔ ایک دم سے ایک انتہائی باجبروت بادشاہ کی ملکہ بن گئی تھی۔

مگر۔ اس جگہ ایک اور عورت بھی تھی۔ اس کا نام شیرازی تھا۔

شیرازی وہ عورت تھی جو اب تک نادر شاہ کی سب سے زیادہ منظور نظر ہونے کا شرف رکھتی تھی۔

ستارہ کی آمد نے اس کے پیروں تلے سے زمین کھینچ لی تھی اور وہ کسی ناگن کی طرح غصے سے بل کھا رہی تھی۔

پھر ستارہ کو خبر ملی کہ نادر شاہ کا لشکر اب دہلی کی طرف روانہ ہونے والا ہے۔ اس کے کچھ حصے کو پیچھے ہی رکے رہنا تھا اور اس میں نادر شاہ کا حرم بھی شامل تھا۔

پھر نادر شاہ نے اسے بتایا کہ وہ کچھ دنوں تک شاید اس سے دور رہے گا۔ اس نے کہا "تم پریشان نہ ہونا۔ میں ایک ہیرا تمہیں دے رہا ہوں' یہ ایک خاص نشان ہے۔ اگر تمہیں کبھی میری سخت ضرورت محسوس ہو تو اسے کسی قاصد کے ذریعے میرے پاس بھیج دینا۔ میں فوراً تمہیں اپنے پاس بلوالوں گا۔"

پھر اس نے وہ ہیرا نکال کر ستارہ کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

اس ہیرے کی ضرورت ستارہ کو جلد ہی پیش آگئی۔ اسے خبر ملی تھی کہ نادر شاہ نے دلی کے شہریوں کے قتل عام کا حکم دے دیا ہے۔ اسے معلوم تھا کہ نادر شاہ کا غصہ کیا معنی رکھتا ہے۔ زندگی اور موت کا کھیل اس کے لیے کوئی معنی نہ رکھتا تھا۔

ستارہ کو دلی سے پیار تھا۔ اس جگہ اس نے اچھے دن گزارے تھے اور اس کی بہت سی محبوب شخصیتیں یہاں تھیں۔ وہ اس قتل عام کو رکوانا چاہتی تھی۔ جس کی ابھی ابتدا ہوئی تھی۔ اس نے آغا باشی کو طلب کیا اور ہیرا نادر شاہ کے پاس بھجوانے کے لیے قاصد دوڑایا۔

یہ ستارہ ہی تھی جس کی التجا پر نادر شاہ کی تلوار نیام میں گئی تھی۔ پھر بھی اس عرصے میں دلی کے گلی کوچوں میں خون ہی خون پھیل چکا تھا۔ یہ اتنا بڑا قتل عام تھا کہ تاریخ میں اس کی نظیریں کم ملتی ہیں۔

نادر شاہ نے دلی کی سلطنت کو اچھی طرح پامال کرنے کے بعد بے شمار مال غنیمت کے ساتھ اپنے ملک واپسی کا سفر شروع کیا تو ستارہ اس کے ساتھ تھی۔

نادر شاہ ہرات پہنچا تو معلوم ہوا نادر شاہ کا بیٹا اور ولی عہد شہزادہ رضا خان استقبال کے لیے آرہا ہے۔

نادر شاہ کو بیٹے سے جدا ہوئے دو سال سے زائد ہوچکے تھے۔ فطری بات تھی کہ وہ بیٹے کو دیکھنے کا متمنی تھا پھر اسے یہ بھی معلوم ہوچکا تھا کہ اس عرصے میں شہزادے نے اپنی لیاقت سے ملک کا انتظام بہت عمدگی سے سنبھالا تھا۔

اس جگہ یہ بتانا ضروری ہے کہ شہزادے کی تعریفیں سن سن کر نادر شاہ کو کچھ شبہ سا ہونے لگا تھا کہ کہیں بیٹا غرور میں آکر کوئی غلط حرکت نہ کرے۔ کچھ لوگوں کی سازش اس کے پس پردہ تھی۔ اور انہوں نے شہزادے کے اندر بھی یہ خیال ڈال دیا تھا کہ نادر شاہ آتے ہی

اسے پھر ایک ادنیٰ عہدے دار میں بدل دے گا۔

پھر ایک روز خلوت میں نادر شاہ نے جب اپنے شبہات کا تذکرہ ستارہ سے کیا تو اس نے شہزادے کی طرف داری میں اسے سمجھانا شروع کر دیا' اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ سمجھا یہ عورت شہزادے سے مل گئی ہے۔

بدقسمتی سے ان ہی دنوں نادر شاہ پر ایک قاتلانہ حملہ ہوا۔ جو ناکام رہا۔ شیرازی نے نادر شاہ کو پٹی پڑھائی کہ یہ حرکت شہزادے کی ہے، جو اب خود بادشاہ بننا چاہتا ہے۔

ادھر ستارہ نے اس خیال سے کہ باپ بیٹے کی دشمنی طول نہ پکڑے۔ نادر شاہ کو سمجھانا شروع کیا کہ وہ بلا تحقیق شہزادے کو موردِ الزام قرار نہ دے۔ بات شاید خراب نہ ہوتی اگر شیرازی نے نادر شاہ کے دل میں ایک خیال اور نہ ڈال دیا ہوتا کہ ستارہ شہزادے کی محبت میں گرفتار ہو گئی ہے۔ ستارہ کی اس سفارش نے نادر شاہ کے اندر اور زہر پھیلا دیا۔ اس نے چیخ کر کہا۔

"میں رضا خان کو اندھا کرانے جا رہا ہوں تاکہ یہ فتنہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے۔"

ستارہ یہ سن کر دہل گئی۔ اس نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

"شاہ! رحم کریں۔ وہ آپ کا بیٹا ہے۔ آپ اسے اندھا کرا کے کبھی خوش نہیں رہ سکیں گے۔"

نادر شاہ نے غصے سے ستارہ کو دیکھا اور اسے زور سے دھکا دیا۔ وہ منہ کے بل فرش پر جا گری۔

آغا باشی نے نادر شاہ کے حکم پر اسے محل سے دوسری جگہ منتقل کر دیا۔

نادر شاہ بے حد چڑچڑا ہو چکا تھا اور ملکی مسائل میں اس طرح دھنس گیا تھا کہ اس نے ستارہ کے بارے میں پلٹ کر کبھی نہیں پوچھا۔ تب وہ ایک روز خود ہی نکل کھڑی ہوئی۔ وہ نادر شاہ سے ملنے چلی تو آغا بہت سخت پریشان ہوا۔ اس نے بہت سمجھایا کہ نادر شاہ اسے مروا بھی سکتا ہے مگر وہ نہ مانی۔

اسی رات۔!

نادر شاہ کے خیمے میں دشمن کا آدمی گھسا اور اس کے خنجر نے ہمیشہ کے لیے اس شخص کو دنیا سے رخصت کر دیا جس نے شک و شبے اور حکومت و اقتدار کی لپیٹ میں آ کر نہ صرف اپنے چہیتے بیٹے کو اندھا کرا دیا تھا بلکہ ایک باوفا بیوی پر الزام لگا کر اسے قید تنہائی میں ڈال دیا تھا۔

ستارہ نے نادر شاہ کی لاش کو دیکھا۔ پھر اس نے نہایت سکون سے اپنی پٹی سے خنجر نکالا اور وہیں اپنے سینے میں گھونپ لیا۔



تاریخ آج تک یہ فیصلہ نہیں کر سکی ہے کہ ستارہ کیا واقعی نادر شاہ کی ایک باوفا بیوی تھی یا یہ حقیقت ہے کہ وہ ولی عہد رضا خان کے سامنے دل ہار گئی تھی۔ اور اس کے اندھا ہو جانے کے بعد دل برداشتہ ہو کر خودکشی کر لی تھی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ اسی نیت سے نکلی تھی کہ وہ نادر شاہ کو ختم کر کے خود اپنا خاتمہ کر لے گی۔ مگر یہ تمام باتیں غیر تصدیق شدہ ہیں۔ محقق نے ستارہ اور رضا خان کے رومان کا ذکر ضرور کیا ہے۔ اور لکھا ہے کہ نادر شاہ کی اس محبوبہ ہی کی وجہ سے رضا خان نے اپنی آنکھیں گنوائی تھیں اور بوڑھے نادر شاہ کی موت میں ستارہ کا بڑا ہاتھ تھا۔



سرورق کی شخصیت

ماڈل	سحر
میک اپ	روز بیوٹی پارلر
فوٹو گرافر	موسیٰ رضا



موسم کے پکوان

خالدہ جیلانی

زنگر برگر

ضروری اجزا :

چکن بریسٹ پیسز	چار عدد
لال مرچ	ایک کھانے کا چمچہ
سرکہ	دو کھانے کے چمچے
انڈے	دو عدد
میدہ	چار کھانے کے چمچے
کارن فلیکس	دو کپ
سلاد کے پتے	چار عدد
سلائس چیز	چار عدد
مایونیز	آدھا کپ
چلی گارلک ساس	دو کھانے کے چمچے
بند	چار عدد
نمک، تیل	حسب ذائقہ و ضرورت

ترکیب :

چکن بریسٹ پیسز کو چھری سے گود لیں یا چپٹا کرلیں۔ پھر نمک، لال مرچ اور سرکہ میں لپیٹ کر دو گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ اس کے بعد میدے میں رول کریں، پھر انڈے میں ڈبو کر کارن فلیکس میں لپیٹ کر گرم تیل میں فرائی کریں۔ مایونیز اور چلی گارلک ساس کو مکس کریں۔ بن پر لگائیں پھر سلاد کا پتا، چکن کا پیس اور چیز کا سلائس رکھیں۔ برگر تیار ہے۔ فرنچ فرائز اور سلاد کے ساتھ پیش کریں۔

مرغ تنجن

ضروری اجزا :

چکن	سوا کلو
چاول	تین پاؤ
دودھ	ڈیڑھ کپ

چینی	آدھا کلو
کشمش، بادام	چار کھانے کے چمچے
زعفران	ایک چٹکی
پیاز	ایک عدد
کیوڑہ، لیموں کا رس	دو، دو کھانے کے چمچے
نمک	حسب ذائقہ
گھی	ایک سے ڈیڑھ پاؤ

ترکیب:

چاول آدھا گھنٹہ بھگونے کے بعد نمک کے ساتھ ایک کنی ابال کر نتھار لیں اور پھیلا دیں۔ دودھ میں چینی ڈال کر پکائیں اور گاڑھا سا شیرہ بنالیں۔ چکن میں چھ گلاس پانی، لہسن کے چھ جوے، پیاز، نمک اور ایک چمچہ سونف ڈال کر پکائیں۔ ایک کپ یخنی رہ جائے تو اتار لیں۔ بڑی پتیلی میں گھی گرم کرکے الائچی کڑکڑائیں پھر یخنی سے چکن کے ٹکڑے نکال کر ڈال دیں۔ آہستہ آہستہ بھوننے کے بعد شیرہ ڈال دیں۔ تھوڑی دیر بعد چاول بھی ڈال دیں۔ لیموں کا رس کشمش اور بادام (دو ٹکڑے کرکے) بھی ڈال دیں۔ ساتھ ہی یخنی بھی ڈال دیں۔ پانی قدرے خشک ہونے لگے تو زعفران کو کیوڑے میں گھول کر چھڑک دیں، پھر دم لگا دیں۔ بیس منٹ بعد ٹرے میں نکال کر بوٹیاں نمایاں کرکے اوپر رکھیں۔

بالائی اور بھنے ہوئے کھوئے میں کیوڑہ اور بادام پیس کر شامل کرلیں یا بادام اور ابلے ہوئے چھوہارے باریک کتر کر ڈال دیں۔ یہ اضافی ڈش ہے جو متنجن کے ساتھ پیش کی جاتی ہے۔ اس کے بغیر بھی متنجن پیش کیا جاسکتا ہے۔

چکن ویجی ٹیبل کباب

ضروری اجزا:

چکن	ایک کلو
آلو	آدھا کلو
گاجر	آدھا کلو
لہسن، ادرک پیسٹ	دو کھانے کے چمچے
سویا ساس	دو کھانے کے چمچے
ہری پیاز	آٹھ عدد
مایونیز	ایک کپ
انڈے	چار عدد
بریڈ کرمبز	حسب ضرورت
نمک	حسب ذائقہ

ترکیب:

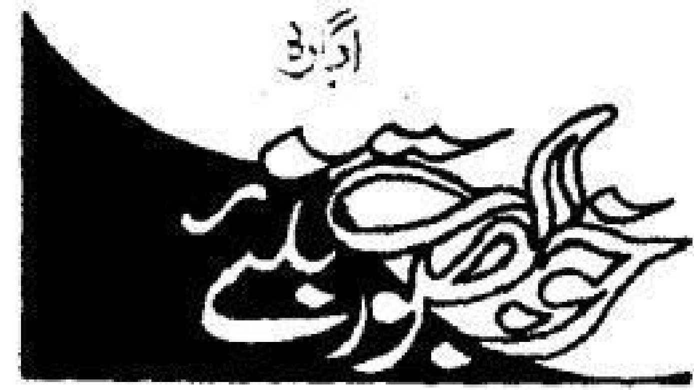
چکن میں نمک، لہسن، ادرک اور سویا ساس ڈال کر ابال لیں، پھر ریشے کرلیں۔ آلو ابال کر چھیل کر چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کرلیں۔ گاجر کو کدوکش کرلیں۔ ہری پیاز اور ہری مرچ باریک کاٹ لیں۔ چکن کے ریشے، آلو، گاجر، ہری مرچ، ہری پیاز میں مایونیز ڈال کر مکس کرلیں۔ کباب بنا کر بریڈ کرمبز میں کوٹ کریں، پھر انڈے میں ڈبو کر فرائی کریں۔ مزے دار چکن ویجی ٹیبل کباب تیار ہیں۔ ٹماٹو کیچپ کے ساتھ گرم گرم پیش کریں۔

کدو کا حلوہ

ضروری اجزا:

کدو	ایک کلو
چینی	آدھا کلو
گھی	ایک پاؤ
بادام، پستے	حسب ضرورت
الائچی	چند دانے

کدو کو چھیل کر بیج الگ کریں اور کش کرلیں۔ گھی میں الائچی دانے کڑکڑائیں۔ کش کیا ہوا کدو ڈال کر ہلکی آنچ پر پکنے کے لیے رکھ دیں۔ گل جائے تو گھوٹ لیں، پھر چینی ڈال کر پکائیں۔ شیرہ گاڑھا ہونے لگے تو بھون لیں۔ گھی چھوڑنے لگے تو کیوڑہ ڈال کر اتار لیں۔ پھر ڈش میں نکال کر بادام، پستے کی ہوائیاں چھڑک دیں۔



جھریاں

عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ پینتیس یا چالیس سال کی عمر سے جھریاں پڑنا شروع ہو جاتی ہیں۔ تفکرات اور صحیح غذا نہ ملنے کی وجہ سے بھی چہرے پر جھریاں پڑنا شروع ہو جاتی ہیں اور عمر زیادہ لگنے لگتی ہے۔ اس کے علاوہ جلد کی خشکی کی وجہ سے بھی جھریاں پڑ جاتی ہیں۔

علاج

اگر تفکرات اور صحیح غذا نہ ملنے کی وجہ سے جھریاں پڑ جائیں تو جلد کا کسی اچھی موئسچرائزنگ کریم سے مساج کریں۔ گہری اور پوری نیند لیں اور پورا آرام کریں۔ اچھی خوراک جس میں پروٹین ہو' جلد کو فائدہ پہنچاتی ہے' وہ استعمال کریں۔

ماسک

بادام باریک پیس کر دودھ میں ملا کر کریم کی صورت میں لگائیں۔ بیس منٹ کے بعد چہرہ دھو لیں۔ اس کے علاوہ خربوزے کے ٹکڑے کر کے چہرے پر آہستہ آہستہ ملیں۔ اس سے جلد تر و تازہ ہو جائے گی۔

چھائیاں

پہلے یہ ہلکے دانوں کی صورت میں چہرے پر نظر آتی ہیں' پھر چھائیوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ جب چہرے پر چھائیاں پڑ جائیں تو چہرے کو دھوپ سے بچائیں اور چہرے پر بلیچنگ کریم لگائیں۔ بادام' ہلدی' دودھ اور لیموں استعمال کریں۔ بادام کو پیس کر اس میں ہلدی اور دودھ ملا کر پیسٹ بنائیں اور اس میں چند قطرے لیموں کے ڈالیں' یہ چھائیوں کے لیے مفید ہے۔

کیلیں

سخت دھوپ گرمی اور پسینے سے چہرے کے مسام کھل جاتے ہیں اور ان میں میل کچیل بھر جاتا ہے۔ جو کالا اور سخت مواد بن جاتا ہے۔ اسے بلیک ہیڈ کہتے ہیں۔ یہ عام طور پر چکنی جلد پر ہوتے ہیں۔

علاج

چہرے کو کسی اچھے صابن سے دھوئیں۔ کلینزنگ کریم کی مدد سے چہرے کا اچھی طرح سے مساج کریں' پھر ٹشو پیپر سے صاف کریں۔ تولیے کو گرم پانی میں بھگو کر چہرے پر بھاپ دیں۔ تاکہ سب مسام کھل جائیں۔ اس کے بعد چہرے کو احتیاط سے روئی کی مدد سے صاف کریں' تاکہ مساموں میں کالا مواد نرم پڑ جائے۔

خشک جلد کے لیے ہدایات اور علاج

چہرے پر اگر جھریاں جلد کی خشکی کی وجہ سے وقت سے پہلے پڑ جائیں ________ تو چہرے کو دھوپ کی تمازت سے بچائیں۔

علاج: کاغذی لیموں کے رس کو نچوڑ کر شہد میں ملا کر چہرے پر ملیں۔ پندرہ منٹ کے بعد چہرہ دھو لیں اور زیتون کے تیل میں بالائی کی کریم ملا کر دس منٹ مالش کریں۔ ماسک میں بادام کو پیس کر لیپ کریں۔ یہ انتہائی مفید ماسک ہے۔

چھائیاں: چہرے کو دھوپ سے بچائیں۔ چہرہ صاف رکھیں۔ روزانہ رات کو سوتے وقت کلینزنگ کریم سے چہرے کی صفائی کریں۔ تازہ سبزیاں' فروٹ میں سیب اور وٹامن سی جن پھلوں میں زیادہ پائے جائیں' استعمال کریں۔

ماسک کی تیاری

شہد کا ماسک: یہ ماسک نرم جلد اور جھریوں کے لیے ہے۔ اس کے لیے شہد میں چند قطرے لیموں کا عرق اچھی طرح سے ملا لیں اور چہرے پر بیس منٹ تک رہنے دیں اور پھر اسکن ٹانک لگا کر روئی کی مدد سے اتار دیں۔

انڈے کا ماسک: یہ ماسک زیادہ عمر کی خواتین کے لیے ہے۔ ایک انڈا لیں۔ اس کی سفیدی میں ایک چمچ لیموں کا عرق اور ایک چمچ دودھ کی بالائی اچھی طرح سے ملا لیں پھر آنکھوں کو بچا کر چہرے پر لگائیں اور آدھے گھنٹے تک لگا رہنے دیں اور اس کے بعد ٹھنڈے پانی سے چہرہ دھو لیں۔

